خطبات

حکیم الامت

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان فون 4540513-4519240

بسلسلہ خطباتِ حکیم الامت جلد ۲۶

اصلاحِ اعمال

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

تصحیح وتزئین	تخریج احادیث
صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ	مولانا زاہد محمود قاسمی

ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

اِصلاحِ اَعمال

تاریخ اشاعت.............رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ
ناشر.........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
طباعت....................سلامت اقبال پریس ملتان

انتباہ

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ...چوک فوارہ...ملتان — مکتبہ الفاروق ۔مصریال روڈ چوہڑ ہڑپال ۔راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی.........لاہور — دارالاشاعت.........اُردو بازار..........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید........اردو بازار......لاہور — مکتبۃ القرآن.......بنوری ٹاؤن.............کراچی
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار ....لاہور — مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار......پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K (ISLAMIC BOOKS CENTERE
119-121- HALLIWELL ROAD BOLTON BL1 3NE. (U.K.)



عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل ''خطبات حکیم الامت'' مکمل ۳۲ جلدوں میں شائع کر چکا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ خطبات میں آنے والی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے اور فارسی اشعار وغیرہ کا ترجمہ ہو جائے۔

الحمدللہ ادارے نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام کیا۔ محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے تخریج احادیث اور حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے فارسی اشعار کے ترجمہ وغیرہ کے کام انجام دیئے۔ اس طرح الحمدللہ یہ جدید ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ بمطابق اگست 2009ء

اجمالی فہرست

مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ
الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّوَالُ

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
اِنَّ اللّٰهَ كَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَقَالَ وَكَثْرَةَ السُّوَالِ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ
اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا
وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا
فَكَرِهْتُمُوْهُ. وَاتَّقُوا اللّٰهَ. اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

فہرست مضامین

الصالحون

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ کو جامع مسجد خورجہ ضلع بلند شہر میں ۳ گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۱۰۰۰ تھی۔
حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری نے قلمبند فرمایا۔

حالت درست وہی ہے جو عند اللہ درست ہو' اصلاح وحی پر موقوف ہے' آج کل بہتوں کا مذاق یہ ہے کہ نیکی کو محض نفع رسانی مخلوق میں منحصر سمجھتے ہیں۔ احکام شرعیہ میں مصالح بیان کرنے کی حقیقت وحی اور عقل کا فرق۔ تقلیل تعلقات اور ترک دنیا سے نور پیدا ہو جاتا ہے' فہم میں گو وہ مقبول نہ ہو' کیونکہ مقبولیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ حقیقت شناس صوفیا ہی ہیں' جتنا فہم اتنا مواخذہ تقلید صحابی کی بھی واجب ہے۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کی وجہ اور ائمہ مجتہدین پر اجتہاد ختم ہونے کی دلیل قرآن کا ترجمہ دیکھنا بعضوں کو حرام ہے۔ ذوق سلیم بلا صحبت کے حاصل نہیں ہوتا۔ اصلاح حال واجب ہے اور اس کا طریقہ ہر کام میں اپنی رائے و ہوائے نفسانی کو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا ہے۔

مکالمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت والا وعظ کے لئے ممبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسب عادت وعظ سے پہلے دعا مانگی۔ دعا ختم ہی کی تھی کہ مجمع میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے جو وضع قطع سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے انہوں نے کہا میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اکثر لوگ حضرت والا کی آزادی طبع سے واقف تھے۔ معمولاً یہ خیال ہوا کہ حضرت کو یہ حرکت ناگوار ہوگی اور عجب نہیں کہ وعظ کو ملتوی فرمادیں۔ اس واسطے چاروں طرف سے یہ آواز آئی کہ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ کوئی ضرورت عرض معروض کی نہیں ہے۔ مگر حضرت والا نے سب کو ساکت فرمایا اور ارشاد ہوا کہ سن لو کیا کہتے ہیں ممکن ہے کوئی کام کی بات ہو۔ سب لوگ ساکت ہو گئے اور انہوں نے تقریر شروع کی۔ اثناء تقریر میں پھر کئی بار غل مچا کہ بیٹھ جاؤ لیکن حضرت والا نے فرمایا یہ صاحب مجھے خطاب کر رہے ہیں ان کی بات کا جواب دوں گا آپ لوگوں کو اضطراب کیوں ہے۔ جو کچھ یہ فرمانا چاہتے ہیں ان کو فرما لینے دیجئے۔ غرض انہوں نے تقریر شروع کی اور پانچ منٹ میں اس کو ختم کیا۔ حضرت والا نے اس کا جواب دیا انہوں نے پھر کچھ کہا حضرت والا نے پھر اس کا جواب دیا یہ مکالمہ بارہ منٹ تک رہا چونکہ اس میں بہت سے مضامین نہایت مفید ہیں اس لئے انہیں ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔

مقرر صاحب۔ اسلامی ممالک پر جو طوفان آفات کا آج کل آ رہا ہے اور جس دشوار گزار راستوں سے اسلام گزر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے مسلمانان دنیا بے چین ہیں اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک تا مقدور جد و جہد میں مشغول ہیں اسی بناء پر تمام ہندوستان میں خلاف کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ کفار نے جو حق تلفیاں مسلمانوں کی کیں اور جو ناجائز مظالم کئے کوئی مسلمان ان کو سن کر خاموش نہیں رہ سکتا۔ (اس کے بعد چند مظالم تفصیل کے ساتھ بیان کئے) ہم چاہتے ہیں کہ آج کسی کے متعلق آپ بیان فرمادیں۔

حضرت والا۔ اب میں کچھ عرض کروں مگر میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری تقریر کو اس طرح ٹھنڈے دل سے سنیں گے جیسے میں نے آپ کی تقریر کو سنا۔ آپ نے جو کچھ مشورہ دیا یا فرمائش کی اس

کو میں محض خیر خواہی پر محمول کرتا ہوں لیکن اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وعظ ایک معالجہ روحانی ہے جیسا کہ دوا کرنا معالجہ جسمانی ہے علاج کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے سپرد کیا جائے اس سے پہلے تحقیق کر لینا چاہئے کہ یہ شخص جس کے سپرد علاج کیا جاتا ہے اس کا اہل ہے یا نہیں اگر اہل نہیں ہے تو اس کے سپرد کرنا ہی غلطی ہے ایسا شخص نہایت خطرناک ہے ایسے شخص کے علاج میں خطرہ جان کا ہے اور علاج روحانی میں خطرہ ایمان کا ہے اور اگر اہل ہے تو اس کو معالجہ میں رائے دینا میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک ٹھیک ہے کیونکہ اگر اس کو رائے دینے کی ضرورت ہے اور آپ رائے دے سکتے ہیں تو آپ خود طبیب ہیں آپ خود ہی علاج کر لیجئے اس کے پاس جانے اور تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اگر مجھ سے بیان کرانا ہے تو پہلے اطمینان کر لیجئے کہ میں اس کا اہل ہوں یا نہیں اگر نہیں ہوں تو بیان نہ کرائیے اور اگر اطمینان ہے کہ میں اہل ہوں تو مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔ یہ خطاب صرف آپ ہی کو نہیں ہے بلکہ سارے مجمع کو ہے سب کو حق ہے رائے دینے کا اور میں سب سے جواب چاہتا ہوں۔

مقرر صاحب۔ یہ جناب کا فرمانا بالکل صحیح ہے ہم کو جناب پر پورا اطمینان ہے جو کچھ عرض کیا گیا وہ نہ اس غرض سے ہے کہ جناب پر اطمینان نہیں بلکہ محض اس وجہ سے ہے کہ ایک بات جو اپنے نزدیک مناسب اور ضروری معلوم ہوئی اس کو جناب کے کان میں ڈال دیا جیسے بعض وقت مریض طبیب سے کہتا ہے کہ مجھے یہ یہ شکایتیں ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلا مسہل کے اس کا ازالہ نہ ہوگا اگر آپ کے نزدیک کوئی حرج نہ ہو تو مسہل دے دیجئے۔ میری التجا جناب کو ناگوار نہ ہونی چاہئے۔ بعض وقت طبیب کا ذہن ایک بات کی طرف نہیں جاتا مریض کے عرض کرنے سے پہنچ جاتا ہے اس وقت اس مضمون سے زیادہ ضروری کوئی دوسرا مضمون نہیں معلوم ہوتا اس وجہ سے جناب سے التجا کی گئی۔

حضرت والا۔ زیادہ تہذیب کے الفاظ کو چھوڑ دیجئے زیادہ تہذیب کی حقیقت تصنع ہے معاملہ کی بات ہے کہ میرا پیشہ وعظ گوئی نہیں ہے نہ مجھے وعظ کہنے کی خواہش ہے نہ ضرورت محض آپ لوگوں کی رغبت دیکھ کر بیان کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔ دو حال سے خالی نہیں آپ نے جو رائے دی یہ امر ہے یا مشورہ۔ اگر امر ہے تو آپ میرے کوئی حاکم نہیں اس واسطے یہ آپ کا فرمانا میرے لئے واجب العمل نہیں اور اگر مشورہ ہے تو آپ کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے کہ آپ نے جس بات کو مفید سمجھا پیش کر دیا اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ لیکن اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے ماننے پر مجبور ہوں ممکن ہے کہ میرے نزدیک مفید نہ ہو۔ میں نے سن لیا اور اس سے برا بھی نہیں مانا اب مجھے اختیار ہے کہ اس پر عمل کروں یا نہ کروں آپ کو حق تھا کہ جس بات کو آپ نے مفید سمجھا پیش کر دیا جیسے آپ کی مثال میں ہے کہ مریض نے رائے دی کہ میرے لئے مسہل کی ضرورت

معلوم ہوتی ہے اس واسطے یہ رائے دینا درست ہے کہ شاید طبیب کا ذہن اس طرف نہ گیا ہو تو اس کے کہنے سے پہنچ جائے لیکن اپنی رائے ظاہر کر دینے کے بعد مریض کو اصرار کا حق نہیں ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو یہی کرنا ہوگا ورنہ آپ غلطی کریں گے۔ جو مریض اپنی رائے رکھتا ہوا سے طبیب کے پاس نہیں جانا چاہئے وہ تو خود طبیب ہے سب جانتے ہیں کہ مریض طبیب میں اس طرح معاملہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر کوئی طبیب ایسا ہو کہ مریض کے کہنے پر چلتا ہو تو عقلاً اس کو بیوقوف کہیں گے۔ اب میں سب سے اور خصوصاً آپ سے عرض کرتا ہوں آپ کی رائے سننے کے بعد مجھے کیا کرنا چاہئے آیا اس رائے کا ماننا میرے لئے ضروری ہے اور آپ ہی کی رائے پر مجھ کو چلنا چاہئے یا اپنے نسخہ پر اب آپ آخری بات فرما دیجئے کہ میں بیان کروں یا نہیں۔

مقرر صاحب۔ ہم آپ پر حاکم کیا ہوتے ہم تو مشورہ دینے کے قابل بھی نہیں ہمارا عرض کرنا تو ایک التجا ہے اور ہم اس پر بوجہ اس درد کے جو اس وقت ہر مسلمان کے دل میں ہے مجبور ہیں۔

حضرت والا۔ آپ نے جو رائے ظاہر فرمائی وہ سراسر درد پر مبنی سہی لیکن ان دو باتوں میں کسی میں تو داخل ہو ہی گی یا امر کے درجہ میں ہوگی یا مشورہ کے وہ جس درجہ میں اس پر اسی کا حکم مرتب ہوگا امر کے حقوق اور ہیں اور مشورہ کے درجہ میں عرض کر چکا ہوں کہ امر کے درجہ میں تو ہو نہیں سکتی کیونکہ آپ آمر اور میں مامور نہیں لامحالہ مشورہ کے درجہ میں ہوگی اور مشورہ کا حق یہ ہے کہ اس پر عمل کرنا واجب نہیں ہوتا۔ اب میں اس پر استدلال کرتا ہوں حدیث بریرہ سے اس کا مضمون یہ ہے کہ بریرہ لونڈی تھیں حضرت عائشہؓ کی اور ان کا نکاح ہوا تھا ایک شخص مغیث نامی سے۔ حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کر دیا اور یہ شرعی مسئلہ ہے کہ لونڈی کو آزاد ہونے کے بعد خیار عتق ہوتا ہے یعنی اختیار ہوتا ہے کہ اپنے نکاح کو باقی رکھے یا نہ رکھے۔ بریرہ نے نکاح کو باقی نہ رکھا۔ مغیثؓ کو ان سے بڑی محبت تھی وہ بہت پریشان ہوئے اور بڑی کوشش کی کہ وہ نکاح کو باقی رکھیں بریرہ نے نہیں مانا۔ مغیث گلیوں میں ان کے پیچھے روتے پھرتے تھے لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مغیث کی حالت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحم آیا اور بریرہ سے فرمایا کہ مغیث سے نکاح کر لو۔ اب سنئے بریرہ کیا کہتی ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ مجھ کو یہ حکم دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں۔ بریرہ صاف کہتی ہیں کہ مجھ کو ضرورت نہیں یعنی جب یہ حکم نہیں سفارش ہے مشورہ ہے تو میں نہیں قبول کرتی۔

(کذافی جمع الفوائد باب الطلاق المکرہ والمجنون عن البخاری واصحاب السنن)

(ایسے ہی جمع الفوائد میں مکرہ و مجنون کی طلاق کے باب میں بخاری اور اصحاب سنن سے مروی ہے)

اس کو کہتے ہیں بے تکلفی اور صفائی اور یہ ہے معاشرت۔ اب یہ باتیں مسلمانوں میں مفقود ہو گئیں) اس جواب پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکیر نہیں فرمایا چنانچہ مغیث ناامید ہو گئے۔ بات ختم ہو گئی۔ میں نہیں سمجھتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی حق رکھتا ہو کہ اس کا مشورہ واجب العمل ہو۔ یہ مشورہ کا حق ہے جس کو میں نے حدیث سے ثابت کر دیا۔ اب میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ میں اس مشورہ کے قبول پر مجبور نہیں ہوں گا۔ اگر مجھ سے بیان کراتا ہے تو مجھے وہی حق حاصل ہو گا جو طبیب کو مریض کے بارے میں ہوتا ہے کہ اپنی تشخیص و تجویز پر عمل کرتا ہے نہ کہ مریض کے کہنے پر۔ ہاں مریض کو اتنی اجازت ہے کہ اپنی رائے ظاہر کر دے مسہل دیا جائے تو مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر اصرار نہیں کر سکتا نہ طبیب کو مجبور کر سکتا ہے ورنہ وہ سیدھا جواب دے دے گا کہ خود علاج کر لو یا کسی ایسے طبیب کے پاس جاؤ جو تمہارا تابع ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص طبیب ہی نہیں جو مریض کے تابع ہو۔ اب میں جواب کا منتظر ہوں۔

مقرر صاحب۔ جناب کو خیال ہوا کہ میں آپ کا مخالف ہوں اور وعظ میں خلل ڈالنا چاہتا ہوں۔ حاشا وکلا میں مخالف نہیں ہوں۔ اس کا میں پورا اطمینان دلاتا ہوں۔ میرے سوال کی وجہ وہ جوش ہے جو میرے دل میں اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے بھرا ہوا ہے جس سے آج کل کوئی بھی مسلمان خالی نہیں اور ہونا بھی نہ چاہئے۔

حضرت والا۔ وعظ میں خلل ڈالنے کا لفظ تو فرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں آپ یا اور کوئی صاحب جو کوئی بھی چاہے شوق سے خلل ڈالے اور کسی ترکیب سے خلل ڈالنے کی ضرورت نہیں صرف زبان سے فرما دیجئے کہ تو بیان مت کر اور سب کے فرمانے کی بھی ضرورت نہیں مجمع میں سے صرف دو ایک حضرات فرما دیں میں اس کی موافقت فوراً کروں گا بلکہ خوش ہوں گا کہ میری محنت بچا دی۔

مقرر صاحب۔ ہرگز نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کہ وعظ کو بند کر دیا جائے کبھی کبھی تو قسمت سے یہ موقع ملتا ہے حق تعالیٰ آپ کے فیض کو جاری رکھے۔

حضرت والا۔ معاملہ کی بات ہے میں پہلے ہی سے صاف کہہ دینے کو پسند کرتا ہوں مجھے پالیسی نہیں آتی آخر میں بھی بچہ نہیں ہوں کچھ تجربہ رکھتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرنے سے گو منہ پر کوئی کچھ نہ کہے لیکن بعد میں شکایتیں ہوتی ہیں اور لعن طعن بھی ہوتا ہے کوئی کہتا ہے یہ گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں ان کو مسلمانوں سے ہمدردی نہیں۔ میرا بارہا کا تجربہ ہے اسی واسطے میں پہلے ہی صاف کہے دیتا ہوں کہ میں کسی مشورہ پر عمل کرنے پر مجبور نہ ہوں گا۔

مقرر صاحب۔ جیسا مناسب ہو ہماری سمجھ میں جو آیا عرض کر دیا۔ اب آپ بیان فرماویں۔

حضرت والا۔ میرا کسی خاص حالت کے متعلق بیان کرنے کا خیال نہیں۔ میرا معمول یہ ہے کہ میں ایسی حالت کے متعلق بیان کرتا ہوں جو عام ہو اور سب میں مشترک ہو۔ خطاب خاص کسی شخص یا جماعت کو نہیں کیا کرتا نہ کوئی مضمون قصداً اختیار کرتا ہوں نہ کسی مضمون کو قصداً ترک کرتا ہوں مجھے کسی سے ضد نہیں۔ اگر اس کے متعلق جس کی آپ نے فرمائش کی ہے کوئی مضمون ذہن میں آ گیا نفیاً یا اثباتاً اس کو چھوڑوں گا نہیں اور نہ آیا تو قصداً لاؤں گا بھی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ واقع میں اس کی ضرورت ہے یا نہیں۔ میں اپنی حالت جانتا ہوں اور اس کے لحاظ سے کہتا ہوں کہ میرے لئے اس کے متعلق یہی معمول مناسب ہے جس پر میں کاربند ہوں۔ ہر شخص کی حالت جداگانہ ہوتی ہے اور اسی کے لحاظ سے حکم ہوتا ہے۔ دیکھئے ابوذر غفاری صحابی ہیں اور ایسے صحابی جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر خصوصیت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

انی احبک و احب لک ما احب لنفسی (الصحیح لمسلم ۱۴۵۷)

یعنی اے ابوذر میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے واسطے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں یہ خصوصیت کا بیان ہے۔ پھر دیکھئے کہ ان کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ کیا دیتے ہیں فرماتے ہیں لا تلین مال یتیم و لاتقض بین اثنین (اتحاف السادۃ المتقین ۸: ۳۱۸)

یعنی تم دو کام مت کرنا ایک تو کسی یتیم کے مال کے متولی مت بننا اور ایک یہ کہ دو شخصوں میں کبھی فیصلہ نہ کرنا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں کام فی نفسہ کیسے ہیں یتیم کی خدمت کرنا کس قدر ثواب کا کام ہے۔ اور دو شخصوں میں فیصلہ کرنا کس قدر اچھا کام ہے لیکن ایک ایسے عارف باللہ صحابی کو جن کی خصوصیت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیان فرمائی کہ اس سے زیادہ کیا خصوصیت ہو سکتی ہے ان دو مذکورہ باتوں سے منع کیا جاتا ہے اور دوسرے بعضے صحابہ کے واسطے ایک یتیم کی تولیت اور قضا بین اثنین کی سلطنت کی اجازت دی جاتی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرؓ نے اقلیم میں سلطنت کی۔ اس سے صاف یہ مسئلہ نکل آتا ہے کہ اختلاف حالات سے اختلاف حکم ہو سکتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر ابوذرؓ تولیت یتیم کی اور قضا بین اثنین کی فضیلت دیکھ کر ان کو اختیار کرتے تو اچھا کرتے یا برا اور ابوبکرؓ اس ابوذرؓ کی حدیث کو سن کر ایک طرف گوشہ میں بیٹھ جاتے اور سلطنت کو ہاتھ نہ لگاتے تو اچھا کرتے یا برا جواب دونوں صورتوں میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ برا کرتے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس وقت ایک کام کو اچھا سمجھ کر سب کو اسی کی رائے دی جاتی ہے۔ کسی کو کیا خبر ہے کہ میری حالت ابوذرؓ کی سی ہے یا ابوبکرؓ کی سی۔ اگر میری حالت ابوذرؓ کی سی

ہے اور کام اختیار کروں میں ابو بکر کا سا تو میں اچھا کروں گا یا برا اور مجھ سے حق تعالیٰ کے یہاں مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ ایسے ہی اس کا عکس ہے بس مجھ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیجئے۔ اپنی حالت جیسے مجھے معلوم ہے آپ کو نہیں معلوم ہو سکتی میں صاف بات بتائے دیتا ہوں نہ میں پبلک کا طرفدار ہوں نہ گورنمنٹ کا نہ میں کہیں سے تنخواہ پاتا ہوں۔ اگر میں جھوٹ بولتا ہوں تو معاملہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ خود سمجھ لیں گے کسی سے کیا مطلب۔ میرے لئے اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے یہی مناسب ہے کہ ان قصوں میں نہ پڑوں اپنی حالت کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔ خدا جانے دوسرے مجھے کیوں مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ اب میں جواب کا منتظر ہوں میں نے اپنا معمول بتا دیا۔ میں کسی فرمائش کی تعمیل پر مجبور نہیں ہو سکتا نہ کسی سے ضد رکھتا ہوں۔ سو اگر فرمائش کے متعلق کوئی مضمون آ گیا تو ضرور بیان کروں گا خواہ نفی کا ہو یا اثبات کا اور اگر مضمون نہ آیا تو قصداً لانے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔

مقرر صاحب۔ آپ بیان شروع کریں۔

حضرت والا۔ بیان ہو یا نہ ہو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وعظ سے غرض کیا ہوتی ہے وعظ سے غرض مسلمانوں کی اصلاح ہوتی ہے اور اس صورت میں کہ بعض کی رائے کچھ ہے اور بعض کی کچھ تو ایسی حالت میں اصلاح کیا ہو سکتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی ہو جاوے اور ہر جگہ تو میں میں ہو اگر پہلے کچھ اصلاح تھی بھی تو وہ بھی ندارد ہو جاوے۔ فرقہ بندی کس قدر بری چیز ہے اس میں نہ تو دین کا خیال رہتا ہے نہ دنیا کا۔ میں اس کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھتا ہوں۔ بیان سے اس قدر نفع کی امید نہیں جتنا اس فرقہ بندی سے نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر مجھے اطمینان دلایا جائے کہ دو فرقہ نہ ہوں گے تب تو میں وعظ کہوں گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ وعظ گوئی میرا پیشہ نہیں۔

مقرر صاحب۔ ہم آپ کے خلاف نہیں وعظ شروع کیجئے۔

حضرت والا۔ میرے خلاف سے بحث نہیں آپ لوگوں میں افتراق نہ ہو۔ میں تو سنتے سنتے بے حیا ہو گیا ہوں اور گالیاں تک کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔ اختلاف کا اثر میرے اوپر کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے تو سوچ لیا ہے کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کیونکہ جب سے نوکری چھوڑی دنیا میں بھی گزر دوسروں ہی کی کمائی سے ہے آپ لوگ کماتے ہیں اس میں سے مجھے بھی کچھ دے دیتے ہیں میرے ہاتھ میں تجارت زراعت وغیرہ کوئی ذریعہ معاش کا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے دیکھا کہ یہ احدی ہے آخرت کے لئے بھی دوسروں ہی کی کمائی میں میری بھلائی کی تدبیر کر دی کیونکہ آخرت کے واسطے بھی میرے پاس کوئی سرمایہ نہیں ہے۔

مقرر صاحب۔ نہیں اطمینان رکھئے افتراق نہ ہوگا۔ بس آپ وعظ شروع کیجئے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔

حضرت والا۔ نے دوبارہ دعا مانگی اور شروع کرنے سے پہلے فرمایا کہ احتیاطاً اتنا اور عرض کیئے دیتا ہوں کہ اگر ان مسائل کے متعلق یا میرے مسلک کے متعلق تر دد ہو تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ دو چار منصف مزاج اور سمجھدار آدمی میرے پاس تھانہ بھون چلے آ دیں اور وہاں اطمینان سے گفتگو کر لیں جب تک بات طے نہ ہو میں حاضر ہوں خواہ ایک مہینہ کیوں نہ لگ جاوے اور یہاں مجھ کو مہمان بنا کر تو یہ قصے لے کر بنوانا مناسب نہیں۔ جن کے یہاں مقیم ہوں ان کا تو مہمان ہوں ہی میں اپنے آپ کو سب مسلمانوں کا مہمان سمجھتا ہوں کیونکہ سب مسلمان ایک ہیں اور آج کل تو اتحاد کی لہر اس قدر دوڑ رہی ہے کہ اغیار کو بھی ایک ایسے بے غرض مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں چاہئے۔

مقرر صاحب۔ سنا ہے کہ عام لوگوں کی رسائی آپ تک تھانہ بھون میں نہیں ہوتی پھر اس کی ہمت کیسے ہو۔

حضرت والا۔ جس سے آپ نے یہ خبر سنی ہو اس سے پوچھئے کہ میرے یہاں کوئی چوکی پہرہ ہے یا بڑا تھانہ تو نہیں ہے میں تو بوریئے پر بیٹھنے والا معمولی آدمی ہوں۔ میرے یہاں کسی کا گزارہ نہ ہونے کی کیا وجہ ہے اور زیادہ وہم ہے تو مجھ کو اس کام کے لئے یہیں بلا لیا کیجئے میں اطمینان سے گفتگو کروں گا۔

مقرر صاحب۔ اور چند دیگر اشخاص۔ اگر آپ کو بلایا جائے گا تو پھر آپ مہمان ہوں گے اس وقت بھی یہی کہا جا سکے گا کہ مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں چاہئے۔

حضرت والا۔ ہاں مہمان تو ہوں گا لیکن اسی کام کیلئے تیار ہو کر آؤں گا۔ آج کی حالت اور اس وقت کی حالت میں فرق ہوگا خیال کیجئے کہ ایک شخص سفر کرے تجارت کے لئے اور راستہ میں بیمار ہو جاوے تو اس کو پریشانی ہوتی ہے اور ایک شخص خاص علاج ہی کی غرض سے سفر کرے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی۔ وجہ یہی ہے کہ یہ شخص تیار ہی ہو کر علاج کیلئے چلا ہے اس وقت تو میں آیا ہوں احباب سے ملنے کے لئے اور کام مجھ سے یہ لیا جاوے تو طبیعت پر گرانی ہوگی اور جبکہ اسی کام کیلئے آؤں گا تو گرانی کیوں ہوگی بلکہ اس وقت تو اس کام کے نہ لئے جانے سے گرانی ہوگی اور مہمان تحفہ بھی لایا کرتا ہے جب مجھے پہلے سے خبر ہوگی تو میں بھی آپ حضرات کے لئے تحفہ لاؤں گا۔ اس کے بعد وعظ شروع ہوا۔ درمیان وعظ میں دور سے ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا اور کوئی ایسی بے ڈھنگی بات کہی جو سارے مجمع کو ناگوار ہوئی حضرت والا نے فرمایا کہ میں ہر ہر شخص کا جواب کہاں تک دوں گا اگر میرا بیان کرنا خلاف طبع ہے تو صاف الفاظ میں کہہ دو کہ مت بیان کر میں ابھی بند کیئے دیتا ہوں اس پر سارے مجمع نے اس شخص پر بہت لعنت ملامت کی اور وعظ کے جاری رکھنے کے لئے اصرار کیا۔ پھر اسکے بعد مسلسل بیان شروع ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.
يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ. (آل عمران آیت ۱۱۴)

(یعنی ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر حکم کرتے ہیں نیکیوں کا اور روکتے ہیں برائیوں سے اور نیکیوں میں سبقت کرتے ہیں۔ یہی لوگ صالحین سے ہیں)۔

اچھی حالت کون سی ہے

اس آیت میں بعض اعمال کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور آیت کے خاتمہ پر ان اعمال کو مدار صلاح قرار دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر صلاحیت اور درستی حال منظور ہو تو ان اعمال کو اختیار کرنا چاہئے اول یہ سمجھنا چاہئے کہ درست اور اچھی حالت کونسی کہی جا سکتی ہے پس ظاہر ہے کہ حالت درست وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے نزدیک درست ہو اور اس کا علم خود خدائے تعالیٰ ہی کے بتانے سے ہو سکتا ہے۔ جس کو وحی کہتے ہیں۔

اصلاح وحی پر موقوف ہے

تو حاصل یہ ہوا کہ اصلاح حال کا مدار وحی پر ہے۔ اب لوگ اس میں طرح طرح کی غلطی

کرتے ہیں۔کوئی صلاح کے معنی کچھ لیتا ہے اور کوئی کچھ۔ بہت سوں کا مذاق آج کل یہ ہے کہ صلاح کے معنی ہیں نیکی اور بھلائی کرنا۔یعنی مخلوق کی نفع رسانی۔

دین کا خودساختہ خلاصہ

انہوں نے دین کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہتے ہیں کہ دین خدا تعالیٰ کا قانون ہے اور خدا رحیم و کریم ہے تمام مخلوق پر اور ہمارا نفع ہی چاہتا ہے تو اس کے احکام وہی ہوں گے جس میں مخلوق کا نفع ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس بات میں نفع معلوم ہو مخلوق کا یہ لوگ اسی کو دین سمجھتے ہیں۔پھر فہم مختلف ہیں اور ہر شخص کی طبیعت جداگانہ ہے جس کی سمجھ میں جو طریقہ نیکی اور بھلائی کا آیا وہ اسی کو دین کہتا ہے خواہ وہ حق تعالیٰ کے حکم یعنی وحی کے موافق ہو یا مخالف۔حتیٰ کہ جب وحی اپنے منصوبے کے خلاف معلوم ہوتی ہے تو اس میں تاویل و تحریف کر لینا آسان ہوتا ہے بہ نسبت اپنی رائے بدلنے کے یہی اصل ہے اس کی کہ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگ جب مذہب کی طرف داری کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو احکام شرعی کی عقلی خوبیاں کرتے ہیں۔ عام لوگ اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں اور ان کو بڑا دیندار اور ہمدرد اسلام سمجھتے ہیں۔

احکام شرعی میں مصالح بیان کرنے کی حقیقت

میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں جس سے سمجھ میں آجائے گا کہ اس میں کیا غلطی ہے سمجھ لیجئے کہ خدا تعالیٰ بشر نہیں ہے جس کو اپنے اوپر قیاس کر کے یوں کہا جا سکے کہ جو حالت ہمارے مذاق کے موافق اچھی ہے وہ حق تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور ان ہی مصالح پر دین الٰہی کی بنا کی جا سکے۔غرض یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ جو مصلحت ہم نے ضروری سمجھی ہو وہ حق تعالیٰ کے نزدیک بھی ضروری ہو ممکن ہے کہ کوئی مصلحت اور ضرورت ایسی ہو کہ اس تک ہمارا علم نہ پہنچا ہو۔خود زمانہ موجود کے لحاظ سے بھی ہمارا علم کافی اور محیط نہیں۔

بعض امور شرعی کا حسن مدرک بالعقل ہے

اور آئندہ آنے والے زمانہ کے بارہ میں تو سب جانتے ہیں کہ ہمارا علم معطل محض ہے۔(یہ میں ان کی تقریب فہم کے لئے کہتا ہوں ورنہ تحقیق تو یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام مصالح کے تابع نہیں۔حق تعالیٰ کو بلحاظ مالک اور خالص ہونے کے ہر قسم کے احکام صادر فرمانے کا اختیار ہے گو حکیم ہونے کے سبب کوئی حکم بلا مصلحت واقع نہیں ہوتا) حاصل یہ کہ احکام الٰہیہ ہماری عقل کے تابع نہیں ہو سکتے اگرچہ یہ مسلم ہے کہ بعض احکام شرعیہ کا حسن مدرک بالعقل بھی ہے۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں

کہ عقل ہی مدار مشروعیت ہے اور جب ایسے امور کے مشروعیۃ کے لئے جن کا حسن مدرک بالعقل کہا گیا ہے عقل کافی نہیں تو امور دینیہ کے مشروعیت کے لئے اس کو کیسے کافی کہا جا سکتا ہے۔ اور کافی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس کا حسن عقل سے معلوم ہوا اسی کو مشروع کہا جاوے۔ جس کا حسن عقل سے معلوم نہ ہوا اس کو مشروع نہ کہا جاوے۔ جیسا کہ ان لوگوں نے سمجھا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ دین کی نسبت یہ قرار دے لینا کہ جملہ امور دینیہ کی بنا عقل پر ہے سخت غلطی ہے۔

عقیدہ توحید ورسالت ثابت بالعقل ہیں

البتہ دین میں صرف دو چیزیں ہیں کہ وہ ثابت بالعقل ہیں۔ توحید اور رسالت یہ دونوں بیشک بایں معنی عقلی ہیں کہ ان کے ثبوت کے لئے دلیل عقلی محض پیش کی جاوے گی باقی ان کے سوا اصول دینیہ میں سے کوئی اصل اور فروع میں سے کوئی فروع بالمعنی المذکور عقلی نہیں۔

دین عقل کے موافق ہونے کا مفہوم

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ دین عقل کے موافق ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کوئی چیز دلیل عقلی کے خلاف نہیں باقی یہ نہیں کہ اگر دلیل شرعی نہ ہوتی تو عقل اس حکم کو ثابت کر لیتی یہی وجہ ہے کہ جن باتوں کے حسن وقبح کے ادراک میں عقل کو کافی بھی سمجھا جاتا ہے جیسے صدق کا حسن اور کذب کا قبح کہ تمام دنیا اس پر متفق ہے اور وہ لوگ بھی اس کو مانتے ہیں جن کو دین سے کچھ علاقہ نہیں ان کے بھی بعض افراد میں سوچنا پڑتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقل ان کے لئے بھی کافی نہیں۔

وحی اور عقل کا فرق

اور وحی کی یہ حالت ہے کہ اس کو کبھی بھی تردد نہیں ہوتا ہے ہر جزئی کا حکم بتا سکتی ہے یہ اور بات ہے کہ وحی کے متعلق کسی مقام پر ہمارے استنباط کی وجہ سے تردد واقع ہو جاوے۔ بہت ممکن تھا کہ وحی ہر ہر جزئی کا حکم صاف صاف بتا دیتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو منظور یہ ہوا کہ اجتہاد کا اجر بھی بندوں کو دیا جاوے اس واسطے قصداً استنباط کی احتیاج رکھ دی ورنہ وحی ہر ہر جزئی کا حکم بیان کر سکتی ہے لیکن بہت سے بہت یہ ہوتا کہ کتاب اللہ بہت ضخیم ہو جاتی تو یہ کیا مشکل تھا۔ رہا یہ شبہ کہ واقعات تو غیر متناہی ہیں تو ان کے احکام بھی غیر متناہی ہوں گے۔ تو ان کو جو کتاب محیط ہوتی وہ بھی مقدار میں غیر متناہی ہوتی اس کتاب کو کون پڑھتا۔ کیونکہ پڑھنے والے کی عمر متناہی ہے اور غیر متناہی کے پڑھنے کے لئے زمانہ بھی غیر متناہی چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ واقعات کا غیر متناہی ہونا مسلم نہیں کیونکہ کتاب اللہ اتری ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں اور اس میں احکام نفخ صور تک کے بیان ہونے چاہئیں اور یہ

زمانہ محدود ہے تو واقعات بھی محدود ہوئے تو ان کے بیان کے لئے نہ کتاب غیر متناہی کی ضرورت ہوتی نہ اس کے پڑھنے کے لئے زمانہ غیر متناہی کی ضرورت ہوتی۔ تو یہ شبہ لغو ہوا اور ثابت ہوا کہ ایسے کتاب ہو سکتی تھی۔ جو تمام جزئیات کو حاوی ہو۔ لیکن ابتلا اور اعطائے اجر اجتہاد کی مصلحت کے واسطے بعض احکام میں غموض رکھ دیا گو وہ بھی ثابت بالوحی ہی ہیں اس لئے فقہاء کا قول ہے کہ قیاس مظہر ہے مثبت نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ثبوت تو ہر حکم کا وحی سے ہوا۔ ہاں قیاس نے اس کو ظاہر کیا اور اس کے اظہار میں غموض ہو گیا اور اسی غموض کے سبب بعض حکم مختلف ہو گیا تو یہ دعویٰ صحیح رہا کہ عقل کو بعض احکام کے بیان میں تردد ہوتا ہے اور وحی کو کسی حکم کے بیان میں تردد نہیں ہوتا۔ اور اختلاف شافعی اور حنفی کے معنی یہ ہیں کہ ایک مجتہد اپنی رائے کو مستند الی الوحی کہتا ہے اور دوسرا مجتہد اپنی رائے کو۔ تو اصل ماخذ وحی ہی ہوئی غرض کسی چیز کے حسن و قبح کے ادراک کے لئے جو عقل کو کار آمد کہا جاتا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عقل ان کے ادراک کے لئے کافی ہے یہ شان صرف وحی کی ہے عقل صرف موید ہو سکتی ہے کافی نہیں چنانچہ بعض اوقات عقل ان چیزوں میں بھی تردد کرتی ہے جن کو مدرک بالعقل کہا جاتا ہے۔ مثلاً صدق کو اچھا اور کذب کو برا کہا جاتا ہے اور یہ مدرک بالعقل ہیں

عقل بعض اپنے مدرکات میں بھی حیران ہوتی ہے

لیکن بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں حکم کرنے کے لئے عقل حیران رہ جاتی ہے مثلاً ایک شخص نے دیکھا کہ ایک بے گناہ پر کوئی ظلم کر رہا ہے اور ایسی صورت ہے کہ اگر یہ سچی بات کہتا ہے تو وہ پھنستا ہے اور اگر وہ جھوٹ بولتا ہے تو وہ چھوٹتا ہے تو عقل کا حکم تو اپنے قاعدہ کے موافق یہی ہوگا کہ سچ کہنا چاہئے کیونکہ وہ صدق کے حسن کو تسلیم کر چکی ہے لیکن کہیں یہ بھی پڑھا تھا کہ بے گناہ کو ظلم سے چھڑانا واجب ہے تو اب دونوں طرف کی دلیل موجود ہے تو عقل حیران ہوئی کہ دونوں دلیلوں میں سے ایک کو کس طرح ترجیح دے۔ اور معتقد وحی کے پاس مرجح موجود ہے یعنی وحی کہ اس نے صدق کو اس لئے حسن کہا ہے کہ اس کے نہ ہونے سے فساد اور اتلاف حقوق لازم آتا ہے۔ اور جہاں خود صدق سے اتلاف حقوق ہونے لگے تو وہاں اس میں حسن نہ رہے گا لہذا اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔ علیٰ ہذا کذب کو بھی سمجھ لیجئے کہ عقل اس کو قبیح کہتی ہے لیکن بعض وقت اس میں مصلحت ہوتی ہے عقل اس وقت حیران ہوتی ہے اور وحی حیران نہیں ہوتی وہ اس کے مواقع کی بلا تردد تعیین کر دیتی ہے۔ ثابت ہوا کہ عقل احکام میں کافی نہیں۔ اور وحی کافی ہے اور میں کہتا ہوں کہ اگر عقل بالکل بھی کافی ہوتی تب بھی بڑے سے بڑا کام عقل کا یہ ہوتا کہ یہ ادراک کر لیتی کہ یہ حالت حق تعالیٰ کو پسند ہے یا

ناپسند۔ پسندیدہ کو حسن کہتی اور ناپسندیدہ کو قبیح۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حسن و قبح کا حکم بھی عقل کے تابع ہو جاوے پس اس صورت میں بھی عقل آلہ ادراک حسن و قبح ہوتی نہ کہ حاکم حق تعالیٰ ہی ہوتے عقل حق تعالیٰ کے سامنے وہ رتبہ رکھتی ہے جو بادشاہ کے سامنے اس کا ایک پیادہ رکھتا ہے۔ جو بادشاہ کا حکم لوگوں کو سناتا ہے۔ نہ اس کی کوئی عظمت ہوتی ہے نہ اس کو مطاع سمجھا جاتا ہے۔ عظمت حکم شاہی کی کی جاتی ہے اور مطاع بادشاہ ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ پیادہ صرف اس کے حکم کا مظہر ہوتا ہے پیادہ کو بادشاہ کے احکام میں دخیل سمجھ لینا یا بجائے بادشاہ کے اس کو کافی سمجھ لینا غلطی عظیم ہے۔ یہی نسبت عقل اور وحی کی ہے۔ غرض ثابت ہو گیا کہ عقل کسی طرح بھی حسن و قبح کے ادراک تام کے لئے کافی نہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ اگر عقل اس کے لئے کافی ہوتی تو بہت سے وہ لوگ جو عقل معاش میں بہت بڑھے ہوئے ہیں وہ ایمان سے کیوں محروم ہوتے۔ اہل عقل ہونا ان کا مسلم ہے پھر ایمان کے حسن کو کیوں نہیں ادراک کیا اور کیوں اس دولت سے مشرف نہیں ہوئے مگر جب ان کو وحی کی رہبری سے سمجھایا جاتا ہے تو ان کو بھی اس کی ضرورت کو ماننا پڑتا ہے۔ تو وجہ صرف یہ ہوئی کہ عقل اس بات کے ادراک کے لئے کافی نہیں ہوئی تھی کہ ایمان ضروری ہے جب دوسری ایک چیز (وحی) نے اس کی ضرورت کو بتلایا تو اس کو ادراک ہو گیا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حکم کرنا عقل کا حق نہیں۔ یہ حق صرف خداوند تعالیٰ کا ہے۔ پس وہ چیز واجب ہے۔ جس کو وہ واجب کہیں وہ چیز حرام ہے جس کو وہ حرام کہے وعلیٰ ہذا۔

احکام شرعیہ میں اختلاف کا سبب

رہا یہ سوال کہ جب وحی ہر چیز کا حکم بے تردد بیان کرتی ہے تو شرعی احکام میں اختلاف کیوں ہوتا ہے ایک عالم کسی بات کو فرض کہتا ہے اور دوسرا ناجائز اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف و تردد خود وحی میں نہیں بلکہ اس کے سمجھنے میں فہم مختلف ہوتا ہے اس سے یہ اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال نور آفتاب ہے کہ نور ایک ہے لیکن قوی البصر کو سب چیزیں صاف نظر آتی ہیں اور ضعیف البصر کو دھندلی اور رنگین۔ تو یہ اختلاف نور کا اختلاف نہیں بلکہ ابصار کا اختلاف ہے اسی طرح وحی میں قصور نہیں۔ فہم کا قصور ہے۔ الحاصل ہر حالت کے حسن و قبح کو وحی سے دریافت کرنا چاہئے عقل پر اس کا مدار نہ رکھنا چاہئے۔

علماء ظاہر اور باطن کے معالجہ میں فرق

اب وحی کے بتانے والے جن کو علماء کہتے ہیں دو قسم کے ہیں علماء ظاہر اور علماء باطن علماء ظاہر بھی

ہر چیز کا حکم بتاتے ہیں لیکن علماء باطن کی تعلیم اثر میں ان سے بڑھی ہوئی ہے۔علماء ظاہر امت سے عام تعلق رکھتے ہیں اس لئے ضابطہ کی تبلیغ کرتے ہیں۔بس اتنا بتا دیتے ہیں کہ اگر یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت ہے تو یہ حکم ہے۔ مثلاً ایک شخص اچھا کپڑا پہنتا ہے علماء ظاہر سے اس کا حکم پوچھے گا تو بتائیں گے کہ اگر نیت تکبر کی نہ ہو تو جائز ہے اور ہو تو نا جائز اور علماء باطن چونکہ خاص تربیت کا بھی تعلق رکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم میں اس کا بھی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس خاص شخص کی نیت تکبر کی ہے یا نہیں۔اور اس کو وہ کپڑا پہننا جائز ہے یا نہیں۔نیز وہ اپنی تعلیم میں اصل منشاء کو دیکھتے ہیں اور اسی کا علاج کرتے ہیں اور آثار کی طرف ان کی توجہ زیادہ نہیں ہوتی اور اہل ظاہر زیادہ تر آثار کو دیکھتے ہیں اور اسی اختلاف طرز تعلیم کے سبب علماء باطن بعض اوقات ظاہری احتساب کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے اسی سے کبھی اہل ظاہر ان پر طعن کرتے ہیں کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے ڈاڑھی منڈے ان کے یہاں آتے ہیں اور کچھ روک ٹوک نہیں کرتے حقیقت اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ حکیم ہیں ایسا راستہ ڈھونڈتے ہیں جس سے اس منکر کا منشاء ہی ندارد ہو جاوے پھر وہ منکر خود نہ رہے گا۔وہ علاج پورا کرتے ہیں مگر مریض کو بھڑکاتے نہیں جیسے شفیق طبیب کہ دوا دیتا ہے اور بوجہ شفقت مریض کے مذاق کی بھی رعایت رکھتا ہے کہ اس کا منہ بھی کڑوا نہ ہونے پائے بتاشہ میں رکھ کر دوا کھلا دیتا ہے یا کوئی ایسی چیز ملا دیتا ہے کہ اس سے تلخی بالکل زائل ہی ہو جاتی ہے۔طبیبان الٰہی طبائع کی خصوصیات کو سمجھتے ہیں اور اسی کی رعایت سے دوا دیتے ہیں مگر عجلت نہیں کرتے مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

نقشبند یہ عجب قافلہ سالار اند ۔۔۔۔ کہ برند از رہ پنہاں بحرم قافلہ را

(یعنی نقشبندی حضرات قافلہ کے عجب سردار ہیں کہ لوگوں کو خفیہ راستہ سے حرم کی طرف لے جاتے ہیں)

یہ بزرگ خود بھی نقشبندی ہیں اس واسطے نقشبندیہ کا لفظ کہہ دیا ورنہ مشائخ نقشبندیہ کی خصوصیت نہیں تمام مشائخ کا یہی طرز ہے۔ان حضرات کے یہاں امر و نہی سب کچھ ہے لیکن تدبیر کے ساتھ۔ان کے معالجات بہت مفید اور مرض کے استیصال کرنے والے ہوتے ہیں مگر ان کے معالجات میں اور اہل ظاہر کے معالجات میں بڑا فرق ہوتا ہے مثلاً کبر کا ایک مریض ہو تو اہل ظاہر اس عمل کو دیکھ کر جو اس شخص سے صادر ہوا کہہ دیں گے تم نے یہ فعل مذموم کیا اس کا علاج یہ ہے کہ توبہ کر لو۔یہ علاج صحیح ہے کیونکہ توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دس برس کے مرض کے علاج کے لئے یہ توبہ استیصال میں کیسے کافی ہو سکتی ہے۔اس علاج سے صرف ایک خاص فعل کا گناہ جا سکتا ہے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔آج اس فعل سے بچ گیا تو کل کو اسی کبر کے کسی دوسرے فعل میں مبتلا ہو سکتا ہے اس فعل سے توبہ کرائی جائے گی تو پرسوں کو اور ایسے ہی گناہ

میں مبتلا ہو جائے گا تو ساری عمر تو یہ بھی رہے گی اور گناہ بھی ہوتا رہے گا معالجہ ہو رہا ہے مگر مرض سے نجات نہیں ملتی اور اہل باطن کیا کریں گے کہ اس فعل کی طرف زیادہ توجہ نہ کریں گے مگر کسی لطیف تدبیر سے اس رذیلہ کا یعنی اس کے غلبہ اور قوت کا اخراج قلب میں سے کر دیں گے جو منشاء تھا اس فعل کا۔ جب منشاء ہی نہ رہا تو یہ فعل بھی نہ رہے گا اور آئندہ کے لئے بھی اس جیسے تمام افعال سے اطمینان ہو جائے گا۔ یہ علاج کامل ہے یا وہ اور یہ نہی ابلغ ہے یا وہ۔

ترفع اور تکبر کا عملی علاج

میں کیرانہ گیا ہوا تھا ایک صاحب آئے اس شان سے کہ خدمت گار ساتھ مٹھائی لئے ہوئے اور فرمائش کی کہ مجھے بیعت کر لیجئے۔ میں اس حرکت کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ ان میں مرض تکبر اور ترفع کا ہے میں نے کہا جلدی نہ کیجئے مجھے اس وقت وعدہ کے سبب ایک اور جگہ جانا ہے وہاں میرے ساتھ چلئے اور یہ مٹھائی بھی لے لیجئے وہ خود مٹھائی لے کر میرے ساتھ چلے دوسرے مکان پر پہنچے میں اسی طرح وہاں سے اور ایک مکان پر گیا اور وہاں سے اور مکان پر۔ اسی طرح بہت سے مکانوں پر گیا اور ایسی ایسی جگہ سے قصداً گزرا جو خوب آباد ہیں اسی طرح خوب چکر لگوایا۔ ان کا علاج ہو گیا ترفع اور تکبر سب ملیا میٹ ہو گیا۔ یہ عملی علاج ایک ہی جلسہ میں ان کے لئے اکسیر ہو گیا اب مرض کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ دیکھئے اتنی سی دیر میں مزاج درست ہو گیا اتنی ذرا سی تدبیر نافع ہو گئی۔ زبان سے اس حرکت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہا گیا لیکن اس حرکت کا منشا مع تمام اس جیسے اور حرکات کے رخصت ہوا۔ دیکھئے یہ نہی ابلغ اور انفع ہوئی یا یہ نہی ہوتی کہ ان سے خاص اس حرکت سے توبہ کرالی جاتی مگر منشاء کے باقی رہنے سے اور حرکات ترفع کی صادر ہوتی رہتیں ایسے ہی موقع پر بعض وقت زبان سے کہنے کا وہ اثر نہیں ہوتا جو سکوت کا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ تفسیر زباں روشن گراست لیک عشق بے زباں روشن تراست

(اگرچہ عشق کا حال زبان سے معلوم ہوتا ہے لیکن واقع میں بے زبان کا عشق زیادہ روشن ہے)

اہل اللہ کی نظر بہت دقیق ہوتی ہے

غرض اہل اللہ کی نظر بہت دقیق ہوتی ہے اس واسطے ان کے معالجات بھی بہت لطیف ہوتے ہیں اور اہل ظاہر کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی اس واسطے ان کے معالجات بھی اس شان کے نہیں ہوتے تو دونوں علاجوں کے طرز میں اس عارض سے فرق ہو گیا گو دونوں کا استناد ایک ہی وحی کی طرف ہے اس تقریر سے اس شبہ کے جواب میں کہ احکام میں وحی کے کافی ہوتے ہوئے پھر علماء میں اختلاف کیوں ہوتا ہے۔

اختلاف کبھی اختلاف فہم کی وجہ سے ہوتا ہے

اس کلیہ کا اثبات ہو گیا کہ اختلاف کبھی اختلاف فہم کی وجہ سے ہوتا ہے تو گو شریعت اور وحی ایک ہے مگر علماء میں اس اختلاف فہم سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ایسا اختلاف آج ہی نہیں ہے بلکہ سلف میں بھی ہوا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ میں مانعین زکوٰۃ کے بارہ میں اختلاف ہوا کہ ان سے لڑنا چاہئے یا نہیں۔ صحابہ کی رائے یہ تھی کہ اس وقت لڑنا خلاف مصلحت ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر جمے ہوئے تھے۔ آپس میں گفتگو ہوئی اچھا خاصہ مناظرہ ہو گیا۔

سلف کا طرز مناظرہ

لیکن ان کا مناظرہ آج کل کا سا مناظرہ نہ تھا کہ ہر شخص کی یہ نیت ہوتی ہے کہ دوسرے کو لاجواب کر دوں۔ ان کی نیت یہ تھی کہ بحث کرنے سے حق واضح ہو جائے خواہ کسی کی طرف ہو چنانچہ دونوں فریق نے گفتگو کی اور غور کیا جس سے حق واضح ہو گیا اور دونوں قتال پر متفق ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور تمام حضرات ایک طرف کثرت رائے پر فیصلہ نہیں ہوا۔ دونوں فریق حق کے طالب تھے اور جانتے تھے کہ حق وہ ہے جو وحی سے ثابت ہو دونوں نے غور کیا اور سوچ کر وحی کا حکم نکال لیا اور اسی کو سب نے مان لیا۔ رائے محض سے فیصلہ نہیں کیا۔ وہ لوگ خدا کے احکام کے متبع تھے اپنی رائے کے متبع نہ تھے۔

احکام الٰہی کے رائے سے نہ معلوم ہونے کا راز

خدا کے احکام رائے سے نہیں معلوم ہو سکتے اس کا راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بشر نہیں ہیں۔ بشر کی رائے جن احکام کو ثابت کرتی ہے خدا تعالیٰ کی طرف ان کو منسوب کرنے میں قیاس الغائب علی الشاہد ہوگا کہ جب ہمارے علم میں یہ اصلح ہے تو خدا تعالیٰ کے علم میں بھی یہی اصلح ہو گا اور یہ جائز نہیں اور یہ ایسی غلطی ہے جس سے بہت سے فرقے گمراہ ہو گئے ہیں دیکھو مجسمہ نے دیکھا کہ اعضا کا ہونا کمال ہے تو اس کو حق تعالیٰ کے لئے بھی ثابت کر دیا اور تجسم کے قائل ہو گئے اس میں کیا غلطی ہوئی سوائے اس کے کہ قیاس الغائب علی الشاہد کیا گیا۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ اعضاء کا ہونا کمال ہے ہمارے لئے نہ کہ حق تعالیٰ کے لئے۔ اور بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کہ کچھ نصوص بھی ان کو مل گئے جن سے ان کے خیال کو تائید ہوئی۔

نصوص کی خاصیت

نصوص کی خاصیت یہ ہے کہ جب کوئی حق کے اتباع کے لئے قطع نظر ضروریات اور مصالح سے ان میں نظر اور فکر کرتا ہے تو اس کو ان سے صحیح راستہ مل جاتا ہے اور جب کوئی حکم کو اپنی رائے سے متعین کر کے نصوص سے اس کی تائید ڈھونڈتا ہے تو اس کو ظاہراً تائید بھی مل جاتی ہے۔ یہی فرق ہے اہل حق اور اہل باطل میں کہ اہل حق خالی الذہن ہو کر وحی کے حکم کو معلوم کرتے ہیں چاہے اس میں ان کی ذلت ہو یا مصالح فوت ہوتے ہوں یا کچھ بھی ہو ان کے نزدیک بس مصلحت یہ ہے کہ۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(سب سے بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی لے لو)

ان کی نظر سوائے ایک ذات کے کسی پر نہیں پڑتی۔

یکے دان و یکے بین و یکے گوئے یکے خوان و یکے خواہ و یکے جوئے

(ایک ہی کو جان ایک ہی کو دیکھ ایک ہی کو پکار و ایک ہی کو چاہو اور ایک ہی کی جستجو کرو)

ان کی رائے میں بڑی مصلحت یہی ہے کہ خدا راضی ہو اور بس اور اہل باطل یہ کرتے ہیں کہ رائے یا تجربہ سے ایک مقصود کو پہلے متعین کر لیا اور اس کے بعد نصوص کی تلاش کی اس صورت میں کچھ نہ کچھ تائید مل ہی جاتی ہے اگر مل گئیں تو خوش ہیں کہ ہم وحی کے موافق عمل کرتے ہیں چاہے نصوص کی دلالت ان کے مقصود پر صحیح ہو یا نہ ہو اگر نہ ہوئی تو کھینچ کھانچ کر بنا لیتے ہیں۔ مرجیہ قدریہ سب اہل باطل نے یہی کیا ہے۔ کوئی اعضاء کا حق تعالیٰ کے لئے قائل ہے کوئی شکل کا سب کے پاس کچھ نہ کچھ نصوص موجود ہیں۔ مثلاً فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری نظروں میں ہیں) اور یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ وعلیٰ ھذا (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) ہر ایک کے پاس اپنے خیال کی موافقت میں نصوص ہیں۔ مجھ کو اپنا ایک واقعہ اس قیاس الغائب علی الشاہد کے متعلق یاد آ گیا کہ دو ہندو گرو اور چیلے میرے پاس آئے ملاقات کے لئے وہ کچھ دھیان گیان بھی کرتے تھے اور خلوت پسند اور زہد پسند تھے اور وہ چیلہ رئیس تھا اور اپنے باغ کے پھل بھی ہدیۃً لایا تھا۔ میں نے لینے سے عذر کیا اس خیال سے کہ اس کی مکافات میں کیا کر سکتا ہوں مسلمان کو تو یہ مکافات کر سکتا ہوں کہ کچھ دینی نفع پہنچا دوں یا کم سے کم دعا کر دوں اور ان کو ان میں سے کوئی نفع بھی نہیں پہنچا سکتا۔ دعا کی جائے تو سب سے پہلے دعا یہی ہو سکتی ہے کہ حق تعالیٰ تم کو مسلمان کر دیں سو یہ ان کے نزدیک کوسنے سے بھی زیادہ ہے مگر اس نے زیادہ اصرار کیا آخر میں نے وہ ہدیہ لے لیا۔ تاکہ دل شکنی نہ ہو۔ پھر اس نے کہا ہم کو کچھ پوچھنا ہے وہ یہ کہ اہل اسلام قرآن کو حق تعالیٰ کا

کلام کہتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ خدا بولتا ہے اور بولنا ہو سکتا ہے زبان سے تو خدا کے لئے زبان ہوئی اور جسم ثابت ہوا حالانکہ حق تعالیٰ تجسم سے پاک ہے میں نے کہا آدمی کو جو متکلم کہا جاتا ہے در حقیقت متکلم زبان ہی ہے تو اگر تکلم کے لئے زبان کا ہونا شرط ہے تو زبان کے لئے ایک اور زبان چاہئے اور اس زبان میں بھی یہی گفتگو ہوگی کہ اس کے لئے بھی ایک اور زبان چاہئے تو تسلسل لازم آئے گا اور یہ گفتگو صرف زبان ہی میں نہیں ہے قوت سامعہ میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اصل سامع کان ہے تو اگر سماعت کے لئے کان کی ضرورت ہو تو کان کے لئے ایک اور کان چاہئے تو اس میں بھی وہی تسلسل لازم آئے گا۔ اسی طرح اصل دیکھنے والی آنکھ ہے تو اگر دیکھنے کے لئے آنکھ کی ضرورت ہے تو آنکھ کے لئے ایک اور آنکھ چاہئے تو وہی تسلسل لازم آیا اور تسلسل محال ہے تو دوسری شق واجب التسلیم رہی وہ یہ کہ زبان متکلم ہے بلا دوسری زبان کے اور کان سامع ہے بلا دوسرے کان کے اور آنکھ مبصر ہے بلا دوسری آنکھ کے تو جب کہ زبان بلا واسطہ کے متکلم ہے تو کیا حق تعالیٰ کی ذات قدرت میں زبان سے بھی کمتر ہے کہ وہ بلا واسطہ زبان کے تکلم نہ کر سکے۔ یہ سن کر وہ حیرت میں رہ گئے اور چونکہ وہ اللہ کا نام لیتے تھے گو کسی طرح سے لیتے ہوں اور خلوت نشین تھے اس لئے ان کے فہم میں ایک گونہ لطافت تھی جو ایسی دقیق بات کو سمجھ گئے۔

تقلیل تعلقات اور ترک دنیا کی خاصیت

میں بقسم کہتا ہوں کہ تقلیل تعلقات اور ترک دنیا میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے نور پیدا ہو جاتا ہے فہم میں گو وہ مقبول نہ ہو کیونکہ مقبولیت کے لئے ایمان شرط ہے مگر پھر بھی وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے اندھوں میں کانا مطلب اس مثال سے یہ ہے کہ اس کو ایسا نور نہیں حاصل ہوتا جیسا اہل ایمان کو وہ شخص اپنے گرو سے کہنے لگا کہ یہ ہے علم اور یہ ہے جواب اس جواب کا حاصل یہی ہے کہ حق تعالیٰ کو بندوں پر قیاس کرنا قیاس الغائب علی المشاہد ہے اور مجسمہ فرقہ نے یہی غلطی کی ہے کہ زبان اور کان وغیرہ اعضاء کو کمال پایا اس واسطے اس کمال کو حق تعالیٰ کے لئے بھی ثابت کر دیا یہ نہ سمجھا کہ یہ کمال ہیں انسان کے لئے نہ کہ حق تعالیٰ کے لئے حق تعالیٰ ان عوارض سے منزہ و مبرا ہیں۔

ایک پکے مسلمان اعرابی کی حکایت

اس پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک واعظ صاحب نے بیان کیا کہ خدا تعالیٰ آنکھ ناک کان سب سے پاک ہیں اس کو سن کر ایک اعرابی بہت خفا ہوا اور کہنے لگا معلوم ہوا کہ تیرا خدا بطیخ شامی ہے گول مول کہ اس میں نہ آنکھ ہے نہ ناک نہ ہاتھ نہ پیر اور وعظ میں سے اٹھ کر چل دیا۔ یہاں ایک تحقیق طالب علموں کے کام کی ہے وہ یہ کہ اس اعرابی پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس پر یہ اعتراض نہ کیا جاوے گا کہ جب یہ اس سے

خفا ہوا کہ حق تعالیٰ سے آنکھ کان کی نفی کی گئی تو یہ تجسم کا قائل ہوا اور فرقہ مجسمیہ اہل باطل میں سے ہے اور ناری ہے۔ سو اس پر یہ حکم جاری نہیں ہوگا۔ یہ بات کسی متکلم سے آپ نہیں سنیں گے متکلم تو یہی فتویٰ دے گا کہ اس کا یہ عقیدہ غلط ہے اور اسلام کے خلاف ہے نہیں یہ شخص خلاف اسلام نہیں بلکہ پکا مسلمان ہے مگر یہ بات متکلم نہیں کہہ سکتا یہ بات صوفیہ کا ایک غلام کہہ رہا ہے۔ صوفیہ ظاہر بین نہیں ہیں اہل حقیقت ہیں وہ الفاظ کو نہیں دیکھتے معانی کو جو الفاظ کے منشاء ہیں) دیکھتے ہیں۔ اس اعرابی نے جو یہ اعتراض کیا کہ تیرا خدا بطیخ شامی ہے تو نہ اس بناء پر کہ وہ فرقہ مجسمیہ کو حق پر سمجھتا تھا بلکہ اس بناء پر کہ لولا لنگڑا اور اندھا بہرا ہونا عیب ہے اور خدا کے لئے عیب کا ثابت کرنا سخت برائی کی بات ہے تو اس نے قصد حق تعالیٰ کی تقدیس کا کیا اور یہ عین ایمان ہے تو وہ مومن ہوا رہا یہ کہ اس کے الفاظ سے تجسم لازم آ گیا اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں وہ معذور ہے وہ اتنی سمجھ ہی نہیں رکھتا تھا کہ واعظ کے مطلب کو سمجھے کہ وہ تجسم کی نفی اس لئے کر رہا ہے کہ وہ عیب ہے اس کی سمجھ اتنا ہی کام کرتی تھی کہ اعضاء کی نفی کرنا عیب کو منسوب کرنا ہے کیونکہ جس کے اعضاء نہ ہوں وہ لولا لنگڑا اپاہج کہلاتا ہے اور اس کو عیب ہی سمجھتے ہیں۔ لہذا اس نے اس کی نفی کی وہ ان دقائق کو کیا سمجھ سکتا تھا کہ اعضاء اور جسم کا ہونا عیب ہے اور ان کی نفی کمال ہے۔ اب آپ غور کر لیں کہ متکلم کا فتویٰ صحیح ہے یا صوفی کا اگر صوفی متکلم سے پوچھ بیٹھے کہ تم اس اعرابی پر جو کچھ اعتراض کرتے ہو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس دقیقہ کو کیوں نہ سمجھ سکا کہ اعضاء کی نفی کرنا درحقیقت کمال ہے اس میں دعویٰ ہے اس بات کا کہ متکلم صاحب ذات وصفات کے تمام دقائق کو کما حقہ سمجھتے ہیں یہ ایسا دعویٰ ہے کہ اس کی نفی خود علم کلام میں موجود ہے علم کلام میں یہ مسئلہ مصرح موجود ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا علم بالکنہ کسی کو نہیں ہو سکتا جب یہ بات ہے تو ثابت ہوا کہ بہت سے دقائق کو تم بھی نہیں جانتے ہو پھر اس اعرابی پر اعتراض کا کیا حق ہے۔ صوفی کے اس اعتراض کو کوئی اٹھا نہیں سکتا۔

صوفیاء حقیقت شناس

دراصل حقیقت شناس یہی حضرات ہیں ان کی نظر تہ تک پہنچتی ہے ان کی کوئی بات سطحی اور بے اصل نہیں ہوتی دیکھئے اس اعرابی کے لئے کیسا صحیح فتویٰ دیا جو دل کو لگتا ہوا اور سمجھ میں آتا ہوا ہے۔

اعرابی کے مسلمان ہونے کے فتویٰ کی دلیل

اور اس فتویٰ میں ان کے پاس حدیث سے ثبوت ہے وہ ایک لونڈی کا قصہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا این اللہ یعنی اللہ کہاں ہے اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ اوپر ہے پھر پوچھا کہ میں کون ہوں کہا آپ رسول ہیں اللہ کے پس آپ نے فرمایا یہ مومن ہے۔ یہ واقعہ بالکل نظیر ہے اس اعرابی کے قصہ کا جو اعتراض اس اعرابی پر ہوتا ہے وہی اس لونڈی پر بھی

ہوسکتا ہے کیونکہ جیسا کہ تجسم حق تعالیٰ کے لئے ممتنع ہے ویسا ہی تحیز ممتنع ہے اور وہ اشارہ کرتی ہے آسمان کی طرف کہ خدا تعالیٰ اوپر ہے تو مکان اور حیز ثابت ہو گیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ایمان کی شہادت دیتے ہیں تو اس اعرابی کے ایمان کا بھی ثبوت ہو گیا بات یہ ہے کہ اس لونڈی کا فہم اتنا ہی تھا اس کا فہم اس سے زیادہ کا متحمل نہ تھا ایسے ہی اس اعرابی کا فہم بھی اتنا ہی تھا اس سے زیادہ کا متحمل نہ تھا اس کو اس سے زیادہ دقائق کے سمجھنے کی تکلیف دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

ایک کفن چور کی خوف خداوندی پر مغفرت

ایک اور قصہ حدیث میں آتا ہے اس سے بھی اس صوفی کے فتوے کی تائید ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک نباش یعنی کفن چور تھا بڑا گنہگار ساری عمر اس نے یہی کام کیا اور جانتا تھا کہ یہ کام برا ہے مگر تمام عمر مبتلا رہا۔ جب مرنے لگا تو اس نے عجیب وصیت کی جس سے کوئی خشک مولوی یا متکلم کفر ہی کا فتویٰ لگائے گا (گو یہ مجمع اس قصہ کے بیان کا متحمل نہیں مگر رحمت خدا تعالیٰ کو میں کیوں تنگ کروں جب ایک واقعہ ہے اور حدیث میں اس کو بیان فرمایا گیا ہے تو میں کیوں اس کے اظہار میں بخل کروں) اس نے وصیت یہ کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھ کو جلا کر راکھ کر دینا اور آدھی راکھ ہوا میں اڑا دینا اور آدھی دریا میں بہا دینا۔ اگر پھر بھی میرے اوپر خدا کا قابو چل گیا تو مجھ کو طرح طرح کا ایسا عذاب پہنچائے گا جو آج تک کسی کو نہ دیا ہوگا۔ حدیث میں لئن قدر اللہ کا لفظ ہے ان شک کے واسطے ہوتا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو شک تھا حق تعالیٰ کی کمال قدرت میں۔ چنانچہ وارثوں نے ایسا ہی کیا کہ اس کی لاش کو جلا کر آدھی راکھ دریا میں بہا دی اور آدھی ہوا میں اڑا دی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ کی قدرت سے باہر کیسے جا سکتا تھا حق تعالیٰ نے تمام اجزاء کو دریا اور ہوا میں سے جمع کیا اور اس کو زندہ کیا اور پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا عرض کیا اے اللہ آپ کے خوف سے حکم ہوا فرشتوں کو کہ یہ ہم سے ڈرتا ہے اسے چھوڑ دو ہم نے بخش دیا اتنے جہل پر بھی بخشش ہو گئی۔ اب اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مومن تھا یا کافر اس کو کافر تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ کافر کی بخشش نہیں ہو سکتی نہ اس امت میں اور نہ کبھی پہلے کسی امت میں ایسا ہوا کہ کافر کی بخشش ہوئی ہو تو لامحالہ اس کو مومن ماننا پڑے گا حالانکہ اس نے لفظ ایسا کہا ہے جو ایمان کے خلاف ہے کیونکہ خدا کی قدرت ہی میں جسے شک ہو وہ مومن کیسے کہا جا سکتا ہے ایمان جیسا کہ ذات حق کے ساتھ ضروری ہے ایسی ہی صفات پر بھی ضروری ہے۔ یہاں متکلم سے پوچھو کہ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔ متکلمین نے اس سے تعرض کیا ہے اور یہی اشکال کیا ہے کہ اس نے ان شک کے ساتھ کہا ہے تو اس کو قدرت میں شک ہوا اور جس کو قدرت حق تعالیٰ میں شک ہو وہ کافر ہے اور

کافر کی بخشش نہیں ہوسکتی مگر جب اس کی بخشش ہوگئی تو یہ کافر نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے اس میں ایک تاویل کی ہے جو صرف من سمجھوتا ہے وہ یہ کہ لئن قدر اللہ کے معنی لئن ضیق اللہ لئے قدر بمعنی تنگ گیری کے بھی آتا ہے جیسے فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ میں ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اگر حق تعالیٰ نے میرے اوپر تنگ گیری کی اور قہاریت سے کام لیا تو بڑا عذاب دیں گے۔ اس پر ان حشکیہ کالا نا بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تنگ گیری کی جاوے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہ کی جاوے۔ یہ تاویل ہے جس سے متکلمین نے دل کو سمجھا لیا لیکن اہل فہم سمجھ سکتے ہیں کہ اگر اس کی یہ مراد تھی تو جسم کو جلانے اور اڑانے کی وصیت کیوں کی کیا اس کے بعد تنگ گیری نہیں ہوسکتی البتہ اس کے بعد تنگ گیری اسی صورت میں نہیں ہوسکتی کہ اجزاء کا جمع کرنا قدرت سے خارج ہو تو پھر وہی اشکال لوٹ آیا کہ اس کو قدرت میں شک تھا غرض یہ فعل خود بتلا رہا ہے کہ قدر کے معنی تنگ گیری کے نہیں ہوسکتے بلکہ قدرت ہی سے مشتق ہے پس یہ تاویل بالکل بارد ہے اس سے وہ سوال رفع نہیں ہوتا۔

فہم کے مطابق مواخذہ

اس کا جواب صوفیہ اور عارفین سے پوچھو وہ کہتے ہیں جتنا فہم اتنا مواخذہ اس کا فہم اتنا ہی تھا کہ اس فعل کے بعد کہ خاک کو دریا اور ہوا میں اڑا دیا جائے اس کو احتمال ہوا کہ شاید پھر اس پر قدرت نہ ہو کہ اسے پھر جمع کر کے زندہ کرے اور عذاب دے پس اس پر مواخذہ اس واسطے نہیں کیا گیا کہ اس سے زیادہ اس کی سمجھ کام نہیں کرسکتی تھی۔ تو اس غلطی میں وہ معذور ہوا اور خشیت کی صفت اس میں موجود تھی ہی پس اس کی بدولت مغفرت ہوگئی دیکھئے کس سہولت سے وہ سوال حل ہوگیا یہ دونوں قصے لونڈی اور نباش کے حدیث میں موجود ہیں ان سے پورا جواب ہوگیا الزام کا جو اس اعرابی پر عائد ہوا تھا اور تحقیق ہوگئی ایک مسئلہ کی کسی کو کافر کہنے میں بڑی احتیاط چاہئے۔ بعض اہل علم ذرا ذرا سی بات میں ایمان سے خارج کر دیتے ہیں یہ بڑی غلطی ہے۔ یہ حکایت اعرابی کی اس ضمن میں بیان ہوئی تھی کہ مجسمہ نے حق تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء ثابت کئے جیسا کہ اس اعرابی کے اس جملہ سے ثابت ہوتا ہے کہ تیرا خدا بطیخ شامی ہے کہ اس میں آنکھ ہے نہ ناک وہ اعرابی تو معذور تھا کیونکہ جاہل تھا اس کو اس سے زیادہ سمجھ ہی نہ تھی وہ اپنے خیال کے موافق یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اعضاء کا ہونا کمال ہے اور نہ ہونا نقصان اور عیب اس واسطے اس نے اعضاء کے نفی کو ذات حق کے لئے برا سمجھا اور اس سے خفا ہوا اور فرقہ مجسمہ اہل علم ہیں وہ دلیل اور حجت کو سمجھ سکتے ہیں وہ ان خرافات کے قائل ہونے میں معذور نہیں ہوسکتے اور ان سے مواخذہ ہوگا۔ مجسمہ نے تو غضب ہی کیا ہے۔ حق تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء ثابت کئے ہیں اور یہاں تک کہہ دیا ہے کہ حق

تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہے اور پیمائش تک لکھ دی ہے کہ چار چار انگل چاروں طرف عرش سے نکلا ہوا ہے نعوذ باللہ من ھذا الخرافات اور لغویات کے لئے ثبوت پیش کئے ہیں۔

فرقہ مجسمہ کی لغویات

چنانچہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (وہ بڑی رحمت والا عرش پر قائم ہے) سے عرش پر بیٹھنا ثابت کیا۔ پھر یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی شان سب سے بڑی ہے چنانچہ ہر وقت نماز میں کہا جاتا ہے اللہ اکبر (اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے) اور جابجا آیا ہے وَھُوَالْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (وہی بڑی عظمت والا ہے) اس واسطے یہ تو احتمال نہیں کہ حق تعالیٰ کو عرش سے چھوٹا مانیں لہذا یہ مان لیا کہ عرش سے بڑا ہے اور بڑائی کی مقدار چار انگل مقرر کر دی کیونکہ اس سے بھی کیا کم بڑائی ہوگی اور چونکہ یہ لوگ اپنے ان دعووں پر دلیل لاتے ہیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہل علم اور اہل استدلال ہیں وہ اس اعرابی کی طرح معذور کیسے قرار دئے جاسکتے ہیں وہ ضرور غلطی پر ہیں اور قابل مواخذہ ہیں۔ انہوں نے غلطی یہی کی ہے کہ اپنے اوپر قیاس کیا ذات حق جل وعلا کو۔ دیکھا کہ ہمارے واسطے اعضاء اور جسم کا ہونا کمال ہے لہذا حق تعالیٰ کے لئے بھی یہی کمال ہوگا اور اس کو ثابت مان لیا حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیا ایک بات جو ایک شخص کے لئے کمال ہو وہ لازم ہے کہ دوسرے کے لئے بھی کمال ہو۔ اگر ایک چپڑاسی کے لئے خدمت کرنا اور نوکری پر کھڑا رہنا کمال ہے تو یہ کیا بادشاہ کے لئے بھی کمال ہوگا بہت موٹی بات ہے کہ اگر بادشاہ ایسا کرے تو کہا جائے گا کہ چھچھورا ہے اور اس کو حوصلہ نہیں ہے سلطنت کا پھر جو بات مخلوق کے لئے کمال ہو اس کو خالق کے لئے کمال سمجھنا کیسے درست ہوگا۔ کم فہم اور عامی آدمی کا معذور ہونا اور بات ہے اور مسئلہ کی تحقیق اور چیز۔ سمجھدار اور اہل علم ایسی غلطی میں معذور نہیں ہو سکتے۔

مولانا شبان کے قصہ میں اس کا فیصلہ کرتے ہیں وہ قصہ مشہور ہے بارہا سنا ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ ایک چرواہا فرط محبت میں حق تعالیٰ کو خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ آپ مل جاویں تو میں روٹیاں پکا کر گھی لگا کر کھلاؤں دودھ مکھن بالائی سب آپ ہی کو کھلا دوں کپڑے پھٹ گئے ہوں تو سی دوں۔ کپڑوں میں جوں پڑ گئی ہوں تو دیکھ دوں اور جانے کیا کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کلمات کو سن کر کانپ اٹھے اور اس کو زجر کیا اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر عتاب ہوا اور ارشاد ہوا۔

ہر کسے را اصلاحے دادہ ایم ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم

در حق او مدح در حق تو ذم در حق اوشہد و در حق تو سم

مطلب یہ ہے کہ ہمارا برتاؤ ہر شخص کے ساتھ اس کی فہم کے موافق ہے جو کلمات آپ کے حق میں ذم ہیں وہ اس کے حق میں مدح ہیں اسی قصہ کے سلسلہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

گر تو مردے رابخوانی . فاطمہ گرچہ یک جنس اند مرد و زن ہمہ

قصد خون تو کند تا ممکن ست گرچہ خوش خوی د حلیم و مومن ست

فاطمہ مدح ست در حق زنان مرد را گوئی بود زخم سناں

(اگر تم کسی مرد کو فاطمہ کہہ کر پکار دو اگرچہ تمام مرد عورت ایک ہی جنس یعنی انسان ہیں تو تا بقدور تمہاری جان لینے کا ارادہ کر دے گا اگرچہ بردبار، خوش خو اور مومن ہو فاطمہ عورتوں کے حق میں تعریف ہے لیکن مرد کے حق میں تلوار کے زخم کی طرح ہے۔)

فاطمہ کوئی برا لفظ نہیں معنی اس کے کچھ خراب نہیں بہت معظم و مکرم نام ہے پھر مرد اس سے کیوں برا مانتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ گو یہ لفظ اچھا ہے اور معظم ہے مکرم ہے مگر صرف عورتوں کے لئے ہے نہ کہ مردوں کے لئے یہ کیا ضرور ہے کہ جو لفظ ایک صنف کے لئے اچھا اور معظم و مکرم ہو تو دوسرے صنف کے لئے بھی ہو ایک کو دوسرے پر قیاس کیسے کیا جاوے۔ جب مرد اور عورت میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک کا حکم دوسرے پر جاری نہیں کر سکتے باوجود یہ کہ دونوں میں علاقہ مجانست کا ہے تو حضرت حق اور انسان میں تو کچھ نسبت اور علاقہ ہی نہیں ہے۔ انسان کے احکام حضرت حق پر کیسے جاری کر سکتے ہیں یہ قیاس کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ جو بات انسان کے لئے کمال ہو وہ حضرت حق کے لئے بھی کمال ہو۔

فہم کے موافق ایک لطیفہ

فاطمہ کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا ہمارے ایک مکرم ہیں وہ مشکوٰۃ شریف پڑھا رہے تھے اس میں حضرت عائشہؓ کے فضائل کی حدیثیں آئیں غایت تمنا سے فرمانے لگے کہ کاش میں عائشہ ہوتا۔ میں نے یہ قصہ سن کر کہا کہ عائشہ ہونے کی تمنا کی ابوبکرؓ ہونے کی تمنا کیوں نہ کی کہ مرد بھی رہتے اور فضیلت بھی حاصل ہو جاتی یہ حکایت طرداً ذکر ہو گئی بیان یہ تھا کہ قیاس الغائب علی الشاہد جائز نہیں یہ کیا ضرور ہے کہ جو بات ہم انسانوں کے لئے کمال ہو وہ حضرت حق کے لئے بھی کمال ہو مجسمہ نے یہی غلطی کی کہ جسم کو مخلوق کے لئے کمال دیکھ کر حق تعالیٰ کے لئے بھی کمال سمجھا اور نصوص سے اس کی تائید تلاش کر کے اسے ثابت کہہ دیا اور درحقیقت انہوں نے نصوص کا بھی کامل تتبع نہیں کیا۔ یدالله فوق ایدیھم (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) میں ید کا لفظ تو دیکھ لیا۔ لیکن لیس کمثله شیء (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) کو نہیں دیکھا جس میں نفی ہے تمام عالم سے مماثلت کی۔ جب کسی چیز کو حق تعالیٰ سے مماثلت اور کوئی جنسیت نہیں تو

کسی چیز کے احکام ان کی ذات پر کیسے جاری ہو سکتے ہیں اور یہ ان کے ذہن میں نہ آیا کہ وہ ذات تمام مخلوقات اور ممکنات سے وراء الوراثم وراء الورا ہے۔ میں نے اوپر ایک موقع پر جہاں حضرت ابو بکرؓ کے قتال مرتدین کا ذکر ہے اس کے تھوڑی دور بعد کہا ہے کہ یہ چال ہی غلط ہے کہ اول ایک مقصود اپنی رائے سے قائم کر لیا پھر اس کی تائید کے لئے نصوص کی تلاش شروع کی۔ اس صورت میں جو یندہ یابندہ نصوص موہمہ بھی مل جاتے ہیں مگر یہ طریقہ اہل حق کا نہیں ہے اور اس طرح سے حق ہاتھ نہیں آتا۔

بہتر فرقے سننے کا سبب

اس صورت میں اتباع تو ہوا ھوی کا اور حیلہ کے لئے نصوص کو بھی لے لیا گیا۔ اگر یہ طریقہ حق کے مل جانے کا ہوتا تو بہتر فرقے کیوں ہوتے کیونکہ حق تو ایک ہی ہے اس تک سب پہنچ جاتے یہ بہتر فرقے اسی طرح تو ہوئے کہ ہر فرقے نے ایک دعویٰ اپنے دل سے تراش کر قرار دے لیا پھر اس کے ثبوت کے لئے کچھ نصوص ڈھونڈ لیں۔ چنانچہ جس سے پوچھئے وہ کہتا ہے قال اللہ کذا وقال اللہ کذا ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ قرآن چوں مرد سخی ست کہ ہر کس و نا کس بداں تمسک تواند کرد یعنی قرآن کی مثال ایک بہت بڑے سخی آدمی کی سی ہے کہ کسی سائل کو خالی نہیں پھیرتا نہ پھیرنے کے معنی یہ نہیں کہ واقعی قرآن میں سے وہ باطل مضمون نکل آتا ہے اس معنی سے تو نعوذ باللہ لازم آئے گا کہ قرآن مجموعہ ہو گا حق و باطل کا بلکہ باطل ہی ہوگا کیونکہ مجموعہ حق و باطل کا باطل ہوتا ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ قرآن کی عبارت مصلحت ابتلاء اس قسم کی ہے کہ اس کے معنوں کو توڑ مروڑ کر مضمون کو ثابت کر لیا جاتا ہے۔

اہل باطل و اہل حق کا فرق

اگر کوئی کہے پھر اہل حق اور باطل میں تمیز کیسے ہو یہ بھی تو احتمال ہے کہ اہل باطل کا استدلال صحیح ہو اور جن کو اہل حق کہا جاتا ہے ان کے معنوں میں توڑ مروڑ ہوئی ہو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں دو قسم کے فرق ہیں ایک بین یعنی ظاہر اور واضح اور سہل جو بعد میں بیان ہو گا اور ایک غامض یعنی دقیق اور باریک اور مشکل جس کو پہلے بیان کرتا ہوں سو جن کو حق تعالیٰ نے علم صحیح اور نظر اور تحقیق اور فہم سلیم دیا ہے وہ طریق غامض تو ان کے لئے خاص ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ وہ بات دل کو لگی یا نہیں ان کے دل میں ایک صحیح حس پیدا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کو اس طرح پہچان لیتے ہیں جیسے زبان کڑوے اور میٹھے کو پہچان لیتی ہے۔ باطل کو ان کا دل قبول ہی نہیں کرتا۔ دس باتیں حق اور ایک باطل ملا کر ان کے سامنے پیش کرو تو الگ کر کے بتا دیں گے کہ اس میں اتنا حق ہے اور اتنا باطل یہ فرق وہ ہے جس کو میں نے غامض کہا ہے یہ ہر شخص کا کام نہیں نہ میں کسی کو اس کی اجازت دیتا ہوں کبھی کسی کی جرات ہو جائے کہ یہ اچھا طریقہ ہاتھ آیا حق و باطل کے پہچاننے

کا کہ جس کو دل قبول کر لے وہی حق ہے اول وہ حس حاصل کیجئے جس سے یہ امتیاز ہوتا ہے سو اس کا حاصل کرنا کارے دارد۔ بڑی محنتوں کے بعد اور بڑی ریاضتوں کے بعد اور کسی کی جوتیاں اٹھانے اور مٹ جانے کے بعد اور اصل میں فضل خداوندی کے بعد وہ حس حاصل ہوتا ہے وہ صرف پڑھنے لکھنے سے نہیں ہوتا۔ خیر اس کو چھوڑیئے۔ ہم لوگوں کا کام نہیں۔

باطل اور حق کے پہچاننے کا سہل طریقہ

دوسرا وہ فرق ہے جس کو میں نے بین کہا ہے اور وہ عام ہے اور وہ وہ ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے جس حدیث میں تہتر فرقوں کا بیان ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ اس میں سے ایک ناجی ہے اور باقی سب ناری۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا **من ھم یا رسول اللہ** یہ کونسا فرقہ ہے جو ناجی ہے یہ وہی سوال ہے جس پر گفتگو ہو رہی ہے حضورؐ سے زیادہ کون اچھا اور سہل جواب دے سکتا ہے۔ فرمایا **ما انا علیہ و اصحابی** (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰)

یعنی ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس مسلک پر ہونگے جو میرا اور میرے صحابہ کا ہے یعنی میرا اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا اتباع کریں گے یہ ایک ایسی پہچان ہے کہ اس سے بہت ہی سہولت سے اہل حق اور اہل باطل میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ دیکھ لیا جاوے کہ کس کے اقوال و افعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اقوال و افعال سے ملے ہوئے ہیں۔ کھینچ تان کر کسی بات کا ثبوت حاصل کر لینا اور بات ہے۔ اس کو ملنا نہیں کہتے یوں تو کوئی جملہ دنیا میں ایسا نہیں جس سے اصلی معنی کے سوا الٹ پلٹ کر کے کوئی دوسرے معنی نہ نکالے جا سکیں مثلاً کوئی رات کو دن ثابت کرنے کے لئے کہہ سکتا ہے کہ دن اس کو کہتے ہیں جس میں سورج نکلا ہوا ہو اور سورج منجملہ ستاروں کے ایک ستارہ ہے اور اس وقت رات کو بھی ستارے نکلے ہوئے ہیں جو بہت اوصاف میں سورج کے مشابہ ہیں پس ان کا نکلنا سورج ہی کا نکلنا ہے لہٰذا اس وقت دن ہوا دیکھئے ثابت ہو گیا کہ رات کے وقت دن ہے لیکن یہ وہی ثبوت ہے جو کھینچ تان سے حاصل ہوا ہے اگر کوئی عقلمند ثبوت نہیں کہہ سکتا اس کو تاویل بلکہ تحریف کہتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جس کو تو جیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کہتے ہیں سو اس طرح تو ہر کلام سے دوسرے معنی نکالے جا سکتے ہیں ثبوت حقیقی وہ ہے جو بے تکلف ہو اور اس میں کھینچ تان کر اصلا ضرورت نہ ہو۔ اہل باطل کی توجیہات اسی قسم کی ہوتی ہیں کہ ایک جگہ وہ نصوص کو کھینچ تان کر اپنے مطلب کے موافق کر لیتے ہیں لیکن دوسری نصوص اس کے خلاف ہوتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ خود متکلم کی مراد ان نصوص سے وہ نہ تھی جو انہوں نے سمجھی۔ اسی کو کھینچ تان کہتے ہیں اس طرح سے مطابق کر لینے کو مطابقت نہیں کہتے مطابقت

واقعیہ اس کو کہتے ہیں جس میں کھینچ تان کی ضرورت نہ ہو سیدھے معنوں کو دیکھا جاوے تو اس کو مطابقت ہو نصوص سے سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا کہ اقوال وافعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور اقوال وافعال صحابہ کے سامنے سر جھکا دیا جائے وہ اپنی رائے کے موافق ہوں یا مخالف یہی تعمیل ہے حدیث مذکورہ بالا ما انا علیہ و اصحابی کی۔ (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰)

قول صحابیؓ بھی حجت ہے

اور اس پر سب سے زیادہ عمل کیا ہے ابو حنیفہؒ نے کیونکہ ان کا قول ہے کہ حدیث موقوف بھی حجت ہے اور مقدم ہے قیاس پر حدیث موقوف اس کو کہتے ہیں جس میں صحابی اپنی طرف سے ایک حکم بیان کرے جو مدرک بالرائے ہو سکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت نہ کرے۔ اس کو کہا جائے گا کہ یہ صحابی کی رائے ہے سو امام صاحب اس کے سامنے بھی قیاس کو چھوڑ دیتے ہیں اور بعض فقہائے مجتہدین کہتے ہیں ھم رجال و نحن رجال یعنی جب قرآن وحدیث میں اس حکم کے بارہ میں کوئی تصریح نہیں ہے تو یہ صحابی کا قیاس ہے تو جیسے وہ قیاس کر سکتے ہیں ایسے ہم بھی قیاس کر سکتے ہیں لہذا اگر وہ قول ہمارے قیاس کے مطابق ہو تو خیر ورنہ ہم کو اپنے قیاس پر عمل کرنا چاہئے۔ ان کا قیاس ہمارے اوپر حجت نہیں جیسے کہ عام قاعدہ ہے کہ ایک مجتہد کا قیاس دوسرے پر حجت نہیں ہوتا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو سب کے لئے حجت ہے ہی جیسا کہ مسلم ہے لیکن جس امر میں حضورؐ کا ارشاد منقول نہ ہو اور اس میں ضرورت ہو اجتہاد کی تو اس اجتہاد میں صحابی اور ہم برابر ہیں وہ بھی مجتہد ہیں اور ہم بھی اور ایک مجتہد پر دوسرے مجتہد کی تقلید ضروری نہیں مگر امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ صحابی کی بھی تقلید مجتہد پر واجب ہے یعنی اس کا اتباع بلا دلیل (تقلید کی حقیقت یہ ہے) بلفظ دیگر صحابی کا قول بھی دلیل ہے اور قیاس اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی دلیل نہ ہو اور قول صحابی دلیل ہے تو اس صورت میں امام صاحب اپنے قیاس کو چھوڑ دیتے ہیں۔

مجتہد پر صحابیؓ کی تقلید واجب ہے

اور امام صاحب کے اس مسلک کا ماخذ ما انا علیہ و اصحابی (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰) کے ظاہر الفاظ ہو سکتے ہیں یعنی وہ میرے اور میرے صحابہ کے مسلک کے متبع ہیں تو صحابی کا اتباع بھی ضروری ہوا اتباع مرادف ہے ترجمہ تقلید کا تو ثابت ہوا کہ تقلید صحابی کی بھی واجب ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کے رہنے والے تھے۔ مزاج داں تھے حضورؐ

کے اشارات کو سمجھتے تھے حضورؐ کے مقالات کو سنتے تھے اور ان پر عمل کے مواقع کو جانتے تھے وہ زیادہ سمجھ سکتے ہیں کہ کس موقع پر وہ مقالہ وجوب کے لئے تھا اور کس موقع پر اباحت کے لئے ان کے ذہن میں مقالات بھی ہیں اور مقامات بھی اور ہمارے پاس صرف مقالات ہیں تو ظاہر ہے کہ ان ہی کی رائے اغراض شارع کے زیادہ مطابق ہوسکتی ہے تو اس صورت میں حدیث موقوف جس کی نسبت صرف صحابی کی طرف ہے وہ اقرب ہوئی حضورؐ کے حکم کے بہ نسبت ہماری رائے اور قیاس کے۔ دیکھئے کس قدر احتیاط کی ہے امام ابوحنیفہ نے اور کس درجہ اتباع کیا ہے وحی کا یہی وجہ ہے کہ ابوحنیفہ کے مذہب میں آثار بہت ہیں کیونکہ ان کو قیاس سے پہلے آثار کی تلاش کرنا پڑی ہے وہ قیاس اس وقت کرتے ہیں جب کوئی حدیث موقوف یعنی اثر بھی نہ ملے اور دیگر آئمہ اس کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے وہ حدیث موقوف پر قیاس کو راجح رکھتے ہیں اور امام صاحب کے مذاق کی تائید ایک امر فطری سے بھی ہوتی ہے۔

حضرات صحابہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے

وہ یہ کہ طبعی بات ہے کہ مزاج شناسی اور مذاق شناسی کو بھی روایت کی تصحیح میں خاص دخل ہوتا ہے دیکھئے ہم کسی بزرگ کے پاس رہے ہوں اور ان کے مذاق سے آشنا ہوں پھر کوئی راوی ایک ایسی حالت بیان کرے جو ان کے مذاق اور وضع کے خلاف ہو تو ہم فوراً کہہ دیں گے کہ غلط ہے مثلاً ہم کو معلوم ہے کہ وہ بزرگ پیشین گوئی نہیں کیا کرتے تھے اس سے قطعاً ان کو احتراز تھا مگر کوئی ثقہ راوی نقل کرتا ہے کہ انہوں نے یہ پیشین گوئی کی اور وہ سچ ہوئی تو گو اس سے ان کا کمال ثابت ہوتا ہے اور ہم بھی کمالات کے معتقد ہیں مگر ہم بے ساختہ کہہ دیں گے غلط ہے انہوں نے کبھی پیشین گوئی نہیں کی ہم کو ان کا مذاق اور طرز عمل معلوم ہے وہ اس سے بہت بچتے تھے اور اگر کوئی پیشین گوئی کی نسبت کسی ایسے بزرگ کی طرف کرے جن کا طرز عمل اور مذاق ہم کو معلوم ہے کہ وہ صاحب کشف تھے اور پیشین گوئی کیا کرتے تھے جیسے شیخ ابن عربیؒ تو ہم تصدیق کریں گے کیونکہ اس صورت میں کوئی وجہ نہیں ہے اس کے جھٹلانے کی پہلی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ اگر راوی ثقہ ہے تو اس کے قول کی کوئی تاویل کریں گے کہ سمجھنے میں غلطی ہوئی یا دوسرے سے روایت کی ہوگی اور اس نے روایت میں احتیاط نہیں کی لیکن ان کا طرز عمل اور مذاق معلوم ہونے کے سبب اس کی تصدیق نہیں کریں گے کہ انہوں نے پیشین گوئی کی غرض صحابہؓ مزاج شناس تھے اور صحبت پائی تھی جیسا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو سمجھ سکتے ہیں بعد کے لوگ نہیں سمجھ سکتے اس واسطے بعد کے لوگوں کو ضرورت ہے ان کے اتباع کی۔

اوران کی رائے دین کے بارہ میں بعد کے لوگوں کی رائے پرضرور مقدم ہونا چاہئے۔ خیر یہ تو ایک فرعی اختلاف ہے اہل حق میں لیکن یہ امر تمام اہل حق میں مشترک ہے کہ ان کا اصلی مقصود وحی کا اتباع ہے اس سے سمجھ میں آ گئی ہوگی پہچان فرقہ حقہ کی اور معلوم ہو گئے ہوں گے معنی حدیث ما انا علیه و اصحابی (تفسیر ابن کثیر ۴: ۲۳۰)

کے الحمد للہ کہ کوئی فرقہ بجز اہل سنت کے اپنے لئے اس طرز کو ثابت نہیں کر سکتا اور یہی معیار ہے حق و باطل کا بموجب حدیث مذکور کے تو اہل سنت ہی کو فرقہ حقہ ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ رائے کو دخل نہیں دیتے ہر امر میں کوشش کرتے ہیں وحی کے اتباع کی۔ بڑی چیز وحی ہی ہے مسلمان کے لئے اسلام نام ہی ہے گردن رکھنے کا حق تعالیٰ کے سامنے اور حق تعالیٰ کے احکام جس ذریعہ سے معلوم ہوتے ہیں اسی کا نام وحی ہے تو اسلام نام ہوا وحی کے سامنے گردن رکھ دینے اور اس کے اتباع کا۔ دین کا یہی خلاصہ ہے اور جب اپنی رائے آ گئی تو وحی کا اتباع کہاں رہا یہ تو رائے اور ہوی کا اتباع ہوا اور اتباع رائے اور ہوی کی بڑی مذمت آئی ہے تمام قرآن و حدیث اس مضمون سے بھرے ہوئے ہیں۔

فقہی قیاس اور رائے میں فرق

یہاں سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب رائے کی اس قدر مذمت ہے تو فقہ کے تو صدہا مسائل ایسے ہیں جن میں رائے کو دخل ہے جس کو قیاس کہتے ہیں زیادہ تر مسائل قیاس ہی سے ثابت ہیں تو فقہ بھی قابل مذمت ہوا۔ بات یہ ہے کہ جس رائے کو دخل دینے سے منع کیا جاتا ہے اور جس کی مذمت ہے وہ وہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے اس کو متبوع قرار دے لیا جاوے اور اس کو دین میں کافی سمجھا جاوے اور فقہاء کا قیاس اس طرح کا نہیں ہے۔ فقہ میں قیاس کے معنی یہ ہیں کہ ایک حکم کو منصوص سے غیر منصوص کی طرف باشتراک علت متعدی کرنا سو یہ حکم رائے کا نہیں ہے بلکہ نص کا حکم ہے۔ ہاں اس میں علت کا تلاش کرنا جس کی وجہ سے وہ حکم منصوص سے غیر منصوص کی طرف متعدی کیا گیا یہ اجتہاد سے ہوا۔ یہ حقیقت ہے قیاس کی۔ اس میں اور اس رائے میں جس کی مذمت کی جاتی ہے کئی طرح سے فرق ہے ایک یہ کہ اس سے اس وقت کام لیا جاتا ہے جب کسی چیز میں حکم منصوص موجود نہ ہو اور اگر کوئی نص خبر آحاد کے درجہ میں بھی موجود ہو تو اس سے کام نہیں لیا جاتا نص ہی پر عمل کیا جاتا ہے اور اہل رائے کی یہ حالت ہے کہ نص صریح اور قطعی میں بھی تاویل کر لیتے ہیں مگر رائے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو اتباع رائے کا یہ ہوا نہ کہ وہ دوسرے یہ کہ فقہا قیاس کو صرف مظہر کہتے ہیں مثبت نہیں کہتے یعنی فقہاء کہتے ہیں کہ قیاس اس حکم کو ظاہر کرتا ہے جو چھپا ہوا تھا۔ اصل حکم نص کا ہے جو مقیس

علیہ کے بارہ میں ظاہر تھا کیونکہ نص اس کے بارہ میں نازل ہی ہوئی ہے اور مقیس کے بارہ میں ظاہر نہ تھا مگر درحقیقت ثابت تھا کیونکہ اس میں بھی علت حکم کی موجود تھی اس کو ان کے قیاس نے ظاہر کر دیا تو حکم دراصل نص کا ہے قیاس نے کوئی نیا حکم ایجاد نہیں کیا۔ اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس حکم کی وقعت اور اس کا درجہ مقیس کے بارہ میں بھی وہی ہونا چاہئے جو مقیس علیہ کے بارہ میں ہے لیکن فقہاء کی احتیاط کو دیکھئے کہ باوجود اس کے بھی قیاس کو ظنی کہتے ہیں کیا معنی کہ اس کا وہ درجہ نہیں جو مقیس علیہ کے حکم کا ہے حتیٰ کہ اس کی تقلید بھی دوسرے مجتہد کو ضروری نہیں کہتے اور آپ دیکھتے ہیں کہ اہل رائے کی کیا حالت ہے کہ اپنے طبع زاد اور خود تراشیدہ حکم کو ایسا یقینی سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں نص بھی کوئی چیز نہیں اور علماء سلف تک کو کہتے ہیں کہ انہوں نے معنی نص کے نہیں سمجھے اس مضمون کی تحریریں موجود ہیں۔ پھر کتنا فرق ہوا دونوں رایوں میں دیکھ لیجئے کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے کہ اس کو متبوع اور کافی سمجھا گیا اور وحی سے قطع نظر کی گئی۔

اتباع فقہ اتباع وحی ہونے کا مفہوم

اتباع فقہ اتباع وحی ہونے کا مفہوم آج کل کی اہل رائے پر صادق ہے یا فقہاء کی رائے پر جس کو قیاس کہتے ہیں دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک حق ہے ایک باطل۔ بلکہ رائے بالمعنی الحقیقی کا لفظ بھی قیاس پر اطلاق کرنا صحیح نہیں تو قیاس کے اتباع کو اتباع رائے نہیں کہہ سکتے بلکہ قیاس منجملہ ادلہ شرعیہ کے ایک دلیل ہے تو اس کا اتباع وحی ہی کا اتباع ہو۔ یہ اس کا جواب ہو گیا کہ فقہ کا اتباع بھی رائے کا اتباع ہے جو مذموم ہے حاصل جواب کا یہ ہے کہ فقہ کا اتباع رائے کا اتباع نہیں بلکہ وحی کا اتباع ہے۔ بعض لوگ جو فقہ کے خلاف ہیں کہتے ہیں ایسے فن کا کیا اعتبار جس میں ہر قسم کی روایتیں موجود ہیں اور جس کے متبعین کی یہ حالت ہے کہ نہ قرآن سے بحث نہ حدیث سے جس کسی امام سے روایت مل جائے اور جب تک روایت نہ ملے اس وقت تک قرآن و حدیث سے ان کی تشفی نہیں ہوتی اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کونسا فن ہے جس میں رطب و یابس نہیں ہیں نحو میں نہیں ہیں یا معقول اور فلسفہ میں نہیں یا طب میں نہیں ڈاکٹری میں نہیں محض اس خلط میں کس کس فن کو چھوڑ دو گے ہر فن میں مدار قول راجح اور مذہب جمہور اور روایت مفتی بہا ہوا کرتا ہے اور امام کی روایت پر جو اعتماد کیا جاتا ہے اور بلا اس کے تشفی نہیں ہوتی اس کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ امام کے قول کو حدیث و قرآن سے زیادہ سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم کو اتنا علم نہیں جتنا ان فقہاء کو تھا جنہوں نے فقہ کو مرتب کیا۔ نصوص سے جس فہم اور احتیاط کے ساتھ وہ مسائل کا استخراج کر سکتے تھے ہم نہیں کر سکتے۔ اس واسطے

مسائل دریافت کرنے کے وقت امام کی روایت پوچھی جاتی ہے کہ انہوں نے اس کے متعلق کیا تحقیق کی ہے اگر ان کی تحقیق ہماری تحقیق کے خلاف ہو تو اس کو ترجیح دی جاتی ہے۔

تقلید کی حقیقت کی مثال

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک طالب علم سے ایک مسئلہ پوچھا جاوے اور وہ اس کا جواب دے اور اسی کو ایک پرانے استاد اور مدرس سے پوچھا جاوے اور وہ جواب دے اور ان کی تحقیق اس طالب علم کے خلاف ہو تو کس کو ترجیح ہوگی ظاہر ہے کہ استاد کے فتوے کو ترجیح ہوگی تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جو معنی قرآن وحدیث کے تھے (جیسا کہ اس طالب علم نے سمجھا تھا) قرآن وحدیث کو چھوڑ کر استاد کا اتباع کیا گیا اور قرآن وحدیث سے استاد کو زیادہ سمجھا گیا اور قرآن وحدیث کو چھوڑ کر ان کا فتویٰ تلاش کیا جاتا ہے نہیں بلکہ حقیقت اس کی یہ ہے کہ قرآن وحدیث ہی کے فتوے کی تلاش ہے اور اسی کے حکم کا اتباع کیا جاتا ہے مگر اس کا حکم طالب علم کے پاس صحیح نہیں ملتا ہے اس واسطے استاد کے پاس حکم کو تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے تقلید ائمہ کی۔

آئمہ اربعہ کی تقلید کی وجہ

رہا یہ کہ ائمہ معروفین ہی پر اس کو کیوں ختم کر دیا گیا اب قرآن وحدیث کے جاننے والے نہیں رہے جو استخراج مسائل کر سکیں اس کا جواب یہ ہے کہ قدرتی غیر اختیاری بات ہے کہ ان پر ملکہ استخراج ختم ہو گیا جیسا کہ فن روایت حدیث محدثین معروفین پر ختم ہو گیا ورنہ اس پر بھی وہ سوال ہو سکتا ہے کہ ان پر روایت حدیث کو کیوں ختم کر دیا گیا وہ بھی آدمی تھے ہم بھی آدمی ہیں۔ اب روایت حدیث کی کوئی کر کے دکھاوے۔

آئمہ مجتہدین پر اجتہاد ختم ہونے کی دلیل

رہا اس دعویٰ کا ثبوت کہ ان پر اجتہاد ختم ہو گیا یہ ہے کہ ائمہ کے فقہ کو عارضی طور پر الگ رکھ دیجئے اور قرآن وحدیث سے خود استنباط مسائل شروع کیجئے اور ایک معتد بہ مقدار مسائل کی جمع کر لیجئے پھر اس کو فقہ منقول سے ملا کر دیکھئے اپنی غلطیاں آپ کو خود معلوم ہو جاویں گی اور آپ بے ساختہ بول اٹھیں گے کہ استنباط صحیح وہی ہے جو فقہ میں ہے علاوہ اس کے آج کل عافیت بھی اسی میں ہے کہ قرآن وحدیث سے استنباط کی اجازت نہ دی جاوے ورنہ ہوی اور رائے کا وہ غلبہ ہے کہ معاذ اللہ زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین کہہ دینا کوئی بات ہی نہیں دیکھ لیجئے۔

ارکان دین میں تراش خراش کی خودرائی

اس وقت کتنے فرقے موجود ہیں ہر شخص کو اجتہاد کا شوق ہے اور یہ نوبت ہے کہ زوائد اور متممات دین کا تو کیا ذکر ہے ارکان دین میں تراش خراش کر ڈالی ہے کوئی رائے دیتا ہے کہ نماز کی قید اٹھا دی جائے تو مسلمانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جاوے اس قید کو دیکھ کر بہت سے لوگ اسلام میں آنے سے گھبراتے ہیں کوئی کہتا ہے قرآن میں تین ہی روزے آئے ہیں تمیں روزے علماء کی گڑھت ہے کوئی کہتا ہے زکوٰۃ سے غرض قومی امداد ہے قومی کاموں میں چندہ دینا کافی ہے کوئی کہتا ہے حج کرنا فضول ہے۔ ریگستانوں میں روپیہ پھینک آنے سے کیا فائدہ کسی قومی کام میں لگایا جاوے تو ترقی ہو۔ غرض کوئی جزو دین کا ترمیم سے نہیں چھوڑا اور جس سے پوچھو قال اللہ و قال الرسول ہی سے ثابت کرتا ہے۔ یہ گت ہے آج کل استنباط کی۔ سچ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ جزاء خیر دے فقہاء کو کہ انہوں نے دین کو بالکل محفوظ کر دیا ورنہ خدا جانے کیا ہوتا۔ پس آج کل عافیت اور دین کی سلامتی اسی میں ہے کہ قرآن وحدیث سے استنباط کی اجازت مطلقاً نہ دی جاوے۔

فقہ پر اعتبار نہ کرنے کا انجام

فقہ پر اعتبار نہ کرنے کا انجام چند روز میں یہ ہوگا کہ قرآن وحدیث بھی حجت نہ رہے گا کیونکہ جب آزادی کی ٹھہری اور ہر شخص ایک رائے رکھتا ہے اور ایک رائے کو دوسری پر کوئی ترجیح نہیں بلکہ جو جس کا خیال ہو وہی دین ہے تو اگر کسی کی رائے یہی ہو کہ قرآن وحدیث کی بھی ضرورت نہیں تو پھر یہی دین ہوگا۔

بدفہموں کو ترجمہ کلام پاک دیکھنا حرام ہے

حضرت یہ حالت ہے خودرائی اور جہالت کی کہ میں کنڈہ ضلع پرتاب گڑھ گیا ہوا تھا وہاں ایک معمر آدمی ملے جو نا تجربہ کار اور ناواقف نہ تھے بلکہ جہاندیدہ اور تجربہ کار اور گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے کتب بینی کا بھی ان کو شوق تھا علماء سے محبت بھی رکھتے تھے صحبت یافتہ تھے دیندار تہجد گزار پابند صوم و صلوٰۃ محتاط تھے رشوت سے بھی بچتے تھے۔ غرض بالکل جاہل نہ تھے دینی واقفیت رکھتے تھے اور دین کا اہتمام بھی تھا وہ ایک مترجم قرآن میرے پاس لائے اور کہنے لگے کچھ پوچھنا ہے اور یہ آیت نکالی۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (اے ایمان والو راعنا مت کہو انظرنا کہو) اس میں حق تعالیٰ نے یہود کی ایک شرارت کا ذکر فرمایا ہے اور اس سے بچنے کا مسلمانوں کو حکم دیا ہے وہ شرارت یہ تھی کہ راعنا ایک لفظ ہے جو عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں آتا ہے لیکن عربی میں معنی ہیں

ہمارا خیال کیجئے رعایت سے مشتق ہے اور عبرانی میں معنی ہیں احمق کے۔ تو یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مجلس میں خطاب کرتے اور راعنا کہتے مسلمان سمجھتے کہ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ہدایت کے طالب ہیں اور وہ مراد لیتے تھے وہ معنی جو عبرانی زبان میں ہے اور دل میں خوش ہوتے کہ ہم حضور کو خوب بناتے ہیں۔ (نعوذ باللہ) اے کم بختو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو نہ بنانے کی ضرورت ہے نہ تمہارے بنانے سے حضور بنیں۔ حضور کے ساتھ حق تعالیٰ ہیں جو عالم الغیب ہیں چنانچہ دیکھو اس مکر کی اطلاع حضور کو کر دی گئی۔ ہاں تم نے اپنے آپ کو بگاڑ لیا کہ ہدایت سے محروم رہے۔ غرض وہ لوگ یہ شرارت کیا کرتے تھے کہ راعنا کا لفظ بول کر وہ دوسرے معنی مراد لیا کرتے تھے۔ بعضے مسلمان بھی رعایت کے معنی سمجھ کر اس سے خطاب کرنے لگے حق تعالیٰ نے اس موہم لفظ کے بولنے سے مسلمانوں کو منع فرمایا اور بجائے اس کے انظرنا کا لفظ تعلیم فرمایا جس میں یہ ایہام نہیں ہے۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا غرض وہ بزرگ مترجم قرآن شریف لائے اس میں اس آیت کے ترجمہ میں لکھا تھا اے مسلمانو مت کہو راعنا کہنے لگے مجھے کیا کرنا چاہئے لفظ راعنا اس آیت میں نہ پڑھا کروں کیونکہ حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے میں نے کہا حضرت آپ کو ترجمہ قرآن کا دیکھنا حرام ہے جب آپ کے فہم کی یہ حالت ہے تو خدا جانے آپ کیا کیا غلطی کریں گے دیکھ لیجئے یہ حالت ان کی ہے جو تجربہ کار دیندار اور کتاب دیکھنے والے ہیں اور ان کا تو کیا پوچھنا ہے جو محض جاہل ہیں کیسے کہہ دیا جاوے کہ آزادی میں کوئی مضرت نہیں۔ آج کل اس فتویٰ سے لوگوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے کہ قرآن کا ترجمہ دیکھئے کہ حرام کہا جاتا ہے۔ قرآن ہی تو مسلمانوں کی کتاب ہے اسی کے دیکھنے سے منع کیا جاتا ہے پھر اسلام کیسے درست ہو میں کہتا ہوں قرآن بیشک مسلمانوں کی کتاب ہے اور اسلام کے درست کرنے کے لئے ہی نازل ہوئی ہے لیکن اس سے اسلام درست کرنے کا طریقہ ترجمہ کا دیکھنا نہیں ہے دیکھ لیجئے کیا نتائج ہیں ترجمہ دیکھنے کے البتہ قرآن سے اسلام کے درست کرنے کا طریقہ کسی ماہر سے اس کا پڑھنا اور سمجھنا پھر عمل کرنا ہے۔

ہر فن سیکھنے سے آتا ہے

اس طریق سے قرآن سے کام لیجئے بیشک اسلام درست ہوگا اتنا تو خیال کر لینا چاہئے کہ کسی فن کی معمولی سی کتاب بھی بلا استاد سے پڑھے سمجھ میں نہیں آسکتی اور اس پر عمل نہیں ہوسکتا مثلاً کھانا پکانا کہ کوئی مشکل کام نہیں ہے جاہل عورتیں اور ڈومنی اور جلاہی سبھی پکاتی ہیں مگر آپ مہربانی کر کے اردو کی کتاب الوان نعمت سامنے رکھ کر جس میں کھانا پکانے کی ترکیبیں مفصل لکھی ہیں اور ہر چیز کے وزن تک لکھے ہیں ذرا کوئی معمولی سا کھانا پکا تو لیجئے وجہ وہی ہے کہ جائے استاد خالیست جاننے

والے سے سیکھنے کی ضرورت باقی ہے جب اتنے سے کام میں بھی کتاب کا دیکھنا کافی نہیں اور استاد کی ضرورت ہے تو قرآن شریف کے سمجھنے کے لئے استاد کی ضرورت کیسے نہیں ہے اور صرف ترجمہ بطور خود دیکھ لینا کیسے کافی ہوسکتا ہے ذرا تو غور کرنا چاہئے۔ اگر اس سے کوئی منع کرتا ہے تو وحشت کیوں ہوتی ہے کیا وہ قرآن کے دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ نہیں وہ قرآن کے دیکھنے سے منع نہیں کرتا بلکہ بے قاعدہ دیکھنے سے منع کرتا ہے۔ باقاعدہ دیکھئے کوئی منع نہ کرے گا اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ کسی استاد سے سبقاً پڑھے تاکہ جو بات سمجھ میں نہ آوے وہ بتلادے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن کو اس قدر سہل سمجھ لیا گیا ہے کہ کسی سے اس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن شریف تو خدا کی کتاب ہے جبکہ بندوں کی لکھی ہوئی کتاب کے لئے بھی استاد سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو تعجب ہے کہ خدا کی کتاب کے لئے پڑھنے کی ضرورت نہ ہو۔ بڑا افسوس ہے کہ قرآن شریف ہی پر مشق کرنے کی سب کو ہمت ہوتی ہے تعزیرات ہند پر کسی کی جرات نہیں ہوتی۔ کوئی مقدمہ تو بلا وکیل کے تعزیرات ہند کو دیکھ کر لڑا لیا ہوتا۔ اگر کوئی اردو خوان آدمی تعزیرات ہند کے ترجمہ کو اس خیال سے دیکھ رہا ہو کہ میں اپنا ایک سنگین مقدمہ خود ہی لڑلوں گا۔ اس حال میں اسے کوئی پرانا تجربہ کار وکیل دیکھ لے تو وہ یہ کہے گا یا نہیں کہ کیوں دماغ خراب ہو رہا ہے مقدمہ کا کیوں ستیاناس کر رہے ہو جیل خانہ چلے جاؤ گے اپنی خیر چاہتے ہو تو کسی قانون پیشہ پاس شدہ اور تجربہ کار وکیل کے سپرد کرو ورنہ پچھتاؤ گے۔ کیوں صاحبو یہ کہنا اس کا بیجا ہوگا یا بجا۔ اس کو تو سب سننے والے یہی کہیں گے کہ وکیل نے بڑی ہمدردی کی اور بڑی قیمتی رائے دی اس کا بہت ممنون ہونا چاہئے اور اس رائے پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔ دیکھئے وکیل تعزیرات کے دیکھنے سے ایک شخص کو منع کرتا ہے اور اس کی تحسین کی جاتی ہے تو اگر کوئی ملانا قرآن کے ترجمہ دیکھنے سے کسی کو منع کرتا ہے تو وحشت کیوں ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں مقدمہ خراب ہونے سے جو بلائیں نازل ہوں گی ان کا یقین ہے اور یہاں عقیدہ خراب ہونے اور غلطی کرنے سے جو بلائیں پیش آنے والی ہیں ان کا ایسا یقین نہیں۔ صاحبو مسلمان کی تو یہ حالت نہیں ہونی چاہئے۔ جب مسلمان آخرت اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا آنا ایسا ہی یقینی سمجھنا چاہئے جیسے دنیا کی بلاؤں کا آنا اور دین کے بارہ میں کوئی ایسی جرات نہیں کرنا چاہئے جو آخرت میں مصیبت کا باعث ہو۔ غرض یہ مشورہ کوئی وحشت کی بات نہیں کہ بعض صورتوں میں قرآن کا ترجمہ دیکھنے یا اور کسی کتاب کے دیکھنے سے منع کر دیا جاوے۔ اسی واسطے میں نے ان صاحب سے جنہوں نے راعنا کے متعلق سوال کیا تھا یہ کہا کہ آپ کو قرآن کا ترجمہ دیکھنا حرام ہے جب کسی کو ایسی بلا میں مبتلا دیکھوں تو فرمایئے کیا کروں کیا اس پر سکوت کروں جس کا مطلب یہ ہو

کہ یہ مستحسن ہے اور اس میں کچھ برائی نہیں یہ تو صریح مداہنت ہے اور دوسرے کے دین کو بگاڑنا ہے کیونکہ ترجمہ دیکھنے سے غرض کتاب الٰہی کے مفہوم کا سمجھنا ہے مگر جب اس میں غلطی ہوئی اور کتاب الٰہی کو الٹا سمجھا ہوا تو اس سے ہدایت ہوگی یا گمراہی یہ بہت موٹی بات ہے۔ جب اس سے گمراہی ہوتی ہے تو یہ حلال ہوا یا حرام۔ اگر اس کو حرام کہا گیا تو تعجب کی کیا بات ہے۔ ضلالت کا سبب تو حرام ہی ہوگا۔ اگر کہا جاوے کہ سب آدمی برابر نہیں سب ایسے کم فہم نہیں ہوتے کہ راعنا کو قرآن سے خارج کرنے کی تجویز کریں تو یہ غلطی کرنا شاذ ہوا اور شذوذ پر کوئی حکم نہیں ہوا کرتا یوں تو بہت سے آدمی ایسے بھی ہیں کہ علم پڑھ کر غلطی کرتے ہیں تو علم پڑھنے کو بھی منع کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ترجمہ دیکھ کر غلطی کرنا شاذ نہیں واقعات کو دیکھئے جتنے آدمی صرف اردو کی یا انگریزی یا اور کسی زبان کی لیاقت رکھنے والے ہوں اور قرآن کا ترجمہ بطور خود دیکھنے کے شوقین ہوں ان کا امتحان لیجئے قریب قریب کل کے کل سخت غلطیوں میں مبتلا نکلیں گے۔ جس کا جی چاہے امتحان کر لے۔ لہذا شذوذ نہ رہا بلکہ شذوذ میری جانب میں ہوگیا کہ ایسے سمجھدار شاذ و نادر نکلیں گے جو غلطی نہ کرتے ہوں اور ان کو اجازت دی جاسکے اور آپ ہی کا فیصلہ یہ ہے کہ شذوذ پر حکم نہیں ہوتا تو یہ حکم نہیں ہونا چاہیئے کہ ترجمہ دیکھنے کی اجازت ہو تو اب اس فتوے سے چونکنا نہ چاہیئے کہ قرآن کا ترجمہ دیکھنا حرام ہے اور ایسے فتوے بہت ہیں جن لوگ چونکتے ہیں ایک تو یہی کہ قرآن کا ترجمہ دیکھنا حرام ہے۔

رویت ہلال میں تار کی خبر معتبر نہیں

اسی طرح کا ایک دوسرا فتویٰ بھی ہے کہ چاند کے بارہ میں تار کی خبر کا اعتبار نہیں کہتے ہیں مولوی لوگ گھروں میں بیٹھے ہوئے فتوے بگھارا کرتے ہیں ان کو اتنی بھی خبر نہیں کہ گورنمنٹ نے تار کے متعلق کیا کیا انتظامات کر رکھے ہیں ممکن نہیں کہ کوئی ایک لفظ کا بھی تغیر کر سکے تو تار کی خبر ایسی ہوئی جیسے خود خبر دینے والے کا بیان پھر اس کے نہ قبول کرنے کی بجز اس کے کیا وجہ کہ مولویوں کو نئی چیزوں سے وحشت ہے ان کے دماغ خشک ہیں کسی قسم کی ترقی کرنا نہیں چاہتے۔ ان چیزوں کے نام سے گھبراتے ہیں جو اہل ترقی کی طرف منسوب ہیں اس واسطے ایسے فتوے دیتے ہیں صاحبو میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ شہادت کی قبولیت کے لئے کچھ شرطیں ہیں وہ شرطیں تار کی خبر میں نہیں پائی جاتیں اس واسطے نہیں قبول کی جاتی اور وہ شرطیں ایسی ہیں کہ اس وقت بیان نہیں کی جاسکتیں کیونکہ عوام تو ان کو کیا سمجھیں گے بعض طالب علم بھی نہیں سمجھ سکتے یہ ممکن ہے کہ کہیں تار کی خبر میں بھی وہ شرطیں موجود ہو جاویں اور قبول کی جاسکے لیکن اکثر یہی ہے کہ نہیں پائی جاتیں لہذا اسد اللباب عدم قبول ہی کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ ایک جگہ جنٹلمینوں کا مجمع تھا اور

اسی مسئلہ کا تذکرہ ہو رہا تھا اور سب تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیسا فتویٰ ہے میں اتفاق سے پہنچ گیا مجھ سے پوچھا گیا کہ تار کی خبر رویت ہلال کے بارہ میں کیوں نہیں مانی جاتی۔

عدالت میں تار پر اعتماد نہیں کیا جاتا

میں نے دل میں سوچا کہ اس کی دلیل کو یہ کیا سمجھیں گے اور کیا اس سے ان کی تسلی ہوگی اس واسطے ان کے مذاق کے موافق جواب دیا کہ کیوں صاحب تار کی خبر کا اعتبار حاکم کے حکم سنانے میں یا عدالت میں شہادت کے وقت بھی ہوسکتا ہے یا نہیں کیا یہ ممکن ہے کہ حاکم دور بیٹھے تار کے ذریعہ سے حکم پہنچا دے یا گواہ کسی مقدمہ میں شہادت بذریعہ تار کے ادا کر دیں کہنے لگے یہ تو نہیں ہوسکتا میں نے کہا اس کی وجہ کیا ہے خود گورنمنٹ کو اپنے انتظام پر اعتماد نہیں جو تار کی خبر کو گواہ کے یا حاکم کے بیان کے برابر نہیں سمجھتی یا عقلاء زمان کے بھی دماغ مولویوں کی طرح خشک ہو گئے ہیں۔ اب ان کی سمجھ میں آ گیا کیونکہ اس فرقہ کے فعل پر جس پر ان کا ایمان ہے مولویوں کے فعل کو منطبق کر دیا گیا۔ افسوس یہ حالت ہوگئی ہے دین کی اور فہم کی کہ دین میں وہ اشکال کئے جاتے ہیں جن کا جواب خود اپنے طرزِ عمل میں موجود ہے لیکن اعتراض تک ذہن چلتا ہے اور جواب تک نہیں چلتا اس کی وجہ دین کی وقعت دل میں نہ ہونا ہے جب فہم اور دین کی یہ حالت ہے پھر کس بات پر اعتماد کر کے اجازت دیدی جاوے قرآن کے ترجمہ دیکھنے کی۔

بعض شبہات سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے

عام حالت یہ ہے کہ اگر غلطی کرنے سے کوئی شبہ دل میں بیٹھ گیا تو اتنی توفیق نہیں ہوگی کہ اس کو کسی جاننے والے سے حل کریں بس اس کو لاینحل سمجھ کر دل ہی دل میں پکاتے رہیں گے اور یہ فیصلہ اول ہی دن کر لیا جائے گا کہ یہ شبہ مولویوں سے حل ہو ہی نہیں سکتا اول تو مولوی لوگ جواب نہیں دیں گے بلکہ بجائے جواب کے کفر کا فتویٰ لگا دیں گے اور اگر جواب دیں گے بھی تو وہی خشک اور اپنے مذاق کے موافق جس سے ہماری تسلی نہیں ہوسکتی پس اس خیال کو پختہ کر کے شبہ کو دل ہی دل میں پالتے رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض وقت وہ شبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے غرض دین کی تو یہ حالت ہے کہ کسی سے پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی اور فہم کی حالت آپ نے سن لی کہ راعنا کے لفظ کو قرآن سے نکال ہی دینے کی تجویز کر رہے تھے اور یہ بھی صرف ان ہی صاحب کے ساتھ مخصوص نہ تھی جس کو شاذ کہا جائے تمام ترجمہ دیکھنے والے ایسے ہی ہیں الا ماشاء اللہ۔ تو اس صورت میں بجز اس کے کیا حکم ہوسکتا ہے کہ ترجمہ دیکھنا جائز نہیں۔

ترجمہ دیکھنے والوں کی غلطیاں

یہ لوگ ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ اگر کوئی ان کو سنے تو چونک اٹھے کہ اسلام میں یہ تعلیم ہے یہ کیسا دین ہے۔ اسی واسطے میں بقسم کہتا ہوں کہ اگر ہفتہ دو ہفتہ مجھ کو مہلت ملے تو واقعات کو دکھا کر آپ کے منہ سے کہلوا دوں کہ ترجمہ دیکھنا نہیں چاہئے اور یہ اس حالت میں کوئی دینداری کی بات نہیں کہ ترجمہ دیکھا کریں بلکہ یہ دین کو خراب کرنے والی بات ہے لیکن لوگوں کو ایسی جرات ہوئی ہے کہ ترجمہ کو بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اور ترجمہ سے عقائد وغیرہ کی تحقیقات کرتے ہیں پھر نصوص میں تحریف کرتے ہیں کوئی ربوا کو ربودن سے مشتق کر کے ربوا کی آیت کو لوٹ کی ممانعت پر محمول کرتا ہے کوئی علق کا ترجمہ جونک کر کے منی میں کیڑے ہونا قرآن سے ثابت کرتا ہے کوئی آیت تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ. (ان کو خیال کر رہا ہے کہ یہ جنبش نہ کریں گے حالانکہ وہ بادلوں کی طرح اڑتے اڑتے پھریں گے) سے زمین کا متحرک ہونا ثابت کرتا ہے۔ انجام اس کا یہ ہے کہ جب ان باتوں کو قرآن سے ثابت مان لیا گیا تو یہ سب جزو مذہب ہو گیا اور ان کے خلاف باطل اور کفر ہوا۔ تو کل کو اگر فلسفہ کی تحقیق بدلی جیسا کہ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے تو اس وقت نعوذ باللہ (ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں) ماننا پڑے گا کہ قرآنی تحقیقات بھی غلط ہیں کیا اس وقت کے لئے کوئی جواب سوچ رکھا ہے۔ یہ سب کاہے کی بدولت ہے ترجمہ کو کافی سمجھنے کی بدولت۔ اصل یہ ہے کہ دین کو لوگوں نے بہت سستا سمجھ لیا ہے اور اسی پر مشق ہوتی ہے جس کی بھی ہوتی ہے یاد رکھئے کہ ایسی جرات اسی چیز کے بارہ میں ہوا کرتی ہے جس کی کچھ وقعت نہ ہو کہ وہ چیز بنے سدھرے یا بگڑے بلکہ خود نفس شے کی بھی پروا نہیں رہی باقی جس چیز کی وقعت ہوتی ہے اس کے بارہ میں آدمی کبھی ایسی جرات نہیں کیا کرتا اس کے بارہ میں احتیاط سے کام لیا کرتا ہے۔ دیکھئے دین کے بارہ میں تو ترجمہ کو کافی سمجھا جاتا ہے لیکن علاج کے بارہ میں ترجمہ کو کافی نہیں سمجھا جاتا۔ ہم تو جب جانیں کہ کسی کی بی بی بیمار ہو اور وہ کسی طبی کتاب کا ترجمہ دیکھ کر اسکو مسہل دے دے اس وقت تو اس بات کی تلاش ہوتی ہے کہ شہر میں طبیب کون سا سب سے زیادہ قابل ہے اس کی طرف رجوع کرو اور اس سے کچھ حالات کہہ کر نسخہ لکھواؤ اور نسخہ کو اچھی طرح پڑھ لو اور سمجھ لو ایسا نہ ہو کہ عطار کوئی غلطی کرے اور مسہل بگڑ جائے اور بجائے نفع کے نقصان پہنچ جائے۔ سو محبت اور وقعت کے آثار یہ ہوتے ہیں کہ اس قدر احتیاط کی جاتی ہے حتیٰ کہ خود طبیب بھی اپنے گھر والوں کا علاج نہیں کرتے دوسرے طبیب سے مشورہ لیتے ہیں کیونکہ گھر والوں کے علاج کا اہتمام اتنا گھر کے طبیب اور اس کے علاج کی چنداں وقعت نہیں ہوتی۔ غرض وقعت اور

محبت جہاں ہوتی ہے وہاں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے چنانچہ بی بی کے علاج میں کبھی جرات نہیں کی جاتی بلکہ نوکر اور خدمت گار کے بھی علاج میں جرات نہیں کی جاتی اس کو بھی فہمائش کر دی جاتی ہے کہ کسی اناڑی کے ہاتھ میں نہ جا پھنسنا فلاں طبیب کے پاس جانا اور میرا رقعہ لے جانا وہ توجہ سے علاج کریں گے۔ اے اللہ کیا ہو گیا کہ دین کی وقعت اور محبت خدمت گار اور نوکر کے برابر بھی نہیں رہی دین کے بارہ میں یہ برتاؤ ہے کہ اپنی فہم پر اور ترجمہ پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔

دین کے بارے میں عدم احتیاط کی مثال

اور اگر کسی نے بڑی ہمت کی تو کسی طالب علم سے ترجمہ پڑھ لیا گو اس کی استعداد بھی کافی نہ ہو اب تو گویا رجسٹری ہو گئی صحت پر اور علاج کے بارہ میں یہ برتاؤ ہے کسی طبیب کے طالب علم سے کبھی نسخہ نہیں لکھواتے بلکہ کہتے ہیں علاج کا کام بڑا مشکل ہے اس میں بڑی باریکیاں ہیں ذرا سی بے عنوانی میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے بڑی لیاقت کی ضرورت ہے اور بہت تجربہ درکار ہے۔ حکیم معمر اور پرانا ہی قابل اعتماد ہوتا ہے کیوں صاحب کیا دین کا علم کچھ بھی مشکل نہیں اور اس علم میں کچھ باریکیاں نہیں اور اس میں کچھ تجربہ اور نشیب و فراز دیکھنے کی حاجت نہیں پھر اس میں کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ صاحب علم اور تجربہ کار ہو مشاق بھی ہو اس میں کیوں معمولی طالب علموں سے مشورہ کر لینے کو کافی سمجھا جاتا ہے دین کے بارہ میں تو اور زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے ہر عالم پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہئے اور ہر عالم کو فتویٰ دینے اور مقتدا بننے کا اہل نہ سمجھنا چاہئے۔

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ وارد سکندری داند
ہزار نکتہ باریک ترز مو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

صاحبو! یہ طریقہ بالکل غلط ہے کہ ترجمہ دیکھنے میں اپنے فہم پر اعتماد کیا جائے یا معمولی طالب علموں سے اس کو پڑھ لیا جائے اس طریقہ کو چھوڑیئے بلکہ اسلم یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ دیکھنا ہی چھوڑ دیجئے دین کی کتابیں اور بہت ہیں جو سہل ہیں اور عام طور سے سمجھنے ہی کے لئے لکھی گئی ہیں ان میں آپ کے کام کی باتیں ہیں ان کو پڑھئے اور اپنی اصلاح کیجئے ارکان اسلام کو درست کیجئے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ قرآن ہی پر پہنچ جایئے۔ قرآن کا اگر شوق ہے تو قاعدہ حاصل کیجئے۔ درسیات پڑھئے اور ان علوم کو حاصل کیجئے جو قرآن کے سمجھنے کے لئے موقوف علیہ ہیں پھر قرآن کو دیکھئے چشم ما روشن و دل ماشاد۔ ہم تو خدا سے چاہتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے پیدا ہوں اور کتابوں کے دیکھنے کے متعلق بھی میں کہتا ہوں کہ ہر ایک کتاب بھی دین کی نہ دیکھئے بلکہ مشورہ لیجئے کسی جاننے والے سے کہ فلاں کتاب ہم دیکھیں یا نہیں اگر وہ مشورہ دیں تو دیکھئے ورنہ نہیں اور اجازت کے بعد بھی میں کہتا

ہوں کہ علماء کی صحبت سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی اصلاح کے لئے صرف کتاب کا دیکھنا کافی ہو جاوے۔ کیونکہ کتاب میں عام اصول اصلاح کے لکھے ہوئے ہوں گے ان کو معلوم کر لینے کے بعد بھی ان کی تطبیق اپنے احوال پر ایک مستقل اور دشوار کام ہے یہ آپ نہیں کر سکتے اس کے لئے ضرورت ہے مشیر کی اور مشیر بھی تجربہ کار اور ماہر ہونا چاہئے اور ایسے مشیر علماء ہی ہیں تو علماء سے استغناء کسی حالت میں نہیں ہو سکتا اور ایک اور بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ دین میں ایک ایسی چیز بھی ہے کہ وہ ہے تو بہت ضروری لیکن کتاب میں نہیں مل سکتی۔ یہ بات بالکل نئی سی اور مستبعد معلوم ہوگی لیکن ہے بالکل سچی بات۔ لوگ علماء کے پاس رہے نہیں ہیں ورنہ اس کی تصدیق میں ذرا تامل نہ ہو۔ ابھی میں اس کو کسی قدر توضیح کے ساتھ بیان کروں گا وہ وہ چیز ہے۔

ذوق سلیم بلا صحبت کے حاصل نہیں ہوتا

جس کو ذوق سلیم اور مناسبت کہتے ہیں۔ یہ کتاب کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتی یہ صحبت سے اور پاس رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ ایسی ضروری چیز ہے کہ اسی سے انسان دین کا غیر دین سے امتیاز کر سکتا ہے اگر ایک ایسا شخص ہو جو لیاقت کتاب کی تو معمولی رکھتا ہو لیکن علماء کی صحبت پائی ہو جو مناسبت دین سے اس شخص کو ہوگی وہ اس شخص کو ہرگز نہیں ہوگی جس کی کتابی لیاقت تو بہت کچھ ہو لیکن صحبت علماء کی نہ پائی ہو یہ شخص حق و باطل میں کافی تمیز نہ کر سکے گا اور وہ باوجود کم لیاقت ہونے کے تمیز کرے گا مثال اس کی یہ ہے کہ ایک وہ شخص ہے جس نے طبی کتابیں خوب دیکھی ہیں لیکن کسی طبیب کے پاس بیٹھا نہیں نہ مطب کیا ہے اور ایک وہ ہے کہ کتابیں تو اس نے زیادہ نہیں دیکھیں لیکن طبیب کے پاس مدت تک بیٹھا ہے اور مریضوں کو دیکھا ہے اور بہت سے علاج اس کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں ان دونوں سے کسی مریض کے لئے نسخہ لکھوایئے اب دیکھیں گے کہ دونوں میں زمین آسمان کا بل ہوگا اس کتاب دیکھنے والے کا نسخہ بالکل بے جوڑ اور بے تکا ہوگا اور اس صحبت یافتہ کا نسخہ صحیح اور باقاعدہ ہوگا یہ علاج کرے گا اور وہ نہ کر سکے گا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ فن میں کوئی بات ایسی بھی ہوتی ہے جو کتاب میں نہیں ہوتی۔ مثال مذکور میں وہی بات تو ہے جو کتاب جاننے والے کو حاصل نہیں ہوئی اور طبیب کے پاس بیٹھنے والے کو حاصل ہوگئی۔ ہر فن کی یہی حالت ہے تو دین کو بھی ایسا ہی سمجھ لیجئے اب کوئی تعجب نہیں رہا ہوگا اس مقولہ میں کہ ایک چیز ایسی ہے کہ کتاب میں نہیں ہے اور وہ صحبت سے حاصل ہوتی ہے کسی نے خوب کہا ہے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید لیک حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

مٹی کی تصویر میں بھی محبوب کی صورت شکل خط و خال سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن وہ بات کہاں آ

سکتی ہے جو زندہ محبوب میں ہوتی ہے۔ علم کو سمجھئے کہ ایک محبوب ہے جو علماء کے پاس ہے دور بیٹھے دریافت کرنے سے اس کا نام اور حلیہ تو وہ بتا سکتے ہیں مگر اس کا ناز اور ایک وہ چیز جس کو لوچ کہتے ہیں وہ کسی طرح نہیں بتا سکتے اور اس بارہ میں ان کو کوئی بخیل بھی نہیں کہہ سکتا بلکہ وہ معذور ہیں وہ چیز ہی ایسی نہیں جس کو کوئی بیان کر سکے وہ تو ان کے پاس ہی رہ کر نظر میں آ سکتی ہے۔ جب تک علماء کے پاس نہیں رہو گے وہ چیز ہرگز حاصل نہ ہوگی۔ اور رہنا بھی وہ معتبر ہے جو اس طرح ہو کہ تم ان کے تابع ہو کر رہو بہت سے لوگوں کو یہ بھی شکایت ہوتی ہے کہ ہم علماء کی بھی صحبت میں رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں کہتا ہوں آپ رہے ضرور ان کے پاس لیکن بے قاعدہ رہے۔

بے قاعدہ کام سے نتیجہ حاصل نہیں ہوتا

کام کو بے قاعدہ کرنے سے نتیجہ نہیں حاصل ہوا کرتا۔ کوئی آٹا گوندھے لیکن بے قاعدہ مثلاً اس میں پانی بہت سا ڈال دے تو اس کی روٹی نہیں پکے گی یا پانی بہت کم ڈالے تب بھی نہیں پکے گی۔ روٹی جب ہی پکے گی جب آٹا قاعدہ کے موافق گوندھا جاوے ورنہ یہ آٹا بھی بے کار جاوے گا اور اتنی لاگت کا اور نقصان ہوگا۔ اسی طرح اگر علماء کے پاس رہنا ہوا مگر بے قاعدہ ہوا تو اس پر اگر نتیجہ مترتب نہ ہو تو کوئی شکایت کی جگہ نہیں قاعدہ کے موافق رہیے پھر دیکھئے نتیجہ کیسے مترتب نہیں ہوتا وہ قاعدہ یہ ہے کہ ان کو اپنے مذاق کا تابع نہ بنایئے بلکہ خود ان کے مذاق کے تابع بن کر رہئے۔

صحبت کی شرط

اب لوگ علماء کے پاس جاتے ہیں اور رہتے ہیں مگر اپنا مذاق بدلنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ علماء بھی ہمارا ہی مذاق اختیار کر لیں اور کسی بات میں روک ٹوک نہ کریں تو یہ علماء کے پاس رہنا نہیں بلکہ ان کو اپنے پاس رکھنا ہے اس کا اثر یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ ان سے کچھ حاصل کر سکیں بلکہ اس کا یہ اثر ہو سکتا ہے کہ وہ آپ سے کچھ جہل حاصل کر لیں سو ان کو جہل حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چند روز تقلید محض کر کے ان کے پاس رہئے اور ان کے اقوال و افعال میں کچھ جرح و قدح نہ کیجئے اور ان کا سا مذاق بنانے کی کوشش کیجئے تب دیکھئے گا کہ علم کا لوچ آپ کو حاصل ہوتا ہے یا نہیں میں بقسم کہتا ہوں کہ جس طرح اقلیدس کی شکلیں بلا تقلید کے اور بدوں اس کے ہر علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیا جاوے سمجھ میں نہیں آ سکتیں اسی طرح حقائق بلا تقلید محض اور بلا رائے کے فنا کر دینے کے منکشف نہیں ہو سکتیں۔ علم انکشاف حقائق ہی کا نام ہے۔

علم انکشاف حقیقت ہی کا نام ہے

سو یہ انکشاف محض حکایات اور روایات کے سننے سے حاصل نہیں ہوتا یہ ہی ہے وہ چیز جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم کو کوئی ایسی خاص چیز کی تعلیم کی گئی ہے جو اوروں کو تعلیم نہیں کی گئی تو یہ بالکل غلط ہے۔ الا فہما اوتیہ الرجل فی القرآن یعنی ہاں ایک چیز زیادہ ملی ہے یعنی فہم دین یعنی ہم کو فہم ایسا عطا ہوا ہے کہ ہم کو دین کے وہ حقائق منکشف ہوتے ہیں کہ اوروں کو نہیں ہوتے یہ اس زمانہ میں فرما رہے ہیں کہ اس وقت میں سب کے سب علماء ہی تھے کیونکہ علم کتابوں کی صورت میں نہ تھا سماع اور روایت پر تھا کاتب اور غیر کاتب سب روایت کے ذریعہ سے عالم تھے۔ ان علماء کے سامنے کہتے ہیں کہ ہم میں ایک فہم ہے کہ وہ اکثروں میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض روایات و حکایات میں علم منحصر نہیں ان کے سوا کچھ اور چیز بھی ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی وہ ایک خاص ملکہ و مہارت اور بصیرت ہے جس کو وہی محسوس کرتا ہے جسے حاصل ہے دوسرے کو وہ سمجھا بھی نہیں سکتا کہ وہ کیا چیز ہے جیسے کسی پرانے ماہر اور تجربہ کار طبیب کو نبض دکھایئے وہ نبض دیکھتے ہی بتلاتا ہے کہ چار مہینہ سے حرارت ہے اب اگر اس سے پوچھا کہ کیسے پہچانا اور یہ مدت حرارت کی کس قاعدہ سے معلوم کی تو اس کا جواب وہ کچھ نہیں دے سکتا اور نہ وہ اس شخص کو سمجھا سکتا ہے جس کو یہ ملکہ حاصل نہیں اگر کچھ بیان کرے گا تو اس میں اس قدر جرح قدح ہوں گی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا لیکن اس کا یہ کہنا ہوگا صحیح اور حرارت واقعی چار ہی مہینہ سے ہوگی تو اس کی تحقیق بے اصل نہیں ہے مگر وہ اصل بیان میں نہیں آتی۔ صاحب کمال کو ایک ذوق پیدا ہو جاتا ہے کہ اس سے وہ حق و باطل کو اس طرح شناخت کر لیتا ہے جیسے زبان نمک کو پہچان لیتی ہے اب اگر کوئی ایسا آدمی جس کی زبان میں حس نہ ہو اس سے الجھنے لگے کہ کیا ثبوت ہے کہ اس چیز میں ذائقہ نمکین ہے تو کسی طرح اس کو سمجھا نہیں سکتا سوا اس کے کہ اس کا علاج کرا دے جس سے اس کی زبان میں حس ذوق پیدا ہو جاوے پھر اس سے کہے کہ دیکھ میں صحیح کہتا تھا یا نہیں کہ یہ نمکین ہے اس وقت وہ شرح صدر کے ساتھ تصدیق کرے گا کہ واقعی تو ٹھیک کہتا تھا۔ غرض بعض باتیں زبانی بتانے سے سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ اور ذوق پیدا کرنے سے سمجھ میں آتی ہیں زبانی بتانے سے ان میں مناقشات پیدا ہوتے ہیں جن کا فیصلہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ وہی طبیب والی مثال یاد کیجئے کہ اس نے نبض دیکھ کر بتا دیا کہ چار مہینہ کی حرارت ہے وہ اگر کسی غیر ماہر کو سمجھانا چاہے تو یہی کہے گا کہ نبض کی سرعت سے پہچانا کہ ایسی حرارت ہے تو اس پر وہ جرح کر سکتا ہے کہ نبض میں سرعت تو دوڑ کر چلنے سے بھی پیدا ہو جاتی ہے اب اس کو یہ سمجھانا کہ اس سرعت میں اور اس سرعت میں فرق ہی بڑا

مشکل ہے۔ جو فرق بیان کیا جاوے گا اس میں اور سوالات پیدا ہوں گے اور بالآخر یہی کہنا پڑے گا کہ سیکھو اور مشق کرو مہارت پیدا کرو تب سمجھ میں آوے گا۔ غرض اس وقت اس غیر ماہر کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آئے گا کہ چار مہینہ کی حرارت کیسے پہچانی جاتی ہے اور اگر بلا ذوق پیدا کیے اور بلا مہارت اور مشق حاصل کیے یہ بھی بتکلف اس ماہر کی ریس کرنے لگے تو بہت دھوکے کھائے گا۔

نمدہ کھانے کا قصہ

اور وہی نمدہ والا قصہ ہو جائے گا کہ ایک طبیب تھے وہ کسی مریض کو دیکھنے گئے اور نبض دیکھی اور کہا اس نے سنترے کھائے ہیں آئندہ احتیاط رہے کہ سنترے نہ کھائے۔ صاحبزادہ بھی ہمراہ تھے انہوں نے گھر آ کر پوچھا کہ ابا جان آپ نے نبض سے کیسے پہچان لیا کہ اس نے سنترے کھائے ہیں۔ کہا بیٹا نبض سے کہیں یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں یک من علم را دہ من عقل باید بہت سی باتیں قرائن سے پہچانی جاتی ہیں۔ میں جب اس مکان میں گیا تو دیکھا کہ مریض کے چارپائی کے نیچے سنترہ کے چھلکے پڑے ہیں بس میں سمجھ گیا کہ اس نے سنترے کھائے ہیں اور یہ شکایت سنتروں ہی کے کھانے سے پیدا ہوئی ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے یہ بات پلہ باندھ لی کہ جو چیز مریض کے چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ طبیب صاحب مر مرا گئے۔ اب صاحبزادے کی عملداری ہوئی آدمیان گم شدند ملک خدا خر گرفت۔ (آدمی گم ہو گئے اور اللہ کا ملک گدھوں کے قبضہ میں آ گیا)

آدمی ناپید ہو گئے ملک خدا گدھوں نے لے لیا

اب یہ ایک مریض کو دیکھنے گئے۔ جاتے ہی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھ لیا۔ دیکھا کہ نمدے کے ٹکڑے پڑے ہیں بس آپ نے نبض پر ہاتھ رکھا اور حال بتانا شروع کیا کہ بخار ہے نبض میں ثقل ہے کوئی چیز نئی غیر معروف کھائی گئی ہے تیمارداروں نے کہا کوئی چیز نہیں کھائی گئی مریض بہت پرہیز کرنے والا ہے کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نبض صاف بتلا رہی ہے کہ کوئی نئی چیز کھائی ہے اور غور سے دیکھ کر میں اس کی تعیین بھی کر سکتا ہوں کہ وہ کیا ہے پھر نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نمدہ کھایا ہے۔ لوگوں نے کہا جناب نمدہ بھی کوئی کھاتا ہے کہا یہی تو مجھے بھی تعجب ہے کہ اس نے کیسے کھایا نمدہ تو کوئی کھانے کی چیز نہیں میں نے پہلے کہا تھا کہ کوئی نئی چیز کھائی ہے نبض میں ایک بالکل نئی کیفیت ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہی کیفیت ہے جو نمدہ کھانے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ لوگوں نے کہا سلام ہے آپ کی طبابت کو۔ تشریف لے جائیے آپ علاج بھی ایسا ہی کریں گے جیسی تشخیص کی۔ غیر ماہر کو بلا تحقیق ماہر کی ریس کرنے سے ایسے ہی دھوکے ہوتے ہیں۔ چند کلیات کو یاد کر لینے سے ہوتا کیا ہے۔

علم کا کمال محیط ہونے سے ہوتا ہے

علم کا کمال جب ہوتا ہے جب آدمی فن کا محیط ہو اور یہ بات بڑی مشق سے اور علماء کے پاس رہنے سے اور ملکہ تامہ اور ذوق صحیح پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ان علوم کی نسبت تو کیا کہا جائے جنہیں جزئیات کی پوری تدوین نہیں ہے صرف اصول اور کلیات ہی ہیں۔ فقہ کو دیکھئے جس میں جزئیات کی تدوین ہے اور اس میں سب کچھ لکھا ہے فقہ نام ہی اس علم کا ہے جس میں ادلہ شرعیہ سے احکام کو استنباط کر کے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس سے کس قدر سہولت ہوگئی اور کیسی دین کی حفاظت ہوگئی مگر باوجود اس سہولت ہو جانے کی خود فقہ میں بھی اس پر محیط ہونے کی ضرورت ہے وہی شخص فتویٰ دے سکتا ہے جو فقہ پر پورا حاوی ہو مگر اب تو یہ حالت ہے کہ فتویٰ پوچھنے والے مفتی کا ماہر ہونا تو کیا دیکھتے وہ تو یہ بھی نہیں دیکھتے کہ جس سے فتویٰ پوچھ رہے ہیں اس نے فقہی کتابیں بھی پڑھی ہیں یا نہیں بس اتنا سن لیا کہ یہ بھی مدرسہ میں رہتے ہیں بس ان سے فتویٰ پوچھنا شروع کر دیا۔ منشاء اس کا دین کی طرف سے لاپروائی ہے کہ جو الٹا سیدھا چاہا کر لیا۔ اور ضابطہ کی کارروائی کرنے کے لئے ایک پڑھے لکھے سے پوچھ بھی لیا۔ صاحبو کوئی علم ایسا نہیں جو بدون احاطہ آ جاوے۔ کسی فن کی دو چار باتیں جاننے سے کوئی اس فن کا عالم نہیں کہا جا سکتا اور اس فن کے بارہ میں اس کی تحقیق مستند نہیں کہی جا سکتی اور ایسے آدمی کی تحقیق پر عمل کرنا اس فن پر عمل نہیں کہا جا سکتا۔ دیکھئے اردو کی ایک کتاب طب کی دیکھ لینے سے آدمی طبیب نہیں کہلایا جا سکتا اور طب کے بارہ میں اس کی تحقیق مستند نہیں ہو سکتی اور اس کی تحقیق پر عمل کرنے سے علاج کرنے کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا جس شخص نے ایسے طبیب سے علاج کرایا ہو اور اس کو آرام نہ ہوا ہو اس کو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ اس نے علاج تو بہت کرالیا اب اس کی تقدیر ہے اس کو ہر شخص یہی کہے گا کہ میاں باقاعدہ علاج کراؤ کسی طبیب کے پاس جاؤ اپنی جان کے کیوں دشمن ہوئے ہو یہ بھی کوئی علاج ہے اسی طرح فقہ بھی ایک علم ہے اس کی ایک آدھ کتاب پڑھ لینے یا دیکھ لینے سے کوئی فقیہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا فتویٰ معتبر ہو سکتا ہے اور نہ اس سے فتویٰ پوچھ کر عمل کرنے سے کوئی مواخذہ سے بری ہو سکتا ہے۔ ایسا نام کا فقیہ ایسی ایسی فاش غلطیاں کرے گا کہ تحریم حلال اور تحلیل حرام کی نوبت آ دے گی۔

تفویض طلاق کا حکم

وجہ یہ ہے کہ بعض مسائل ذی اجزاء ہوتے ہیں اور ان اجزاء میں سے کوئی جزو کسی باب سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی کسی باب سے۔ اب اگر سب کو ایک جگہ لکھا جاوے تو کتاب کی ترتیب میں

فرق آتا ہے اور جو غرض ہے ترتیب سے یعنی مسئلہ کے نکالنے میں سہولت ہو وہ فوت ہوتی ہے اس واسطے وہ اجزاء الگ الگ بابوں میں لکھنے پڑتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کی نظر کل بابوں پر نہ ہو وہ اس مسئلہ کو صحیح طور پر کیسے حل کر سکتا ہے یہ ایسی بات ہے کہ جاہل تو جاہل اس میں کچے پکے مولویوں کو بھی دھوکہ لگ جاتا ہے اور اکثر دھوکہ کھانے کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ میں اس کی مثال میں ایک مسئلہ پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقہ میں کنایات طلاق کے باب میں لکھا ہے کہ لفظ اختاری بھی کنایات میں سے ہے اور کنایات کا حکم یہ ہے کہ اگر ان کے ساتھ نیت طلاق کی ہو تو طلاق بائن ہو جاتی ہے کنایات کے باب میں تو اتنا ہی مذکور ہے کہ اختاری بھی کنایات میں سے ہے تو حسب قاعدہ مذکورہ ظاہراً حکم اس کا یہ ہوگا کہ اگر اس لفظ کو خاوند نے بہ نیت طلاق کہا تو طلاق بائن ہو جائے گی لیکن اس میں ایک شرط بھی ہے جو باب التفویض میں مذکور ہے وہ یہ کہ صرف اختاری کہہ دینے سے طلاق نہ ہوگی بلکہ اس میں شرط یہ ہے کہ اس کے جواب میں عورت بھی یہ کہے کہ اخترت تب طلاق ہوگی اور یہ جزو باب تفویض الطلاق میں لکھا ہے مطلب یہ ہے کہ اختاری طلاق کا لفظ ہے مگر ایقاع کا نہیں بلکہ تفویض طلاق کا یعنی اگر تو چاہے تو طلاق لے لے تو اگر خاوند نے اس نیت سے کہا ہے اور اس کو منظور یہ ہے کہ عورت اگر چاہے تو طلاق لے سکتی ہے تب تو یہ تفویض طلاق ہو گی اور اگر عورت سے کچھ نہ کہا تو کچھ بھی نہیں۔ اب دیکھئے کہ جس کی نظر تمام ابواب پر نہ ہو اور صرف باب کنایات ہی دیکھا ہو اس سے جب یہ مسئلہ پوچھا جاوے گا کہ کسی نے اپنی عورت سے اختاری بہ نیت طلاق کہہ دیا ہے تو فوراً کہہ دے گا کہ طلاق بائن ہوگئی اب نتیجہ کیا ہوگا کہ عدت گزرنے کے بعد یہی مفتی صاحب اس عورت کو دوسرے کے لئے حلال کریں گے کیونکہ اب اس میں کیا شبہ ہے جب طلاق ہوگئی اور عدت بھی گزر گئی تو نکاح جس سے چاہے کر سکتی ہے حالانکہ نفس الامر میں حکم یہ ہے کہ اگر خاوند نے یہ لفظ تفویض طلاق کے لئے کہا ہے اور عورت نے اس کے بعد اخترت نفسی نہیں کہا تو اس سے کچھ بھی نہیں ہوا نہ طلاق ہوئی نہ خاوند کے نکاح سے خارج ہوئی نہ دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے اور ان مفتی صاحب نے اس کو دوسرے کے لئے حلال کر دیا تو یہ حرام کو حلال کرنا ہوا اور پہلے خاوند کے نکاح سے باہر کریں گے اور اس عورت کو اس پر حرام کہیں گے یہ تحریم حلال ہوئی ذرا سے لفظ اختاری کے حکم میں فقہ پر پورا عبور نہ ہونے کی وجہ سے ایسی غلطی ہوئی۔ ایسی نظیریں بکثرت ہیں بعض بعض مسائل کو کئی کئی باب میں دیکھنا پڑتا ہے کوئی جزو کہیں ملتا ہے اور کوئی جزو کہیں ایک مسئلہ اٹھارہ سال سے عدالت میں پیش تھا اور طے نہیں ہوتا تھا منصف صاحب حیران ہو گئے تھے بالآخر منصف صاحب نے اس کو دیوبند بھیجا۔ مولانا استادنا نے اس کو میرے سپرد کیا مجھے بہت ابواب میں دیکھنا پڑا۔ تب اس کا جواب لکھا گیا۔ جب جواب عدالت

میں پہنچا تو ایک دن میں منصف نے فیصلہ کر دیا اور پہلے وہی منصف پریشان ہو گیا تھا اور کوئی فیصلہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آج کل وکلاء بھی ہدایہ کا امتحان دیتے ہیں۔ ہدایہ کا تو کیا دیتے ہدایہ کے ترجمہ کا امتحان دیتے ہیں۔ آج کل ہر علم و فن کے ترجمے ہو گئے ہیں منجملہ ان کے فقہ بھی ہے ہدایہ کا بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔ مگر ترجمہ کی خوبی سنئے میں پھر مکرر کہتا ہوں کہ ترجموں سے کام نہیں چل سکتا کام اگر چلتا ہے تو علماء کی جوتیاں سیدھی کرنے سے چلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھئے کہ میری جوتیاں سیدھی کرنے سے میں تو عالم نہیں ہوں مگر علماء موجود ہیں۔ اب ترجمہ کی خوبی کا ایک واقعہ سنئے۔ ایک شخص نے اپنی بی بی کو تین طلاق دیدی اس کا حکم مشہور ہے کہ طلاق مغلظہ ہو جاتی ہے اور اب کوئی صورت رجوع کی یا دوبارہ نکاح کی باقی نہیں رہتی سوائے اس کے کہ حلالہ کیا جاوے جس کو کوئی گوارا نہیں کرتا لیکن اس عورت کے گھر والے سر تھے کہ ہم تو اس کو اسی شوہر کی بی بی بناویں گے۔ میں اس بات کو مکرر کر کے بیان کر چکا ہوں کہ یہ نہایت غلط طریقہ ہے کہ ایک بات دل میں جما کر پھر اس کو دین میں تلاش کیا جائے اور دلیلوں کو اس پر منطبق کر لیا جاوے۔ اس صورت میں دلیل الٹی سیدھی مل ہی جاتی ہے لیکن یہ اتباع دین کا نہیں ہوتا بلکہ اتباع اپنی رائے اور خواہش کا ہوتا ہے ہاں الزام سے بچنے کے لئے دین سے بھی اس کی تائید لے لی جاتی ہے۔ دین کا اتباع تو اس کا نام ہے کہ اپنی رائے اور خواہش کو قطعاً الگ کر کے دین کے پیچھے ہو لے چاہے وہ اپنی رائے کے خلاف ہو یا موافق یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی رائے کے موافق ہی آن پڑے۔ غرض انہوں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس عورت کو اسی شوہر کی بیوی بناویں گے میرے پاس مسئلہ پوچھنے آئے میں نے کہا اب وہ بالکل حرام ہے کوئی صورت باقی نہیں (سوائے حلالہ کے) جب وہ مولویوں سے مایوس ہوئے تو خود کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ جوئندہ یابندہ (جو تلاش کرتا ہے اسے مل جاتا ہے) مسئلہ مل گیا ان کی خواہش کے موافق ایک کتاب مل گئی وہ ترجمہ ہے کسی کتاب کا ایک مسٹر کا کیا ہوا سنئے گا تو معلوم ہو گا کہ اس میں کیا گت بنی مسئلہ کی۔

اندھے کی کھیر کا لطیفہ

اندھے کی کھیر والا قصہ ہو گیا کہ ایک مادر زاد نابینا تھے لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے ایک دن ایک لڑکے نے کہا حافظ جی آج ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہے کہا کیا کھلاؤ گے کہا کھیر کہا کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید کہنے لگے سفید کس کو کہتے ہیں کہا جیسے بگلا پوچھا بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہاتھ کھڑا کر کے اور پونچے کو جھکا کر اس کی شکل بنا کر بتایا کہ بگلا ایسا ہوتا ہے حافظ جی نے ٹٹولا تو ہاتھ کھڑا ہوا اور ٹیڑھا معلوم ہوا کہا میں دعوت قبول نہیں کرتا۔ ٹیڑھی کھیر کیسے کھاؤں گا۔ یہ حلق میں کیسے اترے گی۔ دیکھئے

کھیر کی شرح کی گئی سفیدی اور سفیدی کی بگلے سے اور بگلے کی ٹیڑھے ہاتھ سے تو نوبت کہاں تک پہنچ گئی کہ حافظ جی کھیر سے ڈر گئے کہ ایسی ٹیڑھی کھیر کیسے کھائی جائے گی۔ کیا گت بنی کھیر کی۔ یہی گت بنی ہے دین کی آج کل کے ترجموں سے۔ غرض وہ حضرت وہ ترجمہ لے کر میرے پاس آئے۔

مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی

کہ اس میں ایک فصل اس بیان میں تھی کہ فلاں فلاں شخص کی طلاق نہیں پڑتی منجملہ ان کے اس میں لکھا تھا کہ متعجب کی طلاق نہیں پڑتی پھر اس شخص کو جس نے طلاق دی تھی تعجب بنانے کے لئے ایک واقعہ بیان کیا کہ طلاق کی بناء یہ ہوئی ہے کہ میاں کی بی بی اور ماں میں کسی بات پر جھگڑا ہوا ماں نے میاں سے شکایت کی اس کو بی بی کی اس خلاف توقع حرکت پر تعجب ہوا اور تعجب کی حالت میں طلاق دیدی تو تعجب کی حالت میں طلاق دی گئی اور کتاب کھول کر دکھائی کہ بحالت تعجب طلاق واقع نہیں ہوتی میں نے کہا یہ مسئلہ بالکل غلط لکھا ہے اور لطف یہ کہ حوالہ بھی فقہ کی کتابوں کا دیا ہوا ہے۔ پھر میں نے غور کیا تو سمجھ میں آیا کہ حوالہ تو صحیح ہے مگر ترجمہ میں غلطی ہوئی۔ ساری خرابی ترجمہ کی ہے۔ اصل مسئلہ کتاب میں یہ ہے کہ مدہوش کی طلاق نہیں پڑتی۔ مدہوش اس متحیر کو کہتے ہیں جس کو اتنا ہوش نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مثلاً سرسام میں بے ہوش ہو یا نیند میں ہو اور ہوش حواس ایسے خراب ہو گئے ہوں کہ مطلق تمیز نہ ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں مترجم نے مدہوش کا ترجمہ کہیں متحیر دیکھا اور متحیر کا ترجمہ متعجب سے کر دیا اس سے مسئلہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہ بالکل اسی کی نظیر ہوئی یا نہیں کہ کھیر کی شرح کی گئی سفیدی اور سفیدی کی بگلے سے اور بگلے کی ٹیڑھے ہاتھ سے نتیجہ یہ ہوا کہ کھیر ٹیڑھی ہو گئی۔ یہ ان ترجموں کی حالت ہے جو بڑی لیاقت والوں کے کئے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کے ترجموں کا تو کیا پوچھنا ہے جو اتنی لیاقت بھی نہیں رکھتے اب فرمایئے کہ جو لوگ بطور خود کتاب بینی کا شوق رکھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں یا نہیں وہ تو ایسے ہی فتوے دیں گے کہ تین طلاق کے بعد بھی عورت حلال ہے یہ دین ہوا یا بے دینی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ تحلیل حرام کی نوبت آ گئی اس طرح تو جس چیز کو چاہو حرام کر لو۔ یہ دین ہوا یا لونڈوں کا کھیل۔ معلوم ہو گیا کہ ترجموں کے دیکھنے سے دین کی اصلاح نہیں ہوتی اس تقریر سے یہ استبعاد رفع ہو گیا ہو گا کہ دین کی کتابیں اردو کی دیکھنا اور قرآن کا ترجمہ دیکھنا بعض حالت میں اور بعض شخص کے لئے منع اور حرام بھی ہو سکتا ہے جیسے میں نے ان سے کہا تھا جنہوں نے لفظ راعنا کے متعلق سوال کیا تھا کہ آپ کو ترجمہ قرآن کا دیکھنا منع اور حرام ہے۔ یہ بہت موٹی بات ہے اس کو میں نے شرح وبسط کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کر دیا قرآن کتاب اللہ بیشک ہے اور ہدایت ہی

کے لئے اترا ہے مگر کیا وہ ایسا سہل ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے کسی لیاقت کی ضرورت نہیں خود انسانوں کی بنائی ہوئی کتابیں تو ایسی سہل ہیں نہیں مثلاً طب یا ڈاکٹری کی کتابیں کہ کوئی ان کو بطور خود دیکھ کر کام نکال لے پھر کتاب اللہ ایسی سہل کیسے ہو جائے گی اس واسطے منع کیا جاتا ہے اس کے دیکھنے سے۔ ہاں اگر ایسا ہی شوق ہے کتاب اللہ کا تو اس کو کسی محقق متورع مولوی سے پڑھے اس صورت میں غلطی نہ ہوگی اور جو غرض ہے اس سے یعنی ہدایت وہ حاصل ہوگی اس کو کوئی منع نہیں کرتا اور بلا اس طریق کے کتاب اللہ کو دیکھنے سے اس کے صحیح معانی کی طرف رسائی نہیں ہو سکتی جب صحیح معانی کی طرف رسائی نہ ہوئی تو اس کا اتباع کتاب اللہ کا اتباع کیسے ہوگا اور ہدایت موقوف ہے اس کے اتباع پر بلکہ اس صورت میں اتباع اپنی رائے کا ہوگا اور وہ موجب ہے ضلالت کا غرض یہ بے قاعدہ دیکھنا کتاب اللہ کا موجب ہوگا ضلالت کا۔

رضائے الٰہی کا طریق وحی سے معلوم ہوتا ہے

خلاصہ یہ کہ بدون شہادت کے نہ کسی کتاب کے دیکھنے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے نہ رائے پر نہ قیاس پر۔ اعتماد صرف وحی پر کیا جاتا ہے وہ بھی جبکہ وحی کو اصول صحیحہ سے سمجھے۔ میں شروع سے یہی کہہ رہا تھا کہ بدون وحی کے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کس سے راضی ہیں اور کس سے ناراض بعنوان دیگر ایسی حالت بلا تعلیم وحی کے نہیں بنائی جا سکتی جس سے خدا راضی ہو اور ایسی حالت بنانے کا حکم ہے پس وحی کا اتباع لازم ہوا پھر اس میں لوگ جو طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض غلطیوں کو بیان کر دیا مثلاً اصلاح کا طریقہ یہ اختیار کرنا کہ احکام کے حسن کو عقل سے ثابت کرنا بایں معنی کہ عقل کو مقدم رکھا جائے نقل پر۔ یا ترجموں کے دیکھنے کو اصلاح حالت کے لئے کافی سمجھنا یہ طریقے غلط ہیں صحیح طریقہ یہی ہے کہ جس کے راضی کرنے کی ضرورت ہے اسی سے اس کی رضا کے طریقے بھی معلوم کئے جائیں اور اس کا ذریعہ دلائل صحیحہ سے وحی ہے تو ضرورت ہوئی تمسک بالوحی کی پھر اس سے تمسک کرنا موقوف ہے خاص اصول پر اس لئے ان اصول پر وحی کا اتباع ضروری ٹھہرا۔ یہ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ جب امر فرمایا اصلاح حالت کا تو اس کے طریقے بھی خود ہی بیان فرما دیئے کہ وہ کون سے اوصاف ہیں جن کے اختیار کرنے سے کہا جائے کہ حالت درست ہوگئی۔ ان اوصاف کا بیان اس آیت میں ہے جس کو اس وقت بیان کے لئے اختیار کیا گیا۔ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْہَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ط وَاُولٰٓئِکَ مِنَ

الصّٰلِحِیْنَ (اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں نیک کاموں کو بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی صالحین لوگ ہیں۔)

وعظ کے نام کا تناسب

اور اتفاقی تناسب اس میں اور اس کے قبل کے وعظ میں یہ ہوگا کہ اس سے قبل (پرسوں شب پنجشنبہ میں) جو ایک بیان مستورات کے لئے ہوا تھا اس میں بھی صالح بننے کا طریقہ مذکور ہوا تھا اور آج کے بیان میں بھی اسی کا طریقہ بیان کیا جائے گا۔ فرق اتنا ہے کہ پرسوں کے بیان میں مستورات کے لئے صالحہ بننے کے طریقہ کا بیان تھا اور آج کے بیان میں مردوں کے لئے اسی طریقہ کا بیان ہوگا پرسوں کی آیت عورتوں کے متعلق تھی اور آج کی آیت میں مردوں کے متعلق ہے گو دونوں وعظوں کے مضامین میں ایک صنف کے ساتھ دوسری صنف بھی شریک ہے جیسا کہ مضامین کے استحضار سے واضح ہو سکتا ہے اس وعظ کا نام الصالحات رکھا گیا تھا آج کے وعظ کا نام الصالحون ہو تو مناسب ہے۔ دوسرا تناسب دونوں بیانوں میں ہے یہ کہ مستورات کی آیت وعنوان میں تخصیص تھی مگر حکم میں تعمیم تھی یعنی اس میں وہ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو مردوں کے لئے بھی ضروری ہیں اور عورتوں کے لئے بھی جیسا کہ میں نے اس روز ثابت کر دیا تھا لیکن بعض ضرورتوں سے الفاظ میں مستورات کی خصوصیت کر دی گئی تھی۔ ان ضرورتوں کو بھی میں نے اس روز بیان کر دیا تھا حاصل یہ کہ لفظاً مذکور اس آیت میں مستورات ہی ہیں مگر حکم میں تعمیم ہے مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے۔ اسی طرح آج کی آیت میں بھی تعمیم ہے حکم میں تو دلیل سے اور عنوان میں بنا بر عادۃ قرآنیہ لفظی دلالت سے بھی پس وہاں تو تعمیم کی تفہیم میں کچھ غموض بھی تھا جس کی وجہ سے کچھ مقدمات ممہد کر کے تعمیم کو ثابت کیا گیا تھا اور یہاں تعمیم میں غموض بھی نہیں سوائے اس کے کہ الفاظ بصیغہ مذکر آئے ہیں سو یہ بات تعمیم فی الدلالۃ کو بالکل مانع نہیں کیونکہ قرآن کا طرز یہی ہے کہ خطاب تمام احکام کا بصیغہ مذکر کیا جاتا ہے مگر اس میں شمول عورتوں کا بھی ہوتا ہے۔ اس کا کوئی قائل نہیں کہ جہاں مردوں کو خطاب ہوتا ہے اس سے عورتیں علیحدہ ہوتی ہیں تو خطاب بصیغہ مذکر ہونا تعمیم فی الدلالۃ کو اصلاً مانع نہیں۔ حاصل یہ کہ اس آیت کی تعمیم فی الدلالۃ میں بھی غموض نہیں اور اس تعمیم کو ایک خاص دلیل سے اور قوت ہوتی ہے وہ اس طرح کہ جب اس آیت کا مضمون جس میں صالحات کا لفظ صاف موجود تھا باوجود تصریح اناث کے مشترک تھا تو یہ مضمون جس میں کوئی قرینہ مردوں کی تخصیص کا بھی نہیں کیوں مشترک نہ ہوگا کیونکہ عرف زبان کا یہی ہے کہ کوئی حکم بیان کرتے وقت

تذکیر ہی کے الفاظ لایا کرتے ہیں مگر وہ حکم مشترک ہوتا ہے مردوں اور عورتوں دونوں میں مثلاً طب کے مسائل لکھنے میں جہاں ملیں گے الفاظ مذکر ہی ملیں گے اور حکم عام ہوگا دونوں صنفوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہر جگہ تصریح کی جاوے کہ یہ حکم مرد وعورت دونوں کے لئے ہے بلکہ عام اصطلاح یہی ہے کہ الفاظ مذکر ہی کے لائے جاتے ہیں اور تاوقتیکہ تصریح نہ کی جاوے کہ یہ حکم مردوں ہی کے لئے ہے اس وقت تک عورتیں بھی اس میں داخل رہتی ہیں جب عام عرف یہ ہے اس لئے اس آیت میں بجز تعمیم کے دوسری طرف ذہن جا ہی نہیں سکتا خصوصاً اس صورت میں کہ آیت سابقہ میں باوجود الفاظ تانیث موجود ہونے کے بھی تعمیم تھی۔ غرض وہ بیان بھی مشترک تھا مردوں اور عورتوں کے لئے اور آج کا بیان بھی مشترک ہے دونوں کے لئے یہ دوسرا تناسب ہوا دونوں بیانوں میں یہ مصلحت اور وجہ نکل آئی اس آیت کے اختیار کرنے کے لئے یہ عجیب اتفاقی تناسب پیدا ہوا ہے کہ عورتیں مضمون رجال میں شریک اور رجال مضمون عورتوں میں شریک یہ تمہید ہوئی۔

تفسیر آیت متلوہ

اب آیت کا مضمون سنئے فرماتے ہیں یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں نیک کاموں کو بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں یہی لوگ صالحین سے ہیں) اس کے کچھ اوپر سے کمالات امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بیان فرمائے ہیں کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کام بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو) کو مومنین کے اوصاف کمال بہت ہیں مگر اس آیت میں بیان ان اوصاف کا کیا گیا ہے جو امہات الاوصاف ہیں وہ یہ ہیں۔ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو) آگے اس امت کے مخالفین اہل کتاب کی مذمت کا بیان ہوا ہے لیکن عادت الٰہیہ یہ ہے کہ مخالفین کی مذمت کے ساتھ مومنین کے استثناء کو بھی ذکر فرما دیتے ہیں یعنی کسی قوم کے لئے کوئی حکم ایسا نہیں فرما دیتے کہ سب اچھوں اور بروں کو عام ہو بلکہ ان میں سے جو برے ہیں ان کے لئے برائی کا حکم فرماتے ہیں اور جو اچھے ہیں ان کے لئے اچھائی کا حکم فرماتے ہیں۔ ہماری طرح نہیں کہ جس قوم سے خفا ہوئے تو ایک عام حکم لگا دیا کہ وہ

ساری قوم ایسی ہے کسی شخص کو اس میں سے مستثنیٰ نہیں کرتے اور اگر کسی شخص سے خفا ہوئے تو اس کی ہر بات پر برائی کا حکم لگا دیا گویا وہ سرتاپا عیب ہی عیب ہو گیا کوئی ادا اس کی پسند نہیں رہی۔ اور اگر کسی کو کسی خطا کی معافی بھی دے دیں تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ کدورت باقی رہتی ہے ایسا دل صاف نہیں ہوتا جیسا اس خطا سے پہلے تھا اور وہاں یہ شان ہے کہ چاہے کتنی ہی خطائیں کرو اور ایک دفعہ دل سے توبہ کرلو بس راضی ہو جاتے ہیں بلا کسی ناخوشی کے اور ان خطاؤں کو ایسا محو کر دیتے ہیں کہ گویا اس نے کوئی خطا کی ہی نہ تھی اور کسی کو ایک خطا کی وجہ سے ہمہ عیب نہیں کر دیتے اور کسی خاص فرد کی خطا سے ساری قوم پر الزام نہیں لگا دیتے دیکھئے اہل کتاب کے بعض آحاد کی مذمت بیان فرمائی لیکن ان آحاد کی وجہ سے تمام قوم کو مذموم نہیں کر دیا بلکہ جو برے ہیں ان کی مذمت فرمائی اور جو اچھے ہیں ان کی مدح فرمائی۔ یہ شان استغناء ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات غنی ہے کسی کی اچھائی اور برائی سے اس پر اثر نہیں پڑتا جو کوئی اچھا یا برا کرتا ہے وہ اپنا نفع یا نقصان کرتا ہے ذات حق کو کوئی تکلیف یا مضرت نہیں پہنچتی اور ہم غنی نہیں ہیں کسی کے برا کرنے سے ہم کو تکلیف یا مضرت پہنچ سکتی ہے اور اس پر ہم کو غیظ آتا ہے پھر وہ غیظ بعض وقت ایسا عام ہو جاتا ہے کہ حدود کے اندر نہیں رہتا اور معافی مانگنے سے بھی بالکلیہ رفع نہیں ہوتا یا ایک خطا کرنے سے اسی خطا تک وہ غیظ نہیں رہتا بلکہ اس کے جوش میں اس خطا وار کے تمام افعال برے نظر آنے لگتے ہیں یا ایک شخص خاص کی برائی پر وہ غیظ ایسا عام ہو جاتا ہے کہ تمام قوم بری نظر آنے لگتی ہے اور وہاں یہ بات نہیں چونکہ وہاں استغناء ہے لہذا کتنی ہی برائی کی جائے وہاں کوئی اثر نہیں پہنچتا پھر ہمارا سا غیظ آوے تو کیوں آوے وہاں تو استغناء مطلق ہے اگر کسی گنہگار پر باستثناء کافر و مشرک بلا معافی مانگے اور بلا توبہ کے بھی رحمت کر دیں تو ممکن ہے۔

لفظ استغناء کا بے موقع استعمال

استغناء کے لفظ پر ایک واقعہ یاد آیا جو اکثر واقع ہوتا ہے وہ یہ کہ مثلاً کوئی آدمی جوان مر گیا اس کے مکان پر تعزیت کے لئے لوگ جمع ہوئے اول سب نے ہمدردی کی کہ بھائی بہت سخت واقعہ ہوا لیکن انسان کے لئے سوائے صبر کے اور کیا چارہ ہے۔ غرض اسی قسم کے الفاظ جو عرفاً کہے جاتے ہیں ادا کئے۔ اس کے بعد ایک صاحب نے اس میت کے فقدان سے اس کے اہل و عیال پر جو مصیبت نازل ہوئی اس کا ذکر کیا اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر یہ پانچ برس اور زندہ رہتا تو سب بچے بھی پرورش ہو جاتے اب بیچارے بے سہارے رہ گئے۔ اس کے بعد ایک صاحب نے بطور اس کی علت کے فرمایا کہ خدا کی ذات بے پروا ہے۔

وہ جو چاہیں کریں۔آج کل یہ لفظ ایسے ہی موقعوں پر اکثر استعمال کیا جاتا ہے کہ خدا کی ذات مستغنی یا بڑی بے پرواہ ہے اور لوگ اس کو کچھ برا نہیں سمجھتے بلکہ اس کو خدا تعالیٰ کی عظمت کا لفظ سمجھتے ہیں۔صاحبو یہ ایسا سخت اور بے ہودہ لفظ ہے کہ اس کی حقیقت سننے کے بعد آپ کانپ اٹھیں گے۔یہ مانا کہ غنی خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور یہ بچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات مستغنی اور بے پرواہ ہے لیکن یہ الفاظ ان موقعوں پر جن معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ معنی غنا کے ہرگز نہیں ہیں اور وہ استغنا خدا تعالیٰ کے لئے ثابت نہیں کیونکہ آج کل اس کا استعمال ایسے موقع پر کیا جاتا ہے جو نہایت دردناک اور مصائب کا مجموعہ اور سطحی نظر میں مصالح کے منافی ہو مثلاً کسی جوان کی موت ہوئی اور بہت سے بچے پیچھے رہ گئے جن کا اب کوئی والی وخبر گیر نہیں۔ان کی حالت دیکھ کر دل پگھلتا ہے اور رونا آتا ہے اس وقت بطور تعجب کہتے ہیں خدا کی ذات بڑی بے پرواہ ہے جس کا مطلب بطور لزوم کے یہ ہوتا ہے کہ وہاں کوئی قاعدہ نہیں جو چاہا کر دیا۔صاحبو یہ بات دو وجہ سے ہو سکتی ہے یا تو یہ کہ وہاں رحم نہیں یا یہ کہ کوئی انتظام نہیں جو ہو گیا سو ہو گیا کیا یہ دونوں باتیں غلط نہیں۔خود انہیں لوگوں سے پوچھئے جو ایسے الفاظ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ رحیم ہیں یا نہیں جواب یہی ملے گا کہ ہیں تو یہ شق تو گئی گزری ہوئی کہ ایسے واقعات اس وجہ سے ہوتے ہوں کہ حق تعالیٰ کو رحم نہیں۔اب وہ دوسری شق رہ گئی کہ شاید وہاں کوئی انتظام نہیں سو یہ شق بھی باطل ہے اس واسطے کہ ایسا ہونا جب ہی ممکن ہے جبکہ وہاں علم وقدرت وحکمت نہ ہو اور یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت حق کو علم بھی ہر چیز کا ہے اور قدرت بھی ہر قسم کی ہے اور حکیم بھی بڑے ہیں خود وہ لوگ بھی اس کے خلاف نہیں کہہ سکتے جو ایسے کلمات بے دھڑک کہہ بیٹھتے ہیں۔جب یہ صورت ہے تو بدنظمی کیسی۔غرض نہ تو ایسے واقعات بے رحمی کی وجہ سے ہو سکتے ہیں نہ بدنظمی کی وجہ سے تو اب اس لفظ کے کیا معنی ہوئے کہ خدا کی ذات بڑی مستغنی ہے۔سوا اس کے کہ اس لفظ سے گویا شکایت واعتراض کا اظہار کیا جاتا ہے جو حق تعالیٰ کے افعال کے متعلق اپنے دل میں ہے اور یہ اسی کا مصداق ہوا کہ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (کیا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کہتے ہو جس کا تم کو علم نہیں) اب فرمائیے یہ لفظ بے ہودہ ہے یا نہیں اور یہ بے ادبی ہے یا نہیں۔اس کو لوگ بلا سوچے سمجھے کہہ بیٹھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک اچھی بات حق تعالیٰ کی طرف منسوب کی کیونکہ غنی خدا تعالیٰ کی صفت ہے سو یہ لفظ صورۃ اچھا اور صحیح ہے لیکن درحقیقت یہ کلمتہ حق ارید بہ الباطل کا مصداق ہے۔غنی صفت خدائے تعالیٰ کی بیشک ہے لیکن اس کے معنی وہ نہیں ہیں جس میں یہ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں یہ تو شکایت کو اس مہذب لفظ سے ظاہر کرتے ہیں سچ یہ ہے کہ بددل دین

کے ہگنا موتنا چلنا پھرنا بولنا چالنا کچھ بھی نہیں آتا۔شریعت ہی ہم کو ایسی چیز دی گئی ہے کہ جس میں ہر بات کی ایسی تعلیم موجود ہے کہ تمام دنیا کے عقلاء مل کر ایسی تعلیم نہیں تجویز کر سکتے مگر کیا کیا جائے دین کا سیکھنا ہی لوگوں نے چھوڑ دیا۔حتیٰ کہ یہ خیال دل میں جم گیا ہے کہ دنیا کی باتوں اور معمولی کاموں سے شریعت کو کیا علاقہ یہ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم اپنی عقل اور تجربہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔بہت سے تعلیم یافتہ یہ کہتے ہیں کہ دنیا کے کاموں میں فتوے لگانا مولویوں کی ایجاد ہے۔ شریعت میں کہیں یہ فتویٰ نہیں۔شریعت نے صرف مذہبی تعلیم دی ہے اور آخرت کے کاموں کو بیان کیا ہے اور دنیا کے کاموں میں ہم کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جیسا موقع دیکھو ویسا کرلو۔صاحبو میں کیا کہوں تفصیل کا موقع نہیں ورنہ دکھلا دیتا کہ شریعت نے ہم کو ہر بات کا ایک قانون بتایا ہے اور آپ کے ذہن میں جو خیال بیٹھ گیا ہے اس کی وجہ دین سے ناواقفیت اور جہل ہے ورنہ ذرا سی بھی واقفیت ہونے کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ دین میں دنیا کی باتوں کی تعلیم نہیں۔دیکھئے دنیا کی باتوں میں سے معاملات ہیں معاشرات ہیں حقوق ہیں کیا ان کا بیان شریعت کی کتابوں میں نہیں ہے کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے عقائد اور عبادات کے جزو سے زیادہ جزو غالباً انہیں کا ملے گا۔

تعلیم معاشرت

پھر یہ کہنا زبردستی نہیں تو اور کیا ہے کہ شریعت میں صرف دیانات کی تعلیم ہے دیکھئے معاشرت کے متعلق یہ تعلیم موجود ہے۔**احبب حبیبک ھوناً ما عسی ان یکون بغیضک یوماً ماوا بغض بغیضک ھوناً ما عسی ان یکون حبیبک یوماما** (سنن الترمذی:۱۹۹۷)
یعنی کسی سے دوستی کرو تو اوسط درجہ کی کرو کیونکہ ممکن ہے کہ اس سے کبھی مخالفت ہو جائے اور کسی سے دشمنی کرو تو اوسط درجہ کی کرو ممکن ہے کہ اس سے کبھی دوستی ہو جائے۔سبحان اللہ کیا تعلیم ہے جس کی خوبی بیان کرنے کی حاجت نہیں۔یہ تو اپنی جماعت کے ساتھ تعلق رکھنے کے متعلق تعلیم ہے اور دیگر اقوام کے ساتھ تعلق رکھنے کے متعلق سنئے **ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لاتعدلوا**.
یعنی کسی قوم کی عداوت اس کا سبب نہ ہو جائے کہ تم عدل یعنی حدود شرعیہ کو چھوڑ دو۔اس سے معلوم ہوا کہ ان معاشرات کے لئے بھی حدود ہیں پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شریعت نے ہم کو بعض کاموں میں آزاد چھوڑ دیا ہے یہ دونوں تعلیمیں اس چیز کے متعلق ہیں جس میں آج کل لوگوں کو بڑا دعویٰ ہے اور جس کو کہا جاتا ہے کہ اس میں آج کل بڑی اصلاح ہو گئی ہے اور بہت بڑی ترقی ہو گئی ہے جس کا نام تمدن ہے جس کے متعلق بہت لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کی تعلیم شریعت میں نہیں ہے اور جس کے متعلق خیال ہے کہ ہماری عقل اس کی اصلاح کے لئے کافی ہے۔دیکھئے شریعت میں اس

کے متعلق کیسی تعلیم موجود ہے اب یہ خیال کہاں تک صحیح ہے کہ شریعت میں بعض تعلیمیں نہیں ہیں۔ شریعت میں ہر ضروری چیز کی تعلیم موجود ہے۔شریعت نے ہر ضروری بات کی تعلیم دی ہے۔محبت کا طریقہ بھی بتلایا اور عداوت کا طریقہ بھی۔اس کے لئے بھی کچھ حدود قائم کیے اور اس کے لئے بھی۔ غرض ہر چیز کے حدود قائم کیے ہیں یہ دو نظیریں ایسی بتلائی گئی ہیں جن کے متعلق ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے لئے کچھ حدود ہونے چاہئیں اور یہ دونوں علی الاطلاق محمود نہیں اور اگر غور سے دیکھئے تو شریعت میں ان کاموں کے بھی حدود ملیں گے جن کو علی الاطلاق محمود سمجھا جاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعت کی نظر کس قدر عمیق ہے کہ وہاں پہنچتی ہے جہاں آپ کا وہم بھی نہیں پہنچتا مثلاً خوف خدا کہ عام طور سے محمود کہا جاتا ہے کہ خوف خدا اچھی چیز ہے اور کوئی قید یا حد اس کے لئے نہ ہونی چاہئے لیکن شریعت نے اس کے لئے بھی ایک حد مقرر فرمائی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں نسئلک من خشیتک ماتحول به بیننا و بین معاصیک یعنی ہم خوف اتنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے معاصی ہم سے چھوٹ جائیں یہ حد ہوئی خوف کی اس سے زیادہ مطلوب نہیں چنانچہ بعض وقت خوف اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آدمی مرجاتا ہے یا مغفرت سے مایوسی کی نوبت آجاتی ہے سو وہ درجہ مطلوب نہیں دیکھئے یہ ایسی چیز کی حد ہے جس کو علی الاطلاق محمود سمجھا جاتا ہے۔شریعت کی نظر حقیقت پر ہے ہم لوگ خوف کو فی نفسہ مطلوب سمجھتے ہیں مگر شریعت رہبری کرتی ہے کہ خوف مطلوب لغیرہ ہے۔یعنی ترک معصیت کے لئے جب اس سے بڑھ جائے تو مطلوب نہیں ایک نظیر اور لیجئے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے اس میں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ مطلوب لغیرہ ہے لیکن جو دوسری نظیر میں پیش کروں گا اس میں بتلانے سے پہلے ذرا آپ غور کرلیں کہ کوئی حد ذہن میں آسکتی ہے یا نہیں ہرگز نہیں آئے گی وہ کیا ہے۔

عشق الٰہی کی حد

شوق لقاء اللہ جس کا ترجمہ عشق الٰہی سے کرنا بہت مناسب ہے اس کے لئے کوئی حد کسی کے ذہن میں نہیں ہوگی چنانچہ اہل اللہ کی فضیلت میں بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں صاحب ہمہ تن غرق تھے عشق خداوندی میں اور محو تھے عشق الٰہی میں۔اور دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔غرض یہ ایسی چیز مانی جاتی ہے کہ جس درجہ میں بھی ہو اس کو محمود اور مطلوب سمجھا جاتا ہے لیکن شریعت نے اس کی بھی حد بیان فرمائی ہے۔جہاں شوق الٰہی لقاء اللہ کی دعا ہے وہاں دو حدیں بھی اس کی بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں فی غیر ضراء مضرة و لا فتنة مضلة یعنی شوق لقاء اللہ ہو مگر اس کے ساتھ نقصان دینے والی مضرت گمراہ کرنے والا فتنہ نہ ہو۔یعنی محبت اس درجہ نہ بڑھ جائے کہ ان دونوں کی

نوبت آ جائے۔ یہ بالکل نئی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ عشق الٰہی کے لئے بھی کوئی حد مقرر کی جائے۔ لیکن جب آپ اس کی تحقیق سنیں گے تو یہ تعجب جاتا رہے گا۔ یہ تحقیق علماء ظاہر کا حصہ نہیں ہے۔ اس کو صوفیہ سے پوچھو وہ ان دونوں نقصانوں کو بیان کرتے ہیں ضراء مضرۃ کا بیان یہ ہے کہ شوق میں حرارت بڑھتی ہے اور یہ جب حد افراط کو پہنچ جاتا ہے تو حرارت بدن کو گھلا دیتی ہے حتیٰ کہ رطوبات اصلیہ تک تحلیل ہونے لگتی ہیں اس سے بیماری کی نوبت آ جاتی ہے اور بہت سے اعمال سے آدمی رہ جاتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے کہ پہلے نماز کھڑے ہو کر پڑھتا تھا اب بیٹھ کر پڑھنے کی نوبت آ گئی پھر بیٹھ کر بھی نہیں پڑھی جاتی لیٹ کر پڑھنے لگے اور وہ حرارت دم بدم بڑھتی جاتی ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ کم ہو حتیٰ کہ رطوبات تحلیل ہو گئیں اور دم نکل گیا بس خاتمہ ہو گیا اور سارے اعمال بند ہو گئے۔ اگر زندہ رہتے تو نماز روزہ تلاوت سب اعمال بڑھتے اور ان کے مدارج بڑھتے رہتے یہ سب ندارد ہو گئے غرض یہ نقصان پہنچا۔ عمر گئی ہوئی پھر کہاں آتی ہے۔ یہ مراد ہے ضراء مضرۃ سے کہ اتنا شوق نہ ہو کہ جسم کو مضرت پہنچے۔ یہ نقصان دنیا کا نہیں ہے بلکہ دین کا ہے کیونکہ دین تو اعمال ہی کا نام ہے اور وہ جسم کی بقاء پر موقوف ہیں اور افراط شوق سے جسم باقی نہیں رہتا تو اعمال واقع نہیں ہوتے اور دین کا نقصان ہوتا ہے اس واسطے اس سے پناہ مانگی ہے۔ ایک حد تو یہ ہوئی۔ دوسری حد فتنہ مضلہ ہے اس کا بیان بھی اہل ظاہر نہیں کر سکتے۔ پھر صوفیہ کے پاس چلو۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ جب شوق حد سے بڑھتا ہے تو ادب نہیں رہتا اس سے بے تکلفی اور اس کے بعد گستاخی کی نوبت آ جاتی ہے اور یہ مضر ہے کیونکہ کہاں بندہ کہاں خدا کہاں حادث کہاں قدیم کہاں فانی کہاں باقی دونوں میں کیا مناسبت کیسی بے تکلفی۔ بے تکلفی برابر والوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے گو لوگ گستاخی اور بے تکلفی کے کلمات بکنے کو کمال سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں فلانے مست ہیں اور مجذوب ہیں اور خدا کے پیارے ہیں۔ صاحبو یہ خیال اسی وقت تک ہے جب تک کہ اس کی حقیقت ذہن میں نہیں آتی۔ اور اس کی حقیقت اس وقت ذہن میں آ سکتی ہے جبکہ اپنی نسبت حق تعالیٰ کے ساتھ ذہن میں آوے۔ سو بندہ کو خدا کے ساتھ کیا نسبت۔ اس کی کوئی نظیر نہیں ہے جس کو بیان کر کے سمجھایا جاوے اور اس نظیر سے یہ نسبت کچھ ذہن میں آ سکے بلا تشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ادنیٰ درجہ کا بندہ نجاست میں آلودہ۔ بھنگی' چمار' ایک ہفت اقلیم کے بادشاہ کے ساتھ دعویٰ محبت کا کرے اور بے تکلفی و گستاخی کے الفاظ بکنے لگے۔ یہ بھی ایک بالکل ناتمام اور کالعدم نظیر ہے کیونکہ بھنگی یا چمار کو کیسا ہی ذلیل' خوار' گندہ اور بری حالت میں ہے لیکن بادشاہ کے ساتھ بہت سی باتوں میں مجانست اور مناسبت اور مشابہت رکھتا ہے مثلاً انسان وہ بھی ہے اور یہ بھی۔ جس

طرح ماں باپ سے وہ پیدا ہوا ہے یہ بھی پیدا ہوا ہے جس طرح وہ کھاتا پیتا ہے اسی طرح یہ بھی۔ غرض بہت سی باتوں میں اس کو مماثلت ہے اور جس کے واسطے یہ نظیر دی گئی ہے یعنی بندہ اور خدا۔ ان دونوں میں کسی بات میں بھی مماثلت نہیں تو ایسی صورت میں یہ نظیر بالکل بے کار اور کالعدم ہے لیکن کیا کیا جاوے حقیقی نظیر تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی لہذا التقریب الی الفہم کے لیے اسی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس ناتمام نظیر ہی میں فرمایئے کہ کیا کوئی عقلمند اس کو معذور سمجھے گا اور اس بے تکلفی کو اس کے کمال کہے گا اور کیا اس صاحب جلال و جمال بادشاہ کو اس پر غیظ نہیں آئے گا سوائے اثبات کے جواب نفی میں نہیں ہو سکتا تو اب میں کہتا ہوں۔ صاحبو ذرا ہوش کی باتیں کرو کہاں بندہ اور کہاں ذات حق جل جلالہ اپنے سے برابر والے اور اپنے ہم جنس محبوب کے ساتھ بھی بے تکلفی کے کلمات کہنا بعض وقت باعث ملال خاطر ہو جاتا ہے پھر کہاں وہ محبوب جس سے بندہ کو کوئی تعلق سوائے تعلق تباین کے نہیں اور کسی قسم کی مناسبت اور مجانست اور مشابہت نہیں اس کے ساتھ گستاخی جس قدر بری ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے محتاج بیان نہیں۔

مجاذیب مرفوع القلم ہیں

یہ اور بات ہے کہ مجاذیب کے ساتھ برا معاملہ نہیں کرنا چاہیے سو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ گستاخی اور بے ادبی کے کلمات ان کے واسطے باعث فضیلت ہیں اور اس کی وجہ سے وہ مقرب ہو گئے ہیں اور ان باتوں میں ان کی نقل کرنا کسی کو روا ہو وہ ان باتوں میں بوجہ بے ہوشی کے معذور ہیں شریعت نے ان کو مرفوع القلم کر دیا ہے ان کے ساتھ برا معاملہ کرنے کی اجازت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان پر عشق الٰہی کا استیلاء ہو گیا ہے خواہ وہ کسی صورت سے ہو اس لئے کسی کو اجازت نہیں ہے کہ ان کی تحقیر کرے یا انہیں ایذا پہنچائے۔ جب شریعت ہی ان کو مرفوع القلم کہتی ہے اور ایسی سخت باتوں پر ان سے گرفت نہیں کرتی تو دوسرے کسی کو کیا منصب ہے کہ ان کو ستائے یہ مختصر بیان ہے مجاذیب کا۔ اور یہ ذکر ان مجذوبوں کا ہے جو واقعی مجذوب ہیں اس سے مراد میری متصنعین نہیں ہیں جو بتکلف مجذوب بنتے ہیں۔ یہاں طول کا موقع نہیں صرف یہ بتلانا ہے کہ مجاذیب معذور ہیں کیونکہ وہ ہوش نہیں رکھتے اور کوئی صاحب ہوش ایسے کلمات میں معذور نہیں ہو سکتا۔ یہ اگر ایسے کلمات بکے گا تو سخت مجرم ہوگا اور دین اس کا غارت ہو جائے گا۔ یہ خرابی ہے شوق کے حد افراط میں پہنچ جانے کی تو کثرت شوق بھی ایک درجہ میں مضر ہوئی۔ اب آپ کا تعجب جاتا رہا ہوگا کہ کیا عشق الٰہی کی بھی کوئی حد ہو سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ شریعت نے محبت کی بھی حد مقرر کر دی ہے اور خوف کی بھی اور حاصل ان حدود کا یہ ہے کہ نہ جسم کے لیے مضر ہو اور نہ ایمان کے لئے جب ان دو چیزوں کے لئے بھی حد ہوئی جن کو علی الاطلاق محمود کہا جاتا ہے تو ان چیزوں کے لئے جن کو ہم خود بھی

سمجھتے ہیں کہ علی الاطلاق محمود نہیں ہیں کیسے حدود نہ ہوں گے ظاہر بات ہے کہ ضرور ہوں گے۔ غرض شریعت نے ہر کام کے لئے حدود مقرر کئے ہیں جب تک وہ کام اس حد کے اندر ہے محمود ہے۔

ہر کام کے حدود

اور جب اس سے متجاوز ہو جائے تو مذموم ہے۔ پس افراط بھی ایسا ہی مذموم ہے جیسے تفریط۔ اسی بارہ میں لوگوں کو ایک دھوکا ہوتا ہے یعنی باوجود اس بات کو تسلیم کرنے کے کہ ہر کام کی کوئی حد ہے پھر بھی لوگ جو اس کام کو بڑھا دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دیکھتے ہیں کہ وہ کام کسی خاص مقصود میں معین ہے پس اس صورت میں اس کے محدود کرنے کو مخل فی المقصود سمجھ لیتے ہیں۔ میں ان کی غلطی بتلاتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس مقصود کا اور اس کام کے علی الاطلاق معین ہونے کا علم حق تعالیٰ کو تھا یا نہیں کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا کہ حق تعالیٰ کو علم نہ تھا۔ جب علم تھا تو پھر اس کام کو محدود کیوں کیا اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ ہمارے ہی سمجھنے میں کچھ غلطی ہے وہ غلطی یہ ہے کہ ہم نے یہ سمجھا کہ یہ کام اپنی حد کے اندر اس مقصود میں معین نہیں ہو سکتا۔ بس یہ غلطی ہے اس کا علم خدا تعالیٰ کو بھی تو تھا کہ یہ اس حد کے اندر معین فی المقصود ہو گا یا نہیں۔ اگر اس حد کے اندر رہ کر علم الٰہی میں معین نہ ہوتا تو کیوں وہ حد مقرر فرماتے اور جب حق تعالیٰ نے وہ حد مقرر فرمائی ہے تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علم الٰہی میں وہ اسی حد کے اندر معین فی المقصود ہے اور آپ اپنے علم میں ایسا نہیں سمجھتے تو یہ معارضہ ہوا حق تعالیٰ کے علم کے ساتھ اور یہ دعویٰ ہوا حق تعالیٰ کے سامنے اپنے علم کے کمال کا۔ غور کیجئے کہ یہ کس درجہ شنیع بات ہے۔ بندہ اور دعویٰ کرے علم کا حق تعالیٰ کے سامنے یہ راستہ ہی غلط ہے صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ اپنے علم اور اپنے ارادہ کو فنا کر دے حضرت حق کے سامنے۔ لوگ مقصود مقصود پکارتے پھرتے ہیں کیا چیز ہے مقصود۔ مقصود وہی ہے جو ان کو مقصود ہو۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار بگذارند و خسم طرہ یارے گیرند

(یعنی بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ایک محبوب حقیقی کے ہو رہو)

خلیل آسا در ملک یقین زن نوائے لا احب الافلین زن

یعنی ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح یقین حاصل کر کے غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا کی صدا لگاؤں)

فنا فی الاطاعت لازم ہے

اس کو شاید کچھ لوگ اشعار پیش کرنے کی وجہ سے شاعری کہیں اس واسطے میں ایک واقعہ حدیث کا نقل کرتا ہوں اس سے میرے دعویٰ کی تصدیق ہو گی کہ اپنی رائے سے مقصود کی رعایت کوئی چیز نہیں صرف حکم شرعی کو دیکھنا چاہئے۔ حضرت اسامہ کا قصہ ہے کہ جہاد میں انہوں نے ایک کافر پر قابو پایا اور

قتل کرنے کو تلوار اٹھائی اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا انہوں نے یہ سمجھ کر کہ وہ دل سے مسلمان تھوڑا ہی ہوا ہے اس نے جان کے خوف سے زبان سے کلمہ پڑھ لیا ہے اس کو قتل کر دیا۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا ھلا شققت قلبه. یعنی تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اس نے صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا دل سے نہیں پڑھا کیا تم نے دل کو چیر کر دیکھا ہے۔ اس حدیث سے یہ قانون مقرر ہو گیا کہ جب کوئی کافر کلمہ پڑھ لے خواہ اس نے بناوٹ ہی سے پڑھا ہو اس کو قتل نہیں کرنا چاہئے۔ اور یہ قانون ظاہراً دین کو نیز دین کی حکومت کو ڈبو دینے والا ہے۔ اس سے ایسی بات کفار کے ہاتھ لگ گئی کہ پہلے مقابلہ کریں اور لڑیں اور مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان پہنچا دیں اور جب مسلمانوں کا پلہ بھاری دیکھیں اور خود ہارنے لگیں اور دیکھیں کہ اب ہم بھی قتل کئے جائیں گے بس فوراً دھوکا دینے کے لئے کلمہ پڑھ لیں اور ان کی جان چھوٹ جائے۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے اور وہ اس کے بعد یہ کر سکتے ہیں کہ جب ہمارے ہاتھ سے چھوٹ جائیں تو پھر وہی قتل و قتال کریں اور ہم کو نقصان پہنچائیں کیونکہ کلمہ تو صرف دھوکا دینے کے لئے پڑھا تھا۔ پھر دوبارہ بھی اگر ایسی ہی صورت پیش آوے کہ مغلوب ہونے لگیں تو اسی طرح دھوکا دینے کے لئے پھر کلمہ پڑھ لیں۔ غرض اسی طرح جب تک چاہیں نقصان پہنچاتے رہیں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھ لیجئے یہ قانون عام عقل میں کیسا مضر ہے لیکن اس مضرت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پروا نہیں کی۔ کیونکہ وہاں سوائے حکم خداوندی کے اور کوئی مقصود تھا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہو بس وہی مقصود ہے۔ اور حکم اللہ کا کفار کے قتل کرنے کا ہے نہ کہ مومنین کے۔ جب ایک شخص نے ہمارے سامنے کلمہ پڑھ لیا تو وہ مومن ہو گیا ہم کو دل کا حال معلوم نہیں جس کو دل کا حال معلوم ہے وہ ان کے ساتھ جو کچھ معاملہ کرے گا وہ جانے ہمارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ اس نے کلمہ دل سے نہیں پڑھا۔ یہی گرفت کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ھلا شققت قلبه (مسند احمد ۴:۴۳۹) (کیا تو نے اس کا دل چیرا تھا) میں پس ہم کو تو وہ کرنا چاہئے جو حکم ہو نہ مصلحت سے بحث نہ مضرت سے ہمارا مذہب سے عشق جس کو فنا فی الا طاعت لازم ہے دیکھو آیت میں کیا ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ شدت محبت کا ترجمہ عشق ہی تو ہے۔ تو یہ معنی ہوئے کہ مسلمان عاشق ہیں اللہ کے۔ پھر عشق کے ساتھ مصلحت بینی کیسی اسی کو کہا ہے۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

(بڑی مصلحت یہی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ایک کو لے لو)

عاشق کا مذہب

عاشق خود تو مصلحت بینی کیا کرتا وہ دوسروں کو بھی یہی صلاح دیتا ہے کہ یہی طریقہ اختیار کرو

مصلحت بنی چھوڑ دو اور محبوب کی رضا میں لگو۔ عاشق کا تو مذہب صرف یہ ہے کہ رضا محبوب حاصل ہو اپنی یا دوسرے کی مصلحت یا مضرت سے اسے کچھ بحث نہیں۔ جب مسلمان کو خدا تعالیٰ سے محبت اور عشق ہے تو بس اس کو اس کی کوشش چاہئے کہ حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو چاہے اس میں اپنا یا دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ بس سوائے رضاء حق اس کا کچھ اور مقصود نہ ہونا چاہئے رضاء حق کی تلاش کرو جب رضا مل گئی تو رضائی یعنی ظاہری راحت بھی مل جائے گی۔ لیکن رضائی کی نیت سے رضا کو مت طلب کرو۔ رضائی ملے تو خیر نہ ملے تو ٹھٹھر کر مر جاؤ۔ جان کی پروا نہ کرو۔ کیونکہ جیسے رضائی تمہاری نہیں ہے بلکہ ان کا عطیہ ہے ایسے ہی جان بھی تمہاری نہیں ہے۔ غرض اپنی طرف سے تو اسی کے لئے آمادہ رہو باقی عادۃ اللہ یہی ہے کہ رضا کے ساتھ رضائی بھی ملتی ہی ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ادھر سے رضا کی طلب ہو اور ادھر سے اس کو ٹھٹھرتے ہوئے دیکھیں اور رضائی نہ دیں مگر تمہارے لئے ادب یہی ہے کہ تم رضائی کی طلب مت کرو تم اپنا کام کرو وہ اپنا کام کریں گے اور اگر رضائی ہی طلب کرنی ہو تو اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ رضائی بھی اسی سے مانگو اس کے یہاں ایک ایسا گودام ہے جس میں ساری چیزیں ہیں۔ رضائیاں بھی بہت سی ہیں ان کے لینے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ گودام والے سے درخواست کرو اور کنجی مانگ لو اس کے بعد رضائی نکال لو۔ یہ طریقہ نہیں ہے کہ درخواست نہ کرو نہ کنجی حاصل کرو بلکہ تالا توڑ کر رضائی نکالنے لگو۔ اگر ایسا کرو گے تو مقدمہ قائم ہوگا اور سزا ہوگی اور وہ رضائی بھی چھین لی جائے گی۔ اور یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ ہم کو سردی لگتی تھی اس مصلحت اور ضرورت سے ہم نے رضائی لے لی یہ حقیقت ہے ان مصلحتوں کی جن کی بناء پر ہم کوئی کام کر بیٹھتے ہیں اور حق تعالیٰ کی رضا کا اہتمام نہیں کرتے خدا تعالیٰ کو راضی کرو وہ اتنا دیں گے کہ تم سے سمیٹا بھی نہیں جائے گا۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد انچہ دروہمت نیاید آں دہد

(یعنی فانی جان لیتے ہیں اور باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا وہ عطا کر دیتا ہے)

یہ مضمون آیت میں بھی موجود ہے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ یعنی جو کوئی خدا تعالیٰ سے ڈر کر کام کرے گا اس کے لئے وہ راہ نکال دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہوگا۔ غرض جن مقاصد کے پیچھے آپ پڑے ہوئے ہیں وہ مقاصد ان کو ناراض کر کے پورے نہیں ہو سکتے اور اگر ان کو راضی کرنے کی

کوشش کریں گے تو وہ مقاصد اس طرح سے پورے ہوں گے کہ گمان بھی نہیں ہوگا اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہتا یہ تو قرآن کی آیتوں کا صاف مدلول ہے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اطاعت کرنے والے کے مقاصد اس جگہ سے پورے ہوں گے جہاں کا اسے خیال بھی نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ لوگ قرآن کو نہیں دیکھتے جو اپنی سمجھ میں آجاوے اسی کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ اور بعضے لوگ جو قرآن کو دیکھتے بھی ہیں ان کی بھی بڑی کوشش یہ ہے کہ دو چار مشہور اعمال جیسے نماز روزہ وغیرہ کے احکام قرآن میں دیکھ لئے یہ اعمال صرف وہ ہوتے ہیں جو از جنس عبادات ہیں گویا سوائے عبادات کے دوسرے احکام قرآن شریف میں ہیں ہی نہیں۔ حالانکہ قرآن شریف میں دیگر مضامین اور اجزاء دین بھی بکثرت ہیں۔ مسلمانوں میں ایک گروہ کا تو یہ طرز عمل ہے اور ایک گروہ دوسرا ہے جو ظاہراً ہر حکم کو قرآن شریف سے نکالتا ہے لیکن اس گروہ نے چال بے قاعدہ اختیار کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ باتیں انہوں نے قرآن شریف سے نکالی ہیں جو بداہتہ دین کے خلاف ہیں۔ کوئی کہتا ہے قرآن میں ایک ہی روزہ کا حکم ہے کوئی کہتا ہے سود لینا جائز ہے۔ بڑھتے بڑھتے لوگوں نے عقائد تک میں تصرف کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے ملائکہ کا ثبوت قرآن شریف سے نہیں ہے' کوئی کہتا ہے جنت کا ثبوت نہیں' نار کا ثبوت نہیں' میزان کا ثبوت نہیں' صراط کا ثبوت نہیں اور ہر بات کے لئے قرآن شریف کی آیتہ پڑھ دیتے ہیں۔ سننے والے حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ باتیں ہیں تو دین کے خلاف مگر ان کے پاس ہر بات کا ثبوت قرآن شریف سے ہے اس کا انکار کریں تو کیسے کریں یہ ایسا مغالطہ ہے کہ اس میں اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ پڑ جاتے ہیں۔ میں اس کا کشف راز کرتا ہوں۔ صاحبو احکام کو قرآن سے ڈھونڈو لیکن طریقہ سے۔ ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے اگر اس طریق سے اس کام کو نہ کیا جاوے تو وہ کام نہیں ہوتا اور جو غرض ہے اس کام سے وہ حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً گیہوں پیدا ہوا ہے آدمی کی غذاء بننے کے لئے لیکن شرط ہے اس کے لئے کہ اس طریق سے استعمال کیا جاوے جو اس کے لئے مقرر ہے مثلاً پیسنا گوندھنا پکانا۔ اگر کوئی گیہوں کو بغیر اس کے کھانے لگے یعنی کچے نگل جایا کرے تو اس سے تغذیہ کا کام نہ ہوگا یا مثلاً دوا ازالہ مرض کے لئے ہے مگر اس کے استعمال کے بھی کچھ طریقے مقرر ہیں۔ مثلاً بعضی دوا پیسی جاتی ہے بعضی پکائی جاتی ہے بعضی بھگوئی جاتی ہے اگر ان طریقوں کے خلاف استعمال کی جائے تو وہ استعمال بیکار ہوگا اور جو غرض ہے یعنی ازالہ مرض وہ حاصل نہ ہوگی۔ اس کی صدہا نظیریں ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں۔

قرآن شریف سے احکام معلوم کرنے کا طریقہ

اسی طرح قرآن شریف سے احکام کے معلوم کرنے کے لئے بھی ایک طریقہ ہے کہ بلا اس

کے احکام صحیح معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ ان پر وہ غرض مترتب ہو سکتی ہے جس کے لیے احکام مقرر ہیں۔ یعنی رضاء الٰہی وہ طریقہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ خالی الذہن ہو کر قرآن سے حکم کو تلاش کرو۔ نہ مقصود کو متعین کرو نہ اس کو پیش نظر رکھو کہ ہماری مرضی کے موافق ہو۔ بس یہ سوچ کر بیٹھو کہ جو حکم ہو گا وہ بجالا دیں گے چاہے ہمارا مقصود حاصل ہو یا نہ ہو اور چاہے ہماری مرضی کے موافق ہو یا نہ ہو۔ بس اس طریقہ سے جب آپ حکم کو قرآن سے تلاش کریں گے تو ضرور ملے گا اور صحیح ملے گا باقی یہ طریقہ بالکل ہی غلط ہے کہ پہلے ایک مقصود متعین کر لیا کہ یہ مسئلہ ہم کو قرآن شریف سے نکالنا ہے پھر قرآن شریف میں تلاش شروع کی تو اس صورت میں بتکلف وہ حکم قرآن میں مل تو جائے گا لیکن غلط ملے گا اور اس پر غایت یعنی رضا الٰہی مترتب نہ ہو گی۔ آج کل لوگ یہی غلطی کرتے ہیں کہ مقصود پہلے متعین کر لیتے ہیں اور اسی پر نظر رکھتے ہیں کہ مسئلہ ہماری مرضی کے موافق نکلے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برا بھلا ثبوت مل ہی جاتا ہے۔ چنانچہ جس نے سود کے جواز کی کوشش کی اور پہلے سے مقصود متعین کر لیا اس کو بھی بزعم اس کے قرآن سے کچھ نہ کچھ ثبوت مل ہی گیا۔ اور جس نے ایک روزہ کو فرض کیا اس کو بھی ثبوت مل گیا اور جس نے ملائکہ کی نفی کی یا جنت و نار کی نفی کی اور میزان و صراط کی نفی کی اس کو بھی ثبوت مل گیا اس طرح تو قرآن کیا ہوا ایک لڑکوں کا کھیل ہو گیا کہ جس طرح چاہا کھیل بنا لیا۔ اسی سے ایک چیز کا اثبات ہوتا ہے اور اسی سے اس کی نفی۔ اسی میں توحید اسی میں شرک نعوذ باللہ۔ اس میں غلطی کیا ہے غلطی یہی ہے کہ قرآن میں سے بے طریقہ احکام کو تلاش کیا گیا دیکھو جن لوگوں نے صحیح طریقہ سے تلاش کیا ان کو حقیقی احکام کیسے مل گئے۔ صحابہؓ نے عبادات بھی کیں معاملات بھی کئے معاشرات وغزوات بھی کئے اور ان کا کوئی کام خلاف حکم نصوص نہ تھا یہ نتیجہ اس کا تھا کہ وہ احکام کو نصوص سے صحیح طریقہ سے معلوم کرتے تھے وہ طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ خالی الذہن ہو کر نصوص سے حکم کو تلاش کیا جائے۔

مسلک صحابہ رضی اللہ عنہم

صحابہ میں یہ نہیں تھا کہ پہلے مقصود کو متعین کر لیتے ہوں اور اپنی مرضی کو پیش نظر رکھتے ہوں۔ ان کا تو مسلک یہ تھا۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا. (مومنین کا قول جبکہ ان کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا جاتا تھا تاکہ اپنے درمیان حکم بنا لیں یہی تھا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے مان لیا۔ اس آیت پر پورے عامل تھے جب کبھی اللہ و رسول کی طرف بلائے گئے بس ان کا جواب یہی تھا کہ بہت اچھا نہ اس کی علت کی تفتیش نہ حکمت کی تلاش۔ اس طرح آپ بھی احکام کو نصوص سے تلاش کیجئے وہی بات

آپ کو بھی حاصل ہوگی۔ یہ طریقہ میں نے ایسا بتا دیا ہے جس میں کوئی خطرہ ہی نہیں اور اس سے اس مغالطہ کا بھی کشف راز ہوگیا کہ ملحدین بھی اپنے مسائل کا ثبوت قرآن سے لیتے ہیں۔ خلاصہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے احکام کو قرآن سے نہیں حاصل کیا بلکہ ان کو اپنی مرضی اور ہوائے نفسانی سے حاصل کیا ہاں تائیداً اور تبعاً نصوص کو بھی ساتھ لے لیا۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہ طریقہ حق تک پہنچانے والا نہیں ہے بلکہ باطل تک پہنچانے والا ہے حق کو اس طریق سے تلاش کرو جو میں نے بتلایا ہے پھر دیکھ لینا کہ کیسے صحیح احکام ملتے ہیں۔ اب یہاں سطحی نظر سے نفس کو بطور عذر کے ایک گنجائش نکال سکتا ہے وہ یہ کہ اگر ہم صحیح طریقہ سے بھی نصوص میں سے احکام کو تلاش کریں تو سب احکام نصوص میں صراحۃً تو موجود ہیں نہیں اس لئے ممکن ہے کہ باوجود صحیح تلاش کے بوجہ صراحۃً نہ ملنے کے احکام میں اختلاف آراء ہو تو اس صورت میں صحیح حکم کیونکر معلوم ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی ایسی بات میں اختلاف پیش آوے جس میں نص موجود نہ ہو تو اس وقت اس شق پر عمل کرنا چاہئے جو اصول شرعیہ سے راجح ہو لیکن ترجیح کے لئے معیار کثرت رائے نہیں ہے جیسا کہ آج کل لوگوں نے اختیار کرلیا ہے کہ ہر اختلاف کا فیصلہ کثرت رائے سے کر لیتے ہیں اور پھر رائے بھی کس کی ممبران کی اور ممبر کس کو کہتے ہیں جو ایک روپیہ دے دے خواہ وہ کچھ بھی لیاقت نہ رکھتا ہو اور اس فن سے جس کے لئے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں اس کو کچھ بھی مناسبت نہ ہو مثلاً مدارس عربیہ کے بارہ میں ان لوگوں کی رائے لی جاتی ہے جو نہ خود عالم نہ علم سے مناسبت نہ انہوں نے کبھی مدارس کا کام کیا نہ دین کی طرف ان کو میلان حتیٰ کہ مدارس کے وجود اور قیام ہی کے وہ مخالف ہیں اور مدارس کو ایک فضول کام سمجھتے ہیں بس صرف اس بناء پر ان کو رائے دہندہ مان لیا ہے کہ وہ ممبری کا چندہ دیتے ہیں اور انہوں نے اس کام کو اس واسطے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ انہیں اس کی لیاقت نہیں۔ لوگ چندہ کی فکر میں رہے اور رائے دہندہ صاحب اظہار لیاقت کی فکر میں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسہ کا کام تمام ہوگیا۔ حیرت ہے کہ کسی اور کام میں ان سے رائے نہیں لی جاتی مثلاً کسی الجھے ہوئے مریض کے بارے میں اطباء کا مجمع ہو اس میں یہ پہنچ جاویں اور ایک روپیہ چندہ دیکر یہ درخواست کریں کہ اس علاج کے بارہ میں میں بھی رائے دوں گا اور میں بوجہ ممبر ہونے کے اس کا مستحق ہوں۔ اگر ایسے آدمی زیادہ جمع ہو جاویں اور طبیب ایک دو ہوں تو ظاہر ہے کہ کثرت رائے انہیں کی طرف ہوگی تو انہیں کی رائے پر نسخہ بھی لکھا جانا چاہئے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کر کے دکھائے تب ہم اس قاعدہ کو صحیح جانیں کہ کثرت رائے معیار ہے ترجیح دینے کا۔ میں بلاخوف اعتراض کہتا ہوں کہ مریض کے بارہ میں کسی کی بھی یہ ہمت نہ ہوگی نہ علاج کرانے والوں کی نہ مریض کی نہ خود ان ممبر صاحب کی۔ وہاں یہ خود صاف کہہ دیں گے کہ حضرت میں

اس کام کو نہیں جانتا جو طبیب کہے وہی صحیح ہے اے اللہ سب سے سستا اور نکما دین ہی کا کام ہو گیا ہے کہ اس میں ہر شخص رائے دینے کا مستحق ہے نہ کسی لیاقت کی ضرورت ہے نہ مناسبت کی نہ مہارت کی وہاں اس کہنے سے بھی ممبر صاحب رکتے ہیں کہ یہ کام علماء کے سپرد کرو ہم کیا جانیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مرض کے بارہ میں تو اندیشہ ہے کہ اگر غلطی ہوئی تو مریض کی جان جاتی رہے گی اور دین کے بارہ میں یہ اندیشہ نہیں کہ اگر غلطی ہوئی تو دین جاتا رہے گا یا بگڑ جائے گا۔ اس لئے کہ دین تو کسی طرح جاتا ہی نہیں نہ کسی طرح بگڑ سکتا ہے دین کی تو آج کل یہ حالت ہے کہ کلمات کفر بکنے اور اللہ و رسول کے خلاف عقیدہ رکھنے سے بھی نہیں جاتا۔ ایسے ایسے کلمات اخباروں اور رسالوں میں نکلتے ہیں کہ ان کو سنا نہیں جاتا اور جب ان کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو اعتراض ہوتا ہے کہ بس مولویوں کو صرف یہی کام رہ گیا ہے کہ گھر میں بیٹھے فتویٰ لگایا کریں۔ مسلمانوں کو کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتے۔ جہاں کسی کام کو مسلمانوں نے متفقہ طور پر شروع کیا بس اس میں انہوں نے روڑا اٹکایا اور فتویٰ لگا لگا کر اختلاف پیدا کر دیا۔ ذرا ذرا سی باتوں میں لڑتے ہیں۔ افسوس دین کی بات ان کے نزدیک ذرا سی ہے۔ دو وکیل مقدمہ میں ایک ایک لفظ پر لڑتے ہیں ان کو کوئی نہیں کہتا کہ ذرا ذرا سی بات پر لڑ رہے ہیں۔ بلکہ وکیل کی قابلیت سمجھی جاتی ہے کہ ایک لفظ کو ایسا پکڑا کہ اس پر تین گھنٹہ تک بحث کی۔ پھر مولویوں کی قابلیت کیوں نہیں سمجھی جاتی کہ انہوں نے ایک لفظ پر اتنی لمبی چوڑی تحریر یا تقریر کی۔ وجہ یہی ہے کہ مقدمہ میں تو سمجھتے ہیں کہ ایک لفظ کے ہیر پھیر میں کام بنے گا یا بگڑ جائے گا اور یہاں یہ اطمینان ہے کہ ہر صورت میں کام بنے ہی گا کسی طرح بگڑ ہی نہیں سکتا کیونکہ دین اختیاری چیز ہے جو ہماری سمجھ میں آ دے اور ہم کو اچھا معلوم ہو وہی دین ہے۔ اور اگر رائے دینے والے متعدد ہوئے تو جس طرف کثرت ہوئی اسی طرف فیصلہ کر دیا وہی دین ہے۔ صاحبو یہ معیار ہی صحیح نہیں حق بات کے معلوم کرنے کا ورنہ میں وہی نظیر پھر یاد دلاتا ہوں کہ مریض کے بارہ میں محلہ میں سے دس بیس آدمیوں کو قطع نظر اس سے کہ وہ طب جانتے ہوں یا نہیں جمع کر کے کثرت رائے سے ایک نسخہ کیوں نہیں تجویز کرا لیا کرتے یہ معیار وہاں کیوں نہیں کام دیتا۔ وہاں کیوں طبیب اور ڈاکٹر کی تلاش میں پریشان پھرا کرتے ہو اور سینکڑوں روپیہ خرچ کرتے ہو۔ خوب سمجھ لیجئے کہ کثرت رائے تو کوئی چیز ہی نہیں نفس رائے کی حجیت کے لئے دو شرطیں ہیں کہ بلا ان کے اس سے کام لینا موصل الی الصواب نہیں ہو سکتا ایک شرط عام ہے اور ایک خاص عام کے معنی یہ ہے کہ بلا اس کے رائے کبھی کام نہیں دے سکتی نہ دنیا کے بارہ میں نہ دین کے۔ وہ عام شرط یہ ہے کہ جس کام کے متعلق رائے سے کام لیا جاوے۔ رائے دہندے اس کام کے جاننے والے اور اس سے مناسبت رکھنے والے اور ماہر ہوں

بلا اس کے رائے کوئی چیز نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مریض کے بارہ میں اطبا ماہرین سے رائے لی جائے گی غیر طب جاننے والے سے نہیں خواہ وہ اور کاموں کی قابلیت کتنے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں اور مقدمات کے بارہ میں وکلاء اور قانون داں صاحبوں کی رائے لی جائے گی تجار اور اہل صنعت اور کسی قابلیت والے کی رائے نہیں لی جائے گی۔ چارپائی بنانے کی اگر ضرورت ہوگی تو اس میں جاہل اور گنوار بڑھئیوں کی رائے لی جائے گی۔ وکلاء اور علماء اور تعلیم یافتوں سے رائے نہیں لی جائے گی۔ غرض ہر کام میں اس کام کے جاننے والوں کی رائے معتبر ہوگی نہ کہ دوسرے کام جاننے والوں کی یہ شرط تو عام ہے اور ایک شرط خاص ہے کہ وہ صرف دین کے بارہ میں ہے وہ یہ ہے کہ دین میں رائے وہ معتبر ہوگی جو نص کے ساتھ اوفق ہو پس حاصل نتیجہ یہ ہوا کہ غیر علماء کی رائے معتبر نہ ہوگی خواہ کتنی ہی کثرت ہو۔ ادھر ایک عالم ہو اور ادھر ہزار عامی لیکن ترجیح عالم ہی کی رائے کو ہوگی کثرت کا لحاظ کسی طرح نہ کیا جائے گا اور عالم کی رائے بھی اس وقت لی جائے گی جبکہ نص کے موافق ہو اور اگر نص کی موافقت میں اجتہادی اختلاف ہو وہاں دونوں طرف حق محتمل ہوگا مجتہد کو اپنی رائے پر اور غیر مجتہد کو کسی مجتہد کی رائے پر جس سے اعتقاد زیادہ ہو گو دلیل اجمالی ہی سے ہو عمل کرنا ہوگا۔ اب میں کثرت رائے کے حجت نہ ہونے کا ثبوت آیت سے پیش کرتا ہوں۔

آیت مبارکہ کثرت رائے کے خلاف اتری

واقعہ اس کا یہ ہے کہ غزوہ بدر میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی تو بہت سے کفار مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے ان کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہئے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور بعض صحابہؓ کی رائے یہ ہوئی کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ ان کو قتل کیا جائے۔ دونوں فریق نے اپنی اپنی رائے کی مصلحتیں بیان کیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی ابوبکرؓ کی طرف ہوئی لیکن آیت اتری حضرت عمرؓ کے موافق۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں جب تک کہ وہ زمین پر اچھی طرح خونریزی نہ کرلیں۔ تم دنیا کا مال واسباب چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں اگر خدا کا نوشتہ مقدر نہ ہو جاتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم کو کوئی بڑی سزا واقع ہوتی) اس آیت کے اترنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

پر اتنا اثر ہوا کہ آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اگر عذاب اترتا تو سوائے عمرؓ کے کوئی بھی نہ بچتا (عذاب اترتا کیوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک تو غیروں کے واسطے بھی رحمت ہے چہ جائیکہ صحابہ کے لئے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمت ہی ہیں) دیکھئے اس وقت کثرت رائے حضرت عمرؓ کے خلاف تھی اور حضور کی رائے مبارک بھی اسی طرف تھی لیکن آیت اتری حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق اس سے کثرت رائے کی تو بالکل ہی جڑ کٹ گئی اگر کثرت رائے حجت تھی تو احتمال کی کیا وجہ۔ یہاں اس طالب علمانہ شبہ کا جواب دینا بھی مناسب ہے کہ کیا حضرت عمرؓ کی رائے ایسی صائب تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مبارک پر بھی اس کو فوقیت ہوگئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت کی جائے

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے میں اصابت اس حیثیت سے نہیں ہوئی کہ وہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی (پھر تو بے شبہ اس کو فوقیت ہے) بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ رائے بھی حضور ہی کی تعلیم کا فیض تھا مگر غایت رحمت کے سبب آپ کی نظر اس طرف نہیں گئی پس حضرت عمرؓ کی رائے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر ترجیح نہیں ہوئی بلکہ حضور ہی کی ایک رائے کو حضور کی دوسری رائے پر ترجیح ہوئی اور اس کے متعلق بعض شبہات و جواب میری تفسیر بیان القرآن میں بھی قابل ملاحظہ ہیں۔ دیکھئے کس وضاحت سے یہ مسئلہ اس آیت میں موجود ہے اب آپ کی سمجھ میں کثرت رائے کے معتبر غیر معتبر ہونے کا فیصلہ آ گیا ہوگا۔ اور اس تقریر سے بہت سی جزئیات کا جواب نکل آتا ہے مثلاً بعض عالی دماغوں نے رائے دی ہے کہ بہت سے غیر مسلم لوگ مسلمان ہونے کو تیار ہیں لیکن بعض پابندیوں سے گھبراتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز پانچ وقت پڑھنی پڑے گی لہذا اگر علماء اسلام متفق ہو کر نماز کی قید اٹھا دیں تو ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں شامل ہو جائے اور قومی ترقی خاطر خواہ حاصل ہو جائے یا آج کل ایک عام خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ مسلمانوں پر سخت افلاس کا ادبار ہے لہذا اس کی ضرورت ہے کہ سود کے جواز کا فتویٰ دیا جائے اور سب علماء متفق ہو کر اس کو حلال کر دیں اور بہت سے لوگ یہ بھی دلیل پیش کرنے لگے ہیں کہ اب تو زیادہ تر علماء کا خیال اور رائے اسی طرف ہو گئی ہے کہ سود لینا چاہئے لہذا کثرت رائے بھی اسی طرف ہو گئی ہے بس یہی بات قابل اخذ ہے۔ میری مجموعی تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ رائے کے کار آمد ہونے کا موقع وہ ہے کہ نص موجود نہ ہو پس جبکہ نماز کی فرضیت اور رکن اسلام ہونے کے بارہ میں

نص موجود ہے تو ایسی حالت میں کثرت رائے تو الگ رہی اگر شرقاً وغرباً بلا اختلاف اتفاق رائے بھی اس کے خلاف پر ہو جائے تو حجت نہیں ہو سکتا اور سود حربی کے باب میں گو اجتہادی اختلاف ہے لیکن اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ایسے موقع میں مرجح اقربیت الی النص ہے اور سود کی جن صورتوں کے جواز کی کوشش کی جاتی ہے زیادہ تر وہ خلاف نص ہیں اور جو قلیل صورتیں اجتہادی ہیں انہیں بھی احتمال قوی ہے کہ گنجائش دینے سے عوام حدود سے نکل جائیں گے اور ایسے مباح کی اجازت دینا خود خلاف نصوص ہے خوب سمجھ لیجئے۔ اور اگر کسی کی خاطر سے کثرت رائے کو معتبر بھی مان لیا جاوے تو امور دنیویہ انتظامیہ میں تو کچھ گنجائش ہو سکتی ہے مگر دین میں کچھ گنجائش نہیں اور فرق یہ ہے کہ دین مکمل ہے اس میں گنجائش کسی ترمیم و تنسیخ کی باقی نہیں بہ خلاف دنیا کے کہ اس کی تکمیل کی کہیں خبر نہیں آئی تو امور دنیا میں تو کچھ گنجائش ہو سکتی ہے کہ عقلاء غور کریں اور حسب ضرورت کوئی قانون بنالیں اور اگر آپس میں اختلاف ہو تو کثرت رائے کی طرف رجوع کریں باقی دین کے بارہ میں یہ گنجائش اس لئے نہیں کہ اس کی تکمیل کی خبر آ گئی ہے جو قانون شارع نے مقرر فرما دیا وہ ناطق ہے کسی زمانہ میں اور کسی جگہ کے لحاظ سے بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ شارع یعنی حضرت حق وہ ذات ہے جو علیم و حکیم ہے اس کو حکم فرماتے وقت ہر بات کا علم تھا اور ساری ضرورتوں و مصلحتوں پر نظر تھی جو لوگ اس وقت میں نماز کی قید اٹھانا چاہتے ہیں یا سود کو علی الاطلاق جائز کرنا چاہتے ہیں ان سے کوئی پوچھے کہ جب شارع نے نماز کا حکم دیا تھا یا سود کو منع فرمایا تھا تو کیا اس کا علم اس بات تک نہیں پہنچا تھا کہ فلاں وقت میں نماز خارج فی الدین ہو گی یا بغیر سود لئے زندگی نہ ہو سکے گی اس نے ان مواقع کو مستثنیٰ کیوں نہیں کر دیا یا تو یوں کہو کہ اس کو اس کا علم نہ تھا نعوذ باللہ یہ شق تو یقیناً باطل ہے تو جب اس نے باوجود علم کے استثناء نہیں کیا تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس کو کسی وقت میں اس کی اجازت دینا منظور ہی نہیں۔ نماز ہمیشہ کے لئے فرض کی اور سود ہمیشہ کے لئے حرام کیا اب نماز کی عدم فرضیت کا قائل ہونا یا سود کی حلت کا قائل ہونا یا تو اس کو نعوذ باللہ بے علم ماننا ہے یا ان دونوں حکموں میں اس کی مزاحمت کرنا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا اور یہ دونوں شقیں جیسی ہیں ہر مسلمان کا دل خوب جانتا ہے حاصل یہ کہ ان احکام میں جن میں شارع نے خود کوئی قید نہیں لگائی ان میں قید لگانا ایجاد فی الدین اور دین کو ناقص سمجھنا ہے جس کے خلاف قرآن میں تصریح موجود ہے یہ ہے راز دین میں کثرت رائے کی بالکلیہ حجت نہ ہونے کا۔

کثرت رائے مطلق حجت نہیں

حاصل یہ ہے کہ کثرت رائے مطلقاً حجت نہیں اس کے لئے بھی کچھ قواعد اور قیدیں ہیں مگر لوگوں نے یہ سبق یاد کر رکھا ہے کہ بات بات میں کثرت رائے کو پیش کر دیتے ہیں سو یہ محض مغالطہ ہے۔ بس میں نے جو کہا تھا کہ اگر اختلاف ہو تو وہ شق اختیار کرو جس میں اصول شرعیہ سے رجحان ہو سو وہ رجحان اس طریق سے نہیں ہوتا جس طریق سے آج کل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ جدھر کثرت رائے دیکھی اسی کو راجح سمجھ لیا بلکہ اس کے لئے قواعد اور شرائط اور حدود ہیں جن کو عنقریب ذکر کر چکا ہوں۔ یہ صحیح طریقہ ہے قرآن سے احکام نکالنے کا جو ان قواعد صحیحہ سے کام لیتے ہیں ان کو قرآن میں اور نصوص میں سب کچھ مل جاتا ہے اور حق بات ہاتھ آ جاتی ہے پھر نہ وہ صراط کا انکار کرتے ہیں نہ ملائکہ کا نہ عذاب قبر وغیرہ کا اور نہ وہ سود کو جائز کرتے ہیں اور نہ رمضان کے روزہ کو ایک کہتے ہیں اور نہ ان کی دوڑ اس پر ختم ہو جاتی ہے کہ شریعت میں صرف چند عبادات ہیں بلکہ وہ شریعت کے ہر حکم کے بجالانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں خواہ اپنی رائے اور مصلحت اور ضرورت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو وہ رائے اور مصلحت کو فنا کر دیتے ہیں حق تعالیٰ کے امر کے سامنے اور معارضہ نہیں کرتے حق تعالیٰ کے علم سے اور وہ اس خیال کی بناء پر کوئی کام نہیں کرتے کہ حکم کو خاص حد تک محدود رکھنے سے خلل ہوگا مقصود میں وہ ہر کام اسی حد تک محدود رکھتے ہیں جہاں تک شریعت نے محدود کر دیا ہے کیونکہ شریعت میں ہر کام کے لئے حدود ہیں حتیٰ کہ ان کاموں کے لئے بھی جن کو مطلقاً محمود سمجھا جاتا ہے جیسے خوف اور شوق جس کو میں نے ابھی تفصیل سے بیان کیا ہے جب ایسی چیزوں کے لئے بھی حدود ہیں تو ان چیزوں کے لئے حدود کیسے نہ ہوں گے جن کے لئے عقول متوسطہ بھی تجویز کرتی ہیں کہ محدود ہوں منجملہ اس کے کسی قوم سے موافقت یا مخالفت کرنا بھی ہے اس کے لئے میں نے یہ آیت پڑھی تھی۔ لایجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لاتعدلوا. (کسی قوم کی عداوت اس کا سبب نہ ہو جائے کہ تم عدل شرعیہ کو چھوڑ دو) میں نے احکام شریعت میں سے بطور مثال کے چند جزئیات بیان بھی کر دی ہیں باقی غور سے دیکھا جائے تو ہر کام کا ایک حکم اور قاعدہ شریعت میں موجود ہے مگر افسوس کہ ہم کو مقصود احکام ہی نہیں رہے بلکہ جو طریقہ اپنی سمجھ میں آ جائے یا جو طریقہ دوسرے لوگ بتائیں وہی مقصود سمجھ لیا جاتا ہے نہ اس میں کسی حد کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ حکم شرعی کی پروا کی جاتی ہے حالانکہ شریعت میں سب کچھ موجود ہے۔ میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بلا شریعت کے ہگنا موتنا اور اٹھنا بیٹھنا بھی نہیں آتا۔ یہ بیان لفظ

استغناء کے ضمن میں شروع ہوا تھا کہ ایک شخص نے تعزیت کے موقع پر اسے نہایت بری صورت کے ساتھ استعمال کیا تھا۔ ایک جوان کی موت ہوگئی تھی اس میں اس نے کہا تھا کہ خدا کی ذات بڑی مستغنی ہے اس میں شک نہیں کہ استغناء حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہے لیکن نہ بایں معنی کہ اس میں بے ڈھنگا پن اور بے رحمی ہے جیسا کہ جہلاء کے کلام میں آج کل اس معنی میں مستعمل ہے بلکہ استغناء بایں معنی ہے کہ ان کا کچھ نہیں بگڑتا جس پر چاہیں رحمت کردیں کیسا ہی گنہگار ہو اس کو معافی دے دیں اور ان کی معافی بلا کدورت ہوتی ہے ہماری طرح سے نہیں کہ اگر ہم کسی کو معافی بھی دیں تو کچھ نہ کچھ کدورت باقی رہتی ہے اور اس سے دل ویسا نہیں ملتا جیسا اس جرم سے پہلے ملتا تھا گو خوشامد درآمد سے معافی دے دیں مگر اندر سے دل صاف نہیں ہوتا اور وہاں کچھ بھی نہیں کوئی کیسا ہی گناہ کرے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ غنی ہیں جب چاہا اور جس کو چاہا معاف کردیا اسی استغناء کا یہ ظہور ہے کہ آیت میں اوپر سے کفار اہل کتاب کے عیوب کا بیان اور ان کی مذمت بڑے شد ومد سے تھی لیکن اس میں سے مومنین کا استثناء بھی کردیا اور ان کے اوصاف بیان فرمادیے یہ نہیں کہ جس طرف چل دیئے اسی طرف چلے جائیں۔ مذمت شروع کی تو مذمت ہی کرتے چلے جائیں بلکہ اس مذمت کو ایک حد پر ختم کردیا اور اس فرقہ میں سے جس کی مذمت ہو رہی تھی ان لوگوں کا استثناء بھی کردیا جو ان اوصاف ذمیمہ سے بری ہیں۔ جن پر اس فرقہ کی مذمت کی گئی تھی پس فرماتے ہیں۔ لَيْسُوْا سَوَآءً ط مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ط وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مستعد ہے دین میں کہ وہ پڑھتے ہیں خدا تعالیٰ کی آیتوں کو رات دن اور عبادت کرتے ہیں۔ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور آخرۃ پر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مسارعت کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ مطلب یہ کہ سب اہل کتاب برابر نہیں ہیں۔ ان میں سے جو اسلام لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے اعمال درست کر لئے ہیں وہ اہل اسلام ہی کے زمرہ میں ہوگئے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اہل کتاب ہی رہے اور مومن نہیں ہوئے۔ صرف یہ اعمال جو آیت میں مذکور ہیں ان کے اختیار کرنے سے چونکہ وہ اعمال خیر ہیں اس لئے وہ باوجود اہل کتاب رہنے کے اور باوجود مومن نہ ہونے کے مقبول ہوگئے۔ آج کل اس مسئلہ کے متعلق بھی مذاق بگڑ گیا ہے بہت سے لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ زبردستی ہے کہ صرف اہل اسلام کو جنتی اور ناجی کہا جائے۔ دوسرے

مذاہب میں بھی اہل خیر لوگ موجود ہیں ان کو بھی ناجی اور جنتی کیوں نہ کہا جائے۔اہل کتاب کی اس تقسیم سے یہ شبہ ہوا ہے کیونکہ یہاں مقسم اہل کتاب ہیں اور مقسم کا قسم پر صادق آنا ضرور ہے تو یہ حاصل ہوا کہ یہ گروہ بھی اہل کتاب تو ہیں مگر ان اوصاف کے ساتھ متصف ہونے سے ناجی اور جنتی اور صالحین میں سے ہو گئے مگر ان لوگوں نے اور نصوص کو نہیں دیکھا۔

قرآن پر ایمان لانا شرط ایمان ہے

مثلاً قرآن پر ایمان لانا شرط ایمان ہے قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب تم کسی شمار میں بھی نہیں ہو جب تک کہ انجیل اور توراۃ پر اور اس پر جو اب اتارا گیا ہے یعنی قرآن پر پورا عمل نہ کرو اور ارشاد وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ یہ خطاب اہل کتاب ہی کو ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے اتاری ہے کہ وہ تمہاری کتابوں کی بھی تصدیق کرنے والی ہے اور اس کے ساتھ اول کافر نہ بنو یعنی اگر تم اس کا انکار کرو گے تو کافر ہو گے اور سب سے اول درجہ کے کافر ہو گے کیونکہ تم اہل علم ہو اور پہلے بھی تم کو کتاب مل چکی ہے برخلاف مشرکین کے کہ وہ اہل علم نہیں اور کسی کتاب کو نہیں مانتے ان سے اس کتاب کا انکار بھی اتنا بعید نہیں جتنا تم سے ہے اس آیت میں بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ سے سوائے قرآن کے اور کچھ مراد نہیں ہو سکتی۔ لہذا ثابت ہوا کہ قرآن پر ایمان لانا بھی شرط ایمان ہے بلا اس کے آدمی مومن نہیں ہو سکتا کافر ہی رہے گا اور کافر کی نجات نہیں اور ظاہر ہے کہ تمام قرآن حضور کی رسالت سے بھرا پڑا ہے قرآن پر جو کوئی ایمان لائے گا وہ حضور کی رسالت کا ضرور قائل ہو گا اس سے ثابت ہوا کہ بلا حضور کی رسالت پر ایمان لائے بھی نجات نہیں ہو سکتی تو اب اس شبہ کی گنجائش کہاں رہی کہ اس آیت میں صرف وہ اعمال مراد ہیں جو آیت میں مذکور ہیں اور ان میں قرآن پر ایمان لانے اور حضور کی رسالت کے قائل ہونے کا ذکر نہیں جواب یہ ہے کہ دوسری نصوص کی وجہ سے ان اوصاف کو مقید ماننا پڑے گا ایمان بالقرآن اور تصدیق رسالت کے ساتھ۔ رہا ان پر اہل کتاب کا صادق آنا یہ باعتبار ماضی کے ہے جیسا کہا جاوے کہ اس نابالغ جماعت میں سے بعضے بالغ ہو گئے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ نابالغ بھی رہے۔ غرض یہ شبہ محض لغو ہے اہل کتاب کا عنوان صرف اس واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اہل کتاب ایمان لائیں گے تو یہ نہ سمجھا جاوے کہ کسی وقت میں ان کا اہل

کتاب ہونا مانع ہوگا مقبولیت سے اور بعد ایمان کے بھی حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کدورت باقی رہ جائے گی بلکہ ان کو وعدہ دیا جاتا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں گے اور یہ اوصاف اختیار کریں گے تو وہ مومنین اور صالحین ہی میں شمار ہوں گے اور کوئی کدورت ان کی طرف سے باقی نہ رکھی جائے گی اور یہ معنی نہیں ہیں کہ بلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے یہ اعمال نجات کے لئے کافی ہو جائیں گے افسوس ہے کہ اچھے اچھے لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاس اس قسم کے سوالات آتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے موجود ہیں کہ وہ عالم ہیں فاضل ہیں بڑی بڑی قابلیتیں رکھتے ہیں۔ نیک مزاج نیک طینت ہیں کسی کے ساتھ برائی نہیں کرتے توحید کے بھی قائل ہیں۔ اور انہوں نے بڑے بڑے علوم وفنون کے حاصل کرنے میں عمریں صرف کردی ہیں۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے تو ایسے شخص کو یہ کہہ دینا کہ خالد فی النار ہوگا یہ تعصب ہے یا نہیں۔ میں نے جواب میں لکھا کہ اگر ایسا ہی شخص جس میں اتنی قابلیتیں موجود ہوں نیک مزاج اور سخی بھی ہو غرض کہ سارے اوصاف اس میں جمع ہوں عیب صرف اتنا ہو کہ حاکم وقت سے بغاوت کرے تو اس کے واسطے حاکم کیا تجویز کرے گا اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بغاوت کی دفعہ لگا کر پھانسی یا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بڑا تعصب ہے کہ ایسے شخص کو جو اتنی بڑی بڑی قابلیتیں رکھتا ہو اور متعدد اوصاف حمیدہ اس میں جمع ہوں صرف ایک برائی کی وجہ سے اس کو وہی سزا دی جائے جو ایک بدمعاش بدچلن غیر تعلیم یافتہ نا قابل باغی کو دی جاتی ہے۔ اگر یہ تعصب ہے تو وہ بھی تعصب ہے۔ اگر یہ تعصب نہیں تو پھر اس کے تعصب کہنے کی کیا وجہ۔ بات یہ ہے کہ لوگوں کے مذاق ایسے بگڑ گئے ہیں کہ جب تک یورپ کا قانون کسی بات کی موافقت نہ کرے اس وقت تک چاہے کتنی ہی دلیلیں عقلی نقلی پیش کی جاویں تسلی نہیں ہوتی میرے اس جواب اور اس نظیر کے دینے سے تسلی ہوگئی۔ یہ بھی افسوس کی بات ہے کہ ہم اور تسلی کے لئے ان نظائر پیش کرنے کے محتاج۔ ہم کو تو حق تعالیٰ نے وہ چیز دی تھی کہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز کسی کے پاس ہو ہی نہیں سکتی۔ شریعت ایسی صاف وصحیح اور سہل سمجھ میں آتی ہوئی عقل و فطرت کے موافق ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے چاہیے تو یہ تھا کہ اس کے اصول اور قوانین سے دوسرے لوگ اپنے دعووں کو ثابت کیا کرتے نہ کہ ہم کو حاجت پڑتی ہے کہ ہم اپنے دعووں کو ان کے قانون ونظائر سے ثابت کریں خلاصہ یہ ہے کہ جب باغی کے تمام کمالات ایک جرم بغاوت کے ہوتے ہوئے مقبول نہیں تو ایسے ہی تمام قابلیتیں اور علم وفضل اور نیکی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار نبوت کے ساتھ مقبول نہیں ہوسکتیں۔ یہ بہت موٹی بات ہے۔

کافر کے اعمال کا صلہ

البتہ دنیا کے حکام میں اور حق تعالیٰ میں اتنا فرق ہے کہ حق تعالیٰ چونکہ بڑے عادل ہیں انہوں نے باغیوں کے حقوق کی بھی رعایت فرمائی ہے جو کسی سلطنت میں نہیں ہے وہ رعایت یہ ہے کہ کافر کے بھی بعض اعمال کا صلہ دے دیتے ہیں مثلاً کسی کافر میں عدل وصلہ رحم وغیرہ کے اوصاف بھی ہیں تو اس کی نسبت وعدہ فرماتے ہیں۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ.

ترجمہ جو کوئی حیات دنیا اور اس کی زینت یعنی عیش وآرام کو (مقصود بالذات کے درجہ میں) چاہتا ہو (اس کا مصداق کافر ہو سکتا ہے) تو اس کے اعمال کی جزا اس کو دنیا میں ہم پوری دیتے ہیں اور اس میں کچھ کمی نہیں کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کافر کے اعمال کے صلہ میں اس کو دنیا دی جاتی ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ کافر کے اعمال بھی ضائع نہیں کئے جاتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی جزا دنیا میں دے دی جاتی ہے آخرت کے لئے کچھ نہیں باقی رہتی کیونکہ آگے آیت میں اس کی تصریح موجود ہے ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں سوائے دوزخ کے اور حبط ہو جائے گا جو کچھ انہوں نے کیا اور بیکار ہیں جو عمل کرتے تھے یعنی یہ اعمال ان کے آخرت میں کچھ بھی کام نہ دیں گے جو کچھ ملنا تھا دنیا میں مل چکا۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ کفار کے اعمال بھی ضائع نہیں جاتے کچھ نہ کچھ ثمرہ ملتا ہے دنیا ہی کا سہی۔ دنیا میں ثروت وغیرہ جو کفار کو حاصل ہے ممکن ہے کہ یہ ان کے نیک اعمال کا صلہ ہو اس لئے کہا کہ اعمال علت ہیں شرط نہیں بدوں اعمال کے بھی یہ چیزیں کسی حکمت سے مل جاتی ہیں یہاں سے یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ یہ حقیقت ہے اس ثروت اور تمول کی جس پر مسلمانوں کی رال ٹپکی پڑتی ہے کہ چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے اسی لئے حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس باب میں تسلی دیتے ہیں۔

کفار کا بے بنیاد ثمرہ

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی کفار کا عمل دخل دنیا میں دیکھ کر فریب مت کھاؤ یہ بہت تھوڑی چیز ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے جو بہت بری جگہ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی بڑے حریص ہو جو ان کی جاہ وثروت پر رشک کرتے ہو تم کو رحم نہیں آتا کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے کے لئے ہیں ان کو کچھ تو مل جانے دو۔ دو چار دن تو وہ دل خوش کر لیں پھر جہاں جائیں

گے جائیں گے غرض یہ حق تعالیٰ کا کمال عدل ہے کہ ان کی نیکیاں بھی جو دراصل نیکی کہے جانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ ان میں مغز یا جڑ جس کو کہتے ہیں وہ بالکل نہیں ہے وہ جڑ کیا ہے ایمان جب جڑ ہی نہیں تو شاخ کیا ہری ہوگی اور کیا پھلے پھولے گی صرف ایک صورت اور نقل ہے نیکی کی جیسے کاغذ کے پھول کہ صرف نقل ہے پھول کی مگر اس نقل کا بھی وہاں اپنے درجہ کے موافق اعتبار کیا جاتا ہے اور اس پر بھی ثمرہ مترتب کیا جاتا ہے گو جیسی نیکی بے اصل ہے ایسا ہی ثمرہ بھی بے بنیاد دیا جاتا ہے۔ یعنی دنیا کا کہ چند روزہ ہے اور فنا ہو جانے والا ہے ان کو وہ ثمرہ نہیں ملتا جو اہل ایمان کو ملے گا کہ وہ پائیدار اور غیر فانی ہوگا اور خود یہ بھی مقتضا عدل ہی کا ہے کہ اصل اور نقل کو برابر نہ کیا جاوے۔ غرض نیکی کا ثمرہ ضرور ملتا ہے مسلمان بہت سے کار خیر کرتے ہیں مگر کوئی ثمرہ نہیں حاصل ہوتا اور کفار کار خیر کرتے ہیں تو فوراً پھلنے پھولنے لگتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نیکی میں یہ اثر نہیں ہے کہ اس پر ثمرہ مترتب ہو اس کا خاصہ تو یہی ہے لیکن نیکی کے ساتھ ہم لوگ بداعمالیاں بھی کرتے ہیں اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اس پر سزا دی جائے اب کوئی کہے کہ بداعمالیاں وہ بھی تو کرتے ہیں تو ان کو بھی سزا ملنی چاہئے میں کہتا ہوں کہ ان کو سزا تو سب سے اشد ملے گی مگر دنیا میں سزا نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ سب آخرت کے لئے جمع ہو رہی ہے دوسرے اپنوں کی اصلاح مقصود ہوتی ہے اس لئے فوراً تنبیہ کی جاتی ہے اور غیروں کی اصلاح تو مقصود ہوتی نہیں اس لئے ان کی بڑی بڑی خطاؤں پر بھی فی الحال ایسی نظر نہیں کی جاتی۔ غرض اپنوں کے ساتھ برتاؤ اور ہوتا ہے اور غیروں کے ساتھ اور سو کفار کے ساتھ غیروں کا سا برتاؤ ہے اور تمہارے ساتھ اپنوں کا سا۔ اس وجہ سے ان کی بداعمالیوں پر فی الفور سزا نہیں دیتے اور ان کی نعمت کو سلب نہیں کرتے اور تمہاری بداعمالیوں پر سزا دیتے ہیں اور نعمت سلب کر لیتے ہیں اور ایک عدل اور ہے وہ یہ کہ کفار اگرچہ سب جہنم میں جائیں گے لیکن سب کو یکساں سزا نہیں دی جائے گی کوئی جہنم کے اول طبقہ میں بھیجا جائے اور کوئی ساتویں میں جیسے جس کے جرائم ہوں گے۔ حالانکہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ خدائے تعالیٰ جو کچھ بھی کریں کوئی روکنے والا تو کیسا کوئی پوچھنے والا بھی نہیں کہ یہ کیوں کیا جس کی یہ شان ہو وہ جو کچھ بھی کرے یعنی سارے کفار کو ساتویں طبقہ میں بھیج دے تو کوئی بول نہیں سکتا نیز حکیم ہونے کے سبب وہ سب بجا اور برمحل ہوتا لیکن حق تعالیٰ ایسا نہیں کرتے کفار کے معاملات میں بھی ان کے مراتب کی رعایت رکھی ہے جو اول طبقہ کے قابل ہے اس کو اول طبقہ میں رکھا اور جو ساتویں طبقہ میں رکھنے کے قابل ہے اس کو ساتویں میں۔ دیکھنے کی بات ہے کہ حق تعالیٰ باوجود مختار مطلق ہونے کے حدود کی کس

درجہ رعایت فرماتے ہیں اور ہم بالکل غیر مختار اور پابند لیکن حدود کی رعایت نہیں کرتے حتیٰ کہ اگر خادم سے خطا ہو جائے تو وہ کسی طرح معاف نہیں کرتے بلا سزا دیئے جرمانہ کئے مارے پیٹے غصہ نہیں فرو ہوتا اس کی تمام خدمات نسیاً منسیا کر دی جاتی ہیں یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہی معاملہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ کریں کہ کسی خطا کو بلا سزا نہ چھوڑیں تو ہمارا کیا حال ہو حالانکہ ہم خادم کا کر ہی کیا سکتے ہیں بہت سے بہت یہ کہ مار پیٹ لیں تنخواہ کاٹ لیں۔

اللہ تعالیٰ کے غصہ سے بچنے کی تدبیر

اور حق تعالیٰ سب کچھ کر سکتے ہیں ان کا غصہ ایسا نہیں جو برداشت کیا جا سکے مگر وہ ایسا غصہ نہیں کرتے ان کے غصہ کے ناقابل تحمل ہونے کو مولانا فرماتے ہیں۔

گفت عیسٰی را یکے ہشیار سر چیست در ہستی ز جملہ صعب تر
گفت اے جان صعب تر خشم خدا کہ ازو دوزخ ہمی لرزد چو ما

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ سخت چیز کیا ہے۔ فرمایا خدائے تعالیٰ کا غصہ جس سے دوزخ بھی تھراتی ہے آگے ہمارے لئے ایک تعلیم نقل فرماتے ہیں۔

گفت از خشم خدا چہ بود اماں گفت ترک خشم خویش اندر زماں

یعنی پھر اس نے پوچھا کہ اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہے فرمایا تدبیر یہ ہے کہ تم اپنے خطا کاروں کی خطاؤں کو معاف کیا کرو حق تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو معاف فرمائیں گے۔ غرض باوجودیکہ حق تعالیٰ کا غصہ اس قدر شدید اور ہولناک چیز ہے اور ان کو اس کے اجرا پر ہر طرح قدرت بھی ہے لیکن اس سے کام نہیں لیتے بلکہ عفو و کرم سے کام لیتے ہیں اور اس قدر عفو و کرم کو وسعت دی ہے کہ اس پر بھی رحم فرماتے ہیں جو دوسروں پر رحم و کرم کرتا ہے۔ ہم لوگوں کی سی حالت نہیں کہ ذرا سی بات پر غصہ سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور جا بے جا کسی کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ غصہ بھی ہم لوگوں کے لئے ایک خطرناک اور مہلک مرض ہے۔ حیرت یہ ہے کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ایسا مرض ہے مگر علاج کی طرف مطلقاً توجہ نہیں حالانکہ علاج اس کا کچھ دشوار نہیں۔

غصہ کا علاج

بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے حالات میں غور کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اگر غور کرتے رہیں تو اپنے نفس پر ہم کو ضرور قدرت رہے مثلاً غصہ کے وقت یہی سوچ لیا کریں کہ ہمارے اوپر بھی کوئی بڑا اور حاکم ہے وہ بھی ہم پر ہماری خطاؤں پر ایسے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ گرفت کر سکتا ہے جیسے ہم اپنے چھوٹوں کو پکڑتے ہیں تو اس سوچنے سے غصہ کا علاج ہو جاوے اور حد سے تجاوز نہ ہو۔ اور

اگر ہم لوگوں میں سے کبھی کوئی غور بھی کرتا ہے تو بے طریقہ جس سے بجائے نفع کے الٹا اور نقصان ہوتا ہے مثلاً خشیت کے غلبہ سے بعضے لوگ اپنے اس برتاؤ کو دیکھ کر یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ جیسے ہم کسی سے درگزر نہیں کرتے ایسا ہی حق تعالیٰ کے یہاں بھی ہمارے ساتھ ہوگا یعنی وہاں بھی ہم سے درگزر نہیں کی جائے گی۔ بعض وقت یہ خیال اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ یاس تک کی نوبت آ جاتی ہے جس کا اخیر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب مغفرت کی امید نہیں رہتی تو گناہوں پر جسارت اور دلیری ہو جاتی ہے۔ اور اپنے خیال میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ سزا تو ہو ہی گی جہنم میں تو جاویں ہی گے پھر دل کھول کر کیوں گناہ نہ کرلیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے۔ حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ اپنے اوپر قیاس کیا یہ شبہ یاس عن المغفرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی بعض لوگوں کو ہوا تھا حتیٰ کہ ان کو اسلام لانے سے مانع ہو گیا۔ اور انہوں نے یوں کہا کہ اگر ہم ایمان لے ہی آئے تو کیا نتیجہ ہوگا۔ ہم بہت سے گناہ کر چکے ہیں زنا ہم نے کیا قتل ہم نے کیا۔ اب ایمان لائیں گے بھی تو ان گناہوں سے کیسے چھٹکارا ہوگا اس پر یہ آیت اتری۔ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا. اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ یعنی حق تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس مت کرو حق تعالیٰ اسلام لانے سے سارے گناہ معاف کر دیں گے اور یہ وہ آیت ہے جس کو مسلمانوں نے غیر محل پر محمول کر کے اپنے واسطے پشت پناہ بنا لیا ہے۔ بے دھڑک گناہ کرتے ہیں اور جب کوئی کہتا ہے تو یہ آیت پڑھ کر جواب دے دیتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے مغفرت کا وعدہ کر لیا ہے۔ آیت اتری تھی کس مقصود کے لئے اور کر لی انہوں نے اپنے اغراض کے لئے اتری تھی ان کے واسطے جن کو استحضار معصیت مانع عن الایمان تھا اور کر لیا لوگوں نے جرات علی المعصیت کے لئے۔ خیال کیجئے کس قدر بیجا تصرف ہوا۔ ہر چیز کا ایک موقع محل ہوتا ہے۔ آیتیں تو اس لئے اتری تھیں کہ ان سے یاس قطع ہو کر تقویٰ حاصل ہو اور طاعات کا شوق ہو اور معاصی سے بعد و اجتناب ہو۔ لیکن یہ تو جبھی ہوتا ہے جب ان سے موقع اور محل پر کام لیا جائے اور جب بے موقع کام لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ بھی الٹا ہوگا اس آیت میں آپ بحالت موجودہ مراد نہیں وہ لوگ مراد ہیں جن کے لئے استحضار معصیت مانع عن الایمان تھا۔ ان کو اس آیت سے بے حد نفع ہوا اس کی برکت سے ایمان لائے اور معاصی سے بچ گئے۔ آپ اس سے بے موقع کام لیتے ہیں اس واسطے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اور جرات علی المعصیت پیدا ہوتی ہے آج کل یہ مرض عام ہو رہا ہے کہ وعدہ اور وعید کو بے موقع استعمال کیا جاتا ہے اگر کوئی موقع بے موقع کا معیار پوچھے تو اس کا جواب نافع ہمارے پاس صرف یہ ہے کہ کچھ دنوں ہمارے پاس رہو تب بتلا

دیں گے کہ کونسا موقع ہے وعدہ سے کام لینے کا اور کون سا موقع ہے وعید سے کام لینے کا۔ یہ میں نے اس باب میں صرف ایک عام غلطی کا حال بیان کردیا ورنہ یہ مقصود نہیں کہ رحمت الٰہی کو تنگ کیا جاوے اور ایسی آیت کو آپ سے چھین لیا جاوے جس سے بڑھ کر شاید دوسری آیت قرآن میں رحمت کی ہو۔ ایک واقعی بات کو بیان کردیا کہ یہ آیت بلحاظ شان نزول کے تمہارے واسطے نہیں ہے مگر اس سے غم نہ کیجئے یہ آیت نہ سہی سارا قرآن آپ کے واسطے موجود ہے جس میں رحمت ہی رحمت ہے قرآن کی ہر آیت رحمت ہے حتیٰ کہ عذاب کی آیتیں بھی۔

آیت مداینۃ سے متعلق ایک بزرگ کا ارشاد

ایک بزرگ کا لطیفہ سنئے کہ آیت مداینہ کو انہوں نے فرمایا کہ بڑی رحمت کی آیت ہے حالانکہ اس میں کہیں رحمت وعذاب کا ذکر بھی نہیں اس میں بعض معاملات کا ذکر ہے وہ آیت یہ ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ (اے ایمان والو جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعاد معین کے لئے تو اس کو لکھ لیا کرو) آخر رکوع تک یہ بہت بڑی آیت ہے حتیٰ کہ اس سے بڑی کوئی اور آیت قرآن شریف میں نہیں ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے کہ جب ادھار کا کوئی معاملہ کرو تو اس کو لکھ لو اس کے بعد کاتب کے لئے کچھ ہدایات ہیں پھر یہ ارشاد ہے کہ دو گواہ کرلو پھر گواہوں کے متعلق کچھ ہدایات ہیں پھر آگے دین کا ذکر ہے اور اس کے متعلق کچھ ہدایات ہیں غرض اس آیت میں اول سے آخر تک کہیں عذاب ثواب کا ذکر نہیں صرف بعض معاملات کا ذکر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں وہ طریقے بتائے ہیں کہ جن سے معاملہ صاف رہے اور آپس میں نزاع نہ ہو نہ کسی کا مال تلف ہو وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ رحمت کی کوئی آیت نہیں کیونکہ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ جب حق تعالیٰ نے ہمارے دنیا کے چند پیسوں کی حفاظت کے لئے اتنی بڑی آیت اتاری اور ہمارے اتنے بھی نقصان اور تکلیف کو گوارا نہیں فرمایا تو ہمارا جہنم میں جانا کیسے گوارا فرمائیں گے دیکھئے ان بزرگ کا فہم کہاں پہنچا اسی طرح یہ بات دیکھنے کی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم تک اپنے احکام ایسی ذات مقدس کے زبانی پہنچائے جن کی شان رحمۃ للعالمین ہے اور جو از سرتا پا رحمت مجسم ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی فرشتہ کے ہاتھ بھیج دیتے۔ جو کوئی ان احکام کو مانتا اس کی نجات ہو جاتی اور جو نہ مانتا وہ معذب ہوتا حضور کی معرفت بھیجنے میں کیا مصلحت ہے سو سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ رحمت مجسم کو درمیان میں واسطہ بنانا مقتضائے رحمت ہی ہے اور اس لئے ایسا کیا ہے۔

نماند بعصیان کسے در گرو ۔۔۔ کہ دارد چنیں سید پیشرو

(وہ شخص دوزخ میں نہ رہے گا جو ایسا سردار پیش رو رکھتا ہو)

صاحب قصیدہ بردہ کہتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کو خوش ہونا چاہئے کہ ہم کو رحمت کا ایک ایسا سہارا ملا ہے جو ٹلنے والا نہیں۔

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا وجود سراپا رحمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود ہمارے واسطے سراپا رحمت ہے۔ مجموعہ قرآن کو حضور کے ہاتھ بھیجنا رحمت کی بین دلیل ہے تو ایسی حالت میں عذاب کی آیتیں بھی ہمارے حق میں رحمت ہی کی آیات ہوگئیں یہ بات طالب علموں کو تعجب کی معلوم ہوتی ہوگی کیونکہ آیتیں دونوں قسم کی جدا جدا ہیں ثواب کی بھی اور عذاب کی بھی تو عذاب کی آیتوں کو رحمت کی آیات کیسے کہہ دیا جائے۔ وعدہ اور وعید دو متقابل چیزیں ہیں دونوں کو ایک کیسے سمجھ لیا جائے۔ لیکن یہ بات غور کرنے سے اس طرح سمجھ میں آجائے گی کہ مثلاً باپ بچے سے کہے کہ یہ چیز نہ کھانا اس سے پیچش ہو جائے گی تو یہ حکم اگرچہ بچے کی طبیعت کے خلاف اور اسے ناگوار بھی ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ واقع میں یہ حکم باپ کی طرف سے رحمت ہے یا غضب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ غضب ہے کیونکہ غایت رحمت سے باپ نے اس کو اس تکلیف دہ چیز سے روکا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے جن باتوں سے روکا ہے اور ان پر وعیدیں فرمائی ہیں ان سے بھی مقصود ہے کہ یہ باتیں بری اور آئندہ تکلیف دینے والی ہیں جس کا انجام آخر میں ہلاکت ہے اس سے بچو تاکہ تکلیف سے بچو۔ حاصل یہ کہ آیات عذاب کے اتارنے کا بھی منشاء رحمت ہے۔ اب وہ استعجاب جاتا رہا ہوگا کہ آیات عذاب کس طرح آیات رحمت ہیں اور اس کی تائید میں سورہ رحمٰن کو پیش کرتا ہوں جس میں یہ آیت بار بار مکرر آئی ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (پس اپنے رب کی کون کونسی نعمت کی تکذیب کرو گے) اس سورہ میں تین قسم کے مضمون ہیں۔ اول رکوع میں آیات توحید ہیں اور دوسرے رکوع میں آیات عذاب اور تیسرے رکوع میں جنت کا بیان۔ اول اور سوم میں یعنی توحید اور جنت کے بیان میں تو فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ظاہراً بھی بے جوڑ نہیں لیکن جہنم کے ذکر کے ساتھ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کا کیا جوڑ ہو سکتا ہے مثلاً فرماتے ہیں فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ یعنی قیامت کے دن کسی جن وانس کا عذر گناہ کے متعلق نہ چلے گا۔ اس کے آگے پھر وہی فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ہے اس میں کونسی نعمت تھی جو یاد دلائی گئی آگے ہے يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ یعنی گنہگاروں کو ان کے چہروں سے پہچان لیا جائے گا پھر یہ گت بنے گی کہ ایک طرف سے بال پکڑے جائیں گے اور ایک طرف سے

پیراور دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔اس کے آگے بھی فرماتے ہیں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ اس میں کونسی نعمت ہے جس کو جتلایا گیا۔آگے ہے هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُکَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ یعنی بطور سرزنش کہا جائے گا یہ وہی جہنم ہے جس کو مجرمین جھٹلایا کرتے تھے حاصل یہ کہ ان کی یہ حالت ہوگی کہ کبھی آگ میں جلائے جائیں گے اور کبھی ماء حمیم پلایا جائے گا۔جس سے آنتیں کٹ پڑیں گی بتایئے کس قدر سخت عذاب ہے لیکن اس کے ساتھ بھی وہ آیت ملی ہوئی ہے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (حق تعالیٰ شانہ کا عذاب سے ڈرانا بھی رحمت ہے ان ساری آیتوں میں سے کسی میں بھی رحمت کا ذکر نہیں بلکہ عذاب ہی عذاب کا ذکر ہے پھر کس نعمت کو یاد دلایا اور اس کا کیا جوڑ ہوا۔دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ کہا جائے کہ یہ آیت نعوذ باللہ جا بجا بے جوڑ ہے یا کچھ جوڑ بتلایا جائے۔ بے جوڑ تو ہو نہیں سکتی اس واسطے کہ قرآن شریف ایسا کلام ہے جس کی فصاحت و بلاغت صرف مسلمانوں ہی کے نزدیک مسلم نہیں بلکہ بے دینوں اور دشمنوں اور مخالفین کے نزدیک بھی مانی ہوئی ہے اور کلام کے لئے اس سے زیادہ کوئی عیب نہیں ہوسکتا کہ اس میں جوڑ اور ربط بھی نہ ہو۔غرض قرآن میں اس شق کا تو احتمال ہی نہیں پس یہ یقینی بات ہے کہ جوڑ ہے وہ جوڑ یہی ہے کہ عذاب کو یاد دلایا گیا تا کہ اس کے موجبات سے لوگ بچیں اور رحمت کے مستحق ہوں جیسے کہ باپ نے بچے کو ڈرایا تھا کہ اس چیز کو مت کھانا اس سے پیچش ہو جائے گی۔ یہ اس نے اسی واسطے کہا کہ بچہ اس تکلیف دہ چیز سے بچ جائے اور پیچش کی تکلیف نہ اٹھائے جس طرح باپ کا ڈرانا رحمت تھا اسی طرح حق تعالیٰ کا عذاب کو بیان کرنا بھی رحمت ہے اسی کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ یعنی ہماری تمہارے اوپر ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ ہم تم کو ایسے ایسے عذابوں سے بچانا چاہتے ہیں تم کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے اس آیت کے تکرار سے میرے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ آیات عذاب بھی آیات رحمت ہیں اب غور کرنے کی بات ہے کہ جن کی آیات عذاب بھی رحمت ہوں تو آیات رحمت کا کیا حال ہوگا اس کو کس لفظ سے بیان کیا جائے۔تو اگر آیت لاتقنطوا نومسلموں کے لئے بھی خاص ہو تو غم نہ کیجئے۔آپ کے لئے سارا قرآن موجود ہے جس کا ہر ہر جزو رحمت ہے۔نومسلموں کے لئے تو وہ آیت تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ اسلام لانے سے اس سے پہلے کے سب گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں آپ کے لئے ایسی صدہا آیتیں موجود ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ انابت الی اللہ کرنے اور توبہ کرنے سے اور گناہ پر شرمندہ ہونے سے سارے گناہ محو کر دئے جاتے ہیں اور حق تعالیٰ ان کو نسیاً منسیا کر دیتے ہیں ان کی تو یہ شان ہے۔

اگر خشم گیرد بکردار زشت چو باز آمدی ماجرا در نوشت

(اگر اللہ تعالیٰ برے کاموں کی وجہ سے غصہ کریں جب تم باز آجاؤ ماجرا بیت دیں)

عقائد کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بڑے سے بڑا گناہ ساری عمر کرتا رہے اور اخیر میں سچے دل سے توبہ کرلے اور پشیمان ہو تو توبہ اس کی مقبول ہے اور جیسا کہ اسلام لانے سے کفر محو ہو جاتا ہے اس طرح توبہ کرنے سے بھی گناہ محو ہو جاتے ہیں جیسے یہ حدیث ہے۔

الاسلام يهدم ما كان قبله (طبقات ابن سعد ۴:۳)

یعنی اسلام ان تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے جو اسلام لانے سے پہلے کے ہوں اسی طرح یہ حدیث ہے

ان الله يقبل توبة العبد مالم يغرغر (سنن الترمذی: ۳۵۳۷)

بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرماتے ہیں جب تک غرغرہ نہ چلے (رواہ الترمذی)

اور وہاں خود اس کا انتظار کیا جاتا ہے کہ گنہگار توبہ کرے اور ہم اس کے گناہ معاف کردیں چنانچہ ارشاد ہے **يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا.** الایہ اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے خالص توبہ کرو۔ اس میں کوئی قید نہیں عام حالات میں عام خطاب اس کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

باز آ باز آ ہر انچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

وہاں آپ کے یہاں کا سا معاملہ نہیں ہے کہ اگر آپ کا نوکر ایک دفعہ چوری کرے تو آپ ہرگز درگزر نہیں کرتے اور ضرور سزا دیتے ہیں اور کم سے کم اتنا تو ضرور ہی کریں گے کہ اس کو موقوف کردیں گے اور پھر اپنے یہاں نہ رکھیں گے۔ یہ اول خطا کا نتیجہ ہے اور اگر خوشامد درآمد سے ایک خطا کے بعد رکھ بھی لیا تو دوبارہ خطا کے بعد تو اس کو مار پیٹ بھی کریں گے اور نکال بھی دیں گے اور سہ بارہ کے بعد تو یہ مشہور ہے سہ بارہ خطا مادر بہ خطا۔ اور حق تعالیٰ کے یہاں ایسا نہیں ایک دفعہ دو دفعہ دس دفعہ سو دفعہ کی بھی قید نہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی خطا کرے اور اس کے بعد توبہ کرلے تو وہ پچھلی خطا کالعدم کردی جاتی ہے اور معمولی اعمال تو کیا اگر ایک دفعہ بھی کوئی مرتد ہو جائے اور پھر سچے دل سے ایمان لے آئے تب بھی ارشاد ہوگا آجاؤ۔ اور اس لاکھ دفعہ لوٹ پھیر کا کبھی ذکر بھی نہ کریں گے۔

اے خدا قربان احسانت شوم

(اے اللہ تیرے احسان پر میں قربان ہوں)

اس توبہ میں نہ کسی شخص کی تخصیص ہے نہ کسی خطا کی۔ وہاں کا تو قانون یہ ہے۔

ہر کہ خواہد گو بیاء و ہر کہ خواہد گو برو دار و گیر و حاجب و دربان دریں درگاہ نیست

(جو شخص آنا چاہے آجائے جو شخص جانا چاہے چلا جائے اس دربار میں دربان چوبداری ڈیوڑھی بان نہیں ہے)

جو آنا چاہے اس کے لئے کوئی مانع نہیں اور جس آئے ہوئے کو ناز ہو کہ ہم کچھ ہیں اس سے کہو نکل جائے یہاں کچھ پروانہیں وہ دربار قادر مختار کا ہے وہاں مصاحبین اور وزراء پر دارومدار نہیں۔ کوئی دوسرا دربار ایسا نہیں جس کو دیکھ کر اس دربار کی شان کا کچھ اندازہ کیا جا سکے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ. وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (اس کے مثل کوئی شئی نہیں اور وہ سننے والے دیکھنے والے ہیں) تو اپنے غصہ پر ان کے غصہ کو قیاس نہ کرو تم غصہ میں بے اختیار ہو جاتے ہو وہ بے اختیار نہیں ہوتے وہاں غصہ غیر اختیاری نہیں۔ اختیاری ہے۔ ایک بات اور یاد آئی جس سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں کس قدر رحمت ہے اور حدود کی کس قدر رعایت ہے۔

والدین کے حقوق کی رعایت

یہ شریعت کا مسئلہ ہے کہ ایک شخص مسلمان ہو اور ماں باپ اس کے کافر ہوں تو اس کے لئے یہ حکم تو نہیں ہے کہ اس حالت میں اس کی اطاعت کرو لیکن یہ حکم اب بھی ہے کہ ان کا ادب کرو۔ حتیٰ کہ اگر جہاد میں بیٹا تو مسلمانوں کے ساتھ ہو اور باپ کافروں کے ساتھ اور دونوں کا مقابلہ ہو جائے تو ایسی حالت میں بیٹے کو یہ اجازت نہیں کہ باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے ہاں اگر ایسی ہی ضرورت پڑ جائے تو وہ کسی دوسرے مسلمان کو باپ کے مقابل کر دے کہ وہ قتل کر دے دیکھئے شریعت میں کس قدر حدود کی رعایت اور کیسا عدل ہے۔ اور حکمت اس رعایت میں یہ ہے کہ باپ تمہاری ہستی کا واسطہ بنا ہے لہذا تم اس کی نیستی کا سبب نہ بنو رہا یہ کہ وہ تم کو جہنمی بنانا چاہتا ہے یعنی مرتد کرنا تو تم اس کے جواب میں اسے جہنمی کیوں نہ بنا دو یعنی قتل کیوں نہ کر دو کہ ابھی جہنم میں پہنچ جاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہنمی بننا نہ بننا فعل اختیاری ہے وہ باوجود اغوا کے اس میں واسطہ نہیں بن سکتا تم اگر اغوا کے بعد جہنمی بنو گے تو اپنے اختیار سے بنو گے وہ تم کو مجبور نہیں کر سکتا۔ بخلاف خلق اور تکون کے جس میں وہ واسطہ بنا ہے کہ وہ تمہارے اختیار سے نہیں ہوا لہذا اس کا احسان اس اساءت سے بڑھا رہا۔ دیکھئے حقوق کی کتنی بڑی رعایت ہے اور باپ کا کتنا بڑا حق مقرر فرمایا۔ یہ مضمون اس آیت میں بھی ہے۔ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ . فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی اگر وہ اس بات پر زور دیں کہ تم شرک کرو تو اس بات میں ان کا کہنا نہ مانو لیکن اس پر بھی دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو پھر تم سب میری طرف اور میرے ہی یہاں آؤ گے پھر میں ایک ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دوں گا۔ اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ جب باپ نے شرک کیا تو وہ باغی

ہے اور اسی بغاوت کی طرف بیٹے کو بھی بلاتا ہے اس سے اور بغاوت میں اضافہ ہوا لیکن پھر بھی شریعت میں اس کے کچھ حقوق مقرر ہیں۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلی کہ رحمت حق تعالیٰ کی اس قدر وسیع ہے کہ اس نے باغی کے بھی حقوق رکھے ہیں کہ مسلمان بیٹے کو اجازت نہیں ہے کہ باپ کے ساتھ برتاؤ کرے اور اس بات کو کس لطیف پیرایہ سے بیان فرمایا۔

تفسیر بے نظیر حقوق والدین

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی ہم جانیں اور وہ جانے وہ جائے گا کہاں آخر آئے گا ہمارے ہی یہاں ہم اس سے سمجھ لیں گے تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو آخر وہ تمہارا تو باپ ہی ہے تم اس کا ادب کرو۔ کسی اور قانون میں آپ یہ بات دکھا سکتے ہیں کہ باغی کے بھی کچھ حقوق ہوں باغی کا ترجمہ دشمن ہے اور دشمن کے حقوق کیسے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب دشمنوں اور مخالفوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو محبین وموافقین کے ساتھ کیسا ہوگا۔

دوستاں را کجا کنی محروم　　تو کہ با دشمناں نظر داری

(دوستوں کو کب محروم کرو گے جبکہ دشمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہے)

دوسرے اس میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ جب دشمن اور باغی کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے حدود ہیں تو پھر کونسا کام ایسا ہو سکتا ہے جس میں حدود نہ ہوں۔ اس سے ان لوگوں کے طرز عمل کا بطلان ہوتا ہے جو کسی گروہ یا قوم سے مخالفت ہو جانے پر کسی حد اور ضابطہ و قاعدہ وقانون کے مطلقاً پابند نہیں رہتے نہ کسی کام کے جواز یا عدم جواز کا شریعت سے فتویٰ حاصل کرتے ہیں بس یہی فکر رہتا ہے کہ جس طرح اور جس عنوان سے ہو فریق مخالف کو نقصان پہنچایا جائے۔ چاہے شریعت کی صریح مخالفت ہی کیوں نہ ہو۔ جائز یا ناجائز کی بحث کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں نہ حق اللہ کی رعایت نہ حق العبد کی پرواہ معاملات ومعاشرات کا خیال۔ بس ایک اندھی تقلید ہے کہ سب آنکھیں بند کئے ہوئے اندھا دھند چلے جا رہے ہیں۔ ذرا قرآن میں غور کیجئے ہوش درست کر کے کام کیجئے عقل کو ہاتھ سے نہ دیجئے۔

مشرک دشمن کے لئے ضابطہ اور قانون

میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر ذرا بھی آپ عقل سے کام لیں گے تو کوئی فعل اور کوئی قول آپ کو ایسا نہ ملے گا جس کے متعلق شریعت میں حدود وقانون اور ضابطہ نہ ہو۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ مشرک اور باغی باپ کے لئے عین قتال کی حالت میں یہ حد مقرر ہے کہ بیٹے کو اس پر ہاتھ نہ چلانا چاہئے۔ یہ صاف دلیل اس بات کی ہے کہ جب ایسے دشمن کے حقوق کے لئے بھی جو مشرک ہے

ایک قانون ہے تو دوسری باتوں کے لئے کیوں نہ ہوگا۔ اسی لیے تو میں کہا کرتا ہوں کہ جو شخص شریعت کی پابندی کا خیال رکھے گا وہ ہرگز آپ کا اتباع نہ کرے گا نہ آپ کی رائے سے کبھی موافقت کرے گا۔ کیونکہ وہ پابند ہے اور آپ آزاد دونوں کا ساتھ کیسے ہوسکتا ہے۔ دو آدمیوں کا ساتھ جب ہی ہوسکتا ہے جب دونوں میں مجانست ہو اور جب مخالفت ہو تو ساتھ کیسا۔ جب ایک پورب کو جاتا ہے اور ایک پچھم کو تو دونوں کے ساتھ کے کیا معنی ایسی حالت میں تو دونوں کے درمیان بعد ہی بڑھتا جائے گا۔ اگر اس ساتھ کو بھی متوافقین کی ہمراہی سمجھو تو اس کو اس مثال سے سمجھ لو۔ ایک اونٹ اور چوہے کے درمیان دوستی تھی۔ دونوں ساتھ رہا کرتے تھے ایک دن اتفاق سے چلتے چلتے دریا سامنے آگیا اونٹ نے کہا چلو اس پار چلیں چوہے نے کہا کیسے اتروں میں تو ڈوب جاؤں گا۔ اونٹ نے کہا اچھا میں پہلے گھس کر دیکھتا ہوں کہ کتنا پانی ہے۔ اونٹ اندر گھسا تو گھٹنوں گھٹنوں پانی تھا۔ چوہے کو آواز دی کہ چلا آ پانی زیادہ نہیں ہے صرف گھٹنوں تک ہے چوہے نے کہا معاف کرو تمہارے گھٹنوں تک ہے یا میرے گھٹنوں تک تمہارے گھٹنے تو میرے سر سے بھی اونچے ہیں اتنا پانی میرے ڈوبنے کے لئے کافی ہے میرے لئے تو ایسا گھٹنوں گھٹنوں اور بانس دو بانس سب برابر ہیں۔ یہی حالت آزاد اور پابند شریعت کی ہے کہ جب دونوں کا مسلک الگ الگ ہے تو ان کا ساتھ ہرگز نہیں نبھ سکتا۔ پابند شریعت ہر جگہ یہ کہے گا کہ اس طرف نہ چلو شریعت مانع ہے اور آپ کے نزدیک بلا اس طرف گئے ہوئے کام نہیں ہوسکتا تو آپ اس طرف جائیں گے جس طرف وہ جا نہیں سکتا پھر بتایئے ساتھ کہاں رہا۔ اس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ہم تو دین ہی کی ترقی کے واسطے اس طرف چل رہے ہیں تو ایسی حالت میں اگر دین اس طرف جانے سے منع کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین خود ہی ترقی نہیں چاہتا۔ صاحبو یہ مغالطہ ہے اس میں ایک بات آپ بھول گئے۔ دین ترقی چاہتا ہے مگر اس کی راہ بھی وہ خود ہی بتاتا ہے۔ اس میں وہ آپ کا محتاج نہیں اور جو راہ آپ تجویز کرتے ہیں وہ اگرچہ ترقی کی راہ ہو مگر دین کے ترقی کی راہ نہیں واقعات سے اس کی شہادت کا پتہ چلتا ہے۔

رہبران قوم کا مافی الضمیر

لکھنؤ میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا موضوع مسلمانوں کی ترقی کی تدابیر کا سوچنا تھا۔ اس میں بہت غور و خوض و بحث مباحثہ اور تبادلہ خیالات کے بعد آخری فیصلہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو جو چیز ترقی سے مانع ہے وہ اسلام ہے اس کو چھوڑ دینا چاہئے جب ترقی ہوگی ایسے ہی لوگوں کے بابت شیخ علیہ الرحمہ جل کر فرماتے ہیں۔

مبادا دل آں فرو مایہ شاد　　کہ از بہر دنیا دہد دین بباد

(وہ کمینہ خوش دل نہ رہے جس نے دنیا کی وجہ سے دین کو خراب کیا)

دیکھ لیجئے یہ بات زبانوں پر آ ہی گئی۔ اس سے رہبران قوم کا مافی الضمیر ظاہر ہو گیا اور میرے قول کی پوری تصدیق ہو گئی کہ آپ لوگ آزاد ہیں۔ صاحبو اگر ایسی ترقی کرنا ہے تو ہمارا اس ترقی کو سلام ہے۔ ہم بے ترقی ہی کے اچھے ہیں۔ نہیں معلوم مسلمانوں کی ترقی اور پھر اس کے ساتھ اسلام کو چھوڑنا اس کے کیا معنی ہوئے یہ ترقی تو مرتدین اور کفار کی ترقی ہوئی مسلمانوں کی ترقی کیسے ہوئی۔ افسوس صحت مذاق دنیا سے اڑ ہی گئی۔ کیسے ہمت پڑی ان لوگوں کی یہ لفظ منہ سے نکالنے کی۔ غرض آزاد اور پابند کا ساتھ ہو نہیں سکتا۔ آزاد جگہ جگہ شریعت کی قید سن کر کہے گا کہ یہی قیود مانع ہیں ترقی کے اور پابند سے پوچھو تو وہ ان قیود کی نسبت یہ کہے گا۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند　　شکارش نہ جوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار جال سے رہائی نہیں ڈھونڈتا)

اس کے نزدیک یہ قیود ایسی ہیں جیسے کسی عاشق کو مدتوں کی تمنا کے بعد اس کا محبوب پیچھے سے آ کر آغوش میں دبا لے اور ایسا تنگ پکڑے کہ پسلیاں ٹوٹنے لگیں تو جب تک کہ عاشق کو معلوم نہ ہو کہ یہ کون ہے تب تک تو پریشان ہوگا اور آنکھیں نکالے گا اور چلائے گا بھی لیکن جب معلوم ہو جائے گا کہ یہ تو میرا محبوب ہے اور میں مدت سے جس کی تلاش میں تھا تو اب آنکھیں نکالنا تو کیسا آنکھیں بند کر لے گا اور ایسی لذت اسے محسوس ہوگی کہ بالکل اسی میں محو مستغرق ہو جائے گا اور اگر پسلیاں ٹوٹ بھی جاویں تب بھی کچھ پروا نہ کرے گا حتیٰ کہ اگر وہ محبوب اس سے یوں کہے کہ اگر میرے دبانے سے تجھ کو تکلیف ہوتی ہے تو تجھے چھوڑ کر تیرے رقیب کو اسی طرح دبا لوں تو وہ اسے ہرگز گوارا نہ کرے گا اور یہ جواب دے گا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں) اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

گر دو صد زنجیر آرے بگسلم　　غیر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو صد زنجیریں بھی لاؤ تو توڑ ڈالوں گا سوائے اپنے محبوب کی زنجیر کے زلف کے)

اور زنجیر زلف کو توڑنا کیسا وہ تو خدا سے چاہے گا کہ میں اس میں اچھی طرح جکڑ دیا جاؤں کہ پھر کبھی نکل ہی نہ سکوں اس شعر کی شرح بھی سن لیجئے۔ بعض جاہل صوفی یوں سمجھتے ہیں کہ دو صد زنجیر سے مراد قیود شرعیہ ہیں ان کی نسبت کہتے ہیں کہ میں ان کو توڑ سکتا ہوں لیکن زلف محبوب جس سے

مراد سکر و مستی ہے اس کو نہیں چھوڑ سکتا یہ ان کی جہالت اور فن سے ناواقفیت ہے۔ میں اس بیان کو طول نہیں دینا چاہتا صرف ضروری تفسیر پر اکتفا کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ زلف محبوب سے مراد وہ پابندیاں ہیں جو قرب محبوب کی موجب ہوں انہیں کو دوسرے لفظ میں احکام شریعت کہتے ہیں اور دو صد زنجیر سے مراد وہ قیود ہیں جن میں آدمی جکڑا ہوا ہے اور جن کی وجہ سے محبوب سے دور ہے وہ کیا ہیں شہوات نفسانیہ و دیگر علائق جو مانع وصول الی اللہ ہیں۔ ان کی نسبت کہتے ہیں کہ میں ان سب کو توڑنے کے لئے تیار ہوں مگر زلف محبوب یعنی پابندی شریعت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں اول اول کچھ تکلیف ضرور ہوگی کیونکہ جن زنجیروں میں آدمی مقید ہے ان سے نکلنے میں کچھ نہ کچھ تکلف اور ہمت کی ضرورت ہے ایں معنی کہ ان کو زنجیر کہا گیا ہے کیونکہ زنجیر اسی چیز کو کہہ سکتے ہیں جس میں کچھ مضبوطی ہو اور اس کا ٹوٹنا آسان نہ ہو تو ان کے توڑنے میں کچھ نہ کچھ دقتیں اور تکالیف ضرور ہوں گی لیکن یہ تکلیفیں ایسی ہیں کہ جیسے کسی کے دنبل نکلا ہو اور اس کے علاج میں بھی طرح طرح کی مصیبتیں پیش آئی ہوں حتیٰ کہ بعض وقت وہ دنبل ایسا ہو جاتا ہے کہ آدمی چل پھر بھی نہیں سکتا پھر اس کو ڈاکٹر کے یہاں اس طرح لے گئے کہ

با بدست دگرے دست بدست دگرے

(پاؤں کسی کے ہاتھ میں ہاتھ کسی کے ہاتھ میں) پھر ڈاکٹر نے اس کے لئے آپریشن تجویز کیا خیال کیجئے کہ وہ کس قدر جانکاہ چیز ہے اس کے نام ہی سے مریض لرز جاتا ہے حتیٰ کہ بعض وقت مر جانے کو گوارا کرتا ہے لیکن اس کو گوارا نہیں کرتا مگر جو شخص طالب صحت ہوتا ہے وہ چار و ناچار اس پر آمادہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر کو اپریشن کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ اپریشن کرتا ہے اس وقت مریض پر جو گزرتی ہے اس کو وہی جانتا ہے اور ناگواری کی کوئی حد نہیں ہوتی لیکن محض صحت کی امید پر یہ ساری تکلیفیں گوارا کرتا ہے اور باوجود ناگواری کے ڈاکٹر کو اپریشن کی اجازت دیتا ہے۔ غرض اس وقت تو ناگواری ضرور ہوتی ہے لیکن بعد صحت کے کیا ہوگا کہ ڈاکٹر کے قدم دھو دھو کر پئے گا۔ یہی حالت ان زنجیر کے توڑنے والے اور شریعت کی قید اختیار کرنے والوں کی ہے کہ اول اول تو طبعی ناگواریاں اور تکلیفیں پیش آئیں گی۔ احکام شریعت کے اختیار کرنے سے بہت سی دنیاوی مصلحتیں فوت ہوں گی جس سے طبعاً ناگواری ہوگی مگر یہ ناگواری چند روزہ ہے۔

چند روزے جہد کن باقی بخند

تھوڑے دن ناگواری رہے گی اس کے بعد وہ خوشگواری پیدا ہوگی جو بیان میں نہیں آسکتی۔ وہ کب ہوگی جبکہ رضائے حق تعالیٰ کی معلوم ہو جائے گی اس وقت قلب میں وہ بشاشت پیدا ہوگی کہ خود ہی بے اختیار یہ کہو گے۔

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ اپنی طبیعت کے خلاف اور طبیعت ناخوش ہی کیوں نہ ہو مگر وہ میری جان پر خوش و پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ وہ حالت نصیب فرمادیں تو یہ حالت ہو جاوے گی۔ افلاس ہو غربت ہو ناداری ہو بیماری ہو ہر حال میں خوش رہے گا۔ جب تک وہ حالت نصیب نہیں ہوتی تب ہی تک یہ ساری چیزیں جو خلاف شریعت میں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں مصلحتیں نظر آتی ہیں اور جب شریعت کا چسکا لگ گیا اور اس کی لذات سے واقفیت ہوئی تو اس کا چھوڑنا تو درکنار خود دل سے یہ دعا کرے گا۔

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد　　　کہ بستگان کمند تو رستگارا نند

رضائے حق کی لذت

مثلاً آج کل لوگ سود کے جواز کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اسے تو کسی طرح حلال کرنا ہی چاہئے۔ دوسری قوموں کی ترقی کو دیکھ دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہے میں سچ کہتا ہوں کہ سود کی ضرورت اور مصلحت اس وجہ سے آپ کے ذہن میں آتی ہے کہ اپنے مقصود کو نہیں سمجھا۔ اگر مقصود پر نظر پڑ جائے تو یہ ساری مصلحتیں اور ضرورتیں کلیۃً ذہن سے نکل جائیں۔ اور آپ خود اپنی زبان سے یہ کہنے لگیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار　　　بگزارند و خم طرہ یارے گیرند

(بڑی مصلحت یہی ہے کہ دوست سب کو چھوڑ کر بس ایک محبوب حقیقی کے ہو جائیں)

اس مقصود کا نام رضاء حق ہے اور وہ حق تعالیٰ کی مرضیات کے خلاف کرنے سے حاصل نہیں ہوتی سود لینا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے اور رضاء حق و مخالفت احکام یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔ آپ رضاء حق کی لذت سے واقف نہیں اس لئے سود کی خوبیاں آپ کو نظر آتی ہیں اور سود لینے والوں کی حالت دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا ہے اگر رضاء حق کا پتہ چل جاتا تو سود پر ہرگز نظر نہ پڑتی۔ حضرت رضاء محبوب وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ساری چیزوں سے نظر اندھی ہو جاتی ہے بس وہی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے جس میں رضاء محبوب کو دخل ہو۔ میرے قصبہ کا قصہ ہے کہ ایک مخنث سے کسی نے کہا کہ اگر تم بالکل ننگے ہو کر مجمع سے نکل جاؤ تو میں تجھ کو اتنے مرمرے دوں۔ حضرت چونکہ وہ مرمروں کا طالب تھا اس نے ایسا ہی کیا ننگا ہو کر بھرے مجمع میں سے نکل گیا اور ذرا بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ عزت گئی آبرو گئی مگر اسے کچھ پروا نہیں ہوئی کیونکہ اس کی نظر اس وقت

ان چیزوں پر تھی ہی نہیں اس کا تو مقصود کچھ اور ہی تھا اس پر نظر تھی جب عزت آبرو پر نظر ہی نہ تھی تو آنکھ کیوں جھپکتی اس کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ کس نے مجھے ننگا دیکھا اور کس نے نہیں دیکھا اسی طرح اگر کوئی بازاری عورت اپنے عاشق سے ایسی ہی فرمائش کرے اس کو ذرا بھی جھجک نہ ہوگی کیونکہ اس عاشق کا مقصود تو بیسوا کو راضی کرنا تھا اس کو کسی دوسرے سے کیا مطلب کوئی راضی ہو یا ناراض کوئی برا کہے یا بھلا اس پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا ہے صاحبو جب ایک عورت کے عشق میں یہ بات ہو سکتی ہے کہ ساری مصلحتیں اور تمام عزت و آبرو برباد کر دی جاتی ہے تو محبوب حقیقی یعنی حضرت حق کے عشق میں یہ حالت کیوں نہیں ہو سکتی اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلے بود گوے گشتن بہر او اولے بود

(مولا حقیقی کا عشق لیلیٰ سے کب کم ہوا اس کے لئے کوچہ گردی زیادہ ہے)

تعجب ہے کہ حضرت حق کے ساتھ محبت کا دعویٰ اور اس چیز کی فکر جو ان کی رضا کے خلاف ہو میں کہتا ہوں کہ اول تو ایسا ہوگا ہی نہیں کہ سود کے ترک کر دینے سے بھوک مر جاؤ گے اور کپڑے اتر جائیں گے اور اگر ایسا ہو بھی تو ننگے اور بھوکے رہنا اس سے اچھا ہے کہ آگ کھا کر اس سے پیٹ بھرو۔ جب اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہوئی تو پیٹ بھر کر اور زندہ رہ کر کیا کرو گے ایسے کھانے اور کپڑے کو پھینکو جہنم میں جس سے اللہ تعالیٰ کی ناخوشی ہو۔

بہر چہ از دوست وامانی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

(جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو)

کیسے کپڑے اور کیسا کھانا بس تمہارا تو مذہب یہ ہونا چاہئے کہ جس میں خدائے تعالیٰ کی رضا ہو اسی میں راضی رہو۔ اگر خدائے تعالیٰ کی رضا کے لئے بھوکے رہے تو پروا نہیں اور ننگے رہے تو پروا نہیں جیتے رہے تو پروا نہیں مر گئے تو پروا نہیں تم اور تمہاری ساری چیزیں انہیں کی ملک ہیں۔ اپنے ملک میں جو تصرف وہ کریں گے کرنے دو ان کے ہر تصرف سے راضی رہو اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی رضا ساری چیزوں سے ارزاں اور سہل الحصول ہے۔ دوسروں کی رضا سے مقابلہ کر کے دیکھو تو معلوم ہو کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی ایسا نہ ملے گا جس کی رضا اتنی جلد اور آسانی سے حاصل ہو جاتی ہو۔

جتنی جلد اور آسانی سے حق جل علا کی رضامندی حاصل ہو جاتی ہے دیکھو کوئی شخص ملحد ہو کافر ہو خدا کا کیسا ہی دشمن ہو لیکن وہ بھی اگر ان کو راضی کرنا چاہے تو بس ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے کلمہ پڑھنا تھا کہ وہ راضی ہو گئے پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دو دفعہ جرم کرنے کے بعد پھر وہ کبھی راضی نہ ہوں۔ نہیں کسی نے ایک دفعہ دو دفعہ دس دفعہ ہزار مرتبہ خلاف ورزی کی لیکن جب آستانے پر آ کر حاضر ہو گئے اور اپنی تقصیر کی معافی چاہی بس سب معاف۔

اگر خشم گیرد بہ کردار زشت چو باز آمدی ماجرا در نوشت

(یعنی اگر اللہ تعالیٰ برے کاموں کی وجہ سے غصہ ہوجائیں تب توبہ کرکے باز آجاتا کہ تیرا ماجرا لپیٹ دیں)

یہ آپ کے عقائد کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی ہزار دفعہ مرتد ہو اس کے بعد پھر ایمان لائے تو وہ مومن ہے بتایئے یہ نظیر اور کہیں مل سکتی ہے۔ کسی کو ایک مرتبہ ناراض کر دو تو اس کا راضی کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور دو تین دفعہ کے بعد تو وہ بات بھی نہیں کرتا چہ جائے کہ راضی ہونا۔ اور وہاں معافی کی کوئی حد ہی مقرر نہیں عمر بھر کوئی یہی سلسلہ رکھے کہ ایک دن مومن ہوا ایک دن کافر تو جب مومن ہوگا اس کے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو اس سے پہلے مومن ہونے کے وقت تھا ساری عمر بھی اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ جا اب ہم تیرا ایمان اور تیری توبہ نہیں قبول کرتے اس کی نظیر کوئی ایک بھی نہیں دکھا سکتا تو میرا یہ کہنا صحیح ہوا کہ اتنی آسان کسی کی بھی رضامندی نہیں جتنی کہ حضرت حق جل شانہ کی ہے اب ایک بات اور بھی سمجھ لیجئے وہ یہ کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کیا کرو کہ آج مومن ہوئے کل کافر ہو گئے آج گناہ کیا کل توبہ کرنے لگے۔

اصرار علی المعصیت کی خاصیت

میں نے ایک امر واقعی کا بیان کیا تھا کہ بالفرض کسی سے بار بار ایسا ہو جائے تو ادھر سے دروازہ رحمت کا بند نہیں ہے جب توبہ کی جائے گی ادھر سے رحمت ہی کا برتاؤ ہوگا۔ میرا یہ مقصود ہے نہ کہ استخفاف معصیت کا نعوذ باللہ اگر یہاں کوئی کج فہم طالب علم یہ اشکال کرے کہ جب یہ نص آچکی ہے

الاسلام یهدم ما کان قبله (طبقات ابن سعد ۴: ۲)

و ان الله یقبل التوبة مالم یغرغر. (سنن الترمذی: ۳۵۳۷)

یعنی اسلام لانے سے پہلے کا کفر جاتا رہتا ہے اور توبہ کرنے سے پہلے کا گناہ جاتا رہتا ہے تو بار بار گناہ کرنے میں کیا حرج ہے یہ ایسا اشکال ہے کہ اس کا شافی جواب اہل ظاہر دے نہیں سکتے گو کافی جواب ظاہر ہے مگر شافی جواب صوفیہ دے سکتے ہیں وہ یہ کہ یہ مسلم ہے کہ اگر کوئی بار بار ایسا کرے گا تو ہر دفعہ ایمان اور توبہ کے بعد گذشتہ جرم معاف کر دیا جاوے گا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بار بار گناہ کی طرف عود کرنا یہ اصرار علی المعصیت ہے اور اصرار میں خاصیت ہے کہ اس سے توبہ کی توفیق اکثر سلب ہو جاتی ہے اور پھر توبہ نصیب نہیں ہوتی جب توبہ نہ ہوئی تو گناہ بحال رہے گا۔ یہ کتنی خطرناک بات ہے اس کی ایک مثال ہے اس سے اس کی توضیح اچھی طرح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ صابون میں خاصیت ہے میل کے صاف کر دینے کی اگر ایک دفعہ دھوؤ گے جب دس دفعہ دھوؤ گے جب ہزار دفعہ دھوؤ گے غرض وہ برابر صاف کرتا رہے گا لیکن ایک صورت ایسی

بھی ہے کہ صابون آپ کے ہاتھ سے جاتا رہے مثلاً کنوئیں میں گر جاوے تو اس صورت میں یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ صابون میں خاصیت صاف کرنے کی نہیں رہی اس کی خاصیت تو موجود ہے مگر وہ خود غائب ہے تو پھر کپڑا کیسے صاف ہو اسی طرح توبہ صابون ہے گناہ کا ایک دفعہ اس سے کام لو تب اور ہزار دفعہ کام تو تب اس کا برابر اثر ہوگا لیکن اگر صابون ہی ہاتھ سے جاتا ہی رہے تو گناہ کا میل کاہے سے صاف ہوگا۔ سو اصرار علی المعصیت میں خاصیت ہے کہ اس سے اکثر صابون ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اس واسطے میں نے کہا تھا کہ یہ مطلب نہیں کہ ایسا کیا کرو۔ اب طالب علموں کے اس اشکال کا حل ہوگیا کہ جب نص موجود ہے کہ توبہ سے گناہ مٹ جاتا ہے تو بار بار کرنے میں کیا حرج ہے۔ بیان یہ تھا کہ حق تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا اصل مقصود ہے تو ایسی چیز کو ضرور حاصل کرنا چاہئے اپنی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ان کو پورا تصرف اپنے اوپر دے دو۔ مقصود صرف اسی کو سمجھنا چاہئے بے شک بعض طبائع کو اول اول اس میں ناگواری ضرور ہوگی مگر مقصود پر نظر پڑ جانے کے بعد ایسی خوشی ہوگی جیسے اپریشن سے صحت ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ مقصود کے حاصل کرنے کے لئے جو تکلیفیں پیش آتی ہیں عقلمند آدمی ان کو برداشت کرتا ہے چونکہ شریعت کی پابندی موصل الی المقصود ہے پس جس شخص کی نظر مقصود پر ہے وہ اس پابندی کو چھوڑ نہیں سکتا ان آیات میں اسی شریعت موصل الی المقصود کی پابندی کا ذکر فرماتے ہیں اور پابند و غیر پابند کے فرق کو بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے **لیسوا سواءً من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون ایات اللہ اناء الیل وھم یسجدون یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر ویامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولٓئک من الصالحین** یعنی اہل کتاب سب برابر نہیں ان میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین پر قائم ہے وہ خدائے تعالیٰ کی آیتوں کو رات کے اوقات میں پڑھتی ہیں۔ (تو دن میں تو بدرجہ اولیٰ) اور وہ سجدہ کرتے ہیں یعنی نماز پڑھتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیک کاموں میں پیش قدمی کرتے ہیں اور یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس جماعت کو دیگر اہل کتاب میں سے جن کی مذمت بیان فرمائی تھی مستثنےٰ کیا اور ان کو صالحین میں سے فرمایا اس میں سب سے پہلے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ اہل کتاب کی اس جماعت صالحین میں اور اس دوسری جماعت میں جس کی مذمت فرمائی گئی کیا فرق تھا وہ گمراہ جماعت بھی گو بعض پیغمبروں کو ابن اللہ کہتے تھے چنانچہ بعضے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے اور بعضے حضرت عزیز علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے لیکن یہ عقیدہ کسی کا بھی نہ تھا کہ خدا کوئی چیز نہیں اور نہ یہ کہ

ابن اللہ من کل الوجوہ خدا کے مقابل ہیں۔ واجب مطلق کو سب ایک مانتے تھے مگر ہاں ایسی بات ثابت کرتے تھے جو خدائے تعالیٰ پر محال ہے یعنی بیٹے کا ہونا لیکن ان دونوں عقیدوں سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مومنین باللہ نہ تھے اللہ پر ایمان ضرور رکھتے تھے ہاں بعض ایسی باتوں کے قائل ضرور تھے جو غلط اور بے ثبوت ہیں۔ غرض وہ لوگ بھی مومن باللہ و آخرت کے بھی قائل تھے۔ سب جانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کا کوئی فرد بھی یہ نہیں کہتا کہ قیامت نہیں آئے گی۔

اصلاح کا اصل الاصول

حاصل یہ کہ وہ گروہ جس کی مذمت فرمائی گئی اللہ پر بھی ایمان رکھتا تھا اور قیامت کا بھی قائل تھا تو اس گروہ میں اور اس گروہ میں جن کی مدح فرمائی گئی ہے ان دونوں میں تو اختلاف نہ تھا اختلاف تھا تو اس بات میں کہ یہ گروہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا اور وہ گروہ حضور پر ایمان نہیں لاتا تھا تو اس لحاظ سے یہاں دونوں کے فرق بیان کرنے کے لئے بظاہر یہ مناسب تھا کہ یوں فرماتے یومنون بالرسول یومنون باللہ کے کیونکہ دونوں میں یہی مابہ الفرق تھا مگر اللہ نے بلاغت قرآن شریف کی کہ ایسا عنوان اختیار کیا۔ جس میں مخاطب کے حالات کی بے حد رعایت ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اصلاح کا اصل الاصول یہ ہے کہ جس کی اصلاح کا قصد ہوتا ہے اس کو شرمندہ نہیں کیا کرتے یہ ایسا پاکیزہ طرز ہے کہ دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے کیسا ہی دشمن ہو مگر اس رعایت کو دیکھ کر وہ دشمنی سے باز آجائے گا اگر یوں تصریحاً فرماتے یومنون بالرسول تو وہ لوگ اس وجہ سے کہ ابھی قریب ہی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر چکے ہیں اور اب ایمان لائے ہیں تو اس مخالفت کو یاد کر کے آپ کے سامنے آنکھیں نیچی ہوتیں کہ ابھی تو ہم نے آپ کو ایذائیں دی تھیں اب کیا منہ لے کر آپ کے سامنے جائیں اور مطیع و دوست ہونے کا دم بھریں تو ممکن تھا کہ یہ خیال شرمندگی کا مانع عن الایمان ہو جاتا اس وجہ سے بجائے یومنون بالرسول کے یومنون باللہ رکھا جس میں اس ایذاء سے کچھ تعرض ہی نہیں بلکہ یہ تعلیم ہو گئی کہ تمہارا وہ ایمان باللہ جو اب تک رکھتے رہے کافی نہیں بلکہ دوسرے طریق سے ایمان لانا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ بات ایسے شخص سے کہی جاتی ہے جو ایمان باللہ کا خود مدعی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ گو تم ایمان باللہ کے مدعی ہو لیکن یہ ایمان تمہارا ایمان باللہ نہیں ہے ایمان باللہ صحیح معنی میں وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حاصل ہوا اور جس پر اہل اسلام عامل ہیں اور جس میں حضور کی تصدیق بھی شرط ہے۔ اس عنوان میں یہ خوبی ہوئی کہ ایمان بالرسول کی تعلیم بھی کر دی اور ان کی اس قدر رعایت بھی ہو گئی کہ رسولؐ نام نہیں آیا جس سے وہ شرمندہ ہوتے اور ایمان سے رہ جاتے یہ کس قدر رحمت و شفقت ہے کہ ان پر ابہاماً

بھی اعتراض نہیں کرتے ورنہ اگر یہ رعایت نہ ہوتی تو ان کی مخالفتوں اور گستاخیوں اور ایذاؤں کو بھی یاد دلاتے پھر خواہ وہ راہ پر آتے یا نہ آتے ایمان لاتے یا نہ لاتے حق تعالیٰ کا کیا بگڑتا۔ مگر نہیں وہاں دشمن کے ساتھ بھی یہ برتاؤ ہے کہ اس کو ایمان سے محروم رکھنا نہیں چاہتے اور یہی چاہتے ہیں کہ یہ بھی جہنم سے بچ جاوے اور ایسے عنوان سے اسے بلاتے ہیں کہ کسی طرح آ ہی جائے یہ وہ برتاؤ ہے کہ پتھر کو بھی پانی کر دیتا ہے چنانچہ ان رعایتوں کا جو اثر ہوتا تھا سب کو معلوم ہے اگر بجائے اس کے ضابطہ سے کام لیا جاتا تو ہرگز یہ اثر نہ ہوتا (اب اگر کوئی اس پر سوال کرے کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ ایمان باللہ بدوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہو ہی نہیں سکتا اس کا جواب میں دیتا ہوں سنئے۔ اول ایک مقدمہ کی ضرورت ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں فلاں شخص کو مانتا ہوں کہ وہ حاکم ہے اور تم یہ سن کر اس سے کہو کہ ذرا اس کا حلیہ تو بیان کرو اور وہ حلیہ اس طرح بیان کرے کہ اس کے ایک سونڈ ہے اور چار پیر ہیں اور دو بڑے بڑے کان ہیں تو آپ یہی کہیں گے کہ خدا جانے اس نے کس چیز کو دیکھ کر اس کو حاکم سمجھ لیا کیونکہ جس کا حلیہ یہ بیان کرتا ہے وہ تو ایک جانور ہے جس کا نام ہاتھی ہے۔ یہ حاکم نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حاکم کو حاکم ماننا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اس کو مع اس کی صفات واقعیہ کے مانا جائے وہ صفات کیا ہیں وہ یہ کہ وہ انسان ہو دو پیر رکھتا ہو اس کی صورت آدمیوں کی سی ہو ذی عقل ہو نہ کہ اس کے سونڈ ہے اور وہ لا یعقل محض ہے۔ جس وقت ان سب باتوں کو مانا جائے گا تب یہ کہا جائے گا کہ اس نے حاکم کو صحیح پہچانا۔ اس مقدمہ کے بعد سنئے کہ خدا کو ماننا بھی جب ہی معتبر ہوگا جبکہ اس کو مع صفات واقعیہ کے مانا جائے ورنہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ اس شخص نے حاکم کو مانا تھا مگر جب اس سے حلیہ پوچھا گیا تو اس نے بہت سی خرافات بکواس کی کہ اس کے سونڈ ہے چار پیر ہیں اور اس بناء پر آپ نے اس کے بیان کو غلط سمجھا۔ اسی طرح اگر خدائے تعالیٰ کو کوئی صفات غیر واقعیہ کے ساتھ مانے گا تو لامحالہ آپ کو کہنا پڑے گا کہ یہ غلط کہہ رہا ہے اللہ تعالیٰ کی یہ صفات نہیں اس لئے یہ ایمان اس کا ایمان باللہ نہیں ہے چنانچہ اسی لئے اس کلمہ کی تعلیم کی جاتی ہے۔ امنت باللہ کما ھو باسمائہ وصفاتہ سو وہ لوگ خدا تعالیٰ کی صفات میں بہت اختلاف کرتے تھے حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے لئے ابوت ثابت کرتے تھے جو ذات حق تعالیٰ پر مستحیل ہے تو ان کا ایمان باللہ ویسا ہی ہوا جیسا کہ حاکم کے لئے سونڈ اور چار پیر کا ماننا۔ لہذا اس ایمان کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا ایمان باللہ بالمعنی الصحیح اگر حاصل ہوا تو وہ حضور کی تعلیم کی بدولت جس میں صفات واقعیہ کو صحیح صحیح بیان فرمایا گیا اور غیر واقعیہ کی نفی کی گئی تو جب تک اس تعلیم کو کوئی صحیح نہ مانے گا اور اس بارہ میں حضور کو سچا نہ سمجھے گا اس وقت تک اس کو ایمان بالمعنی الصحیح حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایمان باللہ کیلئے

اب وہ شبہ جاتا رہا کہ ایمان باللہ کے لئے حضورؐ کی تصدیق رسالت کی کیوں ضرورت ہے۔
پھر اگر اس پر کوئی کہے کہ اچھا قیامت کو تو وہ مانتے تھے پھر آیت میں والیوم کے بڑھانے کی کیا ضرورت تھی تو میں اس کے جواب کے لئے بھی اس مقدمہ کو یاد دلاتا ہوں کہ کسی چیز کا ماننا جبھی معتبر ہے جب اس کو مع تمامی صفات واقعیہ کے مانا جائے وہ لوگ قیامت کے بے شک قائل تھے لیکن اس کو کما ھو فی نفس الامر نہیں مانتے تھے مثلاً ان میں ایک فرقہ کفارہ کا قائل تھا اور ایک فرقہ کا قول تھا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اگر چہ کچھ بھی گناہ کریں لیکن دوزخ میں چندروز ہی رہیں گے اس پر حق تعالیٰ نے نکیر فرمائی قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی پوچھئے ان سے کہ کیا تم نے حق تعالیٰ سے کوئی ایسا وعدہ لے لیا ہے کہ تم کو خلود فی النار نہیں ہوگا اور حق تعالیٰ اس وعدہ کے خلاف نہ کریں گے یا خدا تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہو اور ایسی بات کہتے ہو جس کا ثبوت تمہارے پاس نہیں ہے یعنی یہ تمہارا خیال غلط ہے تمہارے واسطے ہمارا کوئی ایسا وعدہ نہیں ہے ہمارے یہاں کا تو عام قانون یہ ہے بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی جو کوئی گناہ کرے گا اور گناہ اس کے اتنے ہو جائیں گے کہ چاروں طرف سے اس کو گھیر لیں یہ مرتبہ کفر کا ہے اور ایمان کے ہوتے ہوئے احاطہ سیئات کا صادق نہیں آتا کیونکہ ایمان کا حصہ تو اس احاطہ سے بچا ہوا ہے تو یہ لوگ اصحاب نار ہیں اور ان کے لئے اس میں خلود ہوگا۔ اور وہ لوگ اس کے قائل نہ تھے بلکہ ایسی قیامت کے قائل تھے جس میں کفار کی بھی مغفرت ہو جائے گی اور یہ واقعہ کے خلاف ہے تو ان کا قیامت کا قائل ہونا بصفت غیر واقعیہ ہوا اور آپ تسلیم کر چکے کہ کسی چیز کا مان لینا اسی حالت میں معتبر ہوتا ہے جبکہ وہ مع صفات واقعیہ کے مانی جاوے تو یہ ان کا قیامت کو ماننا بھی غیر معتبر اور کالعدم ہوا اس لئے والیوم الاخر بھی فرمایا گیا غرض ان کا ایمان باللہ معتبر ہوا نہ ایمان بالاخرہ اس واسطے فرمایا گیا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے ہیں) پس جب وہ ایمان جس پر ان کو بھروسہ تھا کالعدم ٹھہرا تو صرف اسی کا ذکر کرنا کافی ہو گیا اور یومنون بالرسول (رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں) کی ضرورت نہ رہی اور در حقیقت حضورؐ کا ذکر اس طرح بھی آ گیا کیونکہ ان کو یہ غلطی جو ان کے ایمان میں تھی حضورؐ ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی پس اگر حضورؐ پر ایمان نہ لائیں گے تو اپنی اس غلطی کی اصلاح کیسے کریں گے۔ ایسی حالت میں تصریحاً حضورؐ کے

ذکر کی بھی ضرورت نہ ہوئی یومنون باللہ کافی ہو گیا۔ اور ایک طریق سے حضورؐ کا ذکر ہو بھی گیا۔ سبحان اللہ کیا لطیف پرایہ ہے یہاں سے ایک بات اور پیدا ہوئی وہ ذرا غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوپر کی تقریر سے یہ قاعدہ مستنبط ہوا کہ جو چیز جس طریقے سے مطلوب ہو جب تک اس طریقے کے موافق نہ ہوگی یہ نہ کہا جائے گا کہ شے مطلوب حاصل ہو گئی۔ دیکھئے ان میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ دونوں موجود تھے مگر قاعدے کے خلاف اس لئے انہیں غیر معتبر سمجھ کر بالکل کالعدم قرار دیدیا گیا اور ان سے پھر مطالبہ ایمان صحیح کا کیا گیا۔ جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو ہمیں اپنے ایمان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ شرائط مطلوبہ کے موافق ہے یا نہیں۔ اگر ویسا ہے تو فہوالمراد اور اگر ویسا نہیں ہے تو سخت افسوس کی بات ہے ہمیں اپنے ایمان کی خیر منانا چاہئے اور حسب قاعدہ مذکورہ ہمارے حق میں بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہمارا ایمان اگر معدوم نہیں تو کالعدم تو ضرور ہے۔ ایسی حالت میں کیا غضب کی بات ہو گی کہ جس ایمان پر ہم پھولے بیٹھے ہیں وہ کالعدم ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ بات معلوم کیسے ہو کہ جس طرح کا ایمان ہم سے مطلوب ہے وہ بجنسہ ہم میں ہے یا نہیں اس کو چل کر اللہ ہی سے پوچھو ان کا فیصلہ سب کے نزدیک مسلم ہوگا ان کا فیصلہ اس آیت میں موجود ہے۔

حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا حکم بتانے کا امر

فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (پھر قسم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں آپ سے تصفیہ کرالیں پھر آپؐ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ کیا کریں اور پورا پورا تسلیم کرلیں)

اس آیت کو سن کر ذرا مسلمانوں کے کان کھڑے ہو جانے چاہئیں اور بدن پر لرزہ پڑ جانا چاہئے اس میں ایمان مطلوب کا معیار بیان کیا گیا ہے اور اس بات کی ایک پہچان بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم یہ دیکھیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان مطلوب ہے یا نہیں جس کو اپنی قلبی حالت ایمان کے متعلق معلوم کرنی ہو وہ اس علامت سے بہت آسانی کے ساتھ معلوم کرسکتا ہے۔ مطلب آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ آپ کو اپنے ہر کام میں حکم نہ بنائیں اللہ تعالیٰ نے حصر فرمایا مومن ہونے کو اس بات میں کہ آپ کو جملہ امور میں حکم بنایا جائے۔ حکم اس کو کہتے ہیں جس کا فیصلہ بلا دلیل مان لیا جاوے اور اس میں چون و چرا نہ کیا جاوے اب ہم غور کرلیں کہ ہم میں یہ علامت ایمان کی موجود ہے یا نہیں اگر موجود ہے تو آیا درجہ مطلوبہ میں ہے یا نہیں۔ اگر انصاف

کو دخل دیں گے تو غالباً یہی کہنا پڑے گا کہ اگر معدوم نہیں جو کہ کفر ہے مگر کالعدم تو ضرور ہے جو اگر کفر نہیں مگر ناقص ہونے میں تو شبہ ہی نہیں پھر معلوم نہیں کس بات پر ہم کو ناز ہے اور کس کرتوت پر پھولے ہوئے ہیں۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان حقیقی سے جو کہ مطلوب ہے ہم لوگ بالکل کورے نہیں بلکہ کور ہیں۔ اگر یہ بات محض اجمالی طور سے سمجھ میں نہ آتی ہو تو تفصیلی نظر سے دیکھئے اس سے بخوبی سمجھ میں آ جائے گا کہ میرا یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی ایک ایک حالت کو لیجئے اور اس کو حضورؐ کے ارشادات پر منطبق کرتے جایئے کہ ہم کو اس حالت میں حضورؐ کے ارشادات پر انشراح اور تسلیم حاصل ہے یا نہیں اس سے خود بخود پتہ چل جائے گا اور آپ خود ہی یہ کہیں گے خود غلط بود آنچہ ماپنداشتیم۔ (جو کچھ میں نے گمان کیا وہ غلط تھا) حضورؐ کے تمام ارشادات منضبط ہیں یہ فقہ و حدیث و تصوف اور اخلاق کی کتابیں سب آپ ہی کے ارشادات کا مجموعہ ہیں۔ اور ہمارے حالات کی تقسیم پانچ چیزوں کی طرف ہے۔ عبادات' معاملات' عادات' اخلاق' معاشرات' ان پانچوں میں سے جس شعبہ کو کتاب پر پیش کریں گے تو یہی معلوم ہوگا کہ کتاب کہہ رہی ہے پچھم کی طرف چلنے کو اور ہم جا رہے ہیں پورب کی طرف اور کتاب کہہ رہی ہے دکھن کی طرف جانے کو ہم جا رہے ہیں اوتر کی طرف ہم کو جانا ہے کلکتہ اور ہم اس ریل میں بیٹھے ہیں جو شملہ کو جا رہی ہے اور جی میں خوش ہیں کہ اب کلکتہ پہنچ جائیں گے حالانکہ واقعہ میں دمبدم کلکتہ سے بعد ہو رہا ہے۔ یہ حالت کم و بیش ہر شعبہ میں نظر آئے گی اور ظاہر ہے کہ اگر انشراح و تسلیم کامل ہو تو ان شعبوں میں یہ نقصان ہرگز پیش نہ آوے مگر جب ہر ہر شعبہ میں یہ نقصان ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم میں انشراح و تسلیم کامل ہے۔ غرض تفصیل سے دیکھو تو اجمال سے دیکھو تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ ہم میں ایمان مطلوب کی علامت موجود ہے۔ پھر کیا فتویٰ ہوا ہمارے بارہ میں قرآن کا اس کا جواب ہر شخص کا دل خود ہی دے رہا ہے اور حضورؐ کے حکم بنانے کے متعلق قرآن میں جہاں تذکرہ ہے وہاں صرف اسی پر بس نہیں کیا گیا کہ لوگ حضورؐ کو محض زبانی اور ظاہری طور پر حکم بنالیں بلکہ فرماتے ہیں۔

ہمارے سارے کام ناقص ہیں

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ (پھر اس تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی ہونا ہو) یعنی صرف ظاہری حکم بنانا کافی نہیں بلکہ یہ حالت ہونی چاہئے کہ حضورؐ نے جو حکم کیا ہو اس سے کسی قسم کی تنگی دلوں کے اندر نہ پائیں اور ذرا بھی انقباض نہ ہو پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ اس مضمون کی اور تاکید پر تاکید ہے۔ فرماتے ہیں وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا یعنی اس حکم کو مان لیں پورا مان لینا یعنی صرف یہی نہیں کہ اس سے انقباض نہ ہو جیسا لَا يَجِدُوْا سے معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کے

ساتھ تسلیم کامل ہو۔ اب ہم لوگ دیکھ لیں کہ ہماری یہ حالت ہے یا نہیں کیا کہا جائے سوائے اس کے کہ جواب نفی میں ہے۔ افسوس صد افسوس اس آیت سے کمر ٹوٹ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ ایمان مطلوب سے بالکل خالی ہیں اور ایسے ایمان سے خالی ہونے والے کا جو لقب ہے وہ سب کو معلوم ہے اس لفظ کو منہ سے نکالتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے یعنی غیر مومن بدرجہ خاص ہے لیکن منہ کے نہ نکالنے سے کیا ہوتا ہے اگر ہماری حالت اس کے اطلاق کے قابل ہے تو وہ ہے ہی۔ کانے کو کوئی زبان سے کانا نہ کہے تو اس سے کیا ہوتا ہے اس نہ کہنے سے کیا عیب اس کا مٹ جائے گا جب ایک آنکھ نہیں ہے تو کانا تو ہے ہی چاہے کوئی کہے یا نہ کہے اب یہ سمجھئے کہ ہم لوگوں نے اپنی برات کے لئے ایک اور ترکیب نکال رکھی ہے جس سے دل کو سمجھا لیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس آیت میں و نیز اس کے مثل دوسری آیتوں میں ایمان سے مراد کامل ایمان ہے تو معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب یہ علامت موجود ہو اور جب یہ علامت موجود نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کامل نہیں ہے مگر نفس ایمان تو جب بھی رہے ہی گا۔ خدا بھلا کرے اس تاویل کا کہ اس کی بدولت ذرا سہارا تو ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ ہم لوگ بھی کچھ پٹ پٹا کر عذاب سے نجات پا جائیں گے کیونکہ ایمان کامل نہ سہی ناقص سہی کچھ تو موجود ہے میں اس ترکیب کو باطل نہیں کہتا مسئلہ صحیح ہے لیکن یہ حفظت شیئا و غابت عنک اشیاء (تو نے ایک چیز یاد رکھی اور بہت سی چیزیں غائب کر دیں) کا مصداق ہے یہ بھی تو دیکھو کہ تم ایمان لا کر کس ثمرہ کے طالب ہو کامل کے یا ناقص کے جواب ظاہر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ثمرہ کامل ایمان کامل ہی پر مرتب ہو سکتا ہے اور تمام مقاصد اور ذرائع میں بھی قاعدہ ہے۔ اسی لئے عادات میں ثمرات ہی پر نظر کر کے جو طریق ترتب ثمرہ مطلوبہ میں ناقص ہو اس کو محاورات میں کالعدم ہی قرار دیا جاتا ہے چنانچہ کسی کو مالدار کہا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کسی کے پاس ایک کوڑی یا ایک پیسہ ہے تو وہ بھی مالدار ہے اگرچہ لغۃ اس حالت میں بھی مالداری کا اطلاق اس پر صحیح ہے لیکن اپنے محاورہ کو دیکھئے۔ آپ اس شخص کو کبھی مالدار نہیں کہیں گے۔ علیٰ ہذا جتنی صفات ہیں سب میں یہی قاعدہ جاری ہے کہ جب صفت کا اطلاق کسی چیز پر کیا جاتا ہے تو اس کا ادنیٰ درجہ بلکہ اوسط درجہ بھی مراد نہیں ہوتا بلکہ کامل ہی درجہ مراد ہوتا ہے۔ جیسے شجاع، سخی، حسین وغیرہ کہ ان صفتوں میں ادنیٰ درجہ والے کو شجاع سخی، حسین نہیں کہہ سکتے جب یہ بات ہے تو مومن ہونا بھی ایک صفت ہے اس کا اطلاق بھی عادات میں کسی شخص پر جبھی کیا جائے گا کہ اس میں صفت ایمان کی بدرجہ کمال موجود ہو ورنہ آپ کے محاورہ مذکورہ کے موافق اس پر عدم ایمان کا اطلاق اقرب ہوگا تو پھر وہی

بات لوٹ آئی کہ ہم سے جس ایمان کا مطالبہ کیا گیا ہے وہ ہم میں موجود نہیں تو پھر کس بات سے دل خوش کیا جائے اگر قیامت کے دن یہی سوال ہو کہ ہم نے تم سے جس صفت ایمان کا مطالبہ کیا تھا وہ تم نے حاصل کی یا نہیں تو کیا اس کے جواب میں آپ اس ضعیف اور ناقص ایمان کو جس پر آپ خود عدم کا حکم لگا چکے ہیں پیش کر سکتے ہیں۔اور اگر آپ فرضاً پیش بھی کر دیں اور ادھر سے یہ کہا جائے کہ تم اپنے واسطے تو ہر صفت کا اطلاق اس وقت کافی سمجھتے تھے جبکہ وہ کمال کے درجہ میں موجود ہو اور ہمارے مقابلہ میں یہ صفت ناقص کس منہ سے پیش کرتے ہو تو کوئی صاحب ذہین سے ذہین مجھے بتائیں کہ اس کا کیا جواب ہوگا۔میرے نزدیک کچھ جواب نہیں ہو سکتا۔غرض جب ہمارا ایمان باوجود ہونے کے کالعدم ہے تو وہ نہ تو حضرت حق کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہے نہ اپنے ہی دل کی تسلی کے لئے کافی ہے مگر خیر بالکل نہ ہونے سے جیسی کفار کی حالت ہے ناقص ہی ہونا غنیمت ہے جہاں ہمارے سارے کام ناقص ہیں ایمان بھی ناقص سہی۔اس طرح دل کو سمجھا لو کوئی جز تو ایمان کا ہے ہی۔اگر ذرہ برابر بھی ایمان موجود ہے تو ان شاء اللہ وہ بھی اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا) ابتداءً نہ سہی سزا کے بعد تو نجات ہو ہی جائے گی اور بڑی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے اگر وہ ہمارے ضعف اور اپنی قدرت پر نظر فرما کر رحم فرما دیں۔تو ان کو کون روکنے والا ہے۔اس کے علاوہ ایک اور امید گاہ ہے وہ یہ کہ ہم کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے اس سے بہت کچھ امید ہوتی ہے کیا عجب ہے کہ پہلے ہی سے رحمت کا ارادہ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کے دلائل

اور حضور کی محبوبیت کے مستقل دلائل تو ہیں ہی خود اس آیت میں اس محبوبیت پر ایک عجیب دلالت ہے وہ یہ کہ اس آیت میں یعنی فَلَا وَرَبِّکَ میں مقسم بہ ذات حق ہے اور انہوں نے اپنی ذات کی قسم کھائی مگر ایک عجیب عنوان سے جو حضور کی محبوبیت پر دال ہے کیونکہ قسم کے لئے تو اور بھی الفاظ ہو سکتے تھے مثلاً واللہ تاللہ جیسا کہ اور دوسرے مقامات پر موجود ہیں۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِکَ (خدا کی قسم ہے ہم نے رسول کو تمہاری امتوں پر بھی بھیجا ہے) یعنی یہ کہ حق تعالیٰ نے قسم کھائی اپنی یا مثلاً یونہی فرما دیتے ونفسی وامثال ذالک مگر سارے عنوان کو چھوڑ کر یہ عنوان اختیار کیا فَلَا وَرَبِّکَ جس کے معنی ہیں قسم ہے آپ کے رب کی اور ظاہر ہے وہ رب خود ہی ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ مجھے اپنی قسم ہے مگر اس حیثیت سے کہ میں آپ کا رب ہوں کیا ٹھکانا ہے حضور کی محبوبیت کہ حضرت حق اپنی ذات کی قسم من الذات نہیں کھاتے بلکہ اس حیثیت سے قسم کھاتے ہیں

کہ وہ رب ہیں حضور کے اس سے ابلغ کون سا لفظ محبوبیت کے معنی ادا کرنے کے لئے ہو سکتا ہے اور بظاہر تو یہ خیال میں آتا ہے کہ اگر اس قسم کے موقع پر ورب العالمین فرماتے تو بہ اعتبار موقع کے بہت ابلغ ہوتا کیونکہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے وہ حضور کی ذات سے متعلق نہیں بلکہ ایک مسئلہ بتاتا ہے جس میں ایمان کے معیار کو ظاہر کیا گیا ہے اور جس کا تعلق عامۃ الناس سے ہے۔ تو اس موقع پر ربوبیت عامہ کو جتلانا زیادہ مناسب تھا لیکن بجائے اس کے یہ عنوان اختیار کیا گیا کہ رب العالمین کی جگہ وَرَبِّکَ فرمایا گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صحیح معیار ایمان کا یہی ہے کہ حضور کے فیصلہ کو بدل و جان تسلیم کیا جاوے سو اس کے لئے یہی زیادہ مناسب تھا کہ لوگوں پر یہ بات ظاہر کر دی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضور کا مرتبہ جن کے بناء پر آپ کے فیصلہ کو تسلیم کرانا ہے کیا ہے جب یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ حضور کا مرتبہ حق تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے تو حضور کے فیصلہ کی پوری وقعت ہوگی اور پھر کسی کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اس کو بخوشی تسلیم نہ کرے اس واسطے وربک فرمایا گیا۔ پس اس میں قسم کے ساتھ حضور کی عظمت بھی ظاہر ہوگئی یعنی یہ ظاہر ہو گیا کہ حضور کا درجہ اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ حق تعالیٰ اپنی قسم بلحاظ اس علاقہ کے کھاتے ہیں جو حضرت حق کو حضور کے ساتھ ہے اور یہ علاقہ اتنا بڑا ہے کہ جب عامۃ الناس کو اس کی اطلاع ہو جائے گی تو پھر حضور کے فیصلہ میں ان کو کسی چون و چرا کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس بیان سے اس کا نکتہ واضح ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاقہ سے کیوں کھائی اب ایک سوال اور باقی رہتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو حضور سے تو کئی قسم کے تعلقات ہیں مثلاً سب سے بڑا علاقہ الوہیت کا ہے جو ام العلائق ہے تو بجائے وَرَبِّکَ کے والٰھک کیوں نہ فرمایا۔ سبحان اللہ قرآن کی بلاغت قابل ملاحظہ ہے چنانچہ اس میں بھی ایک نکتہ ہے جو اس وقت سمجھ میں آیا اور یہ آپ لوگوں کی برکت ہے۔ بعض وقت بیان کرنے والا بالکل خالی الذہن ہوتا ہے مگر سامعین کی طلب اور کشش کی برکت سے اس کے قلب میں کسی نئے مضمون کا القا ہو جاتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ماں کی چھاتیوں میں دودھ اس وقت آتا ہے جب پینے والا ہو جاتا ہے جس کی بابتہ مولانا فرماتے ہیں۔

تانہ گرید ابر کے خندد چمن   تانگرید طفل کے جوشد لبن

(یعنی جب تک بادل نہیں برستا چمن سرسبز و شاداب نہیں ہوتا اور جب تک بچہ نہیں روتا ماں کے پستانوں میں دودھ نہیں اترتا اور جب تک دودھ پینے والا نہیں ہوتا تب تک وہ بھی نہیں آتا۔

اصل موثر فضل الٰہی ہے

غرض حاصل یہ ہوا کہ پستانوں میں دودھ پینے والے کی کشش سے آیا مگر اس پر آپ غرہ نہ

ہوں کہ ہم ایسے طالب صادق اور متبرک ہیں کہ ہماری طلب سے مضامین کا القا ہوتا ہے کیونکہ محض آپ کا یہ خیال کر لینا آپ کے دعوے کے لئے کافی نہیں ہوگا وجہ یہ کہ بچہ کی طلب اور کشش سے دودھ جبھی آتا ہے جب کہ چھاتی میں موجود ہو کسی بچہ کے ذریعہ سوکھی لکڑی میں سے تو دودھ نکلوا لیجئے۔ غرض اس میں آپ کی کشش کا بھی اثر ہے مگر اصل موثر فضل الٰہی ہے۔ بہرحال یہ نکتہ اس وقت سمجھ میں آیا وہ یہ ہے کہ اگر والٰھک فرماتے تو اس میں اتنی لطافت نہ پیدا ہوتی جتنی کہ وَرَبِّکَ کے لفظ میں پیدا ہوئی کیونکہ صفت الوہیت کا مقتضا یہی ہے کہ تمام عالم بحیثیت عبد ہونے کے بلاچوں وچرا سارے حقوق بندگی کے ادا کریں تو الوہیت کا تعلق ایک حاکمانہ تعلق ہے کوئی شفیقانہ تعلق نہیں۔ برخلاف صفت ربوبیت کے کہ وہ شفیقانہ تعلق ہے۔ یہ اور بات ہے تو وَرَبِّکَ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم اس علاقہ سے قسم کھاتے ہیں جس کی رو سے ہم تمہاری خاص رعایتیں کرتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ لفظ الٰھک وربک میں کیا فرق ہوا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان محبوبیت

اب غور کیجئے کہ جب حق تعالیٰ خود ہی حضور کی خاص رعایتیں فرماتے ہیں تو عامۃ الناس کا کیا منہ ہے کہ وہ حضور کی رعایت نہ کریں اور اس رعایت کی حقیقت اور حقوق جس کا حاصل اطاعت ہے مستقل دلائل سے ثابت ہے اور خود اس آیت میں بھی ہے حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ الخ اس سے حضور کی محبوبیت کی تاکید پر اور تاکید ہو گئی کیا بلاغت ہے قرآن کی کہ ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اس کا موتی کی لڑی کی طرح پرویا ہوا ہے غرض یہ آیت حضور کی شان محبوبیت سے لبریز ہے جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو اپنے ایسے محبوب کی امت میں پیدا کیا ہے تو اس سے جس قدر لطف وکرم کی ہم امید رکھیں وہ ہر صورت سے کم ہے گو ہماری حالت اس قابل نہ ہو۔

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

اے رب تو بھی کریم ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے سینکڑوں شکر کہ ہم دو کریموں کے درمیان ہیں۔

اصل بیان یہ تھا کہ حق تعالیٰ نے اس آیۃ کریمہ میں مومن ہونے کا معیار اور دل میں ایمان ہونے کا نشان بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے لَایُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ یعنی یہ لوگ مومن جب ہی کہلائیں گے جبکہ آپ کو ہر بات میں اپنا حکم قرار دیں اور اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ فرماتے ہیں۔ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (پھر اپنے دلوں میں ذرہ برابر تنگی نہ پائیں اور پورا پورا تسلیم کریں) وہ تحکیم ظاہری حکم تھا اور یہ تسلیم باطنی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ آپ کے فیصلہ پر عمل بھی

کریں اور دل سے خوشی کے ساتھ اسے تسلیم بھی کریں۔ خواہ کوئی قضیہ ہو حضور ہی کی طرف اس میں رجوع کریں خواہ وہ حق سلطنت ہو یا حق قوم یا حق دشمن اور خواہ حق مشترک ہو یا منفرد۔ حتیٰ کہ حقوق بہائم میں بھی حضور ہی کی طرف رجوع کریں اور حضور ہی کے فیصلہ کا اتباع کریں۔ جو حضور بتائیں اس کو بطیب خاطر تسلیم کریں اور اس کے موافق عمل کریں۔ اور یہ بتلانا حضور کا صحابہؓ کے لئے تو بلا واسطہ تھا مگر ہمارے لئے بواسطہ ہے گو حضورؐ اب موجود نہیں مگر دین کا سارا کام چل رہا ہے اور قیامت تک چلا جائے گا جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چوں کہ شد خورشید و مارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش جز چراغ

جب پھول کا موسم چلا گیا اور چمن اجڑ گیا تو اب پھول کی تمنا ہی فضول ہے ہاں پھول سے اثر ایسا ہی موجود ہے جب سورج غروب ہو گیا اور ہم کو داغ دے گیا اب اس کی جگہ سوائے چراغ کے چارہ کار نہیں ہے۔

جب پھول کا موسم چلا گیا تو اب پھول تو میسر ہو نہیں سکتا اس کی تو تمنا ہی فضول ہے ہاں پھول کے اثرات بھی موجود ہیں اور وہ خوشبو ہے جو گلاب کے اندر ہے لہذا اب طالب کے دل کے سمجھانے کے لئے اگر کوئی چیز ہے تو وہ خوشبو ہے جو عرق گلاب کے اندر موجود ہے اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم گو اب دنیا میں تشریف فرما نہیں لہذا یہ تمنا کرنا کہ حضور کی صحبت کا فیض بلا واسطہ ہم کو حاصل ہو جیسا کہ صحابہ کو حاصل ہوا تھا بالکل ہی بے سود ہے اس لئے کہ اب وہ صورت ہی نہیں پیدا ہو سکتی اب تو اگر حضور کا فیض حاصل کرنا ہے تو ان آثار سے حاصل کر سکتے ہیں جو حضور کے بعد اب تک باقی ہیں وہ کیا ہیں حضور کے علوم جو حضور کے نائبین کے پاس بجنسہ موجود ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت در فشان ست خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اب بھی وہ ابر رحمت درخشاں ہے اور خم و خمخانہ مہر و شاں کے ساتھ ہے۔

طالب کے لئے یہی کافی ہے۔ یہ مثال پھول اور گلاب کی جو میں نے دی کس قدر ناقص ہے کیونکہ وہاں تو خوشبو کامل نہیں حضور کا جو فیض باقی ہے اور حضور کے نائبین اس کے حامل ہیں وہ ناقص نہیں بلکہ ہر طرح کامل ہیں اس کی مثال کے لئے یہ دوسرا شعر مناسب کیا بلکہ انسب ہے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ کہ استاد ازل نے کہا ہے وہی میں کہتا ہوں۔

علماء ان فیوض و برکات کے پہنچانے میں صرف واسطہ ہیں ورنہ در حقیقت علوم وہی ہیں جو حضور سے فائض ہوتے ہیں اس کی مثال عارف رومی نے خوب دی ہے۔

دو دہاں داریم گویا ہمچونے یک دہاں پنہاں ست در لبہائے وے
یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما ہائے و ہوئے در فگندہ در شما

ہم بانسری کی مانند دو منہ رکھتے ہیں ایک دہاں اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے ایک دہاں ہماری طرف نالاں ہے تم میں ہائے ہوئے ڈالے ہوئے ہیں۔

اور فرماتے ہیں۔

ما چو چنگیم و تو زخمہ میزنی زاری از مانے تو زاری میکنی

حضور کے حقیقی نائبین صرف واسطہ ہوتے ہیں حکم کے پہنچانے میں مگر وہ حکم واقع میں حضور ہی کا ہوتا ہے یہ نطق علماء ربانی کا واللہ نطق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اور حضور کے نطق کی نسبت سب کو معلوم ہے کہ وہ وحی ہے وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے نہیں بولتے) خوب کہا ہے۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(اس کی بات اللہ ہی کی بات ہے اگرچہ اللہ بندہ کے گلو سے نکلی ہے)

علماء حقانی کی شان

علماء کی نسبت حدیث میں آیا ہے

ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درھما لکن ورثوا علما (فتح الباری:۱۶۰:۱)

یعنی انبیاء علیہم السلام نے روپیہ پیسہ میراث میں نہیں چھوڑا اور کیا چیز چھوڑی علم۔ اس علم کے وارث کون ہیں وہ لوگ جو متصف ہیں اس علم کے ساتھ یعنی علمائے حقانی۔ ان علماء حقانی کی شان بالکل انبیاء علیہم السلام سے ملتی جلتی ہوئی ہے اور یہ حضرات ایسے ہیں کہ اگر نبوت ختم نہ ہو جاتی تو تعجب نہ تھا کہ ان کو عطا ہوتی مگر چونکہ نبوت ختم ہو گئی۔ لہذا اس کا نام لینا یا اس کی تمنا کرنا یا کسی کے لئے اس کا ثابت کرنا از سرتاپا غلط و خیال خام ہے۔ اگر کسی میں نبوت کی استعداد ہوتی اور وہ نبی ہوتا تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی ہو جاتا کیونکہ اس وقت نبوت ختم نہیں ہوئی تھی۔ اب چونکہ نبوت ختم ہو چکی لہذا صرف اس کی نیابت باقی ہے۔ چنانچہ یہ نائبین ہمیشہ رہے ہیں اور اب بھی بفضلہ موجود ہیں اور یہ نیابت کا درجہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے بجا ہے۔ وہی علوم جو انبیاء علیہم السلام کے پاس تھے ان کے پاس بھی ہیں فرق اتنا ہے کہ ان کو وحی بلا واسطہ حق تعالیٰ سے حاصل ہوتی تھی اور ان کو جو کچھ ملتا ہے نبی کے ذریعہ سے لہذا یہ محتاج ہوئے نبی کے لیکن علوم ان کے سارے وہی ہیں جو نبی پر نازل ہوئے ہیں گویا یہ مبلغ ہیں ان علوم کے۔

اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب علماء کے پاس وہی علوم ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے پاس تھے تو نعوذ باللہ علماء علم میں برابر ہوئے انبیاء کے۔ استغفر اللہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے اگر کوئی بادشاہ اپنی تمام تجویزات وقوانین سے کسی کو آگاہ کر کے اپنے تمام ملک کا انتظام اس کو سپرد کردے کیا دونوں برابر ہوگئے۔ بادشاہ اپنے کمالات وعظمت میں اس کا محتاج نہیں بلکہ اصل ہے اور یہ بادشاہ کا محتاج ہے اور تابع ہے جیسے قمر کا نور شمس سے مستفاد ہے مگر کیا وہ شمس کے برابر ہوگیا۔ پس علماء کتنے ہی بڑھ جائیں مگر انبیاء علیہم السلام کے سامنے ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں جیسے ایک چھوٹے ملک کا نواب کہ وہ رعایا سے بڑا ہے اور ہزاروں آدمی اس سے چھوٹے ہیں لیکن کسی بڑے ملک کے بادشاہ کے سامنے اس کی کچھ بھی ہستی نہیں بلکہ یہ اس کی وزارت کے بھی قابل نہیں۔ اسی طرح علماء ربانی اگرچہ ہم جیسے عوام سے بڑے ہیں لیکن نبی کے مقابل ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہزار عالم بھی مل کر ایک نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ اب ایک بات رہ گئی وہ یہ کہ کسی عالم کی نسبت یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ عالم ربانی اور نائب پیغمبر ہے تاکہ اس کو اتباع نبوی کا واسطہ بنایا جاوے سو یہ بات ان علوم سے معلوم ہوتی ہے جو ان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں وہ علوم مشابہ ہوتے ہیں علوم نبوت کے بلکہ علوم نبوت ہی ہوتے ہیں۔ یعنی باعتبار حقیقت کے تو علوم نبوت ہوتے ہیں اور باعتبار صورت کے بعضے ان میں عین نہیں مگر مشابہ ان کے ہوتے ہیں اس میں القیاس مظہر لا مثبت کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس بات کی شناخت کہ اس کے علوم مشابہ ہیں علوم نبوت کے کچھ دشوار نہیں کیونکہ نبی بھی تو علوم ہی کے ذریعہ سے پہچانے جاتے ہیں ان کے علوم کو آخر کیسے پہچانا جاتا ہے اسی طرح علماء کے علوم کو بھی پہچانا جاسکتا ہے اور یہ پہچان بلا واسطہ تو خواص کو ہوتی ہے باقی عوام بواسطہ خواص کے معلوم کر سکتے ہیں اس طرح کہ خواص کا پہچان لینا علامت ہے کہ یہ علوم ہم رنگ ہیں علوم نبوت کے اور یہ مشابہت ایسی بین ہوتی ہے کہ معاند اور مخالفین کا تو ذکر نہیں لیکن منصف مزاج اور طالب حق اور ذی فہم آدمی کو اس کا پہچان لینا نہایت آسانی سے ممکن ہے اس پہچاننے کے معیار کو میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ عنقریب عرض کروں گا مگر یہاں تک یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ علماء حقانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں تو یہ جو حکم پہنچاتے ہیں وہ درحقیقت حضور ہی کا حکم ہے۔ یہ لوگ صرف حکم پہنچانے کے لئے درمیان میں واسطہ ہیں۔ تو ان سے کسی بات کا پوچھنا فی الواقع حضور ہی سے پوچھنا ہوا اور ان کے فیصلہ کو تسلیم کر لینا حضور ہی کے فیصلہ کو تسلیم کر لینا ہوا تو اب ایمان کی علامت از روئے آیت مذکورہ کے یہ ہوئی کہ ہر حکم شرعی ایسے علماء سے پوچھا کریں اور جو کچھ وہ جواب میں بتلادیں اس کو دل سے تسلیم کریں۔ ان کے فیصلہ کو تسلیم کرنا حضور ہی کے فیصلہ کا ماننا ہوا۔

ایمان کی علامت

غرض یہ بات بہت اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ ایمان کی علامت علماء کا اتباع ہے مگر آج کل لوگوں نے یہ ایک حیلہ نکال رکھا ہے اور یہ لفظ زبانوں پر آتا ہے کہ علماء میں سے ہم کس کا اتباع کریں اس لئے کہ ان کے آپس میں خود ہی اختلاف ہے ایک عالم ایک چیز کو جائز کہتا ہے دوسرا ناجائز۔ میں آپ کی اس بات کو مانتا ہوں لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ نفس الامر میں یہ صرف کام نہ کرنے کا ایک حیلہ ہے۔ آپ کا نفس آپ کو دین سے ہٹانا چاہتا ہے کیوں صاحبو اور بھی تو دنیاوی ضروریات بہت سی ایسی ہیں جن میں اختلاف ہوتا ہے آخر ان میں آپ کیا کرتے ہیں۔ کیا کسی مرض کے بارہ میں دو طبیبوں کے درمیان یا کسی مقدمہ میں دو وکیلوں کے درمیان اختلاف نہیں ہوتا پھر آپ ایسی حالت میں اس اختلاف کو کیسے رفع کر لیتے ہیں اور کس طرح علاج اور مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں۔ وہاں تو آپ اختلاف کی وجہ سے نہ علاج چھوڑتے ہیں نہ مقدمہ کی پیروی۔ بلکہ مخالفین میں سے خوض وغور کے بعد ایک کو ترجیح دیکر اس کام کے لئے منتخب کر لیتے ہیں۔ پس میں اتنا ہی کہتا ہوں کہ جو طریقہ علاج اور مقدمہ کی پیروی میں آپ وہاں اختیار کرتے ہیں اسی طریق کو یہاں بھی کیوں نہیں جاری کرتے۔ میں اس کی تفصیل میں زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ مختصراً آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جتنی کوشش آپ حکیم ڈاکٹر اور وکلاء کے انتخاب اور علاج معالجہ ومقدمہ کی پیروی میں کرتے ہیں اتنی کیا اس سے آدھی تہائی بھی اگر طلب دین میں کریں گے تو آپ کو حق کا راستہ ضرور مل جائے گا۔ دنیا کے بارہ میں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اطباء اور ڈاکٹروں یا وکلاء کے انتخاب میں غلطی ہوگئی اور کسی اناڑی کے ہاتھ میں پھنس گئے تو ناکامی بھی ہوگی اور جان یا مال کا نقصان بھی ہوگا مگر تلاش دین کے بارہ میں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ یہاں تو خطاء اجتہادی پر بھی اجر ہے لوگوں کو خبر نہیں کہ ہمارے گھر میں کیا دولت ہے۔ شریعت میں سب دولتیں موجود ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ اسے اٹھا کر دیکھتے بھی نہیں ہیں اختلاف میں بھی کسی حالت میں ناکامی نہ ہونے کی اثبات میں ایک حدیث آپ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اختلاف میں ناکامی نہ ہونے کا واقعہ

حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی قریظہ کی طرف جہاد کے لئے تشریف لے چلے لشکر سے فرمایا کہ جلدی چلو اور عصر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر پڑھو۔ اتفاق سے راستہ میں عصر کا وقت آ گیا لشکر ہر وقت ایک جگہ تو ہوتا نہیں متفرق جماعتیں ہوا کرتی ہیں جو لوگ حضور سے دور تھے ان کے آپس میں اختلاف ہوا کہ عصر کی نماز راستہ میں پڑھیں یا نہیں ایک فریق نے کہا کہ حضور کا حکم تو یہی ہے کہ بنی قریظہ میں پڑھیں پھر ہم یہاں کیسے پڑھ سکتے ہیں صحابہ

کا اتباع دیکھئے کہ کس قدر حضور کے حکم کے متبع تھے اس سے بحث نہیں کہ وہاں پہنچ کر نماز کا وقت بھی رہے گا یا نہیں۔ یہ حکم سنا تھا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں پڑھو اسی بات پر تیار ہو گئے کہ وقت متعارف میں نماز ہو یا نہ ہو ہم تو وہیں پہنچ کر پڑھیں گے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک برفرق قناعت بعد ازیں

جب شاہ دین ہم سے طمع کے خواہشمند ہوں تو ہم کو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈالنا چاہئے۔

چنانچہ اس فریق نے راستہ میں نماز نہیں پڑھی اور برابر چلے گئے۔ جب بنی قریظہ میں پہنچے تو عصر کا وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ مغرب کے وقت عصر کی نماز پڑھی اور دوسرے فریق نے کہا کہ حضور کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں کہ عصر کی نماز باوجود وقت ہو جانے کے راستہ میں نہ پڑھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جلدی پہنچنے کی کوشش کرو جس میں عصر تک وہاں پہنچ جاؤ۔ چنانچہ اس فریق نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی۔ پھر وہاں پہنچ کر دونوں فریق نے حضور کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا۔ حضور دونوں سے خوش ہوئے۔ دیکھئے دونوں کے کام ایک دوسرے سے مخالف تھے ایک نے نماز وقت پر پڑھی اور دوسرے نے وقت کے بعد مگر دونوں ناکام نہیں رہے۔ حضور دونوں سے خوش رہے اور حضور کی رضا عین حق تعالیٰ کی رضا ہے۔ الحاصل نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ دونوں فریق سے راضی رہے۔ ایک دوسری نظیر اس سے واضح پیش کرتا ہوں اس واقعہ میں تو شاید کوئی یوں کہنے لگے کہ یہ ایک خاص واقعہ تھا جس میں اختلاف آراء ہوا ممکن ہے کہ حضور نے کامیابی تو ایک ہی شق میں سمجھی ہو مگر ناکام کو معافی دیدی ہو۔

اختلاف میں ناکامی ہونے کی ایک نظیر

میں جو نظیر اب پیش کروں گا اس میں احتمال کی بھی گنجائش نہیں دیکھو مسئلہ یہ ہے کہ اگر جنگل میں چار آدمی ہوں اور نماز کا وقت آجاوے اور قبلہ نہ معلوم ہو سکے تو ایسی حالت میں شرعاً جہت تحری قبلہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خوب سوچ لینا چاہئے جس طرح قبلہ ہونے کا ظن غالب ہو اسی طرح نماز پڑھ لینی چاہئے۔ اب فرض کیجئے کہ ان چاروں آدمیوں میں اختلاف ہوا ایک کی رائے پورب کی طرف ایک کی پچھم جانب ایک کی دکھن ایک کی اتر طرف قبلہ ہونے کی ہوئی تو اب مسئلہ فقہ کا یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے پر عمل کرنا چاہئے اور جس سمت کو اس کی رائے میں ترجیح ہو وہ اسی طرف نماز پڑھے اگر دوسرے کی رائے کے موافق پڑھے گا تو نماز نہیں ہوگی خواہ وہ سمت واقع میں صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ اب یہ بات صریحاً ظاہر ہے کہ سمت صحیح کی طرف ان چاروں میں سے ایک ہی کی نماز ہوئی ہوگی لیکن عنداللہ سب ماجور ہیں اور قیامت میں کسی سے یہ سوال نہ ہوگا کہ تم نے نماز غیر قبلہ کی طرف کیوں نہ پڑھی تھی جس کی یہ وجہ نہیں کہ سب نے نماز قبلہ ہی کی طرف

پڑھی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ قبلہ چاروں سمتوں میں تو ہو نہیں سکتا لامحالہ ایک ہی طرف رہا ہوگا بلکہ وجہ یہ ہے کہ سبھوں نے قصداً اتباع قبلہ ہی کا کیا ہے مگر صحیح سمت معلوم کرنے سے معذور رہے جتنا ان کا اختیاری فعل تھا وہ انہوں نے ادا کر دیا۔ ان دونوں نظیروں سے ثابت ہو گیا کہ اختلاف کی حالت میں جس کا بھی اتباع کیا جائے گا حق تعالیٰ کے نزدیک وہ مقبول ہے حتیٰ کہ اگر خطا پر بھی ہے تب بھی کوئی باز پرس نہیں بلکہ اجر ملے گا تو ثابت ہو گیا کہ دین کے راستہ میں کوئی ناکام نہیں بلکہ اگر وہ مقلد ہے تو اس کو معذور سمجھا جائے گا اور اگر مجتہد ہے تو اس پر بھی ملامت نہیں بلکہ ایک اجر اس خطا کی صورت میں بھی ملے گا۔ تو دین میں کسی طرح بھی ناکامی نہ ہوئی حتیٰ کہ خطا کی صورت میں بھی کامیابی ہی رہی تو اب وہ حیلہ آپ کا کہ علماء میں اختلاف ہے ہم کس کا اتباع کریں بالکل نہیں چل سکتا۔ علماء کے اختلاف کی صورت میں آپ جس کا بھی اتباع کریں گے تعمیل حکم ہو جائے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس بات میں اختلاف دیکھو بے سوچے سمجھے یا ہوائے نفسانی سے جس کا چاہو اتباع کر لو۔ مثلاً قادیانی اور سنی کا اختلاف دیکھو تو کیفما اتفق ایک فریق کو اختیار کر لو۔ قرآنی اور غیر قرآنی کا اختلاف دیکھو تو۔ جس فریق کو چاہو اختیار کر لو یہ مطلب ہرگز نہیں کیونکہ گفتگو ہے علماء حقانی کے اختلاف کے بارہ میں پہلے اس کو تحقیق کر لو کہ دونوں علماء حقانی ہیں یا نہیں جب تحقیق ہو جاوے کہ دونوں حقانی ہیں تو اب دونوں کی اتباع میں گنجائش ہے۔ جس کی بھی موافقت کر لی جائے گی تعمیل حکم ہو جائے گی اور وہ موجب رضاء خدا ہو گی۔ اب آپ کہیں گے کہ ہم یہ کیسے تحقیق کریں کہ کون علماء حقانی ہیں اس کے لئے میں بہت مختصر طریق بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے معاندانہ اعتراضات اور اغراض کو چھوڑ کر اور حق تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر اور دین کو ضروری سمجھ کر ان علماء کے حالات میں غور کیجئے اگر آپ ایسا کریں گے تو عادۃً ممکن نہیں کہ نہ پہچان سکیں کہ یہ علماء حقانی ہیں یا نہیں۔ دیکھو علاج کی ضرورت کے وقت اور قتل کے مقدمہ کی پیروی کے وقت آپ طبیبوں اور وکیلوں کی تلاش کرتے ہیں تو آپ کو دو چار طبیب اور دو چار وکیل قابل اطمینان ضرور مل جاتے ہیں اور وہ سب قابل اعتماد ہوتے ہیں لیکن اس وقت بھی آپ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے کہ ان سب قابل اعتماد لوگوں میں سے ایک کو چھانٹ کر علاج اور مقدمہ کی پیروی اس کے سپرد کر دیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ طبیب یا وکیل تو ہم نے کامل اور قابل اطمینان ڈھونڈ لیا ہے اب صحت ہونا یا پھانسی کے مقدمہ سے بری ہونا تقدیر کے اوپر منحصر ہے۔ اسی طرح دین کے لئے جتنی کوشش آپ کے امکان میں ہے وہ کر کے علماء حقانی کو تلاش کر لیجئے اور ان کے اختلاف کی صورت میں کسی ایک کے قول کو لے لیجئے جس کے متعلق دل

زیادہ گواہی دیتا ہو اور بلاچون و چرا اس قول کا اتباع کر لیجئے بلکہ علاج اور مقدمہ کے بارہ میں تو یہ بھی احتمال تھا کہ شاید باوجود حاذق اور تجربہ کار ہونے کے طبیب یا وکیل کوئی غلطی کر جائے اور کام بگڑ جائے مگر دین کے بارہ میں تو یہ احتمال بھی نہیں کہ عالم حقانی اگر غلطی کر جائے گا تو آپ کے ذمہ باز پرس کا بار رہ جائے گا۔ وہاں کا قانون یہ ہے کہ مجتہد کی خطا بھی مقبول اور موجب اجر ہے۔

گر خطا گوید ورا خاطی مگو ور شود پرخوں شہید آں راشو

خون شہیداں را از آب اولیٰ ترست ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست

اگر خطا کریں تو ان کو خطا کار مت کہو اور اگر شہید خون میں لت پت ہو جائے تو اس کو مت دھوؤ شہیدوں کا خون پانی سے بہتر ہے یہ خطا ثواب سے زیادہ بہتر ہے۔

مجتہدین کے اختلاف کا حکم

ابھی آپ نے سنا کہ تحری قبلہ کے بارہ میں چار شخصوں میں کیسا اختلاف ہوا جس میں جمع کی کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر فقہ نے اس میں یہ حکم دیا کہ جس طرف جس کا دل یقین کرے نماز پڑھ لے ہر شخص کی نماز صحیح ہو جائے گی اور اس کے لئے یہی جہت قبلہ ہے حتیٰ کہ اگر اپنی تحری کے خلاف نماز پڑھی تو وہ باطل سمجھی جائے گی اور مقبول نہیں ہوگی اور قیامت کے دن وہ منہ پر ماری جائے گی۔ یہ نماز بے کار گئی اور مردود ہوئی نتیجہ یہ کہ اس وقت کی نماز اس کے ذمہ باقی رہی قیامت میں اس نماز کا سوال ہوگا اور ایک دوسری باز پرس الگ رہی کہ غیر قبلہ کی طرف نماز کیوں پڑھی اس کی پکڑ دھکڑ علیحدہ ہوگی کیونکہ اس کا قبلہ تو جہت تحری تھا گو واقع میں وہ قبلہ نہ ہو۔ اسی کو کہا ہے

ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

یہیں سے ایک مسئلہ یہ نکالا گیا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید حرام ہے۔

بس یہ بناء ہے اختلاف مجتہدین کی۔ بعض لوگ آج کل یہ بھی کہتے ہیں کہ مجتہدین کے آپس میں اختلاف کیوں رہا۔ سب نے مل کر کمیٹی کر کے اتفاق رائے کیوں نہ کر لیا۔ یہ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کی کون سی چیز اختلاف سے خالی ہے بہت سے مسائل طب کے ایسے ہیں جن میں اطباء مجتہدین کا اختلاف رہا تو انہوں نے کمیٹی کر کے اس اختلاف کو کیوں نہ رفع کر لیا آج کل کمیٹی کا بڑا زور ہے۔ ڈاکٹر لوگ تو کثرت رائے کے معتقد ہیں تو ذرا ان سے پوچھئے کہ انہوں نے اپنے باہمی اختلاف کو جو ان کے درمیان طبی مسائل میں اس وقت بھی موجود ہیں کمیٹی کر کے کیوں نہ دور کیا۔ اور اس سے بھی واضح نظیر لیجئے کہ سلطنت موجودہ کا قانون ایک ہے لیکن پھر بھی دو ججوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ انہیں واقعات کی بناء پر جو مثل میں موجود ہے ایک پھانسی کا حکم دیتا ہے دوسرا

اس کو رہا کرتا ہے۔ دونوں موجود ہیں دونوں مل کر کمیٹی کر کے ایک بات پر کیوں نہیں اتفاق رائے کر لیتے۔ میں اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتا بس یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ **فما هو جوابكم فهو جوابنا** (جو تمہارا جواب ہے وہی ہمارا جواب ہے) ہاں اس کا راز اور کنہ بتائے دیتا ہوں کہ یہ سوال ان کے دلوں میں کیوں پیدا ہوتا ہے خوب غور کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ سوال ان ہی کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے جن کے دلوں میں دین کی عظمت و وقعت ذرا بھی نہیں ہے اور دین کو صرف رسم و رواج کے طور پر مانتے ہیں اس واسطے رفع الزام کے طور پر کہتے ہیں کہ مجتہدین نے اتفاق رائے کیوں نہ کر لیا ان کے نزدیک دین کوئی مہتم بالشان چیز نہیں لہذا ان کے نزدیک رفع اختلاف کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ جن لوگوں میں اختلاف ہو وہ جمع ہو کر بیٹھ جاویں اور دو چار آدمی ادھر اور دو چار ادھر ہو جائیں اور جس طرف کثرت رائے ہو اسی کو ٹھیک سمجھ لیا جاوے اور اسی کو دین قرار دیا جائے چاہے وہ صحیح ہو یا غلط افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنے کسی خاص عزیز کی بیماری کے وقت محلہ والوں کو جمع کر کے کثرت رائے سے نسخہ کیوں نہیں لکھوالیا کرتے۔ اس میں تو یہ حالت ہے کہ کامل حاذق تجربہ کار معتمد علیہ طبیب کی تجویز کے بعد بھی اس میں ہندی کی چندی نکالی جاتی ہے کہ حکیم صاحب کتنے پانی میں دوا پکائی جائے گی اور کس طرح پلائی جائے گی۔ غذا کیا ہو گی۔ طبیب سے بار بار یہاں تک پوچھتے ہیں کہ وہ تنگ ہو کر کہنے لگتا ہے کہ تم بڑے وہمی ہو تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جناب علاج کا معاملہ ہے ذرا سی بے عنوانی میں کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے بہت ممکن ہے کہ مریض کو نقصان پہنچ جاوے دوا میں اتنا وہم اور دین میں ذرا بھی نہیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ صحت کی تو ذہن میں وقعت ہے اور دین کی بالکل نہیں۔ اب یہ بات دیکھنے کی ہے کہ صحت جسمانی میں خرابی پڑنے سے جو نتیجہ پیدا ہو گا وہ زیادہ سخت ہے یا دین میں خرابی پڑنے سے جو نتیجہ ہو گا وہ زیادہ سخت ہے سو ظاہر ہے کہ دین کی خرابی کا نتیجہ زیادہ سخت ہو گا۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ صحت کے فقدان سے انسان اکثر کاموں سے معذور ہو جائے گا لیکن بدن تو خود ہی فانی ہے دنیا میں صرف چند روز رہنے والا ہے۔ صحت کی خرابی سے یہ ہو گا کہ چند روز یعنی حیات محدود تک تکلیف رہے گی لیکن جب بدن ختم ہو جائے گا تو وہ تکلیف بھی جاتی رہے گی بخلاف دینی خرابی کے کہ اس سے جو تکالیف ہوں گی وہ فانی نہیں بلکہ وہ باقی یا ممتد رہیں گی اور چند روز میں ان کا خاتمہ نہ ہو گا۔ کیونکہ وہاں کا ایک ایک دن یہاں کے ایک ایک ہزار برس کے برابر ہو گا۔ اگر ایک دن کی بھی تکلیف بھگتنی پڑی تو وہ ایک ہزار برس کے برابر ہوئی اور تکلیف بھی کیسی جس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ وہاں کی تکلیف کما بھی زیادہ اور کیفا بھی زیادہ غرض دونوں طرح سے یہاں سے کہیں زیادہ ہے تو اب بتلایئے اس کے بارہ میں احتیاط کی زیادہ ضرورت ہے یا دنیا

کی چند روزہ صحت کے لئے لیکن ان حضرات کا طرز عمل بالکل اس کے خلاف دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے بارہ میں تو بہت واہی اور آخرت کے معاملہ میں بہت ہی جری اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہوسکتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزوں کی ان کی نظروں میں وقعت ہے اور آخرت کی عظمت و وقعت نہیں اس کو بالکل غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں چنانچہ یہی بناء ہے ان کے اس قول کی کہ مجتہدین نے کمیٹی کر کے اتفاق رائے کیوں نہ کرلیا ورنہ اگر اس کی عظمت قلب میں ہوتی تو کمیٹی کو کافی نہ سمجھتے

اب میں بعض احکام میں اتفاق نہ ہونے کا راز بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ دو قسم کے لوگوں میں اتفاق رائے کبھی نہیں ہوسکتا ایک تو ان لوگوں میں جو اعلیٰ درجہ کے جاہل ہوں اس لئے کہ وہ بات کو سمجھتے ہی نہیں تو اتفاق کیا کریں گے دوسرے ان لوگوں میں جو اعلیٰ درجہ کے عالم اور محقق ہوں۔ ہر فن کے موجدین' ماہرین اور محققین کا اختلاف اسی قسم ثانی کا اختلاف ہے دیکھئے بوعلی سینا اور جالینوس کے درمیان بعض طبی مسائل کا اختلاف ہے اسی طرح ارسطو اور افلاطون میں بھی اختلاف ہے۔ آج کل ان ڈاکٹروں میں بھی جو موجد فن اور اہل تحقیق کہلاتے ہیں بہت سے معاملوں میں اختلاف اور یہ اختلاف کسی طرح رفع نہیں ہوسکتا اسی طرح آئمہ مجتہدین کے اختلاف کو سمجھ لیجئے۔ ظاہر ہے کہ یہ اختلاف قسم اول کا تو ہے نہیں یقیناً اور حتماً قسم ثانی کا اختلاف ہے کیونکہ یہ حضرات جس درجہ کے عالم اور اہل تحقیق اور صاحب فن تھے دنیا کو معلوم ہے جب ان کا اختلاف اسی قسم کا ہے جیسے طبیبوں اور ڈاکٹروں میں ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ طبیبوں اور ڈاکٹروں کے اختلاف کو تو برا نہ کہا جائے نہ اس پر اعتراض کیا جاوے کہ کمیٹی کر کے اتفاق رائے کیوں نہیں کر لیتے۔ اور مجتہدین پر یہ اعتراض کیا جاوے۔ حضرات انصاف آپ ہی کے اوپر ہے۔

ائمہ مجتہدین کی شان

صاحبو ائمہ مجتہدین کا علم تو دنیا کو معلوم ہے باقی دیانت و تقویٰ اور خوف خدا بھی اعلیٰ درجہ کا ان کے رگ و پا میں رچا ہوا تھا اس لئے ان کے اختلاف کو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کم علمی کی وجہ سے تھا یا کسی ذاتی غرض اور نفسانیت پر مبنی تھا بلکہ ان حضرات نے حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر محض للّٰہیت سے دین کو مرتب کیا۔ ان کو دین سے جاہ مقصود تھا نہ مال صرف رضائے الٰہی مقصود تھی پس ایسے شخص کو تحقیق سے جو بات معلوم ہو جاوے اس کے چھوڑنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے اور وہ اپنی تحقیق کو چھوڑ کر دوسرے کی تحقیق کو کیوں اختیار کرنے لگا۔ البتہ ایسا بکثرت ہوا ہے کہ ایک بات کسی مجتہد کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے اپنے دوسرے ہم عصر اور ہم رتبہ سے مشورہ کیا یا بدوں ان کے مشورہ کے کسی دوسرے نے ان کو از خود بتا دیا کہ آپ کی یہ رائے صحیح نہیں ہے اور ان کے دل نے قبول کرلیا یا ان دونوں صورتوں

میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہوئی بلکہ خود ان کو اپنے تجربہ یا مزید تحقیق سے کوئی دوسری رائے زیادہ صحیح معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنی پہلی رائے سے فوراً رجوع کر لیا لیکن جب تک کہ دوسری تحقیق ان کے اجتہاد کے موافق ہوئی اپنی پہلی تحقیق کو نہیں چھوڑا۔ خلاصہ یہ کہ انہوں نے جو کچھ کیا محض للّٰہیت سے کیا۔ اور للّٰہیت ہی ان کے اتفاق واختلاف کا سبب ہوئی۔ پھر بتایئے ایسے شخص کو دوسرے کی تقلید کیسے جائز ہو سکتی ہے ایسا شخص اگر تقلید کرے گا تو اس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ اس نے وہ تحقیق تو چھوڑ دی جو خالصاً لوجہ اللہ اسے حاصل ہوئی تھی اور کسی مصلحت سے رائے کو بدل دیا تو ایسا شخص جو للّٰہیت کو چھوڑ کر مصلحت کا اتباع کرے مجتہد تو کیا ہوتا ایک ادنیٰ درجہ کا عالم بھی کہلانے کا مستحق نہیں ہے اس تقریر سے یہ مضمون خوب ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ مجتہد کو دوسرے کی تقلید جائز نہیں اگر وہ کسی مصلحت سے ایسا کرے گا تو مواخذہ ہوگا۔ اس تقریر میں قدرے طول ہو گیا بیان یہ تھا کہ ہر کام میں علماء کے اتباع کی ضرورت ہے اگر علماء میں اختلاف ہو تو آپ کو گنجائش ہے کہ اس مسئلہ میں کسی کا بھی اتباع کر لیں یہ اختلاف برا نہیں بلکہ عند اللہ دونوں مقبول اور ماجور ہیں۔ حق تعالیٰ کے یہاں دونوں اسی طرح ماجور ہیں جیسے جہت تحری کی طرف دو مختلف سمتوں کے نماز پڑھنے والے کہ کسی پر ملامت نہیں غرض کہ علماء کا ایسا اتباع بعینہٖ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے اور علماء حضور کے نائب ہیں اور یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر یاد دلاتا ہوں کہ علماء سے مراد علماء حقانی ہیں کیونکہ علماء بھی دو قسم کے ہیں ایک علماء حقانی دوسرے علماء شیطانی علماء حقانی کے کچھ اوصاف میں اوپر بیان کر آیا ہوں مختصراً پھر بھی بیان کئے دیتا ہوں علماء حقانی وہ ہیں جو اپنی رائے اور اغراض کو حق تعالیٰ کے حکم کے سامنے بالکل فنا کر چکے ہوں اور ان کے نزدیک اس حکم کے مقابلہ میں دنیا و مافیہا کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ بس خلاصہ تمام اوصاف کا یہ ہے اور جو اپنی اغراض و ہوائے نفسانی کے بندے ہوں وہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کو عالم کہا جائے۔ حق بات وہ کبھی کہہ ہی نہیں سکتے۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد   صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

(جب غرض آجاتی ہے تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے سو پردے دل سے آنکھ پر پڑ جاتے ہیں۔)

بلکہ وہ حق بات کو سمجھ بھی نہیں سکتے کیونکہ جب تک اغراض باقی رہتے ہیں نور علم قلب میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ اغراض کے سبب قلب کے اوپر پردہ پڑ جاتا ہے۔

ایک متبع ھویٰ کا ساس کو حلال کرنا

ابھی حال ہی کا قصہ ہے کہ ایک صاحب اپنی ساس پر مفتوں ہو گئے اور چاہا کہ اس سے نکاح

کریں۔ (چونکہ بڑے متقی تھے اس وجہ سے ناجائز تعلق رکھنا مناسب نہ جانا) ایک مولوی کے پاس گئے ایسے کم بخت نالائق کو مولوی کیسے کہوں ایسے ہی لوگوں نے تو مولویوں کو بدنام کر دیا۔ کام کے مولوی تو تھے نہیں صرف نام کے تھے اس وجہ سے کہ کچھ پڑھے لکھے تھے مگر افعال ان کے ایسے تھے کہ کسی جاہل کے بھی ویسے نہ ہوں گے چنانچہ انہوں نے ساس جیسی محرمہ علی التابید کو بھی حلال ہی کر چھوڑا جیسا ابھی معلوم ہوتا ہے غرض اس دین فروش سے انہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ساس پر میری طبیعت آ گئی ہے اور ناجائز کام کرنا نہیں چاہتا۔ لہذا کسی طرح اس کو جائز کر کے اس سے میرا نکاح کر دو۔ اس نے کہا بھلا ساس سے کہیں نکاح ہو سکتا ہے دنیا جانتی ہے کہ ساس ماں کے برابر ہے پھر اس سے نکاح کیسے ہو سکتا ہے کہا کوئی صورت بھی ہے کہنے لگے کہ ایسا مشکل کام تم ہم سے لینا چاہتے ہو جس میں بہت دماغ خرچ کرنا ہوگا مگر خیر سوچیں گے اور سوچنے کے بعد کوئی صورت نکالیں گے مگر ایک ہزار روپیہ تم سے لیں گے چونکہ ساس کے اوپر طبیعت ان کی آئی ہوئی تھی اور اس سے نکاح کرنے کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا لہذا اتنے بڑے کام کے لئے ایک ہزار روپیہ کا دے دینا کیا بڑی بات تھی منظور کر لیا۔ افسوس ہے کسی نے سچ کہا ہے زل العالِم زل العالَم (عالم کی لغزش ایک جہان کی لغزش ہے) ایک گناہ تو جاہل کا ہوتا ہے کہ وہ اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے کہ وہ گناہ کرے گا تو اس کا نتیجہ خود ہی بھگتے گا دوسرے تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اور ایک گناہ عالم کا ہوتا ہے جو متعدی ہے وہ محض اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں تک اس کا اثر پہنچتا ہے۔ یہ دین فروش خود تو گنہگار ہوا ہی دوسرے کو بھی ڈبویا اور ساس کو کسی نہ کسی طریقہ سے پھیر پھار کر جائز کر ہی دیا اور ویسے نہیں بلکہ شرعی دلیل سے اب وہ دلیل سنئے ساس کی حرمت قطعیہ اس لفظ سے ثابت ہے وامھات نساء کم اس کے معنی ہیں کہ تمہاری بیبیوں کی مائیں بھی تم پر حرام ہیں۔ بی بی کی ماں کو ساس کہتے ہیں اس سے ساس کی حرمت ثابت ہوئی اس نے اس میں ایک مقدمہ قائم کیا وہ یہ کہ ساس کہتے ہیں بی بی کی ماں کو اور بی بی کس کو کہتے ہیں جس سے نکاح صحیح ہوا ہو۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ بیوی سے تمہارا نکاح صحیح ہوا تھا یا نہیں سو اس میں کلام ہے کیونکہ نکاح صحیح جبھی ہوتا ہے جب مرد و عورت دونوں مسلمان ہوں یا بی بی کتابیہ ہو غرض مشرک نہ ہو اور تمہاری بی بی جاہل ہے (یہ دریافت کر لیا تھا کہ وہ جاہل ہے اور یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ نکاح کے وقت کلمہ وغیرہ نہیں پڑھایا گیا تھا بس اب معاملہ درست ہو گیا اور گنجائش نکل آئی اس طرح سے کہ جاہل بسا اوقات کلمات کفر کے بک دیا کرتے ہیں پھر نکاح کے وقت کلمہ بھی نہیں پڑھایا گیا جس

سے کفر کا ازالہ ہو جاتا۔ غرض نکاح کے وقت بی بی کا ایمان ثابت نہیں اور نکاح میں ایمان شرط ہے جب یہ شرط نہ پائی گئی تو نکاح بھی صحیح نہیں ہوا اور جب نکاح صحیح نہیں ہوا تو وہ منکوحہ بھی نہ ہوئی جب وہ منکوحہ نہ ہوئی تو اس کی ماں ساس بھی نہ ہوئی بلکہ ایک اجنبی عورت ہے لہذا اس سے نکاح جائز ہے۔ دیکھئے پھیر پھار کر کے کس طرح دلیل سے اس کو جائز کر دیا۔ کتنا بڑا کام بن گیا ایک شخص کا دل خوش ہو گیا اور اس وقت گناہ سے بھی بچ گیا۔ ع عاقبت کی خبر خدا جانے دیکھئے حضرات یہ عالم ہیں جنہوں نے اتنا بڑا کام کیا۔ (بڑا تو کیا یوں کہئے کہ سڑا کام کیا) ایسے صریح حرام کو جس کی تصریح نص قرآنی میں موجود ہے توڑ مروڑ کر حلال ہی کر کے چھوڑا اور ایسا ویسا حلال بھی نہیں بلکہ باقاعدہ قیاس مرتب کر کے دلیل قائم کر کے تب حلال کیا اور اپنے خیال کے موافق اس میں کوئی موقع اعتراض کا نہیں چھوڑا ہاں ایک اعتراض ممکن ہے کوئی وارد کرے کہ انہوں نے اس بناء پر اس عورت کو حلال کیا کہ اس کی بیٹی سے نکاح صحیح نہیں ہوا تھا لہذا وہ ساس ہی نہیں ہوئی۔

ام مزنیہ سے نکاح حرام ہے

لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک ام مزنیہ سے بھی نکاح حرام ہے۔ بی بی سے نکاح نہ ہوا نہ سہی لیکن وطی بالزنا تو ثابت ہے لہذا اس حالت میں بھی ساس سے نکاح حرام ہے لیکن بات یہ ہے کہ جب اس شخص نے صریح حکم کو پھیر پھار کر الٹ دیا تو اسے اس اشکال کا جواب دینا کیا مشکل ہے سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ کہہ دے یہ ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کہ مزنیہ کی ماں سے نکاح حرام ہے۔ ابوحنیفہؒ کی رائے ہمارے واسطے حجت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں اور بھی رائیں ہیں افسوس کیا ناس کیا ظالم نے دین کا۔ ایسے ہی نام کے مولوی دین اور اہل دین کو بدنام کرتے ہیں جہاں دو حرف آ گئے بس اپنے کو مولوی سمجھنے لگے اور فتویٰ دینے بیٹھ گئے ان کی تو مشق ہوتی ہے اور دین کا کام تمام ہوتا ہے۔

حضرت ابن المنصور کو سولی چڑھانے کا واقعہ

چنانچہ مولانا حضرت ابن المنصور کے قصہ میں فرماتے ہیں۔

چوں قلم در دست غداری فتاد ۔۔۔ لاجرم منصور برداری فتاد

جبکہ قلم ایک غدار کے ہاتھ میں گیا تو لامحالہ منصور کو دمہ پر چڑھنا پڑا۔

ابن المنصور کا کام اسی طرح تو تمام ہوا۔ ایک وزیر ان کا دشمن تھا اس واقعہ سے اس کو موقع مل گیا حکومت کے اثر سے علماء سے فتویٰ لے کر ان کو سولی پر چڑھا دیا۔ ساری دینداری وزیر کی بس اسی ے پر تھی۔ درحقیقت نکالی تو عداوت اور آڑ رکھی فتوے کی اسی طرح یہ علماء دنیا طلب کرتے ہیں کہ

خواہش تو پوری کرتے ہیں نفس کی اور آڑ رکھتے ہیں دین اور فتوے کی۔ خدا بچائے ایسے مولویوں سے سچ بات یہ ہے کہ اس میں ذرا سی کوتاہی علماء حقیقی کی بھی ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کو مولوی بنا کر اس کی دستار بندی کر دیتے ہیں اور اسے تعلیم و فتویٰ دینے کی اجازت بھی دے دیتے ہیں پہلے انہیں دیکھ لینا چاہئے جس کی طینت خراب ہو اور جس میں اہلیت مقتدا بننے کی نہ ہو اس کو ہرگز ان کاموں کی اجازت نہ دیں بلکہ درسیات بھی نہ پڑھائیں۔ صرف ضروریات دین کے موافق اس کی تعلیم کر دیں۔

بد گہر را علم و فن آموختن دادن تیغ است دست راہزن

نااہل کو علم و فن سکھانا گویا ڈاکو کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے۔

سلف صالحین میں اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ جس شخص کے متعلق آثار سے معلوم ہو جاتا تھا کہ اس میں حب دنیا غالب ہے تو اس کو مولویت کے درجہ تک بھی نہیں پہنچاتے تھے ارشاد و تلقین اور فتویٰ نویسی کا کیا ذکر۔ آج کل مدارس میں بالکل اس کی احتیاط نہیں کی جاتی۔ اسی کے یہ نتائج ہیں کہ ایسے ایسے عالم پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھئے ہر کام میں اہلیت اور طبیعت کی مناسبت دیکھی جاتی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ دین کے مقتدا بنانے کے لئے اہلیت اور مناسبت نہ دیکھی جاوے۔ ایسے لوگوں میں علم پڑھنے سے بجائے تحقیق کے یہ مادہ پیدا ہو جاتا ہے کہ زور تقریر سے جس مدعا کو چاہا الٹی سیدھی دلیل قائم کر کے ثابت کر دیا جیسا کہ اس فتویٰ دینے والے نے ساس کی حلت کو ثابت کر دیا بات بنا لینا تو کچھ مشکل نہیں البتہ حق بات کو معلوم کر لینا یہ مشکل ہے وہ بلا علم حقیقی اور نور علم کے نہیں حاصل ہو سکتا اور نور علم حاصل ہونے کے لئے بڑے مجاہدات اور نفس کشی کی ضرورت ہے باقی جب ایک غرض کو سامنے رکھ لیا وہ جائز ہو یا ناجائز تو اس کے لئے بات کا بنانا کیا مشکل ہے۔ دہلی میں ایک صاحب نے سہرہ کے جواز کا فتویٰ دیا اس طرح کہ سہرہ باندھنے میں کیا کیا افعال ہوتے ہیں۔ سہرہ سامنے لٹکتا ہے اور پھولوں کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ پھول سونگھنا سنت ہے۔ اس میں تو کسی کو کلام نہیں۔ پھر اگر کسی نے ہاتھ میں لے کر سونگھنے کے بجائے الٹا لٹکا کر سونگھ لیا تو اس میں کیا قباحت لازم آئی یوں سونگھ لیا تو کیا اور ووں سونگھ لیا تو کیا ہر حال میں سنت ہی رہا۔ پھر کیا خرابی ہوئی سہرہ باندھنے میں بلکہ سہرہ تو عین سنت ہوا۔ دیکھئے دلیل باقاعدہ موجود ہے اسی طرح ہر مدعا کے لئے دلیل بنالی جاتی ہے۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ علماء کے اختلاف کے وقت اس پر نظر نہ کرو کہ دلیل تو ان کے پاس بھی ہے۔ دلیل تو سبھی کے پاس ہوا کرتی ہے کیا اس کے پاس دلیل نہ تھی جس نے ساس سے نکاح کو حلال کر دیا۔ کوئی شخص جب ایک دعویٰ کرتا ہے تو دلیل اس کی پہلے سوچ لیتا ہے اب آپ شاید یہ کہیں یہ تو عجیب گڑبڑ ہے۔ دونوں طرف دلیل موجود ہے تو اس میں ہم کس کو ترجیح دیں ہمارے لئے تو بڑی مشکل ہو گئی لڑیں تو علماء اور بیچ میں مارے جائیں ہم مفت

کہتا ہوں کہ اس وقت بھی حق کے معلوم کرنے کا ایک طریقہ ہے طلب صادق چاہئے طالب حق کے لئے کہیں راستہ بند نہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ اگر طالب صاحب فہم ہے تو دونوں دلیلوں میں قوت وضعف کو دیکھ کر ترجیح دے سکتا ہے بشرطیکہ انصاف سے کام لے اور خدا تعالیٰ کا خوف اور راہ حق کی طلب کو پیش نظر رکھے اور اگر صاحب فہم نہیں ہے اور دلیل کو کسی طرح سمجھ ہی نہیں سکتا تو اس کے لئے آسان طریقہ ترجیح کا یہ ہے کہ دونوں فتوے دینے والوں کو دیکھئے اور دونوں کے حالات پر غور کرے اس کے نزدیک جو متقی اور پرہیزگار زیادہ ثابت ہو اس کے فتوے کو ترجیح دے اور اسی پر عمل کرے مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ محض ایک نظر میں سرسری طور پر دیکھنے سے یہ بات نہیں معلوم ہو سکتی اس کے لئے ضرورت ہے کہ کم از کم ایک ایک ہفتہ دونوں کے پاس بالکل خالی الذہن ہو کر رہو نہ ان کے معتقد بنو نہ مخالف بلکہ منصفانہ نظر سے دونوں کو دیکھتے رہو اور سفر وحضر خلوت و جلوت میں ان کے حالات میں غور کرتے رہو۔ اس میں اگر دیر لگے گی تو کچھ مضائقہ نہیں تم عند اللہ ماجور ہو گے۔ اتنے غور کے بعد ضرور تم پر حق واضح ہو جائے گا طالب صادق کی تائید حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اگر بالفرض تلاش سے بھی فیصلہ نہ ہو اور کسی فریق کی ترجیح سمجھ میں نہ آوے اور تمہارے نزدیک دونوں علم وتقویٰ میں برابر ثابت ہوں تو اس صورت میں جس طرف دل گواہی دے اس طرف ہو جاؤ۔ بس جو کام تمہارے کرنے کا تھا تم کر چکے اب اگر غلطی بھی رہی تو تم معذور ہو اس بات کو میں پھر دہرائے دیتا ہوں کہ اس طریق کے ہر جزو میں اس کا اہتمام ضروری ہے کہ محض طلب حق اور للّٰہیت رہے نفسانیت وغرض اور ضد نہ آنے پائے۔ یہ ممکن نہیں کہ اس طرح کوئی تلاش حق کرے اور اس کو حق نہ ملے۔ حق تو بہت واضح چیز ہے وہ کسی طرح چھپ ہی نہیں سکتا۔

ہر امر میں اتباع سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت

ہاں اغراض وغیرہ سے اس پر پردہ ضرور پڑ جاتا ہے۔ جب اغراض وغیرہ کو آپ بالائے طاق رکھ دیں گے تو آپ کو حق بھی اور عالم حقانی بھی سب مل جائے گا بس اس کا اتباع کیجئے اب یہ اتباع اس عالم کا اتباع نہ ہوگا بلکہ اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا۔ غرض ہر بات میں اتباع کرو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواہ بواسطہ ہو اور وہ واسطہ عالم حقانی ہے یا بلا واسطہ اور اس وقت تو بواسطہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ حضور دنیا میں تشریف فرما نہیں ہیں جب ہر بات میں تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو گے تو اس وقت یہ کہا جا سکے گا کہ وہ علامت ایمان کی جو آیت فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ (قسم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی یہ لوگ یمان دار نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے جھگڑے میں آپ کو حاکم نہ بنا لیں) کے متعلق بیان ہوئی

ہے تم میں موجود ہے اور تم مومن ہو میں نے اوپر یہ قاعدہ بیان کیا تھا کہ جو چیز جس طرح مطلوب ہو اگر اسی طرح واقع نہ ہو تو اس کو عادات میں موجود نہ کہا جائے گا بلکہ کالعدم سمجھا جائے گا اور اسی ضمن میں یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ جس ایمان کے ہم مدعی ہیں وہ جس صفت کے ساتھ مطلوب ہے اسی صفت کے ساتھ ہم میں موجود ہے یا نہیں۔ اور اس شناخت کو محض آپ کی رائے پر نہیں چھوڑا بلکہ اس حکم کو آیت مذکورہ کے حوالہ کیا جس سے ہمارے ایمان کی حالت بخوبی معلوم ہوگئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ جس ایمان پر ہم پھولے بیٹھے ہیں وہ بموجب آیت مذکورہ کے عدم کے حکم میں ہے گو عدم نہیں اس کے ضمن میں اور بہت سی مفید باتیں بیان ہوئیں اور یہ قاعدہ کہ جو چیز جس طرح مطلوب ہو اس طرح نہ ہو تو وہ حاصل نہ کی جائے گی۔ میں نے آیت لَيْسُوْا سَوَآءً سے اس طرح مستنبط کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی اس جماعت کی جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا یہ حالت بیان فرمائی کہ وہ لوگ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت پر وغیرہا من الصفات حالانکہ یہ صفات اس دوسری جماعت میں بھی موجود تھیں جن کی مذمت فرمائی سو وجہ اس تخصیص کی یہ ہے کہ گویا صفات اس جماعت میں بھی موجود تھیں لیکن اس طرح کی نہیں جس طرح مطلوب تھیں۔ مثلاً وہ صفات الٰہی کے سمجھنے میں غلطی کرتے تھے اور قیامت کو کما حقہ نہیں مانتے تھے کیونکہ مقولہ ان کا یہ تھا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً چند دن کے علاوہ ہم کو دوزخ میں نہ رہنا پڑے گا) جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا پس چونکہ یہ صفات اس طرح موجود نہ تھیں جس طرح ہونی چاہئیں لہذا ان کو کالعدم مانا گیا اور ان

صفات کو اس خاص جماعت میں موجود مانا گیا جن میں یہ صفات اس طرح موجود ہیں جس طرح ہونی چاہئے اس سے قاعدہ کا استنباط بالکل ظاہر ہے۔ یہ بیان ہو يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں) کا آگے فرماتے ہیں وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں بری بات سے یہ بھی صفت ہے اہل کتاب کی اس جماعت کی جن کو مذمت سے مستثنیٰ کیا ہے اس میں بھی وہی کلام ہے جو يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں تھا کہ یہ صفت اگرچہ اس دوسری جماعت میں بھی تھی جس کی مذمت کی گئی لیکن اس وجہ سے کہ ان میں یہ صفت بلا اتباع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تھی تو اس طرح نہ ہوئی جس طرح مطلوب تھی لہذا اس کا وجود کالعدم ہوا اور یہ کہا جاوے گا کہ یہ صفت قبل اسلام لانے کے گو صورۃً ہو مگر حقیقۃً ان میں تھی ہی نہیں خلاصہ یہ کہ گو ان میں دین تھا مگر وہ دین جو مطلوب ہے نہ تھا اور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت تھی بھی ایسے ہی گو وہ بظاہر دین کا کام کرتے تھے لیکن دین کو من حیث الدین نہ کرتے

تھے بلکہ ان میں دوسری اغراض کو بھی شامل کر دیتے تھے مثلاً غریب کو مسئلہ کچھ اور بتاتے تھے امیر کو کچھ اور جیسا کہ اس مولوی نے ہزار روپیہ دینے والے کے لئے ساس کے ساتھ نکاح کو جائز کر دیا اگر کوئی غریب ہوتا اور کچھ نہ دیتا تو وہ شخص قیامت تک اس کے جواز کا فتویٰ نہ دیتا اسی کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ وَلَاتَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (ہماری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت مت لو) اگرچہ ہزار روپیہ کی رقم بظاہر کثیر معلوم ہوتی ہے پھر اسے قلیل کیسے کہا جائے گا آخرت کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی قلیل کیا بلکہ اقل ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیں دنیا کی پونجی قلیل ہے) دین تو حکم الٰہی کا نام ہے امیر و غریب سب اس کے بندے ہیں حکم الٰہی میں کوئی تخصیص کسی کی نہیں تو اس میں تخصیص کرنا نفس اور ہوی کا اتباع ہوا دین کا اتباع نہ ہوا حاصل اس تمام تقریر کا یہی ہے کہ ان میں وہ دین نہ تھا جو مطلوب ہے دین مطلوب جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ وحی کا اتباع کیا جائے اور بلفظ دیگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آگے ارشاد ہے وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ یعنی پیش قدمی کرتے ہیں نیک کاموں میں یہ بھی صفت اہل کتاب کی اسی جماعت کی ہے جس کو مذمت سے مستثنیٰ کیا ہے اور اس میں بھی وہی کلام ہے جو پہلی صفتوں میں تھا یعنی یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں) اور وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ میں آگے ارشاد ہے وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ اس میں اس جماعت اہل کتاب کا حکم بیان فرمایا جس جماعت میں یہ اوصاف ہیں یعنی وہ صالحین میں سے ہیں یہاں ایک بات اور قابل غور ہے اس دوسری جماعت کے واسطے جو فرمایا ہے۔ واولئک من الصالحین (یہی صالحین میں سے ہیں) ظاہراً صالحین کے لفظ سے کچھ ایسا مفہوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کیلئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں کیونکہ صالحین کا درجہ مومنین کے سارے درجات میں سے سب سے کم درجہ ہے جیسا کہ مشہور ہے اور سب جانتے ہیں کہ صالحین سے اوپر شہداء کا درجہ ہے اور ان کے اوپر صدیقین کا تو اس سے ثابت ہوا کہ یہ جماعت اہل کتاب کی مومنین کے ادنیٰ درجہ میں شمار کی جائے گی حالانکہ واقع میں اس کے خلاف ہے اس لئے کہ جو کوئی ایمان لایا وہی مومن ہے خواہ وہ پہلے اہل کتاب رہا ہو یا بت پرست یا مجوسی غرض کچھ بھی رہا ہو اسلام لانے کے بعد اسے یہ سب درجات مل سکتے ہیں جواب یہ ہے محاورات کے نہ جاننے سے اس قسم کے اوہام پیدا ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس شبہ کی بناء بھی یہ ہے کہ لفظ صالحین کو اسی معنی پر محمول کیا گیا جو ایک درجہ والوں کا لقب ہے حالانکہ اس کا استعمال دوسرے معنوں میں بھی آیا ہے۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان

حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی شان میں بھی اس کا استعمال قرآن میں موجود ہے واٰتیناہ فی

الدنيا حسنة و انه في الأخرة لمن الصالحين یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں ہے جو انبیاء علیہم السلام میں بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے نبی ہیں ان کو بھی صالحین میں سے فرمایا یہاں معنی صالحین کے وہ ہو ہی نہیں سکتے جو ادنیٰ درجہ ہیں نیز اس کے ساتھ فرمایا ہے فی الاخرة جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت کی صلاحیت ثابت ہے۔ علماء نے اتفاق کیا ہے اس بات پر کہ انبیاء علیہم السلام کو آخرت میں بھی برابر ترقی ہوتی رہے گی۔ اور اس سب کو حق تعالیٰ نے صلاح فرمایا تو معلوم ہوا کہ صلاح ایک ایسا مفہوم ہے جو بڑے اور چھوٹے مراتب کو شامل ہو سکتا ہے اس درجہ کے لئے بھی صلاح ثابت ہے جو مومنین کا ادنیٰ درجہ ہے جس سے یہ دھوکا ہوا اور اس درجہ کو بھی شامل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آخرت میں ہوگا اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کیونکہ درجات برابر بڑھتے جائیں گے اور صلاح کا لفظ سب میں استعمال کیا جاتا ہے غرض صالحین کا درجہ ادنیٰ درجہ نہ ہوا بلکہ بڑے بڑے مدارج کو بھی شامل ہے تو اب وہ وہم دفع ہو گیا کہ اس جماعت اہل کتاب کے لئے کوئی بڑی فضیلت ثابت نہ ہوئی ایک توجیہ تو اس وہم کے دفع کی یہ ہوئی اور ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ قاعدہ ہے کہ المطلق اذا اطلق يراد به الفرد الكامل صالحین کے یہاں کوئی قید نہیں ہے تو ہم اس صالحین سے انہیں لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو اس کے فرد کامل ہیں تو معنی آیت وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّٰلِحِينَ کے یہ ہوئے کہ اس جماعت کا شمار ان صالحین میں ہوگا جو اعلیٰ درجہ کے صالحین ہیں۔ لہذا اب وہ وہم جاتا رہا کہ اس جماعت کے لئے کچھ زیادہ فضیلت ثابت نہیں ہوئی بلکہ یہ بات پورے طور سے ثابت ہو گئی کہ یہ سب اعلیٰ درجہ میں شمار ہوں گے اور اس تقریر سے غلط فہمی میں نہ پڑ جانا کہ انبیاء علیہم السلام سے ان کی مساوات لازم آ گئی کیونکہ ان کے لئے بھی من الصالحین کا لفظ آیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے بھی یہی لفظ مستعمل ہوا ہے۔

صالحین کا مفہوم

بلکہ مطلب یہ ہے کہ صالحین ایک مفہوم ہے جو ادنیٰ درجہ والوں پر بھی بولا جا سکتا ہے اور اعلیٰ درجہ والوں پر بھی۔ اس کے بعض افراد وہ بھی ہیں جو مومنین کے ادنیٰ درجہ میں ہیں اور وہ بھی ہیں جو اعلیٰ درجہ میں ہیں میں نے محض آپ لوگوں کے وہم دفع کرنے کے لئے کہ ان کے لئے کچھ زیادہ فضیلت نہیں ثابت ہوئی قرآن شریف سے اس لفظ کا استعمال دکھلا دیا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ والے کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہوا ہے اور ادنیٰ درجہ والے کیلئے بھی غرض کہ جب وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّٰلِحِينَ (یہی

صالحین میں سے ہیں) میں صالحین کو مطلق رکھا ہے تو ہم بقاعدہ المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل اعلیٰ ہی درجہ کیوں نہ مراد لیں جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے ثابت ہے۔ اور اس استدلال سے ہم ان سے مساوات نہیں ثابت کرنا چاہتے اور نہ ہو سکتی ہے ہمارے لئے تو یہی معراج ہے کہ ہم ان کے خدام میں شامل ہو جائیں یہ بسا غنیمت ہے مساوات کا تو نام ہم کیا لے سکتے ہیں ہمارے لئے تو ان کی معیت و تبعیت ہی باعث فخر ہے اور یہی ہمارے لئے اعلیٰ درجہ ہے۔ سو اتباع سے ان شاء اللہ یہ ضرور حاصل ہوگی اس لئے کہ یہ معیت قرآن شریف سے جو کہ نص قطعی ہے ثابت ہے۔ فرماتے ہیں وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (اور جو لوگ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں پس یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین اور صالحین کے ساتھ۔ اور ان کا رفیق کہا ہے)

اس آیت میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنے والوں کے لئے ان حضرات کے ساتھ معیت ثابت کی گئی ہے جن پر خدا کا انعام ہوا اور منعم علیہ کون ہیں۔ نبیین و صدیقین و شہداء و صالحین۔ گو بطریق تابعیت ہی ہو مگر یہ بھی کتنی بڑی بات ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

فی الجملہ تمہارے ساتھ محبت کو تو نسبت ہے۔ کاہے بلبل کو ہی کافی ہے کہ گل کا قافیہ ہو جائے۔

اگر اللہ یہ معیت نصیب فرما دیں تو بہت ہی بڑی خوش قسمتی ہے یہ درجہ کس کو نصیب ہوتا ہے الحمد للہ کہ صالحین کے لفظ کے متعلق ایک بہت بڑا وہم رفع ہوا اب میں بیان ختم کرنا چاہتا ہوں جو اصل مدعا ہے اسے سن لیجئے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاُولٰٓئِکَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔ اور لفظ اولئک کا مشار الیہ اہل کتاب کی وہ جماعت ہے جس میں یہ صفات ہوں۔ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ (اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں) مگر اس حکم میں خصوصیت محض اہل کتاب کی نہ سمجھی جاوے کیونکہ گو مورد آیت کا خاص ہو مگر عموم الفاظ یا علت سے حکم عام ہوا کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ اصلاح کامل اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہو۔ گویا دوسروں کے حق میں حکم بیان کر کے اس امت کو بھی سنانا ہے کہ اگر اصلاح کامل چاہتے ہو جس سے انبیاء علیہم السلام کی رفاقت نصیب ہو تو یہ

صفات حاصل کرو جو آیت میں مذکور ہیں اور بناء ان سب کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی کی اتباع ہے چاہے وہ بواسطہ ہو یا بلاواسطہ اس طرح سے کسی حالت میں اپنی رائے کا اتباع نہ کیا جائے۔ چنانچہ اہل کتاب کی دونوں جماعتوں میں جو ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت فرمائی گئی ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ جس جماعت کی مذمت ہوئی انہوں نے حضور کا اتباع نہ کیا اور اپنی رائے کو کافی سمجھ کر اس پر عمل کرتے رہے اور دوسری جماعت نے اپنی رائے کو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم و وحی کا اتباع کیا۔ اب انہیں واقعات سے لوگ اپنی حالتوں کا موازنہ کرلیں کہ کہاں تک ان میں وحی الٰہی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے اور کہاں تک خود رائی ہے۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ کہ ہم لوگوں کے سارے اعمال گندے اور قابل اصلاح ہیں اور اصلاح ہر ایک کے اوپر واجب ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہر کام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اور اپنی رائے وہوائے نفسانی کو چھوڑ دیا جائے بلا اس کے کام نہیں چل سکتا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا   تواں رفت جز درپے مصطفےٰ

سعدی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر راہ صفا پر چل سکتا ہے یہ نا ممکن ہے۔ اور فرماتے ہیں۔

درایں راہ جز مرد داعی نرفت   گم آں شد کہ دنبال راعی نرفت

مرد داعی سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سو جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا پکڑا اور آپ کا اتباع کیا وہ منزل مقصود کو پہنچ گیا اور جس نے حضور کے اتباع کو چھوڑ کر اپنی رائے اور خواہشات نفسانی کو اپنا رہنما بنایا وہ گمراہ ہو کر جادہ مقصود سے بالکل دور ہو گیا

اب دعا کیجئے حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم اور توفیق اعمال صالحہ کی عطا فرمائیں (آمین)

تسہیل الاصلاح

حضرت حکیم الامتؒ نے یہ وعظ ۱۱ شعبان ۱۳۲۹ھ کو جلال آباد ضلع مظفر نگر میں آدھا گھنٹہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۲۰۰ تھی، مولوی محمد عبداللہ صاحب نے قلم بند کیا۔

اصلاح اعمال، اعمال صالحہ وہی ہیں جن سے آخرت کی منفعت حاصل ہو، ضروری اعمال صالحہ یعنی ارکان اربعہ آج کل لوگوں پر گراں ہیں۔ ان کی گرانیوں کو سہل کرنے کا طریقہ دل اور زبان سے درست رکھنا ہے۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

فقد قال اللہ تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّاَہُ اللّٰہُ مِمَّا قَالُوْا. وَکَانَ عِنْدَاللّٰہِ وَجِیْھًا یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ. وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِیْمًا

(ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے گا سو وہ کامیابی کو پہنچے گا) (سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۷۰،۷۱)

یہ ایک آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے مختصر لفظوں میں ایک کارآمد مضمون پر متنبہ فرمایا ہے۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جو آدمی جو کام کرتا ہے اس سے دو چیزوں میں سے ایک شے مقصود ہوتی ہے یا تو دفع مضرت یا جلب منفعت مثلاً کھانا کھاتا ہے لذت وتغذی کے لئے یہ ایک منفعت ہے دوا پیتا ہے دفع مرض کے واسطے یہ مضرت کا دفع ہوا' اور مثلاً نوکری کرتا ہے روپیہ کی تحصیل کے لئے تجارت کرتا ہے منفعت وفائدہ کے واسطے رشوت دیتا ہے تاکہ کسی قسم کی سزا نہ ہو جاوے یا کسی بلا میں مبتلا ہے اس سے رہا ہو جاوے مکان بناتا ہے سردی وگرمی سے بچنے کے واسطے خلاصہ یہ ہے کہ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ جو کچھ انسان کرتا ہے جلب منفعت کے لئے

کرتا ہے یا دفع مضرت کے واسطے اس میں کسی عاقل کو کلام نہیں اور نہ اس پر براہین و دلائل قائم کرنے کی ضرورت ہے البتہ منفعت ومضرت کی تعین میں اہل الرائے اور اہل ملت میں اختلاف ہے باقی نفس مسئلہ میں اتفاق ہے چنانچہ اول واضح ہو چکا ہے تعین میں البتہ بہت بڑا اختلاف ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ منفعت کی تحصیل تو ہر ایک کا مقصود ہے۔ لیکن منفعت کی تعین میں ہر ایک نے ایک رائے قائم کر رکھی ہے ایک شخص ساعی ہے کہ مجھ کو مثلاً تحصیلداری یا تھانہ داری یا ڈپٹی یا ڈپٹی کلکٹری وغیرہا مثلاً علی حسب اختلاف القاصد مل جائے کہ اس میں میری عزت و آبرو ہے دوسرا ساعی ہے کہ مجھ کو نہ ملے کہ غریبوں پر ظلم ہوگا۔ چنانچہ بعضوں پر زور دیا جاتا ہے کہ حکومت قبول کرو۔ اور وہ نہیں کرتے ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے سلطنت کے لئے ہزاروں جانیں ضائع کر دیں ایک وہ تھے کہ بھاگتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کوئی اس کو منفعت سمجھا اس کی تحصیل کے لئے سعی کی اور دوسرے نے اس کو مضرت خیال کیا اس لئے اس کے دفع میں کوشش کی اور جس قدر اختلاف عالم میں ہیں سب کی وجہ یہی ہے کہ ایک شخص ایک امر کو منفعت و مستحسن سمجھتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اس کی تحصیل کے درپے ہوتا ہے دوسرا اسی کو مضرت سمجھتا ہے اس لئے اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اختلاف مذاہب کی یہی وجہ ہے لیکن اس وقت اس میں بحث نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت بفضلہٖ تعالیٰ سارا مجمع ایک مذہب کا ہے۔

کونسا نفع قابل تحصیل ہے

اس وقت قابل غور امر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہونا ضرور ہے کہ آیا کون منفعت واقع میں قابل تحصیل کے ہے کون مضرت میں قابل دفع کے ہے تو بعد تامل یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منفعت وہ لائق تحصیل کے ہے جس میں دو صفتیں ہوں ایک تو یہ کہ وہ منفعت زیادہ باقی رہنے والی ہو دوسری یہ کہ خالص ہو مشوب بضرر نہ ہو دیکھ لیجئے اگر کوئی منفعت چار سال رہنے والی ہو اور دوسری آٹھ سال تو ہر عاقل دوسری ہی کو پسند کرے گا اور اسی کو اختیار کرے گا۔ مثلاً دو مکان ہوں ایک بڑا عالی شان اور خوبصورت ہو اور دوسرا چھوٹا اور بدصورت ہو اور وہ مکان کسی شخص کے سامنے پیش کئے گئے لیکن یہ کہا گیا کہ بڑا مکان چار پانچ روز کے بعد خالی کرا لیا جاوے گا اور چھوٹا کبھی خالی نہ کرایا جاوے گا تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چھوٹے ہی مکان کو پسند کرے گا اور اگر یہ کہہ دیا جاوے کہ نسلاً بعد نسل تم کو دے دیا جاوے گا تو ضرور ہی پسند کرے گا معلوم ہوا کہ منفعت باقی رہنے والی ہوگی اسی قدر زیادہ اعتبار کے قابل ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ مکان عالیشان باوجود اپنی خوبصورتی کے کسی ضرر پر مشتمل ہو مثلاً ہمسایہ اچھا نہ ہو یا اور کوئی مضرت کا احتمال ہو اور اس چھوٹے مکان میں یہ اندیشہ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ

چھوٹا ہی مکان پسند ہوگا۔ پس یہ قاعدہ ثابت ہوا کہ منفعت وہ قابل تحصیل کے ہے جو مضرت سے خالص ہو اسی طرح مضرت بھی وہ زیادہ قابل اہتمام کے ہوتی ہے جو زیادہ باقی رہنے والی ہو اور نیز من کل الوجوہ مضرت ہی ہو کوئی شائبہ اس میں منفعت کا نہ ہو دیکھو اگر اتنا سفر میں آدمی کسی مکان میں ایک دو شب کے لئے قیام کرتا ہے اور وہاں کوئی ناگوار امر پیش آتا ہے اس کے دفع میں زیادہ اہتمام اور فکر نہیں کرتا بخلاف اس کے کہ وطن اصلی میں کوئی امر پیش آوے تو اس کو دور کرنے کی زیادہ فکر ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں ہمیشہ رہنا اور مثلاً اگر کہا جاوے کہ اگر تم چار دن کے لئے دھوپ میں سفر کرلو تو تم کو عمر بھر راحت ملے گی یا اگر چار ماہ راحت سے رہو گے تو عمر بھر جیل خانے میں رہو گے تو ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس چار روز کے سفر کی مشقت کو گوارا کرلے گا۔ اور دوسری صورت کو پسند نہ کرے گا۔ معلوم ہوا کہ مضرت باقیہ و خالصہ زیادہ فکر کے قابل ہے اور مضرت فانیہ زیادہ قابل التفات نہیں ہے پس منفعت و مضرت دونوں کی دو قسمیں ہوئی منفعۃ باقیہ خالصہ' منفعۃ فانیہ غیر خالصہ' مضرۃ باقیہ خالصہ' مضرۃ فانیہ غیر خالصہ۔ اس کے بعد معلوم کرنا چاہئے کہ دنیا کی منفعۃ و مضرۃ تو ہر شخص کے پیش نظر ہے ہم کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور منفعت و مضرت کی بھی خبر دی ہے جو مرنے کے بعد واقع ہونے والی ہے اب محل کے اعتبار سے منفعۃ و مضرۃ کی دو قسمیں اور نکلیں۔ منفعۃ دنیویہ منفعۃ اخرویہ مضرۃ دنیویہ مضرت اخرویہ اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ چار قسمیں آخر کی یعنی منفعت دنیویہ و اخرویہ مضرت دنیویہ و اخرویہ پہلے اقسام کی کس قسم میں داخل ہیں۔ یعنی غور کرنا چاہئے کہ منفعۃ دنیویہ یا منفعۃ باقیہ خالصہ ہے یا فانیہ غیر خالصہ اسی طرح مضرۃ دنیویہ کو بھی دیکھنا چاہئے اور منفعۃ اخرویہ و مضرۃ اخرویہ کو بھی دیکھنا چاہئے یعنی یہ کونسی منفعۃ اور مضرۃ کس قسم میں داخل ہے سو دیکھ لیجئے کہ دنیا کی منفعۃ تو فانیہ ہے اور آخرۃ کی باقیہ ہے اور آخرۃ کی مضرۃ باقی رہنے والی ہے۔ دنیا کی مضرۃ فنا ہونے والی ہے۔

منفعت دنیا کا حال

اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ دنیا کی منفعت کیسی اعلیٰ درجہ کی ہو مگر خالص نہیں مثلاً کھانا ہی لے لیجئے اول تو حاصل کس کلفت سے ہوتا ہے کہ اول زمین کو درست کیا جاتا ہے اس کے لئے بیل و آلات زراعت مہیا کرنے ہوتے ہیں اس کے بعد بوتے ہیں پانی دیتے ہیں' حفاظت کرتے ہیں۔ کاٹتے ہیں گاہتے ہیں اوڑاتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ پکاتے ہیں۔ اس قدر کلفتوں کے بعد جب اس سے عین انتفاع کا وقت ہوتا ہے کہ اس وقت بظاہر تمام کلفتیں ختم ہو جاتی ہیں اور التذاذ ہی کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت بھی اکثر اوقات کوئی نہ کوئی کلفت پیش آجاتی ہے کہ وہ کلفت التذاذ میں سد راہ ہو جاتی ہے مثلاً روٹی کا ٹکڑا گلے میں اٹک گیا' کھانا کھانے بیٹھے کسی

عزیز کے مرنے کی خبر آ گئی یا اور فکر میں ڈالنے والی کوئی بات سن لی کہ سب کھانا پکا پکایا بے لطف ہو گیا یا یہ وہ کھانا ہضم نہیں ہوا قبض ہو گیا یا دست آنے لگے سلاطین اور امراء کے عیش سے زیادہ کسی کا عیش نہیں ہے لیکن ان کو سب سے زیادہ پریشانیاں ہیں اولاد کو دیکھ لیجئے کہ بڑی بڑی تمناؤں کے بعد پیدا ہوتی ہے انواع انواع کی تکالیف اٹھا کر ان کو پرورش کرتے ہیں پھر اکثر اولاد خلاف مزاج ہوتی ہے والدین کو سینکڑوں طرح کی ان سے تکالیف پہنچتی ہیں غرض دنیا کی جس منفعت کو دیکھو گے خالص نظر نہ آوے گی اور اپنے مقصد کے موافق نہ ہوگی۔ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی کیا یہ انسان کے لئے ہے جو جو تمنا کرے وہ حاصل ہو جاتے ہیں (یعنی نہیں) پس آخرت اور دنیا سب اللہ کے اختیار میں ہے۔

کوشش سے دنیا کامل جانا ضروری نہیں

لیکن اس پر کوئی شبہ نہ کرے فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰی (پس آخرت اور دنیا اللہ ہی کے اختیار میں ہے) سے تو یہ معلوم ہوا کہ جیسے دنیا ہمارے اختیار میں نہیں ہے اسی طرح آخرۃ بھی نہیں ہے پھر فرق کیا ہوا بلکہ نہ وہ قابل تحصیل ہوئی نہ یہ ہوئی تو جو اس تقریر سے تمہارا مقصود ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرۃ کی رغبت دلانا وہ حاصل نہ ہوا جواب یہ ہے کہ دوسرے مقام پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا یعنی جو شخص صرف دنیا طلب کرے تو دنیا میں جو ہم چاہیں گے جس کو چاہیں گے وہ دیں گے پھر اس کے لئے ہم جہنم تجویز کریں گے اس میں داخل ہوگا اس حالت میں کہ مذموم و مردود ہوگا اور جو شخص آخرت چاہے گا اور اس کے لئے پوری سعی کرے اور وہ مومن بھی ہو پس ان لوگوں کی سعی کی قدر کی جاوے گی دیکھئے دنیا کی نسبت تو یہ فرمایا کہ ہم جس کو چاہیں گے اور جتنی چاہیں گے دیں گے اور آخرت کی نسبت وعدہ فرمایا کہ جو اس کے لئے سعی کرے گا اس کی سعی کی قدر کی جاوے گی یعنی اس کا بدلہ ملے گا دونوں جگہ قضیہ شرطیہ ہے مگر دوسری جگہ کامیابی کا وعدہ ہے اور پہلی صورۃ میں نہیں ہے پس حاصل یہ ہوا کہ اختیار میں تو خدا ہی کے ہے دنیا بھی آخرت بھی مگر آخرت کی سعی پر بدلہ دینے کا وعدہ ہے اس لئے وہ قابل تحصیل ہوئی بخلاف دنیا کے بہر حال آیۃ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی (کیا یہ انسان کے لئے ہے کہ جو جو وہ تمنا کرے حاصل ہو جائے) سے جو شبہ ہوا تھا وہ مرتفع ہو گیا۔ اب ہم لوگوں نے برعکس معاملہ اختیار کیا ہے کہ جس کا (یعنی دنیا) وعدہ نہیں ہے اور اس کو اپنی مشیۃ پر رکھا ہے اس کے طلب میں تو منہمک ہیں اور نیز اس کے اسباب تحصیل

(نوکری تجارت زراعت وغیرہا) کی نسبت تو ایسا معاملہ کرتے ہیں کہ گویا ان کے نزدیک مسبب ان پر ضرور مرتب ہوگا اور جس کا وعدہ ہے (یعنی آخرۃ) اس کے اسباب (صلوۃ صوم حج زکوۃ وغیرہا من المامورات) کی طرف مطلق التفات نہیں' ببین تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

دنیا کی ہر منفعت میں کدورت ہے

خلاصہ یہ کہ دنیا کی ہر منفعت کے اندر کدورت ہے۔ بخلاف آخرت کی منفعت کے کہ جس کو حق تعالیٰ اپنی رضامندی کے ساتھ جنت نصیب فرمادے وہاں اس کو کوئی آزار نہیں فرماتے۔ وَاَکْوَابٍ وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ یعنی تمہارے لئے جنت میں وہ شے ملے گی جس کو تمہارا جی چاہے گا۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ یعنی ہم کو جنت میں نہ تعب لگے گا اور نہ اس میں تکان ہوگا۔

جنت میں حسد نہ ہوگا

اگر کوئی کہے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک کے پاس دنیا کا سامان جیسے مال اولاد مکان گھوڑے جوڑے وغیرہ بہت ہوتا ہے تو دوسرا دیکھ کر اس کو حسد کرتا ہے اور حسد کی آگ سے جلتا ہے تو مسلم ہے کہ جنت میں سب نعمتیں ہوں گی لیکن اختلاف درجات کی وجہ سے شاید آپس میں حسد ہو تو یہ بھی ایک قسم کی تکلیف اور کدورت ہے جواب یہ ہے کہ وہاں یہ حسد نہ ہوگا ہر شخص اپنے حال اور نعمتوں میں بے حد خوش ہوگا اور کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو دوسروں کو اپنے سے افضل سمجھے گا یا نہیں اگر افضل جانے گا تو حسد ہوگا اور اگر نہ جانے گا تو جہل لازم آئے گا جواب یہ ہے کہ ہم اس شق کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ افضل کو اپنے سے افضل جانے گا۔ لیکن وہ ان کے درجات کی تمنا نہ کرے گا اس لئے کہ اپنی استعداد اس کو معلوم ہوگی اور اپنے اعمال اس کو اپنے پیش نظر ہوں گے اور تفاوت درجات وہاں تفاوت اعمال سے ہوں گے اس لئے اس کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ درجہ مجھ کو نہیں مل سکتا اس لئے وہ اسی میں خوش ہوگا نہ کسی پر اس کو حسد ہوگا اور نہ زیادہ کا متمنی ہوگا۔

اہل جنت کو مقام رضا حاصل ہوگا

دوسرا جواب اس سے باریک ہے وہ یہ کہ وہاں سب عبد کامل ہوں گے تمام مقامات باطنی حاصل ہوں گے اور مقامات میں سے رضا بھی ہے اس لئے مقام رضا بھی اس کو حاصل ہوگا اور وہ اس میں اس قدر خوش ہوگا کہ درجات فاضلہ کی اس کے قلب میں تمنا نہ ہوگی جیسا کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ بعض طبائع میں قناعت کا مضمون ایسا راسخ ہے کہ ان کے قلب میں ترقی دنیا نہ ہونا کیا معنی بلکہ اس سے نفرت

ہے۔ایک پولیس کے اہلکار کو دیکھئے کہ ان کے افسر کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ترقی کریں مگر وہ منظور نہیں کرتے اور ان کے ہم چشم ان پر ہنستے ہیں۔بات یہ ہے کہ طبائع کا مذاق مختلف ہے جبکہ دنیا میں اس کا نمونہ موجود ہے۔آخرت میں تو کیا بعید ہے۔ہاں ایک شبہ رہا وہ یہ کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جنتی آپس میں ملیں گے اور ایک جنتی دوسرے کو دیکھ کر تمنا کرے گا کہ جیسا لباس اس کا ہے ایسا ہی میرا بھی ہو۔

مضرت دنیا کو فنا نہیں

چنانچہ فوراً اسی طرح اس کا لباس ہو جائے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ تمنا کرے گا جواب یہ ہے کہ یہ تمنا صرف لباس کے بارے میں آئی ہے درجہ کے بارے میں نہیں آئی اور لباس کے اندر مساوات ہونے سے درجہ کی مساوات یا فضیلت لازم نہیں۔ کما ھو ظاھر جدا پس جس میں فرق رہنا ضروری ہے یعنی درجہ اس کی تو تمنا نہ ہوگی اور جس کی تمنا ہوگی یعنی لباس اسی میں فرق ہونا ضروری نہیں۔پس حسد کی کوئی گنجائش نہ ہوئی حاصل یہ کہ جنت کی نعمتیں سب خالص ہوں گی کدورت کا ان میں نام ونشان نہ ہوگا۔بخلاف نعماء دنیا کے کہ ان سب میں کچھ نہ کچھ کدورت ضرور رہی ہوتی ہے اب مضرت دنیوی کو دیکھئے کہ مضرت دنیوی خواہ کیسی ہی اشد ہو لیکن فنا ہونے والی ہے اگر کسی کو کوئی بیماری ہے اول تو دنیا ہی میں صحت ہو جاتی ہے ورنہ مر کر تو تمام مصائب کا خاتمہ ہو ہی جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی افلاس میں یا کسی اور طرح کے رنج وغم فکر میں مبتلا ہوتا ہے سب ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔

مضرت دنیا کے منافع

معلوم ہوا کہ مضرت دنیا کو بقا نہیں ہے۔اسی طرح دوسرے اعتبار سے دیکھئے کہ مضرت دنیا خالص مضرت نہیں بلکہ تامل سے دیکھا جاوے تو اس میں سینکڑوں منفعتیں دنیا اور دین کی ہوتی ہیں دنیا کی منفعت تو یہ کہ مثلاً ایک شخص کسی بیماری میں مبتلا رہتا ہے تو اگر یہ تندرست رہتا تو خدا جانے کیا کیا فساد کرتا اور اس کے سبب سے یہ بے آبرو ہوتا جیل خانہ جاتا اور ظاہر ہے کہ عاقل کے لئے آبرو جان سے زیادہ عزیز ہے اور دین کی منفعت تو بہت ہی ظاہر ہے کہ بیماری ذنوب کو محو کرتی ہے اور بہت سے منہیات سے روکتی ہے خلاصہ یہ کہ دنیا کی مضرت فنا ہونے والی بھی ہے اور من کل الوجوہ مضرت نہیں ہے بخلاف مضرت اخرویہ کے کہ وہ مضرت ہی مضرت ہے تمام مضرتیں وہاں علی الکمال موجود ہیں۔پس ثابت ہوا کہ منفعت دنیویہ فانی بھی ہے قلیل بھی ہے اور شوب بہ کلفت ہے اور اخروی منفعت باقی بھی ہے کثیر بھی ہے اور حاصل بھی ہے اسی طرح مضرت دنیا فانی ہے اور غیر خالص اور اخروی مضرت باقی بھی ہے اور خالص ہے۔

منفعت اخرویہ قابل تحصیل ہے

اب روز روشن کی طرح فیصلہ ہو گیا اور آپ خود موازنہ کر سکتے ہیں کہ حاصل کرنے کے قابل کونسی منفعت ہوئی سو ظاہر ہے کہ مسلمان (جو کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جانتا ہے) اس سوال کا یہی جواب دے گا کہ منفعت اخرویہ تحصیل کے قابل ہے اسی طرح دنیا اور آخرۃ کی مضرتوں میں موازنہ کر لیجئے کہ کون سی مضرت زیادہ بچنے کے قابل ہے ظاہر ہے کہ دنیا کی مضرت آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں اصلا قابل التفات نہیں زیادہ اہتمام کے قابل آخرۃ کی مضرۃ ہے۔ اس کے بعد سمجھئے کہ آخرۃ کی منفعت کس طرح حاصل ہوتی ہے اور آخرۃ کے ضرر سے کس طریق سے بچ سکتے ہیں۔

مضرت آخرت سے بچنے کا طریق

تو سمجھ لیجئے کہ آخرۃ کی منفعت جنت ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریق اعمال صالحہ ہیں اور آخرۃ کی مضرت دوزخ ہے اور اس سے بچنے کا طریق بداعمالیوں سے بچنا ہے خلاصہ یہ کہ اعمال صالحہ کو اختیار کیا جاوے اور ذنوب سے بچا جاوے اور جو ہو چکے ہیں ان سے توبہ کی جاوے خلاصہ یہ کہ مقصود دو شے ہیں اصلاح اعمال محو ذنوب اور محو ذنوب کے معنی یہ ہیں کہ گذشتہ سے توبہ کی جائے اور آئندہ بچنے کا عزم کیا جائے لیکن اعمال کی تحصیل اور گناہوں سے بچنا اول تو اکثر لوگوں پر ہمیشہ ہی سے گراں اور ثقیل ہے۔

عقل پرستوں کی بیہودہ رائے

پھر خصوصاً اس زمانہ میں تو اعمال صالحہ لوگوں پر بہت ہی بھاری ہیں چنانچہ بڑے ضروری اعمال صلوۃ صوم حج زکوۃ ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے کہ ان سب کے اندر بے حد سستی کی جاتی ہے بلکہ مصیبت سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اخبار میں شائع ہوا تھا کہ نماز نے ترقی کو روک دیا ہے کیونکہ یہ سن کر کہ مسلمان ہو کر پانچ وقت کی نماز پڑھنی پڑے گی اسلام سے بعضے آدمی رک جاتے ہیں اس لئے اس کو اسلام سے خارج کر دیا جاوے نعوذ باللہ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ جس اسلام میں نماز نہیں وہ کیا اسلام ہوا۔ اس بے ہودہ رائے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عقل پرستوں پر نماز بہت ہی بھاری ہے۔

منطقیوں کی صحبت کا اثر

ہمارے مدرسہ دیوبند میں ایک طالب علم نو وارد آئے تھے منطقیوں کی صحبت میں بہت رہے تھے دین کی مطلق پروا نہ تھی نماز کی پابندی نہ تھی اور یہاں دیوبند میں نماز کا بڑا اہتمام ہے پانچ وقت سب طلبہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو جب نماز کا وقت آتا ان کو بھی زبردستی لے جاتے ایک روز کہنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو معراج میں تشریف لے گئے تھے وہاں پچاس نمازیں فرض ہوئی

تھیں پھر کم ہوتے ہوتے پانچ رہی تھیں معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں پوری پچاس کی پچاس ہی باقی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ نماز ان کو سخت مصیبت معلوم ہوتی تھی۔ حق تعالیٰ بھی فرماتے ہیں وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ یعنی بے شک نماز بہت بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جو خشوع کرنے والے ہیں اسی واسطے میں تو نمازی کو ولی سمجھتا ہوں' حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ نماز پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔

علی ہذا روزہ کو بہت ثقیل سمجھتے ہیں' کانپور میں ایک شخص تھے انہوں نے کبھی روزہ ہی نہیں رکھا میں نے ان سے کہا تو کہنے لگے کہ میں کسی طرح متحمل ہی نہیں میں نے کہا کہ امتحان کے لئے ایک تو رکھو چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا تب معلوم ہوا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا کہ میں متحمل ہی نہیں۔

سفر حج سفر عشق ہے

بعضے لوگ حج کا نام سن کر وہاں کی بہت مذمت کرتے ہیں کہ وہاں بدو مار ڈالتے ہیں لوٹ لیتے ہیں اور بعضے تو گئے بھی نہیں مگر اوروں سے سن سن کر وہ بھی مذمت کیا کرتے ہیں یہ سب کم ہمتی کی باتیں ہیں میں ان کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ایسے واقعات نہیں ہوتے بلکہ اگر وہاں کے مجمع پر نظر کی جائے تو حق تو یہ ہے کہ جس قدر واقعات ہونے چاہئیں ان سے بہت کم ہوتے ہیں ہندوستان میں اس کا عشر عشیر بھی اگر مجمع ہو جائے تو بھیرے واقعات ہو جاتے ہیں بلکہ بغیر مجمع کے بھی راستوں میں واقعات ہو جاتے ہیں ہم یہ نہیں کہتے جیسا بعض کہتے ہیں کہ بدوؤں کو لوٹ مار حلال ہے اس لئے کہ وہ دائی حلیمہ سعدیہ کی اولاد ہیں یہ تو بالکل لغو ہے وہ اگر ایسا کرتے ہیں تو زیادہ گنہگار ہوتے ہیں لیکن یہ ضرور کہیں گے اور تم اس کو یاد رکھو کہ حج کا سفر سفر عشق ہے راہ عشق میں تو سب کچھ پیش آتا ہے بلکہ پیش نہ آنا عجیب ہے دنیا کے محبوب سے ملنے کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں پیش آتی ہیں مگر تب بھی گوارا کرتے ہیں۔

نسازد عشق را کنج سلامت　　خوشا رسوائی کوی ملامت

(عشق کے لئے سلامتی گوشہ مناسب نہیں بلکہ بدنامی کے کوچہ کی رسوائی بہترین چیز ہے)

عشق مولی کے کم از لیلیٰ بود　　کوی گشتن بہر او اولے بود

(اللہ تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے تو گلی گلی پھرنا ہی بہتر ہے)

چند خوش نصیب بزرگ

ایک بزرگ ایسے باہمت تھے کہ انہوں نے ۳۳ حج کئے تھے۔ ایک شخص مولوی منظور احمد صاحب بنگالی تھے مدینہ طیبہ میں رہتے تھے مگر ہر سال حج کیا کرتے تھے اور حج کر کے مدینہ طیبہ ۔ٹ جاتے تھے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو دیکھ کر ایک بار یہ شعر پڑھا۔

زہے سعادت آں بندہ کہ کرد نزول گہے بہ بیت خداؤ گہے بہ بیت رسول
(وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کس قدر خوش نصیب ہے جو کبھی خدا کے گھر میں جا پہنچتا ہے اور کبھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں)

اور بعضے ایسے بھی ہیں کہ قریب بیت اللہ شریف کے رہتے ہیں اور ان کو اب تک بھی حاضری نصیب نہیں ہوئی ایک صاحب فرماتے تھے کہ ایک بدوی بیس پچیس برس سے مکہ معظمہ آتا تھا اس نے ایک دن پوچھا کہ یہ لوگ اطراف و جوانب سے اس کثرت سے یہاں کیوں آتے ہیں اللہ اکبر اس کو اتنی بھی خبر نہیں تھی کہ یہاں کیوں آتے ہیں۔

امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصی فضل خداوندی

علیٰ ہذا' زکوٰۃ میں گرانی ہوتی ہے چالیس ہزار میں سے جب ایک ہزار روپیہ نکلتا ہے تو گراں گزرتا ہے حالانکہ چالیسواں حصہ بہت ہی کم ہے امم سابقہ پر چوتھائی حصہ مال کا فرض تھا یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ چالیسواں حصہ ہی فرض کیا گیا یہ بھی لوگوں پر بھاری ہے۔ آج کل کے نو تعلیم یافتہ اس فکر میں ہیں کہ احکام شرعیہ ہماری عقل کے موافق ہوتے واللہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ عقل کے فتوے پر حکم شرعی نہیں ہے عقل تو یوں چاہتی ہے کہ اگر کسی کے پاس چالیس ہزار روپیہ ہو تو ۳۹ ہزار بلکہ زیادہ زکوٰۃ میں دیا جائے اور ایک ہزار خود رکھا جائے اس لئے کہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ غرباء و مستحقین زکوٰۃ کی تعداد زیادہ ہے اور اغنیاء کی کم ہے اور ادھر یہ ثابت ہے کہ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند اور نیز مساواۃ بین الاقوام آج کل کے اصول عقلیہ سے ہے تو ایک شخص کو کوئی حق اس بات کا نہیں ہے کہ اس کے پاس ۴۰ ہزار روپیہ ہوں اور دوسرا نان شبینہ کو محتاج ہو پس یہ رحمت نہیں تو کیا ہے ایک ہزار زکوٰۃ کے واجب ہوئے اور ۳۹ ہزار رکھنے کی اس کو اجازت ہوئی۔

احکام شرعیہ عقل کے خلاف نہیں

اگر کوئی کہے کہ جب یہ عقل کا مقتضا تھا تو شریعت نے اس کا کیوں اعتبار نہیں کیا احکام شرعیہ عقل کے خلاف ہیں جواب یہ ہے کہ اگر عقل کے فتویٰ کے موافق زکوٰۃ میں حکم ہوتا تو اس میں تمدن محفوظ نہ رہتا اس لئے کہ سب یکساں حالت میں ہوتے اگر کسی کو کوئی کام پیش آتا اور مزدور کی ضرورت ہوتی تو کہاں سے آتا' خدمت گار کہاں سے ملتا۔ حجام' دھوبی' نائی' بھنگی کے کام کون کرتا غرضیکہ یہ سب کام اٹکے رہتے اور زندگی گزارنا مشکل ہوتا۔ اس سے آپ کو شریعت کی خوبی معلوم ہوئی ہوگی کہ اس کے احکام کتنے مصالح اور حکم پر مبنی ہیں خلاصہ یہ کہ شریعت جو ہمدردی کرتی ہے وہ آپ کی عقل نہیں کر سکتی حاصل یہ کہ جس قدر احکام شرعیہ ہیں سب کے اندر لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جو احکام کرنے کے ہیں ان میں گرانی ہو تو زیادہ

تعجب نہیں ہے جن امور سے منع کیا گیا ہے ان میں بھی گرانی ہوتی ہے حالانکہ ترک فعل سے اسہل ہے فعل میں تو ایک کام کا کرنا ہوتا ہے اور ترک میں کیا مشقت ہے بلکہ سہولت ہونا چاہئے۔ دیکھئے ایک ادنیٰ سی شے غیبت ہے کہ بجز مضرت کے اس میں اور کچھ نہیں اور گناہوں میں تو کچھ حظ یا نفع دنیوی بھی مرتکب کے زعم میں ہوتا ہے اور اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن ہم لوگوں سے یہ نہیں چھوٹتی غرضیکہ احکام شرعیہ خواہ متعلق فعل کے ہوں یا ترک کے سب میں لوگوں کو گرانی ہوتی ہے اور جب ایک ایک فعل اور ایک ایک ترک بھی گراں ہے تو جب کہ پچاس عمل کرنے کے ہوں اور پچاس نہ کرنے کے جیسے احکام کی اب موجودہ حالت ہے تو سو مشقتیں ہوئیں سن کر بھی جی گھبرا جاوے گا کہ میاں یہ تو بڑی مصیبت آ پڑی کہ یہ کام کرو وہ نہ کرو سخت الجھن اور دشواری ہے کوئی میاں فلسفی بتلائے تو سہی کہ یہ معمہ کس طرح حل ہو اور یہ دشوار کس طرح سہل ہو اگر تمام فلاسفہ قدیم و جدید جمع ہو کر سوچیں تو ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہیں نکال سکتے جس سے یہ پیچیدگی اور یہ گلچھڑے کھلیں اور اگر کوئی سوچ بچار کر کے کوئی طریقہ نکالے بھی تو وہ سہل نہ ہوگا۔

مشقت اور الجھن دور کرنے کا طریقہ

حق تعالیٰ شانہ نے اپنے بندوں کی اس مشقت اور اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے ایک طریقہ نہایت مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے۔ اس آیۃ کریمہ میں جو میں نے تلاوت کی ہے اسی طریقہ کا بیان ہے یہ حاصل ہے اس تقریر کا اجمالاً اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اول ثابت ہو چکا ہے کہ دو شے مقصود ہیں اعمال صالحہ کا حاصل کرنا اور محو ذنوب اور ان میں بھی گرانی اس کو سہولت کے لئے دو طریق ارشاد فرمائے ہیں کہ ان کو اختیار کر لو تو وہ دو چیزیں جو بڑی مشقت کی تھیں وہ آسان ہو جاویں گی ان میں سے ایک اتقوا اللہ ہے اور دوسرے قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ہے یعنی اللہ سے ڈرو اور بات ٹھیک کہو اس پر دو شے مرتب فرمائی ہیں۔ يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ یعنی اگر تم ان دو باتوں کو اختیار کر لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی اصلاح فرمادیں گے اور تمہارے گناہ بخش دیں گے اور ان ہی میں تم کو گرانی تھی جس کا اوپر بیان ہوا۔ حاصل یہ کہ تقویٰ جس کا ترجمہ خدا کا خوف ہے فعل قلب کا ہے اور کہنا فعل زبان کا ہے خلاصہ طریق کا یہ ہوا کہ دل اور زبان کو تم درست کر لو باقی سب کام ہم کر دیں گے۔ قلب ایک شے ہے اس کے متعلق صرف ایک شے بتلائی ہے کچھ جھگڑے کی بات نہیں ہے ایک نہایت مختصر کام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا کر لو جیسے کسی شخص سے کہا جاوے کہ یہ پچاس گاڑیاں ہیں ان کو ایک دم سے چلاؤ اور وہ سخت پریشان ہوگا کہ میں کس طرح چلاؤں یہ تو سخت مشکل ہے پھر اس کو طریق ایک بتلایا جاوے کہ اسی میں انجن لگا دو سب گاڑیاں خود بخود چل پڑیں گی۔ واللہ ایسی بے نظیر تعلیم ہے کہ کوئی حکیم کوئی فلسفی کوئی عاقل مثل نہیں لا سکتا اور کیوں نہ ہو وہ ایک مطب ہے ایسی ذات پاک کا جو انسان

کے رگ پٹھوں کے ریشہ ریشہ سے واقف ہے اس لئے اس کی حالت کو دیکھ کر علاج تجویز کیا ہے۔

تقویٰ کو اصلاح اعمال اور گناہوں کی مغفرت میں پورا دخل ہے

اب دیکھنا چاہئے کہ ان دونوں چیزوں کو اصلاح اعمال اور محو ذنوب میں دخل ہے یا نہیں تو بعد تامل یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے افعال کی ترتیب گناہوں کے مٹنے کی یوں ہے کہ اول قلب سے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کے بعد صدور ہوتا ہے گویا انجن قلب ہے تو اگر قلب درست ہوگیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو یہ دنیا کا سارا جہان اور تمام بکھیڑے سب کے سب قلب ہی کے خیال پر چل رہے ہیں یہ پہاڑ کی برابر عمارتیں یہ ہرے بھرے باغ یہ طرح طرح کے سامان سب کا انجن خیال ہی ہے اسی واسطے تو حدیث میں آیا ہے

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسدالجسد کله (الصحیح للبخاری ۱:۲۰)

یعنی آدمی کے جسم میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو تمام جسم درست ہو جاتا ہے اور جب بگڑتا ہے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور یہ مسئلہ طبی قاعدہ سے بھی درست ہے اس لئے کہ امراض قلب تمام امراض میں بہت سخت ہیں اگر قلب صحیح اور قوی ہے تو اور امراض کو طبیعت خود دفع کر دیتی ہے اور اگر قلب میں ضعف اور مرض ہے تو اور جسد کتنا ہی قوی ہو سب بیکار ہے جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قلب کی درستی سے تمام اعمال کی درستی ہوتی ہے تو قلب کی درستی کس سے ہو؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ قلب کے بھی بہت سے افعال ہیں تو اگر حق تعالیٰ تمام افعال کا حکم فرما دیتے یا اجمالاً یہ فرما دیتے کہ اپنے قلب کو درست کرو تو اس صورت میں بھی نفس کو ایک مشقت ہوتی کہ قلب کو کس طرح درست کریں کیا رحمت ہے کہ قلب کے تمام افعال میں سے صرف ایک مختصر سی بات فرمائی کہ صرف ہمارا خوف اختیار کرلو باقی سب ہم درست کر دیں گے اور وجہ یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حاکم کا اگر ڈر دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کی مخالفت پر جرات نہیں ہوتی اسی طرح اگر خدا تعالیٰ کا خوف کسی کے دل پر بیٹھ جائے تو اس سے گناہ نہ ہوں گے اور اعمال کی اصلاح ہو جاوے گی اور گذشتہ سے توبہ اور آئندہ کے لئے عزم ترک بھی کرے گا یہ محو ذنوب ہوا پس معلوم ہوگیا کہ تقویٰ کو اصلاح اعمال و محو ذنوب میں پورا دخل ہے اور تقویٰ اصلاح اعمال کے لئے بمنزلہ علت تامہ کے ہے۔

خوف سے روکنے والی دو چیزیں

اب اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ ہر شے کے لئے کچھ موانع ہوتے ہیں اور کچھ ذرائع اس کی تحصیل کے ہوتے ہیں اسی طرح خوف کے لئے موانع بھی ہیں اور ذرائع کی تحصیل کے بھی موانع

کو بیان کیا جاتا ہے اور طریقہ تحصیل آخر میں بیان کیا جاوے گا۔ تو سمجھنا چاہئے کہ خوف سے روکنے والی صرف دو چیزیں ہیں اول تو عدم ایمان دوسرے تسویل شیطانی عدم ایمان تو ظاہر ہے کہ بفضلہ تعالیٰ یہاں نہیں ہے اس لئے اس کے متعلق تو کچھ کلام کرنا ضروری نہیں البتہ تسویل شیطانی میں ابتلائے عام ہو رہا ہے اس کو بیان کیا جاتا ہے کہ شیطان نے سب کو یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ میاں جو کچھ کرنا ہے کرلو اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے آخر میں توبہ کرلیں گے سب بخش دیں گے۔

چنانچہ ارشاد بھی ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ تو سن لیجئے کہ حق تعالیٰ بیشک غفور الرحیم ہے لیکن غفور رحیم کے وہ معنی نہیں ہیں جو یہ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ غفور الرحیم کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ نافرمانیاں کر چکے ہیں اور نادم ہیں لیکن ان کو یہ تردد ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے تو خیر یہ تدبیر ہے کہ گناہ نہ کریں لیکن گذشتہ کرتوت کی اصلاح کیسے ہو تو ان کے لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ گناہوں کو بخشنے والا ہے چنانچہ شان نزول میں اسی خیال کے جواب میں نازل ہونا اس آیت کا مصرحاً مذکور ہے پس یہ آیت گناہان ماضی کے لئے ہے نہ یہ کہ آئندہ کے لئے بھی گناہ کی اجازت دے رہے ہیں۔ اب لوگ مستقبل کے لئے بھی اسی آیۃ کو اپنا متمسک بناتے ہیں یہ سراسر غلطی ہے یاد رکھو کہ توبہ کی مثال مرہم کی سی ہے۔ اور گناہ کی مثال آگ کی سی ہے مرہم تو اس لئے ہے کہ اتفاق سے اگر جل جاوے تو مرہم لگا دیا جاوے اس لئے نہیں ہے کہ اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس مرہم ہے آگ میں گھسا کریں جس شخص کے پاس نمک سلیمانی ہو اس کو یہ کب روا ہے کہ جان جان کر بہت سا کھایا کرے نمک سلیمانی تو اس واسطے ہے کہ اگر اتفاق سے بہت کھایا جائے تو نمک سلیمانی کھالیا جاوے اس سے ہضم ہو جاوے گا اور ایسا کرے گا تو ایک روز جان سے ہاتھ دھوئے گا۔ اسی طرح جو شخص توبہ کے اعتماد پر گناہ کرتا رہے گا۔ ایک دن عجب نہیں وہ ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے غرضیکہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرنا بہت حماقت ہے۔

لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال سے زیادہ ہوتے ہیں

اس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ طریقہ اصلاح اعمال ومحو ذنوب کا فقط اتنا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرلو تو اسی سے تمام اعمال درست ہو جاویں گے اور زبان کی درستی بھی اگرچہ اس میں داخل ہے مگر پھر زبان کی درستی کو استقلالاً طریقہ کا جزو کیوں بنایا گیا اس میں کیا راز ہے پس بجائے یایها الذین امنوا اتقوا الله یسددلکم لسانکم و یصلح لکم اعمالکم الخ یوں نہیں فرمایا بلکہ وقولوا قولا سدیداً کا اتقوا اللہ پر عطف کیا اور اس کو مستقل طریقہ قرار دیا تو

وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال بہت سے ہیں ایک وہ جو ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہا سے ہوتے ہیں ایک وہ جو زبان سے ہوتے ہیں اور ان دونوں قسموں میں کئی قسم کا تفاوت ہے۔

ایک یہ کہ سوائے لسان کے اور سب جوارح عمل کرنے سے تھک جاتے ہیں پاؤں تھک جاتا ہے کثرت سے چلنے سے ہاتھ تھک جاتا ہے ان اعمال سے جو ہاتھ سے کیے جاتے ہیں آنکھ تھک جاتی ہے زیادہ دیکھنے سے۔

مگر یہ لسان بولنے سے نہیں تھکتی اگر لاکھ برس تک بک بک کرو تو ہرگز نہ تھکے گی۔ یہ بات دوسری ہے کہ بکثرت بولنے سے دل کے اندر بے رونقی سی پیدا ہو کر بولنے سے نفرت ہو جاوے لیکن زبان کوئی نفسہ کوئی تکان نہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ لسانی اعمال سب جوارح کے اعمال سے عدد میں زیادہ ہوں گے پس گناہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے ایک تو یہ تفاوت ہوا دوسرے یہ کہ زبان مثل برزخ کے ہے درمیان قلب و جوارح کے قلب سے بھی اس کو مشابہت ہے اور جوارح سے بھی اور یہ مشابہت خلقی بھی ہے اور باطنی بھی خلقی یہ کہ قلب بالکل مخفی و مستور ہے اور جوارح بالکل ظاہر اور زبان مستور من وجہ و مکشوف من وجہ ہے چنانچہ شارع نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے کہ صائم اگر منہ میں کوئی چیز لے کر بیٹھ جائے روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں کہ مکشوف ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف میں وہ چیز نہیں گئی اور اگر تھوک نگلے تو بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اس میں مستور ہونے کا اعتبار کیا گویا جوف سے جوف میں ایک چیز چلی گئی اور غسل میں کلی کرنا فرض ہوا یہ مکشوف ہونے کا اعتبار فرمایا اور باطنی مشابہت یہ ہے کہ جیسے قلب کی اصلاح سے تمام بدن کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح زبان کی اصلاح سے تمام اعمال جوارح کی اصلاح ہو جاتی ہے جو شخص ساکت ہو کر بیٹھ جاوے اسکے ہاتھ سے نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی ہوگی نہ کسی سے لڑائی ہوگی نہ تکرار ہوگا اسلئے زبان چلانے ہی سے نوبت ہاتھ پاؤں تک پہنچتی ہے۔ ان سب سے حدیث کی بھی تنویر ہوگئی۔

اذا اصبح ابن آدم فان الاعضاء كلها تكفر اللسان فتقول اتق الله فينا فانانحن بك فان استقمت استقمنا و ان اعوججت اعوججنا (سنن الترمذی:۲۴۰۷)

یعنی جس وقت ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے تمام اعضاء زبان کو قسم دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اے زبان) ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ساتھ ہیں پس اگر تو راست ہوگی تو ہم سب راست رہیں گے اور اگر تو کج ہوگی تو ہم سب کج ہو جاویں گے۔

جوارح اور زبان کا ایک فرق

تیسرا تفاوت دیگر جوارح اور لسان میں یہ ہے کہ زبان قلب کی معبر ہے زبان سے جو کچھ کہا جاتا ہے اس سے پوری حالت قلب کی معلوم ہو جاتی ہے اور اگر ساکت رہے تو کچھ حال معلوم نہ ہوگا کہ یہ شخص کیسا ہے زبان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص متواضع ہے یا متکبر ہے قانع ہے یا حریص عاقل ہے یا

احمق دشمن ہے یا دوست خیر خواہ ہے یا بدخواہ بخلاف ہاتھ پاؤں کے سب شبہ ہو سکتا ہے ایک ہی طرح کا فعل ہاتھ پاؤں سے دوست دشمن سے صادر ہو سکتا ہے مثلاً قتل واقع ہوا تو اس سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ قاتل دشمن ہی تھا ممکن ہے کہ دوست ہو اور وہ کسی اور کو قتل کرنا چاہتا ہو اور ہاتھ چوک گیا ہو چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ ایک بھائی نے بندوق چلائی دوسرے بھائی کی آنکھ میں ایک چھرا جا لگا اسی طرح سے مار پیٹ کبھی عداوت سے ہوتی ہے کبھی تادیب کے لئے ہوتی ہے غرض ایک شق متعین کرنے کے لئے خارجی قرائن کی ضرورت ہوتی ہے بخلاف لسان کے کہ یہ پوری نائب قلب کی ہے۔

تعلقات کے دو اقسام

چوتھا تفاوت یہ ہے کہ تعلقات دو قسم کے ہیں ایک اپنے نفس کے ساتھ دوسرے غیروں کے ساتھ جو تعلق اخوت محبت عداوت کا ہوگا وہ بدولت زبان کے ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں ہم کو دوسروں کی امداد کی ضرورت ہے بغیر دوسروں کی امداد کے ہم رکعت تک نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ نماز کا طریقہ ہم کو کسی نے بتلایا ہوگا اس لئے ہم نماز پڑھتے ہیں قرآن شریف کسی نے پڑھایا اس لئے ہم پڑھتے ہیں روزہ کی فرضیت اور اس کی تاکید اور اس کی ماہیت کسی نے بتائی اس لئے روزہ رکھتے ہیں علی ہذا تمام اعمال صالحہ اور ان بتلانے سکھلانے والوں نے بلا تعلق تو بتلائے نہیں اور وہ تعلق پیدا ہوا ہے لسان سے اور نیز تعلیم بھی ہم کو بذریعہ لسان کے کی گئی ہے تو اس اعتبار سے لسان کو تمام اعمال صالحہ میں دخل ہوا گویا یہ تمام اعمال صالحہ بدولت اس لسان ہی کے ہم سے صادر ہوتے ہیں۔ جبکہ دیگر جوارح اور لسان میں اس قدر تفاوت ہوئے اور لسان کو اعمال صالحہ کے وجود میں ایک دخل عظیم ہوا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے اس کو مستقل جزو طریقہ اصلاح کا بنا دیا اگرچہ تقویٰ سے جو درستی ہوگی درستی لسان بھی اس کا فرد عظیم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ذمہ دو کام ہوئے ایک خدا کا خوف دوسرے زبان کی اصلاح ان دونوں کے جمع ہونے سے آئندہ کے لئے اعمال کی اصلاح ہوگی اور گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

بجائے ناز کے نیاز کی ضرورت ہے

اور یُصْلِحْ کی نسبت جو اپنی طرف فرمائی حالانکہ بظاہر اصلاح اعمال کام عبد کا ہے تو وجہ اس کی یہ اشارہ ہے کہ ہم کو اپنے اوپر نظر نہ ہونا چاہئے اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ کام ہم نے کیا ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ ناز مت کرو جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں اور خیر اگر کچھ ہمارے اختیار میں بھی ہے تو یہ ہے مثلاً ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن پوری درستی جو مفہوم ہے یُصْلِحْ کا یعنی یہ کہ جیسے چاہئے اس طرح کی نماز پڑھنا اور قلب کا اس میں حاضر ہو جانا یہ سب خدا کی طرف سے ہے اور اس نسبت میں ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ گویا فرماتے ہیں کہ یہ اعمال تو تم نے کر لئے لیکن ہم اس کی اصلاح کر کے فرشتوں کی معرفت

پیش کرادیں گے جیسے بچہ سے کہا کرتے ہیں کہ یہ شے اٹھالاؤ اور وہ اٹھا نہیں سکتا تو خود اٹھاتے ہیں اور اس کا ہاتھ بھی لگوا لیتے ہیں اور اٹھانے کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں اور اس پر انعام دیتے ہیں ایسے ہی ہمارا نماز روزہ ہے کہ خود توفیق دیتے ہیں خود رکھواتے ہیں اور خود ہی انعام عطا فرماتے ہیں۔ اللہ اکبر کس قدر رحمت ہے اور دوسری شے جو اتقوا اللہ الخ پر مرتب فرمائی وہ یغفر لکم ذنوبکم ہے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ کے یجنبکم ذنوبکم یعنی تم کو گناہوں سے بچالیں گے یہ نہیں فرمایا اس لئے کہ گناہوں سے بچانا تو یُصْلِحْ لَکُمْ میں آچکا ہے ذنوب ماضیہ باقی تھے ان کی نسبت فرمایا کہ ان کی بھی فکر نہ کرو ان کو بھی اللہ تعالیٰ محو فرمادیں گے۔

حصول خوف کا طریق

اب میں آپ کو خوف (کہ جس سے تمام اعمال درست ہوجاتے ہیں) اس کے حاصل ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں اور وہ طریقہ گویا ایک گر ہے اور میرے تمام وعظ کا گویا خلاصہ ہے اور وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا ارشاد ہے وہ یہ ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ یعنی فکر آخرت کیا کرو اور فکر آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ ایک وقت مقرر کرلو مثلاً سوتے وقت روزمرہ بلاناغہ بیٹھ کر سوچا کرو کہ معاد کیا ہے اور مر کر ہم کو کیا پیش آنے والا ہے مرنے سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک جو واقعات ہونے والے ہیں سب کو سوچا کرو کہ ایک دن وہ آئے گا کہ میرا اس دار فانی سے کوچ ہوگا سب سامان مال اسباب باغ نوکر چاکر اولاد بیٹا' بیٹی' ماں' باپ' بھائی' خویش' اقارب' دوست' دشمن سب یہیں رہ جاویں گے میں تن تنہا سب کو چھوڑ کر قبر کے گڑھے میں جالیٹوں گا اور وہاں دو فرشتے آدیں گے اگر میرے دن بھلے ہیں تو اچھی صورت میں ورنہ خدانخواستہ ڈراؤنی صورت میں نہایت ہولناک آواز سے آکر سوالات کریں گے پس اے نفس اس وقت کوئی تیرا مددگار نہیں ہوگا تیرے اعمال ہی وہاں کام آدیں گے اگر سوالات کے جواب درست ہوگئے سبحان اللہ جنت کی طرف کی کھڑکی کھل جائے گی اور اگر خدانخواستہ امتحان میں ناکام رہا تو قبر حفرة من حفر النار (کنز العمال: ۴۲۳۹۷)

(دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا) ہوگی اس کے بعد تو قبر سے اٹھایا جائے گا اور نامہ اعمال اڑائے جاویں گے۔ حساب کتاب کے لئے پیش کیا جاوے گا پل صراط پر چلنا ہوگا اے نفس تو کس دھوکہ میں ہے اور ان سب واقعات پر تیرا ایمان ہے اور یقیناً جانتا ہے کہ یہ ہو کر رہیں گے پھر کیوں غفلت ہے اور کس وجہ سے گناہوں کے اندر دلیری ہے کیا دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اے نفس تو ہی اپنا غمخوار بن اگر تو اپنی غمخواری نہ کرے گا تو تجھ سے زیادہ کون تیرا خیر خواہ ہوگا اسی طرح

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ ان واقعات کو تفصیل سے سوچا کرے میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ چند ہی روز کے بعد دیکھو گے کہ خوف پیدا ہوگا اور خوف پیدا ہونے کے بعد آپ کو ماضی سے توبہ کی فکر ہوگی اور آئندہ کے لئے اطاعت کی توفیق ہوگی اس وقت آپ کو مشاہدہ ہوگا اتقوا اللہ پر کیسے اصلاح اعمال و مغفرت ذنوب مرتب ہوگئے آگے فرماتے ہیں و من وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا یعنی جو شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے وہ بیشک بڑی کامیابی کو پہنچا یطع میں اشارہ ہے کہ جو شخص خوشی سے کہنا مانے اس لئے کہ یہ طلوع سے مشتق ہے اور خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں ہوتے۔

اللہ کی محبت حاصل ہونے کا طریقہ

اور اللہ کی محبت کے حاصل ہونے کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یاد کرنا ہے اس کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر کے سوچا کرو کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں ہیں چند روز کے بعد آپ کو مشاہدہ ہوگا کہ ہم سرتاسر عنایات اور نعمتوں میں غرق ہیں اس سے آپ کے قلب میں حق تعالیٰ کی محبت اور اپنی ناکارگی اور تقصیر جاگزیں ہوگی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یطیع کا تعلق آپ سے بھی ہے آپ کے ساتھ محبت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہمارے لئے مشقتیں اٹھائیں اور اپنی امت پر شفقت فرمائی اس کو سوچا کرو جب محبت پیدا ہوگی۔ اطاعت خوشی سے ہوگی ادھر محبت ہوگی اور پہلے جو طریقہ بیان کیا اس سے خوف ہوگا یہ دونوں شے آپ کے دین دنیا دونوں درست کر دیں گے اور بڑی کامیابی سے یہی مراد ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ حق تعالیٰ ہم کو اصلاح اعمال کی توفیق عطا فرمادیں۔ وصلی الله تعالیٰ علی خير خلقه محمد وآله اصحابه اجمعين والسلام۔

ناظرین! آپ سے استدعا ہے کہ جامع وعظ ہذا اور عبدالمنان کیلئے بھی دعائے حسن خاتمہ فرمادیں تاریخ تحریر ۱۵ شوال سنہ ۱۳۳۰ ہجری فقط تمت بالخیر۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّابَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ط ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِہٖ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (الانعام آیت نمبر ۱۵۳)

(اور یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی) یہ ایک آیت ہے سورہ انعام کی اخیر کے قریب کی اس کا مضمون ایسا عام اور کلی ہے کہ اس کی تفصیل اگر ساری عمر کی جائے اور وہ عمر بھی ایک شخص کی نہیں بلکہ ایک جماعت متعاقبہ کی عمر جو خود فی نفسہ متناہی ہو لیکن بمعنی لاتقف عند حد (کسی حد پر نہ ٹھہرے) غیر متناہی ہو اور اس کا ہر فرد اس کی تفصیل بیان کرنا شروع کرے پھر جہاں سے ایک نے چھوڑا ہو اس سے آگے دوسرا بیان کرے اسی طرح سب افراد بیان کرتے چلے جائیں جب بھی اس کی تفصیل ختم نہیں ہو سکتی کوئی حالت اور کوئی جزئی حادثہ اس آیت سے خارج نہیں بلکہ یہ سب کو مشتمل ہے اور حوادث کے احاطہ سے باہر ہونا ظاہر ہے۔ اس مضمون کے اختیار کرنے کی ضرورت ایک تو یہی ہے کہ مضمون عام ہے اور عام مضمون کا ضروری ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب کی ضرورت کا ہوا کرتا ہے تمام مخاطب اس میں بدرجہ مساوی شریک ہوتے ہیں۔

اظہار نعمت ماموربہ ہے

مگر عام ضرورت کے علاوہ ایک خاص سبب بھی اس کے اختیار کرنے کا ہے جس کو تحدیث بالنعمۃ

کے طور پر عرض کرتا ہوں کیونکہ نعمت کا چھپانا ناشکری ہے اور نعمت کا ظاہر کرنا مامور بہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (اور اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کرو) دوسرے وہ نعمت سب کے نفع کی ہے تو اس کا چھپانا بے مروتی بھی ہے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ حلوا بہ تنہا بنایست خورد (تنہا حلوہ نہ کھانا چاہئے) اس بنا پر جی چاہا کہ اس نعمت سے اپنے دوستوں کو بھی خبر کر دی جائے تاکہ وہ بھی اس علم عظیم سے نفع حاصل کریں۔ مگر جس طرح اظہار نعمت میں یہ مصلحت ہے اسی طرح اس میں کید نفس کا مفسدہ بھی ہے کیونکہ بعض دفعہ ہم نعمت الٰہی کو تحدیث بالنعمۃ سمجھ کر اس خیال سے بیان کرتے ہیں کہ اظہار نعمت کا نص میں امر ہے مگر اس میں نفس کا کید بھی خفی ہوتا ہے کہ اس طریقہ سے وہ اپنا کمال ظاہر کرنا چاہتا ہے اور نعمت سے عجب و کبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اس طریق باطن میں اشتباہ اور تلبیس بے حد ہے۔ اخلاق حمیدہ اور اخلاق رذیلہ دونوں دوش بدوش چلتے ہیں ظاہر میں تحدیث بالنعمۃ اور دعویٰ کی صورت یکساں ہوتی ہے (تواضع و ناشکری میں خلط ہے تادیب و تعنیف میں اشتباہ ہے۔ سیاست اور تحکم کی صورت یکساں ہوتی ہے لطافت اس تن آرائی میں خلط ہے انتظام اور بخل کی صورت یکساں ہے غیرت غضب ایک صورت سے ظاہر ہوتے ہیں استغناء اور تکبر میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا وغیرہ وغیرہ ۱۲ جامع) اسی لئے بعض دفعہ سالک پریشان ہو کر کہتا ہے۔

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا　　ماچو مرغان حریص بے نوا
دم بدم پا بستہ دام نویم　　گر ہمہ شہباز و سیمرغے شویم
میرہانی ہر دمے مارا و باز　　سوئے دامے میرویم اے بے نیاز

(اے خدا یہ ہزاروں دام و دانہ ہیں اور ہم مثل مرغ حریص بے نوا ہیں دمبدم آپ کے دام میں پابستہ ہیں اگرچہ ہم سب شہباز اور سیمرغ ہیں ہر دم آپ ہم کو رہائی دیتے ہیں لیکن پھر بھی دام کی طرف دوڑتے ہیں) مگر یہ نہیں ہے کہ واقع میں بھی فرق نہیں یا ایسا دقیق فرق ہے جس کو غور سے بھی نہ سمجھ سکے بلکہ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے مگر اس فرق کے ادراک کے لئے اہتمام و فکر کی ضرورت ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے)

اخلاق رذیلہ اور اخلاق حمیدہ

بحر تلخ سے اخلاق رذیلہ مراد ہیں اور بحر شیریں سے اخلاق حمیدہ مولانا فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ایک فاصل قوی ایسا موجود ہے جس کی وجہ سے ایک کی مجال نہیں کہ دوسرے میں مختلط

ہو سکے جیسے کلکتہ وغیرہ میں سنا ہے کہ بحر تلخ و بحر شیریں کا اجتماع ہوا ہے اور میلوں تک دونوں میں اخلاط نہیں ہوا ایک طرف شیریں پانی ہے دوسری طرف شور ایک سے کھانا پک سکتا ہے اور دوسرے سے کسی کی دال نہیں گلتی ایسے ہی یہاں اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں گو بظاہر اختلاط ہے مگر واقع میں ہر ایک جدا ہے۔ دونوں میں قوی فاصل موجود ہے جو حقیقی اختلاط سے مانع ہے مگر بعض اوقات صاحب معاملہ کو اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس کے لئے مبصر شیخ کی ضرورت ہے پس مولانا کا پہلا ارشاد یعنی صد ہزاران دام ودانہ است الخ (لاکھوں جال و دانہ ہیں) صاحب واقعہ کے اعتبار سے ہے اور یہ ارشاد یعنی درمیان شاں برزخ لایبغیان (درمیان میں ان کے ایسا پردہ حائل ہے کہ باہم مختلط نہیں ہونے پاتے) واقع کے اعتبار سے ہے خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق حمیدہ و رذیلہ میں واقع میں تو فرق ہے اور ایسا قوی فرق ہے کہ واقعیت کے لحاظ سے دونوں میں خلط کی گنجائش نہیں مگر صاحب واقعہ کو بعض دفعہ اس فاصل کا ادراک نہیں ہوتا اس لئے اس طریق میں خلط و اشتباہ بہت واقع ہو جاتا ہے اور صاحب واقعہ کو بھی یہ اشتباہ قلت اہتمام کی وجہ سے ہوتا ہے اور اہتمام وفکر کے بعد اس کو بھی اشتباہ نہیں ہوتا کیونکہ اہتمام پر حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

مجاہدہ کی حقیقت

رہبری کا چنانچہ ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے خود دکھلا دیں گے) مجاہدہ کی حقیقت اہتمام ہی ہے جس پر حق تعالیٰ خود رہبری کا وعدہ فرما رہے ہیں۔ تو اب ان کی دستگیری کے بعد کون چیز مانع ہو سکتی ہے۔ کوئی نہیں پس یہ مسئلہ تو مسلم ہے کہ اہتمام و مجاہدہ کے بعد خلط نہیں ہو سکتا مگر ہم میں تو اہتمام ہی کی کمی ہے۔ اسی لئے ہم کو اخلاق رذیلہ وحمیدہ میں خلط ہو جاتا ہے ہمارا تحدیث بالنعمۃ ریاء وعجب سے مخلوط ہماری تواضع ناشکری سے مشتبہ ہمارا استغناء و توکل تکبر سے ملتبس ہے۔ اس لئے میں حق تعالیٰ سے مدد لے کر اس نعمت کو بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ خلط سے محفوظ رکھے اور اگر خلط ہو جائے تو حق تعالیٰ معاف فرمائیں کیونکہ ہم بہ نسبت حفاظت کے معافی و مغفرت کے محتاج زیادہ ہیں کیونکہ حفاظت کے اہل وہ حضرات ہیں جو گناہوں سے معصوم ہیں اور ہم گناہوں سے محفوظ نہیں ہیں اس لئے مغفرت کے زیادہ محتاج ہیں دوسرے طلب مغفرت میں اپنا ایک عجز و نیاز وضعف ظاہر ہوتا ہے جو طلب حفاظت میں حاصل نہیں ہے اور بندہ سے عجز و نیاز ہی مطلوب ہے۔ اس لئے ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر مغفرت طلب کرتے ہیں۔

دعائے مغفرت مطلوب ہے

اس وقت مجھے یاد آ گیا قصہ حضرت ابراہیم بن ادہم کا کہ ایک مرتبہ انہوں نے دعا کی اللھم اعصمنی کہ اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) ارشاد ہوا کہ اگر سب یہی دعا کرنے لگیں تو رحمت و مغفرت کا ظہور کہاں ہوگا۔ اللھم اغفرلی (اے اللہ میری مغفرت کر) کیوں نہیں کہتے وہ اس میں بتلا دیا گیا ہے کہ جس طرح حفاظت مطلوب ہے مغفرت بھی مطلوب ہے یہی مطلب ہے اس حدیث کا لو لم تذنبوا لجاء اللہ بقوم یذنبون فیستغفرون اللہ فیغفرلھم. ترجمہ (اگر تم گناہ نہ کرو تو حق تعالیٰ ایسی جماعت کو پیدا کریں گے جو گناہ کریں پھر استغفار کریں اور ان کی مغفرت کی جائے ۱۲) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ ہم سے مقصود ہے اور حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہم گناہ کیا کریں۔ بلکہ گناہ سے جو ضعف و عجز ظاہر ہوتا ہے وہ مقصود ہے پس اگر کہیں بدون صدور گناہ ہی کے یہ ضعف و عجز پیدا ہو جائے جیسے انبیاء علیہم السلام باوجود عصمت کے جس قدر اپنے کو گنہگار خطاوار سمجھتے ہیں ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو اتنا گنہگار نہیں سمجھتے اور جس قدر وہ حق تعالیٰ سے خوف و خشیت رکھتے ہیں ہم مجرم ہو کر بھی اتنا تو کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی خوف نہیں رکھتے۔ تو اگر ہم لوگ گناہوں میں مبتلا نہ کئے جاتے تو نہ معلوم ہماری کیا حالت ہوتی جب ہم گنہگار ہو کر بھی اپنے کو کچھ زیادہ گنہگار نہیں سمجھتے تو معصوم ہو کر نہ معلوم ہم اپنے کو کیسا کچھ مقدس سمجھتے اور ہمارے عجب کی کیا حالت ہوتی۔ اس لئے کبھی کبھی ہم کو گناہ میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جس سے ہمارا وہ عجب توڑ دیا جاتا ہے جو طاعات و اذکار سے کبھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور وہ خیال تقدس پارہ پارہ ہو جاتا ہے جو کچھ دنوں تہجد اور مراقبات کی پابندی سے دل پر گزرنے لگتا ہے۔ تو جیسے ہم کو حفاظت حق کی ضرورت ہے اسی طرح مغفرت کی بھی ضرورت ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادہم کو تنبیہ کی گئی کہ محض عصمت کی دعا کیوں کرتے ہو۔ اس کے ساتھ دعائے مغفرت کیوں نہیں ملاتے۔ اس کے علاوہ اللھم اعصمنی (اے اللہ مجھے گناہوں سے بچایئے) کے ساتھ اللھم اغفرلی (اے رب مجھے بخش دیجئے) ملانے میں ایک اور بھی حکمت ہے جس پر نظر کر کے اس کا ملانا بہت ہی ضروری ہو گیا وہ یہ کہ سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے حق تعالیٰ مجیب الدعوات ہیں۔

اجابت دعا کا صریح وعدہ

چنانچہ جو لوگ دعا قبول نہ ہونے کے شاکی بھی ہوتے ہیں وہ یہ تو کہا کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی مگر یہ کسی کو کہتے ہوئے نہیں سنا گیا کہ دعا قبول ہونے کا وعدہ کہاں ہے بلکہ اس کا سب کو اعتقاد ہے کہ دعا قبول کرنے کا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس کا انکار کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ

قرآن میں صریح ارشاد موجود ہے۔ ادعونی استجب لکم تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری اجابت کروں گا) رہا یہ اشکال کہ جب اجابت دعا کا صریح وعدہ ہے تو پھر اس میں تخلف کیوں ہوتا ہے اس کے جواب بہت سے ہیں مگر ان کی گنجائش کہاں سہل بات وہ ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ دعا کو قبول فرماتے ہیں پھر کبھی تو جلدی وہی مطلوب عطا فرمادیتے ہیں جو مانگا گیا ہے اور کبھی دیر سے عطا فرماتے ہیں کہ اس میں مصلحت ہوتی ہے اگر اس مطلوب کا دنیا میں دینا مصلحت نہیں ہوتا تو اس کو آخرت کے لئے ذخیرہ کے طور پر جمع رکھتے ہیں جب بندہ قیامت میں حاضر ہوگا سب دعاؤں کا ثواب اس کے سامنے کر دیا جائے گا بہر حال اجابت دعاء امر ضروری ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اس کے ساتھ ایک دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ دعا کے وقت اس اعتقاد کا بھی حکم ہے۔ میری یہ دعا ضرور قبول ہوگی حدیث میں ہے

ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ (سنن الترمذی:۳۴۷۹)

(اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم قبولیت دعاء کا یقین بھی رکھو اب بتلاؤ کہ اگر اللھم اعصمنی کے ساتھ اللھم اغفرلی نہ بڑھایا جائے تو یہ شخص تو اس دعاء کے بعد اپنے تقدس کا معتقد ہوگا کیونکہ وہ کہے گا کہ میں نے اپنے لئے عصمت کی دعا کی اور دعاء ضرور قبول ہوتی ہے اور مجھے اعتقاد اجابت کا امر بھی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ میں اپنے کو معصوم مقدس نہ سمجھوں حق تعالیٰ نے اس الہام میں اللھم اغفرلی بڑھا کر اس اشکال کو رفع فرمادیا اور بڑا علم عظیم عطا فرمایا کہ تم دعائے عصمت کے ساتھ دعائے مغفرت بھی کیا کرو۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ اول تو مجھے گناہوں سے بچایئے اور اگر ابتلا ہی مقدر ہے تو مغفرت فرمایئے اس مجموعہ کے اعتقاد میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اب خیال تقدس کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا سبحان اللہ ایک لفظ بڑھا کر کتنے بڑے پہاڑ کو گرا دیا یہ ہیں وہ الہامات جن کو الہام کہنا چاہئے یہ مضمون کچھ اس الہام ہی پر موقوف نہیں الہام کیسا خود نص میں بھی اس کی تعلیم موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں یہ دعا فرمائی ہے اللھم قنی شر نفسی (کنزالعمال:۳۶۹۵)

(اے اللہ مجھ کو میرے نفس کے شر سے بچایئے) وہیں یہ دعا بھی موجود ہے۔ اللھم اغفرلی ذنبی (اے اللہ میرے گناہ معاف کر دیجئے) بلکہ نص میں ایک بات اور زیادہ ہے جس کا اس الہام میں پتہ نہیں وہ یہ کہ آپ نے دعائے مغفرت میں یہ قید بھی زیادہ فرمائی ہے۔

گناہ نہ ہونے کا علم نہ ہونا حقیقۃً درست نہیں ہو سکتا

ماعلمت منہ ومالم اعلم اے اللہ میرے سب گناہ بخش دے وہ بھی جن کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جن کو نہیں جانتا اس میں ان لوگوں کا دعویٰ توڑ دیا گیا جو چند موٹے موٹے گناہوں سے محفوظ ہو

کر تقدس کے مدعی ہیں۔ اس جملہ نے بتلا دیا کہ عدم علم عدم کو مستلزم نہیں پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تمہارے علم میں تمہارے سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا تو یہ کیا ضرور ہے کہ واقع میں بھی سرزد نہ ہوا ہو اور اس کی ضرورت تو تنزل کے بعد ہے ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ انسان کو اپنے اندر گناہ نظر نہ آئیں ادنیٰ تامل سے انسان اپنی خطاؤں کو سمجھ سکتا ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (بلکہ انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو اپنے حیلے پیش لاوے) ہاں کوئی آنکھیں ہی بند کرلے تو اس کا علاج نہیں اس کے لئے بسبیل تنزل وہ جواب ہے جو حدیث کے اس جملہ میں دیا گیا ہے۔ ماعلمت منه و مالم اعلم (وہ بھی جس کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی جس کو میں نہیں جانتا) یعنی تمہارا عدم علم عدم کو تو مستلزم نہیں پس یہی سمجھ کر اپنے کو گناہ گار جانتے رہو کہ شاید تجھ سے کوئی ایسا گناہ ہوا ہو جس کی مجھے خبر نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ حدیث میں اس کی ایک واضح نظیر بھی مذکور ہے حدیث میں آتا ہے یتکلم احدکم بکلمة لایلقی لها بالایحطه الله بها الی النار سبعین خریفاً و یتکلم احدکم بکلمة لایعلمها شیًا یرفع الله بها له درجات فی الجنة او کماقال بعض تم میں سے ایک بات کہتا ہے جس کی طرف قلب کو التفات بھی نہیں ہوتا مگر حق تعالیٰ اس ایک بات کی وجہ سے اس کو جہنم میں بہت دور پھینک دیتے ہیں اور بعض آدمی ایک بات کہتا ہے جس کی کچھ وقعت اس کے نزدیک نہیں ہوتی اور حق تعالیٰ اس کی وجہ سے بہت درجے جنت میں اس کے بلند کر دیتے ہیں (غور کیجئے دوسرے گناہوں کا یاد نہ رہنا تو شاید محل کلام بھی ہو مگر زبان کے گناہوں میں ایسا ہو جانا تو کچھ بھی بعید نہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہم لوگ روانی کلام میں بہت سی باتیں بلا قصد و ارادہ کے کہہ جاتے ہیں جن پر اصلاً التفات نہیں ہوتا کہ ان کا اثر کیا ہوا ہوگا تو ذنوب لسان کا ہم کو یاد نہ رہنا کیا بعید ہے۔ کچھ بھی نہیں پس اب کسی کو بھی دعویٰ تقدس کا منہ نہیں رہا۔

احادیث دعا میں بہت علوم ہیں

یہاں سے اہل علم کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ احادیث دعاء میں بھی بہت علوم ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم سلوک تو اکثر احادیث دعاء ہی میں بھرے ہوئے ہیں مگر ان احادیث کو اہل علم ایسی بے توجہی سے پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس کی کچھ حد نہیں اس لئے ہم لوگ بہت سے علوم سے محروم ہیں۔ الغرض چونکہ دعویٰ کبھی بصورت تحدیث بالنعمة بھی ہوتا ہے اس لئے میں نے دعائے حفاظت کے ساتھ دعائے مغفرت کو بھی منضم کرلیا کہ اگر خدانخواستہ مجھ سے غلط ہو جائے تو حق تعالیٰ اس گناہ کو معاف فرمائیں اس تمہید کے بعد میں حق تعالیٰ پر توکل کر کے اور ان کی امداد طلب کر کے اس نعمت کو بیان کرتا

ہوں۔ وہ نعمت یوں تو نئی نہیں ہے بلکہ پرانی ہے اور ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر بعض دفعہ ایک وارد کسی خاص حالت میں آتا ہے تو نیا معلوم ہوا کرتا ہے جیسے آج جمعہ کا دن ہے سب لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو گو اس جدت لباس سے یہ لوگ بدل نہیں گئے بلکہ سب وہی ہیں جو ایک گھنٹہ پہلے تھے مگر پھر بھی ہر شخص میں ایک جدت ضرور معلوم ہوتی ہے اور یوں خیال ہوتا ہے کہ یہ شخص ہی بدل گیا ہے۔ اور قاعدہ ہے کل جدید لذیذ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے گو وہ نعمت فی نفسہ پرانی ہے مگر اس زمانہ قریب میں وہ جس شدت وجدت کے ساتھ قلب پر وارد ہوئی ہے اس طرح پہلے وارد نہ ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے نئی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے جو لذت وحظ اور جو اثر میرے قلب پر اس وقت ہے وہ ویسا ہی ہے جو نعمت جدیدہ سے ہوا کرتا ہے۔ جمعہ کے دن کپڑے بدلنے سے اشخاص میں جدت معلوم ہونے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں خانقاہ میں ایک صاحب رہتے تھے جو معلم بھی تھے ایک دن میں نے ایک مہمان کو دکھلا کر ان سے کہا کہ میں ان کا کھانا گھر سے بھیجتا ہوں تم ان کو کھلا دینا اور بتلا دیا کہ وہ مہمان یہ ہیں ان کو پہچان لو اس وقت وہ مہمان اتفاق سے ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے میں مکان کو آ گیا کچھ دیر کے بعد ان صاحب کا کھانا آیا معلم صاحب کھانا لے کر خانقاہ میں ان مہمان کو تلاش کرنے لگے جب وہ نہ ملے تو میرے پاس آئے کہ مہمان تو نہ معلوم کہاں چلے گئے ملتے نہیں حالانکہ اس وقت وہ مہمان میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے کہا بندہ خدا یہ تو بیٹھے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں کہ یہ چادر تو اوڑھے ہوئے ہیں نہیں (اس وقت مہمان نے گرمی کی وجہ سے چادر وہ اتار دیا تھا) میں نے ان مہمان سے کہا کہ حضرت جب آپ کہیں جایا کریں تو اول سے آخر تک ایک ہی لباس میں رہا کریں یا کم از کم کھانے کے وقت تو وہی لباس پہن لیا کریں جس میں اول آپ وارد ہوا کریں ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ کیونکہ دنیا میں ایسے بھی عقلاء ہیں جن کے نزدیک چادرہ اتار دینے سے آدمی بدل جاتا ہے تو ہمارے ان دوست نے چادرہ کے نہ ہونے سے مہمان کو نیا آدمی سمجھا اور اس کا یہ خیال گو ہمارے نزدیک حماقت ہو مگر فلاسفہ کی تحقیق پر منطبق ہے کیونکہ فلاسفہ کے نزدیک اعراض کے بدلنے سے تشخص بدل جاتا ہے اور اعراض میں ایک عرض مقولہ ملک اور ایک عرض مقولہ جدہ بھی ہے۔ جن کے تبدل سے تشخص معروض بدل جاتا ہے خیر تو یہ ایک لطیفہ تھا مقصود میرا یہ ہے کہ جدت حال سے ذوالحال میں بھی گونہ جدت آ جاتی ہے (گو اس درجہ کی جدت نہ ہو جیسی ہمارے ان دوست نے سمجھی تھی کہ چادرہ اتار دینے سے مہمان کے وجود ہی کی نفی کر دی) اور قاعدہ ہے کل جدید لذیذ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) اس لئے مجھے اس نعمت سے وہی حظ حاصل ہو رہا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے۔

کل جدید لذیذ پر ایک لطیفہ

کل جدید لذیذ پر مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کا ایک لطیفہ مجھے یاد آ گیا۔ مولانا کی عادت تھی کہ غریبوں کو تو مہمانی میں پلاؤ قورمے کھلاتے تھے اور امیروں کو دال ساگ مولانا کا مقصود تو اس سے اور ہی کچھ تھا وہ یہ کہ مولانا کی نظر میں اغنیا کی قدر نہ تھی غریبوں کی قدر تھی اس لئے غریبوں کی خاطر مدارات امیروں سے زیادہ کرتے تھے اور یہ سنت اللہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالٰی فقراء مہاجرین کو اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل کریں گے تو خدا کے نزدیک غرباء کی اتنی قدر ہے مگر اب یہ رنگ ہے کہ ایک غریب مجھ سے کہتے تھے کہ آج کل تو غریبوں کی بہت ہی مٹی پلید ہے اب تو اگر کسی امیر سے ریح صادر ہو جائے تو کہتے ہیں مبارک ہو صحت ہوئی اور غریب سے صادر ہو جائے تو اس کو دھمکاتے اور مجلس سے نکال دیتے ہیں کہ کمبخت نے سڑا دیا دماغ پاش پاش کر دیا حالانکہ غریبوں سے امیروں کی ریح زیادہ سڑی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ مرغن غذا اور مختلف قسم کے کھانے کھاتے ہیں جس سے معدہ سخت متعفن ہو جاتا ہے غریبوں کے معدے ایسے متعفن نہیں ہوتے کیونکہ اول تو وہ سادہ غذا کھاتے ہیں پھر وہ بھی معدہ میں باقی نہیں رہتی دو چار دفعہ ہل جانے سے سب ہضم ہو جاتی ہے مگر بایں جملہ امیروں کی ریح سے کسی کا دماغ نہیں پھٹتا اور غریبوں سے پاش پاش ہو جاتا ہے یہ زمانہ کا اثر ہے کہ آج کل غریبوں کی بے قدری بہت ہے مجھے اس مبارک اور صحت ہونے پر ایک حکایت یاد آئی ایک دفعہ میں ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب نے زور سے ریح صادر کی لوگوں کو ناگوار ہوا تو انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

چو باد اندر شکم پیچد فروہل — کہ باد اندر شکم باریست بر دل

(جب ریح پیٹ میں گھوے چھوڑ دے کہ ریح پیٹ کے اندر ایک بوجھ ہے دل پر) کہنے لگے دیکھئے شیخ سعدی فرماتے ہیں کہ جب پیٹ میں گڑبڑ ہو تو ہوا چھوڑ دینی چاہئے میں نے اس پر عمل کیا ہے پھر ناگواری کی کیا وجہ میں نے کہا کہ شیخ نے اس شعر میں یہ کہاں فرمایا ہے کہ زور سے چھوڑا کرو کہنے لگے کہ اس شعر میں گو اظہار و اخفاء کی تصریح نہیں جس قصہ میں یہ شعر ہے اس میں وقوع اعلان ہی کے ساتھ ہوا تھا جبھی تو ان کو اس معذرت کی ضرورت ہوئی آہستہ صدور ہوا ہوتا تو اہل مجلس سے عذر خواہی کی ان کو کیا ضرورت تھی اس وقت تو مجھے ان کی بات کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور میں ہار گیا اور وہ دونوں راستوں سے جیت گئے اوپر کے راستہ سے بھی اور نیچے کے راستہ سے بھی (اوپر کے راستہ سے حجت و دلیل کے ساتھ جیتے اور نیچے کے راستہ سے تو جیتے ہوئے تھے ہی کہ سب کو بدبو سے دبا دیا) بعد میں ان کی دلیل کا جواب میری سمجھ میں آیا کہ وہاں تو زور سے

اتفاقاً ہوا تھا اور یہاں ان صاحب نے قصداً زور سے کیا تھا یہ فرق ہے اس قصہ میں اور ان کے فعل میں اور واقعی قصداً زور سے ریح صادر کرنا خصوصاً مجمع میں بہت ہی نازیبا حرکت اور آدمیت کے خلاف ہے ہمارے یہاں ایک میاں جی تھے جو لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے لڑکے بے تمیز تو ہوتے ہی ہیں وہ مکتب ہی میں ریح صادر کر دیتے ہیں میاں جی نے کہا بہت نالائق حرکت ہے سارا مکتب اس سے سڑ جاتا ہے' اب سے جس کی ریح آئے وہ باہر جا کر چھوڑا کرے۔ پھر یہ فکر ہوئی کہ اس کے لئے کس لفظ سے اجازت لی جائے تو میاں جی نے یہ تجویز کیا کہ جب اس کام کے لئے کوئی جایا کرے تو وہ یہاں کہا کرے کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں یہ میاں جی بھی ایسی باتوں میں مجتہد ہوتے ہیں کیا لفظ بامعنی نکالا ہے۔ بس اب کیا تھا۔ لڑکوں کے ایک کھیل ہاتھ آ گیا تھوڑی تھوڑی دیر میں ایک اٹھتا دوسرا اٹھتا تیسرا آتا کہ میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں' میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں میاں جی چڑیا چھوڑ آؤں آخر میاں جی تنگ آ گئے اور جھلا کر کہنے لگے کہ بس یہیں چھوڑ دیا کرو۔

غرباء کی اللہ کے یہاں قدر و منزلت

یہ قصہ اس پر چلا تھا کہ آج کل غریبوں کی بہت بے قدری ہے مگر خدا کے یہاں ان کی قدر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں یہ قدر تھی کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو وصیت فرماتے ہیں۔

یاعائشۃ جالسی المساکین و قربیھم (البدایۃ والنھایۃ ۶: ۵۹)

اے عائشہ مساکین کے پاس بیٹھا کرو اور ان کو اپنے سے قریب کرو نیز آپ دعا میں فرماتے تھے

اللھم احینی مسکیناً و امتنی مسکینا و احشرنی فی زمرۃ المساکین (سنن الترمذی: ۲۳۵۲)

اے اللہ مجھے زندگی میں بھی مسکین رکھئے اور موت بھی مسکینی کی حالت میں دیجئے قیامت میں بھی مساکین کی جماعت میں اٹھایئے سبحان اللہ کس قدر آپ کو مساکین سے محبت تھی کہ اپنے لئے انہی کے ساتھ پسند فرماتے تھے اس میں بعض لوگوں نے یہ نکتہ بھی نکالا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا میں مساکین کو اپنے اوپر بھی ترجیح دی ہے کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ کیجئے بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ کیجئے جس میں اپنے کو تابع اور مساکین کو متبوع قرار دیا گیا ہے مگر میرے جی کو یہ نکتہ نہیں لگا کیونکہ گو آپ نے دعا اس لفظ سے فرمائی ہے مگر حقیقت میں مساکین ہی کا حشر آپ کے ساتھ ہوگا وہی تابع ہوں گے اور آپ متبوع ہوں گے مساکین کی متبوعیت کا کسی درجہ میں بھی وہم نہیں باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان الفاظ سے دعا فرمانا تواضع کی بناء پر ہے اسی سنت اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب پر تھا کہ آپ کی نظر میں غربا کی قدر زیادہ تھی اس لئے آپ ان کو پلاؤ زردہ اور قورمہ کھلاتے تھے اور امراء کی

قدر نہ تھی اس لئے ان کو ساگ اور دال کھلاتے اصل وجہ تو یہ تھی مگر جب لوگوں نے آپ سے اس نرالے برتاؤ کی وجہ دریافت کی تو آپ نے اصل بات نہیں بتلائی کیونکہ اس کے اظہار میں امراء کی دل شکنی اور غرباء کے اعجاب کا خطرہ تھا آپ نے اس کی دوسری وجہ بتلائی فرمایا کہ قاعدہ ہے کل جدید لذیذ نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے اس لئے میں اپنے مہمانوں کو جدید چیز کھلاتا ہوں تا کہ ان کو لذت حاصل ہو غریبوں کے لئے تو پلاؤ زردہ قورمے جدید ہیں جو ان بیچاروں کے خواب میں بھی کبھی نہیں آتے ان کو تو یہ کھلاتا ہوں امیروں کو چٹنی' ساگ' دال کھلاتا ہوں کیونکہ ان کے حق میں یہی جدید ہیں جو عمر بھر ان کے کھانے میں نہیں آتے ان کو انہیں میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ پلاؤ زردہ تو روز کھاتے رہتے ہیں وہ ان کے لئے جدید نہیں اہل لطائف کے یہاں معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں۔ سبحان اللہ اب یہ ایک علمی مضمون ہو گیا حالانکہ ظاہر میں معمولی بات تھی۔

اہل لطائف کے یہاں معمولی سے معمولی باتیں بھی علمی مضامین بن جاتے ہیں

چنانچہ اس پر مولانا ہی کا ایک اور قصہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ مولانا کی مجلس میں احباب مجتمع تھے اور سنا ہے کہ جب ان حضرات کا اجتماع ہوا کرتا تھا تو اکثر مٹھائی کی فرمائش ہوا کرتی تھی کہ بھائی مٹھائی کھلاؤ چنانچہ اس وقت بھی اس کی فرمائش ہوئی اور راز اس میں یہ ہے کہ حضرات اہل اللہ میں ذکر کے انوار سے نشاط کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے وہ اسباب نشاط کو اہل دنیا سے زیادہ برتتے ہیں دنیا داروں کو اس قدر اسباب نشاط میسر نہیں ہوتے جو ان حضرات کو میسر ہوتے ہیں دنیا داروں کو اپنے افکار ہی سے فرصت نہیں ملتی اور اگر کبھی یہ لوگ اسباب نشاط اختیار کرتے ہیں تو بھی ایسے ہوتے ہیں جو فکر سے خالی نہیں ہوتے مثلاً گانا بجانا' شطرنج اور گنجفہ کھیلنا جو خلاف شریعت ہیں اور گناہ کو مستلزم اور ظاہر ہے کہ مسلمان کو گناہ کرتے ہوئے خدا کا خوف ضرور ہوتا ہے خواہ کسی درجہ کا خوف ہو پھر خوف کے ساتھ لذت کہاں اور حضرات اہل اللہ کے یہاں اسباب نشاط سب شریعت کے موافق ہوتے ہیں جن میں گناہ کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ادھر ان کا دل افکار دنیا سے خالی ہوتا ہے اس لئے ان کو دنیا والوں سے زیادہ نشاط میسر ہوتا ہے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ اہل اللہ کو آخرت کا تو غم ہوتا ہے پھر وہ بھی فکر سے خالی نہ ہوئے تو ان کا نشاط بھی کامل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ فکر آخرت لذیذ فکر ہے جس سے نشاط بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا (اسکی ایسی مثال ہے جیسے عاشق کو محبوب کی رضا کی فکر ہوا کرتی ہے رات دن وہ اسی طرح سوچ میں رہتا ہے کہ ایسا کونسا کام کروں جس سے محبوب راضی ہو مگر یہ فکر لذیذ ہوتا ہے جس کی لذت عشاق کے دل سے پوچھو۔ عاشق اس فکر سے کبھی خلاصی کا طالب نہیں ہوتا مجنوں کہتا ہے۔

یارب لا تسلبنی حبھا ابدا و یرحم اللہ عبدا قال امینا

(اے اللہ لیلیٰ کی محبت ہمیشہ رہے مجھ سے سلب نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو شخص آمین کہے) اور کہتا ہے۔

الھی تبت من کل المعاصی ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

(اے اللہ میں گناہوں سے توبہ کرتا ہوں لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا)

حالانکہ محبت لیلیٰ نے اس کے دل کو جلا پھونک دیا تھا مگر اس پر بھی وہ اس کے زوال کا طالب نہیں بلکہ ترقی کا خواہاں ہے اور یہ مثال بہت ہی ناقص ہے کیونکہ مجنوں کا یہ عشق خطرہ آخرت سے خالی نہ تھا اس پر اس عشق کو کیونکر قیاس کیا جا سکتا ہے جس میں لذت ہی لذت ہے خطرہ کا نام نہیں مگر سمجھانے کے لئے ایک مثال ناقص بھی کافی ہے)

حکایت اقطاب ثلاثہ

ہم نے ثقات سے سنا ہے کہ جب حاجی صاحب قدس اللہ سرہ تھانہ بھون تشریف رکھتے تھے تو صبح کو اشراق وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے حجرہ میں سے مٹھائی کی ہنڈیا نکال لیتے اور حضرت حافظ ضامن صاحب شہید قدس سرہ اور مولانا شیخ محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ یہ حضرات سب مل کر مٹھائی کھایا کرتے تھے پھر اس میں باہم چھینا جھپٹی بھی ہوتی تھی کوئی ہنڈیا اٹھا کر بھاگ جاتے' دوسرے حضرات ان کے پیچھے دوڑتے حالانکہ یہ حضرات اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت مشائخ تھے مگر ان کی معاشرت ایسی سادہ تھی جس میں تصنع و تکلف کا نام نہ تھا۔ بھلا آج کل تو مشائخ ایسا کر کے دکھلائیں تو یہ ان کی شان گھٹ جائے گی متانت و وقار کے خلاف ہو جائے گا۔

چنانچہ ہمارے یہاں ایک شخص تھا وہ کہا کرتا تھا کہ علماء و مشائخ کو متانت و وقار سے رہنا چاہئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا وقار اسی کو مبارک ہو ہم تو اس کو تکبر سمجھتے ہیں ہمیں چھچھورے پن ہی میں رہنے دو اور جو کوئی ہمیں چھچھورا کہے کہو۔

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را اور

(اگرچہ عاقلوں کے نزدیک بدنامی ہے ہم ننگ و نام کے خواہاں نہیں ہیں)

ا(رند عالم سوز راباً مصلحت بینی چہ کار کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبر کرنا چاہئے)

جس کو مریدوں اور معتقدوں کی فوج جمع کرنا ہو وہ اس متانت و وقار کو اختیار کرے اور جس

کو جلانا پھونکنا اور جلنا مرنا منظور ہو اس کو ان اسباب وقار کی ضرورت نہیں بس اس کو ضرورت ہے کہ خلاف رضا محبوب کوئی کام نہ ہو جو کام ہو شریعت کی حد کے اندر ہو اس کے بعد اس کو کسی کی فکر نہیں چاہئے کوئی اس کے ساتھ رہے یا نہ رہے اور میاں جس کو حق تعالیٰ عظمت دیتے ہیں اس کی عزت ان باتوں سے کم نہیں ہوا کرتی کہ ذرا ہنسی کی باتیں کر لیں دوستوں سے چھینا جھپٹی کر لی بھاگ دوڑ لئے' ہاں جس کی عزت موہوب نہ ہو مکسوب ہو وہ بیشک متانت و وقار ہی سے بنتی ہے تو لعنت ہے ایسی عزت پر جس کے لئے انسان کو کوشش و سعی کرنا پڑے۔

لطیفہ الفاضل للقاسم

غرض مولانا محمد قاسم صاحب سے احباب نے فرمائش کی کہ مٹھائی کھلایئے۔ مولانا نے ایک روپیہ کی مٹھائی منگوائی اور اپنے ایک مقرب خادم کو جن کا نام مولوی فاضل تھا تقسیم کے لئے فرمایا چنانچہ وہ تقسیم کر چکے تو مولانا محمد قاسم صاحب نے ایک لطیفہ فرمایا الفاضل للقاسم یہ جملہ ذو معانی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جو بچ جائے وہ تقسیم کرنے والے کا ہے (یعنی مولوی فاضل کا) یہی معنی مولانا کا نام قاسم تھا۔ اس صورت میں فاضل بمعنی لغوی ہے۔ اور قاسم بمعنی عرفی۔ اور تیسرے معنی یہ ہیں کہ فاضل (یعنی مسمی بہ فاضل قاسم کے ہیں یعنی تم میرے ہو اس صورت میں فاضل و قاسم دونوں بمعنی عرفی مستعمل ہوں گے۔ مولوی صاحب نے موقعہ اور اجازت دیکھ کر جواب دیا الفاضل للفاضل و القاسم محروم یہ جملہ بھی ذو معتین ہے اس میں اگر فاضل و قاسم دونوں بمعنی لغوی لئے جائیں تو معنی یہ ہیں کہ بچا ہوا اس شخص کا ہے جو فاضل ہے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کیونکہ صاحب فضیلت وہی تھے) اور تقسیم کرنے والا محروم ہے (یعنی مولوی فاضل محروم ہیں کیونکہ وہی تقسیم کر رہے تھے) اور یہ مثل بھی ہے القاسم محروم تو جس میں قاسم بمعنی لغوی مستعمل ہے اور یہی معنی مولوی فاضل صاحب کے مراد تھے لیکن مزاح کے طور پر ایک معنی بھی اس جملہ کے ہو سکتے ہیں جبکہ فاضل و قاسم کو بمعنی عرفی لیا جائے وہ یہ کہ بچا ہوا فاضل ہے۔ (یعنی مسمی بہ فاضل کا) اور قاسم محروم ہیں (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب اہل اللہ کے خدام مودب ہوتے ہیں بے ادب نہیں ہوتے مگر بے ادبی اسے کہتے ہیں جس سے مخدوم کو تکلیف ہو۔ چونکہ مولوی فاضل صاحب جانتے تھے کہ اس وقت حضرت مولانا کی طبیعت مزاح کو چاہ رہی ہے اس لئے انہوں نے اجازت پا کر ذو معتین جملہ استعمال کر دیا سو اس کا مضائقہ نہیں نہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی مراد ادب کے خلاف نہ تھی گو ایہام خلاف کا ہوتا ہے۔

مزاح میں حسب موقع ایہام کی اجازت ہے

سو مزاح میں ایسے ایہام کی اجازت ہے جبکہ شیخ کی طبیعت مزاح پر مائل ہو یہ نہیں کہ ہر وقت موقعہ بے موقعہ ایسے جملے استعمال کیا کرو۔ سو دیکھئے اہل لطائف کے یہاں مٹھائی میں بھی علمی

نکات ہوا کرتے ہیں ان کا کوئی کام اور کوئی قول بھی علمی مضامین سے خالی نہیں ہوتا یہ قصہ تو ضمناً یاد آ گیا تھا اصل مقصود یہ تھا کہ مولانا نے کل جدید لذیذ کے قاعدہ سے اپنے اس فعل کی وجہ بتلائی کہ میں غریبوں کو عمدہ کھانے اور امیروں کو معمولی کھانے کیوں کھلاتا ہوں۔ اس لئے کہ ہر ایک کو جدید کھانوں سے لذت حاصل ہوا کرتی ہے تو جس کے حق میں جو جدید ہوا اس کو وہی کھلانا چاہیے۔ اسی بنا پر میرا جی چاہا کہ اس جدید نعمت سے جو فی نفسہ قدیم ہے مگر مجھ پر بہیئت مخصوصہ وارد ہونے کی وجہ سے مجھے جدید معلوم ہوئی ہے اور اس سے مجھ پر ایسا خاص اثر ہوا ہے جو جدید نعمت سے ہوا کرتا ہے احباب کو بھی مطلع کردوں وہ نعمت یہ ہے کہ ایک مرتبہ جا رہا تھا یا بیٹھا ہوا تھا کہ قلب پر خود بخود یہ بات آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں اتنا ہی ہم آخرت کی طرف مسافت طے کر رہے ہیں یہاں تک کہ ایک دن موت آ جائے گی اور یہ مسافت قطع ہو جائے گی جس کے بعد ہم آخرت تک پہنچ جائیں گے یہ مضمون ایسا ظاہر ہے کہ حدیث وغیرہ سے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے الدنیا مدبرة و الاخرة مقبلة او کما قال (کنز العمال:۶۳۱۱ بلفظ آخر)

یعنی دنیا جا رہی ہے اور آخرت آ رہی ہے اس کا وہی حاصل ہے خواہ اس کو یوں تعبیر کیا جائے کہ ہم آخرت کی طرف جا رہے ہیں خواہ یوں تعبیر کیا جاوے کہ آخرت ہماری طرف آ رہی ہے۔ دوسری تعبیر مجازی ہے پہلی حقیقت جیسا اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کے لئے اقبال ثابت فرمایا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ واقع میں زمانہ خود حرکت کر رہا ہے اور ہماری حرکت فی الزمان مجازی ہے۔ البتہ مکان میں ہماری حرکت حقیقی ہے چنانچہ ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف ہم خود حرکت کرتے ہیں مکان خود ہماری طرف نہیں آتا۔ بخلاف حرکت فی الزمان کے کہ اس کے اعتبار سے ہم متحرک مجازی ہیں کیونکہ ہم کو ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ کی طرف خود جانا نہیں پڑتا بلکہ زمانہ خود بخود حرکت کر کے آتا ہے چنانچہ ہم سوتے رہتے ہیں اور زمانہ ہمارے اوپر گزرتا رہتا ہے کہ اس سے ظاہر ہو گیا کہ حرکت فی الزمان میں ہمارے قصد و اختیار کو اصلا دخل نہیں حقیقت میں زمانہ خود متحرک ہے اور ہم متحرک فی الزمان حقیقۃً نہیں۔

حرکت فی الزمان ممکن نہیں

پس زمانیت کے لئے حرکت فی الزمان مجازی ہے اور بنا بر اس تحقیق کے لطیفہ تفسیر یہ بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ قرآن میں یہ ہے اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جب ان کی میعاد (معلوم یعنی موت) آ جائے گی تو اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ موت کے وقت سے

نہ کوئی آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے اور مقصود یہ ہے کہ موت کے آنے کے بعد اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اب یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ آیت سے جو مضمون مقصود ہے یعنی موت سے محفوظ نہ ہوسکنا اس سے لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً کا دخل تو ظاہر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موت کا وقت آنے کے بعد اس سے بچ نہیں سکتے اور بچنے میں تاخر کو دخل ہوسکتا ہے مگر لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ کو اس میں کیا دخل ہے یہ جملہ کیوں بڑھایا گیا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے وقت سے پہلے کوئی بھی نہیں مرسکتا۔ سو یہ حکم تو صحیح ہے جو مقصود ہے اس میں کیا دخل کیونکہ تقدیم میں نافع ہونے کا کیا احتمال ہے وہ تو اور الٹ مضر ہوگا۔ پھر خصوص مجیی اجل (مدت آنے) کے بعد تو عقلاً بھی اس کا احتمال نہیں ہاں تاخیر کا احتمال ہوسکتا تھا اس لئے اس کی نفی بے شک مفید ہے تو یہ جملہ بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے اس کے مختلف جواب دیئے گئے ہیں مگر حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عجیب جواب دیا تھا جو میں نے کہیں منقول نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کسی نے لکھا ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا اور نہ مجھ کو اس تلاش کا اہتمام ہے ہمیں تو خدا تعالیٰ نے مشائخ ہی ایسے دیئے تھے جن کی باتوں سے ایسی تسلی ہوجاتی تھی جس سے کتب بینی سے استغناء ہوگیا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس اشکال کا مبنی تو یہی ہے کہ تقدیم نافع نہیں ہوسکتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر تقدیم ممکن ہوتی تو وہ بھی نافع ہوسکتی اس طرح موت سے بچنے کی دو صورتیں ہوسکتی تھیں ایک یہ کہ وقت موت سے مقدم وقت میں چلا جائے مثلاً جمعہ کا دن موت کے لئے مقرر ہوا وہ وقت آیا اور یہ شخص جمعرات کے دن میں داخل ہوجائے دوسرے یہ کہ وقت موت سے مؤخر وقت میں چلا جاوے مثلاً جمعہ کا دن آنے کے بعد موت کے آثار دیکھ کر سنیچر کے دن میں پہنچ جائے تو دونوں صورتوں میں موت نہ آئے گی کیونکہ وقت مقررہ تو جمعہ کا تھا اور جمعہ سے دونوں صورتوں میں فرار ہوگیا تو حق تعالیٰ نے اس طرح اشارہ کردیا ہے کہ دونوں صورتیں نافع ہوسکتی تھیں مگر چونکہ حرکت من الزمان ممکن نہیں اس لئے کسی صورت کا وقوع نہیں ہوتا خیر یہ تو لطائف ہیں جو ضمناً بیان کردیئے ورنہ اصل مقصود آیت کا صرف یہ ہے کہ موت آنے کے بعد اس سے بچنا ناممکن ہے جس کو محاورہ میں اسی طرح تعبیر کیا کرتے ہیں لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ وَلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (جیسے وما یبدئ وما یعید وہی دوسری بار بھی پیدا کرے گا) میں ابداء واعادہ کے معنی حقیقی مراد نہیں ہیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ باطل کارآمد نہیں ہوتا اس مقصود کو اس عبارت میں محاورہ کے موافق بیان کردیا گیا اسی طرح یہاں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تاخر وتقدم کی حقیقۃً نفی مراد نہیں بلکہ حاصل مراد ہے، اور محاورات میں کسی شے سے نہ بچ سکنے کو اسی طرح بیان کیا کرتے ہیں) اس تقدیر پر آیت کو حرکت زمانی فی الزمان کی بحث سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ یہ محض ایک لطیفہ ہوگا مگر قرآن میں ایسی جامعیت ہے کہ۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را ببو اصحاب معنی را

(اس کے حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تروتازہ رکھتی ہے)

قرآن میں لطائف عقلیہ کی بہت گنجائش ہے گو وہ لطائف مسوق لہا الکلام نہ ہوں اس بناء پر ایسے نکات جو قواعد شرعیہ و عربیہ کے خلاف نہ ہوں قرآن میں بیان کرنے کا مضائقہ نہیں۔ الغرض یہ بات میرے دل پر آئی کہ ہم آخرت کی طرف چل رہے ہیں اور ہر وقت ہر ساعت برابر چل رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ آخرت برابر ہماری طرف چلی آرہی ہے۔

سلوک میں ہر حال میں ترقی کرنے کی ضرورت

یہی مضمون قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ان لوگوں سے ان کا حساب نزدیک آپہنچا اور یہ غفلت میں ہیں) اور ایک تفسیر یہ بھی ہے حافظ کے اس شعر کی۔

مرا در منزل جاناں چہ امن وعیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

(مجھ کو منزل محبوب میں امن و سکون کہاں ہے جبکہ ہر وقت کوچ کی گھنٹی بجتی ہے کہ سامان سفر باندھو)

اس کی ایک تفسیر یہی کی گئی ہے کہ دنیا میں امن وعیش کہاں جبکہ ہر دم دنیا کی حالت یہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ اسباب باندھ لو اور چلنے کی تیاری کرو کیونکہ واقعی ہمارا ہر سانس جو گزر رہا ہے وہ اس کی خبر دے رہا ہے کہ تم آخرت کی طرف اتنے نزدیک ہو گئے ہو جس کی عمر بیس سال کی ہے اس نے آخرت کی طرف بیس سال کی مسافت طے کر کے قرب حاصل کر لیا جس کی زیادہ عمر ہے اس نے زیادہ قرب حاصل کر لیا ہے (سچ کہا ہے کسی نے)

تسر المرء ما ذھب اللیالی وکان ذھابھن لہ ذھاباً

(ولی خوش ہوتا ہے کہ اتنے ایام گزر گئے حالانکہ دنوں کا گزرنا اس کی عمر کا گزرنا ہے)

انسان کو اس سے خوشی ہوتی ہے کہ میرے بچہ کی عمر دس سال یا بیس سال کی ہوگئی اور یہ خبر نہیں کہ وہ اسی قدر موت سے قریب ہو گیا ہے ۱۲ جامع۔ اسی مضمون کو حافظ رحمۃ اللہ نے اس شعر میں بیان فرمایا ہے۔ اور جرس کا لفظ اس بنا پر اختیار فرمایا کہ اس زمانہ میں قافلہ کے ساتھ جرس رہنے کی عادت تھی جیسے آج کل اسٹیشن پر گھنٹی بجا کرتی ہے یہ بھی جرس کی یادگار ہے مگر آج کل بدوؤں میں جرس کی جگہ حی بولنے کا دستور ہے بس ان کو حی کہتے ہی دوسرے میت ہو جاتے ہیں کیا مجال ہے جو اس آواز کے بعد قافلہ کے چلنے میں ذرا بھی توقف ہو سکے ریل کی سیٹی کے بعد دیر

ہوسکتی ہے مگران کی حی کے بعد دیر نہیں ہوتی یہ تفسیر تو اس شعر کی اہل زہد نے کی ہے۔ اور عارفین کے نزدیک اس کی اور تفسیر ہے کہ مجھے منزل محبوب میں امن وعیش کہاں کیونکہ یہاں تو ہر وقت جرس کی فریاد ہے کہ اس منزل پر نہ ٹھہرو اسباب باندھ کے آگے چلو آگے چلے تو وہاں بھی قیام نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی تاکید ہے خلاصہ یہ کہ سلوک میں ترقی کرتے رہو کسی ایک حال پر قناعت نہ کرو ایک مقام پر ٹھہرو نہیں تو جب سالک کو ہردم ترقی کی فکر ہے تو اس کو امن وعیش کہاں اس مضمون کو دوسرے عارف نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دویدنہا کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

(عشق کا راستہ دوڑنے سے طے نہیں ہوتا جس طرح درخت انگور جتنا قطع کرو اور بڑھتا ہے)

کہ یہ راستہ دوڑنے سے قطع نہیں ہوسکتا جتنا چلتے ہیں اتنا ہی راستہ نکلتا چلا آتا ہے جیسے پہاڑوں کے بیچ میں راستہ ہوتا ہے کہ دور سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آگے دونوں پہاڑ ملے ہوئے ہیں بس اس کے بعد راستہ ختم مگر جوں جوں قریب پہنچتے ہیں راستہ نکلتا آتا ہے یہی حال طریق سلوک کا ہے کہ اس کا منتہی کسی جگہ نہیں مگر حافظ نے اس مضمون کو مبہم فرمایا ہے جس سے صاف یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ طریق سلوک کے متعلق فرمارہے ہیں اسی لئے لوگ ان کو کبابی شرابی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا کلام مختلف محامل پر محمول ہوسکتا ہے۔ مولانا رومی نے اس کو صاف صاف بیان فرمایا ہے۔

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مایست

(بھائی محبوب کی درگاہ کی انتہا نہیں ہے جس مقام پر پہنچو مت ٹھہرو آگے چلو)

اور دنیا میں تو سلوک کی انتہا ہے ہی نہیں بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی بلکہ وہاں بھی ہردم ترقی ہوتی رہے گی کیا عجب ہے کہ خلود اسی واسطے ہو کیونکہ جب راستہ بے نہایت ہے تو اس کے طے کرنے کے لئے سالک کو بھی عمر بے نہایت تک زندہ رہنا چاہئے اور جب آخرت میں بھی ترقی بند نہ ہوگی تو ممکن ہے کہ جس طرح بعض لوگ وہاں پر جنت وحور میں مشغول ہوں گے بعض ان سے بڑھ کر ہوں جو محض دیدار الٰہی میں مشغول ہوں اور ان کو تجلیات میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی ہو۔ اسی لئے بعض کا قول ہے ان فی الجنان جنۃ لیس فیھا حور ولا قصور ولکن ارنی ارنی یعنی جنتوں میں ایک جنت ایسی بھی ہے کہ جہاں نہ حور ہے نہ قصور بلکہ صرف تمنائے دیدار ہوگی اور وہاں کے رہنے والے ہر وقت یہی پکاریں گے ارنی ارنی (مجھ کو دیدار دکھایئے مجھ کو دیدار دکھایئے) مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو لوگ حور وقصور میں ہوں گے وعلی الاطلاق ان سے کم درجہ والے ہوں گے مجموعہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کو حور وقصور ہی کا مشاہدہ ہے اور ان کو اس میں جمال حق نظر نہیں آتا اور خاص خاص مدت میں تجلی حق سے مشرف

ہوتے ہیں دوسرے وہ جو صرف جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق ہیں ان کو کسی طرف التفات نہیں' تیسرے وہ جو جمال حق کے مشاہدہ میں مستغرق رہ کر اس درجہ پر پہنچ گئے کہ ہر چیز میں ان کو جمال حق کا ہی مشاہدہ ہوتا ہے اور ظاہر میں حور وقصور سے بھی متمتع ہو رہے ہیں تو یہ ارنی والے پہلے درجہ والے سے تو بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تیسرے طبقہ سے افضل نہ ہوں گے بلکہ تیسرا طبقہ ان سے بھی بڑھا ہوا ہے اور اس مذاق کے لوگ دنیا میں بھی نظر سے گزرے ہیں جن کو جمال حق کے سامنے حور وقصور کی پروانہ تھی۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ جب ہم جنت میں جائیں گے اور حوریں آویں گی" یہ بات اس طرح فرمائی گویا یہ طے شدہ بات ہے کہ جنت میں تو ضرور ہی جائیں گے یہ غلبہ رجا تھا' تو ہم حوروں سے کہیں گے کہ بی قرآن پڑھو تو یہاں بیٹھو ورنہ چلتی بنو۔ مگر اس وقت مولانا پر غلبہ حال تھا عشق کا حال غالب تھا کبھی عارف پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ ایسی باتیں کہہ جاتا ہے اور جب معرفت کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت اس کو کوئی چیز مشاہدہ حق سے مانع نہیں ہوتی جملہ اشیاء مرآۃ جمال محبوب بن جاتی ہیں اس وقت وہ یوں کہتا ہے۔

ماچو چنگیم و تو زخمہ می زنی ۔ زاری ازمانے تو زاری میکنی

(ہم مثل چنگ کے ہیں اور آپ مضراب مارتے ہیں گریہ وزاری ہماری طرف سے ہے نہ آپ زاری کرتے ہیں)

حضرت اکابر صوفیاء کی عمدہ لباس اور عمدہ غذا میں نیت

حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرات اکابر صوفیہ جیسے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی قدس سرہ عمدہ لباس اور عمدہ غذائیں اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ان کو ان چیزوں میں نعمائے جنت کے اظلال نظر آتے تھے تو عارف کو بعض دفعہ ہر چیز میں ظل جمال حق نظر آتا ہے اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ وہ حور کو بھی حاجب نہیں سمجھتا بلکہ وہ اس کے لئے ایسی بن جاتی ہے جیسے آئینہ میں صورت محبوب نظر آیا کرتی ہے اور جس وقت معرفت کا غلبہ نہ ہو بلکہ عشق کا غلبہ ہو تو وہ اس سے زیادہ کہتا ہے یعنی اپنے کو بھی حجاب سمجھتا ہے حور کو تو کیوں نہ سمجھے گا حضرت قلندر فرماتے ہیں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم ۔ گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرہ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی اس کی باتیں نہ سننے دوں)

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد ۔ تانہ بینم رخ تو روح رمیدن نہ دہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے کو آئے تو میں جب تک آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا۔

اور عارف اپنے کو بھی مرآۃ سمجھتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو وسمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ دردل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو)

چنانچہ صوفیہ نے قلب میں تمام عالم ناسوت وملکوت کو مندرج مانا ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ تم کو چمن اور سرو وسمن کی سیر کی ضرورت نہیں اپنے دل کا دروازہ کھول کر اس کی سیر کرو اس میں سب کچھ موجود ہے اور دوسرے آثار کو بھی جیسا مولانا نے ایک صوفی کا قصہ لکھا ہے۔

صوفی درباغ از بہر کشاد صوفیانہ روئے بر زانو نہاد

یعنی وہ سر جھکائے باغ میں مراقب بیٹھا تھا کسی نے کہا فَانْظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ

آثار رحمت کا مشاہدہ امر

(آثار رحمت الٰہی کی طرف دیکھو) صوفی نے جواب دیا کہ میں تو آثار رحمت ہی کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور تم آثار الاثار کو دیکھ رہے ہو۔ اس صوفی نے تفسیر میں تغیر نہیں کیا بلکہ استدلال کیا ہے کہ جب ان آثار رحمت کے مشاہدہ کا امر ہے جو ظل آثار رحمت ہیں تو اصل آثار کے مشاہدہ کا امر کیوں نہ ہوگا جو مومن کے قلب میں ہیں تو مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب کو غلبہ عشق میں یہ یاد نہ رہا کہ وہاں حور بھی حجاب نہ ہوگی یعنی مشاہدہ جمال حق سے مانع نہ ہوگی اس لئے یہ فرمایا کہ حوریں آئیں گی تو ہم ان سے کہیں گے کہ بی قرآن سناؤ تو بیٹھو ورنہ چلی جاؤ۔ ورنہ وہاں حوروں سے باتیں کرنے میں بھی وہی قرب ہوگا جو تلاوت قرآن میں حاصل ہوتا ہے۔ تو غالباً وہ جنت میں ارنی ارنی کی صدا ہوگی وہاں ایسے ہی عشاق کا مجمع ہوگا عارفین کاملین ان سے بھی اوپر کے درجہ میں ہوں گے جہاں حور وقصور سب کچھ ہوں گے اور کوئی چیز مانع مشاہدہ حق سے نہ ہوگی مگر جنت میں کسی ایسی جنت کا ہونا صرف اس صوفی کے قول سے معلوم ہو رہا ہے احادیث سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملا پس یا تو اس کو کشف پر محمول کر کے سکوت کیا جائے یا تاویل کر کے احادیث پر منطبق کرلیا جائے تاویل یہ کہ صوفی کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی جنت کوئی مستقل ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حور وقصور والی جنت میں ایک حالت ایسی ہوگی جس میں غیر کی اصلا گنجائش نہ ہوگی بلکہ اس وقت مشاہدہ جمال حق میں بجز ارنی کے اور کوئی تمنا نہ ہوگی نہ کسی کی طرف التفات ہوگا چنانچہ یہ مضمون دو حدیثوں کے مجموعہ میں ہے ایک یہ کہ جب اہل جنت جنت میں پہنچ جائیں گے تو حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے جنت والو تم اور کچھ چاہتے ہو وہ کہیں گے خداوندا آپ نے ہم کو بہت کچھ عطا فرما دیا ہے ارشاد ہوگا کہ لو ہم تم کو اس سے بھی افضل نعمت عطا کرتے ہیں اور اس کے بعد حق تعالیٰ تجلی فرمائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس نعمت سے زیادہ لذیذ اہل جنت کے

نزدیک کوئی نعمت نہ ہوگی رواہ مسلم اور جب تک اس تجلی میں مشغول رہیں گے۔ کسی نعمت کی طرف التفات نہ کریں گے رواہ ابن ماجہ۔ ان حدیثوں سے اس صوفی کے قول کی مناسب تاویل ہوسکتی ہے پس اس بناء پر جنت میں بھی ترقی مظنون ہوئی تو بعض نے ترقی مسلوک کو اس شعر حافظ کا محمل ٹھہرایا ہے اور بعض نے دنیا سے آخرت کی طرف سفر کرنے کو محمل کہا ہے اور میں اسی کو کہہ رہا تھا کہ ہم لوگ آخرت کی طرف چل رہے ہیں ہم کو ہر وقت یہ مراقبہ پیش نظر رکھنا چاہئے اور جس طرح سفر قطع کرنے میں ہر وقت اس پر نظر رہتی ہے کہ کون امر اس سفر میں معین ہے تو اس کی تحصیل کرتا ہے اور کون امر مانع ہے اس سے دور رہتا ہے اسی طرح اس سفر الی الاخرت میں بھی ہر دم ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا کریں کہ یہ آخرت کی منزل میں مفید ہوگا یا مضراب بعض امور تو معین آخرت ہوں گے جیسے ذکر اللہ۔ امر بالمعروف تلاوت قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہا یہ تو معین ہیں مقصود میں یعنی حصول نجات میں اور یہی منزل پر پہنچنا اور بعض امور مانع عن الوصول ہیں جیسے معاصی ظاہرہ وباطنہ اور بعض امور ظاہر میں نہ معین ہیں نہ مانع جیسے امور مباحہ کہ ان کے کرنے میں ثواب نہیں الا بنیۃ مخصوصۃ (مگر نیت مخصوصہ سے) اور ترک میں گناہ نہیں اس کو عام لوگ مستقل قسم ثالث سمجھتے ہیں مگر حقیقت میں اثر کے اعتبار سے یہ تیسری قسم نہیں بلکہ ان دونوں قسموں میں سے کسی ایک قسم کی طرف راجع ہے کیونکہ مباح بھی اثر محمود واثر مذموم سے خالی نہیں ہوتا فعل مباح کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے یا محمود یا مذموم گو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے نہ محمود ہے نہ مذموم مگر ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا اثر بھی غیر محمود وغیر مذموم ہی ہے بلکہ اثر یا محمود ہوتا ہے یا مذموم۔ پس اگر اس کا اثر محمود ہے تو وہ قسم اول اعمال مفید آخرت میں داخل ہے اور اگر اثر مذموم ہے تو قسم دوم مضرت آخرت میں داخل ہے۔ اس تقریر کے بعد ایک حدیث کا اشکال رفع ہوگیا۔ حدیث یہ ہے۔

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه (کنز العمال ۳:۸۲۹۱)

(مسلمان کے اسلام کی خوبی میں سے یہ بات ہے کہ وہ لایعنی اور فضول کاموں کو ترک کردے ۱۲) اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ لایعنی سے امور محرمہ تو مراد ہو نہیں سکتے کیونکہ ان کا ترک تو واجب و لازم ہے اور سیاق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وجوب ترک مراد نہیں بلکہ محض ترغیب ترک دی جا رہی ہے تو یقیناً لایعنی سے مراد امور مباحہ ہیں تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ امور لایعنی مانع عن الوصول اور مضر آخرت نہیں ہیں تو ان کے ترک کی ضرورت کیا ہے تقریر گذشتہ سے معلوم ہوگیا کہ امور مباحہ کو لایعنی کہنا یہ محض درجہ ذات کے اعتبار سے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی درجہ کے اعتبار سے ان پر لایعنی کا اطلاق فرمایا ہے ورنہ آثار کے اعتبار سے یہ امور ملابضر ہیں یعنی

مضر اور اسی درجہ آثار کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ترک کا امر فرمارہے ہیں اور اس کو کمال اسلام کی خوبی بتلارہے ہیں پس اگر کوئی مباح مفید آخرت ہو تو اس وقت وہ لایعنی نہ ہوگا۔

مزاح کا اصل مقصد

مثلاً مزاح کرنا بچوں سے یا دوستوں سے یہ فی نفسہ مباح ہے جس سے نہ ثواب نہ گناہ مگر اثر کے اعتبار سے یا مفید آخرت ہے یا مضر اگر مفید ہوا تو لایعنی نہ رہے گا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مزاح فرمایا ہے حالانکہ یقیناً آپ امور لایعنی سے بری تھے اس کا معیار یہ ہے کہ اپنی نیت کو دیکھو کہ مزاح سے مقصود کیا ہے۔ ہمارے یہاں تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا ہم لوگ اکثر کام بدون کسی خاص ارادہ اور نیت کے کرتے ہیں محض عادت کی بنا پر اکثر کام ہوتے ہیں اور اگر کسی مقصود کا ارادہ بھی ہوتا ہے تو وہ نفس کی کوئی غرض ہوتی ہے بلکہ ہم کیا کہیں ہماری تو نماز بھی نفس ہی کے لئے ہے اس میں بھی کوئی نیت خالص آخرت کے لئے نہیں ہوتی اسی لئے نماز پڑھ کر ہمیں تو ڈر لگتا ہے کہ یہ کس منہ سے کہیں کہ اے اللہ قبول فرمالے بلکہ یوں دعا کرتے ہیں کہ خدا معاف کرے تو ہمارے یہاں مزاح میں تو کیا نیت ہوتی امور واجبہ و مفروضہ میں بھی کوئی خاص نیت نہیں ہوتی بلکہ اکثر افعال عادت کی وجہ سے خود بخود صادر ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی نیت ہوتی بھی ہے تو وہ نفس کی غرض سے خالی نہیں ہوتی خیر یہ تو ہمارا حال ہے اس کو تو رہنے دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو یقیناً کچھ مصالح ضرور ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں تو مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا تھا پہنچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خداداد ہیبت کس قدر مانع ہو سکتی تھی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا بس یہ حال ہو جاتا ہے۔

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جاتا ہے　　تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں۔

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دبدبہ

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جارہے تھے کہ دفعتہً آپ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ پیر بھائی تھے جن میں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات معتقد تو تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان وشوکت کے ساتھ مدینہ منورہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہو کر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے۔

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم تا من اسپ ودرخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ اورا قصر نیست مر عمرؓ را قصر جان روشنے ست

(کہنے لگا اے لوگو! خلیفہ کا محل کہاں ہے تاکہ میں وہاں حاضر ہوں لوگوں نے کہا کہ ان کا کوئی محل ظاہری نہیں ہے ان کا محل ان کا قلب روشن ہے)۔

(اس موقع پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہو گیا مگر بہت ضبط سے کام لیا ۱۲) لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس ان کا تو دل ہی قصر وایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اس کے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کر لو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں چلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس آخر وہ جنگل کی طرف چلا۔ جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت ورعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے کہ جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس

نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تن تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جونہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا آج کیا بات ہے کہ اس بے سرو سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزا پیدا ہو گیا بیشک۔

ہیبت حق است و ایں از خلق نیست ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

(یہ ہیبت حقیقت میں حق تعالیٰ کی ہوتی ہے اس مخلوق یا اس گدڑی والے کی نہیں ہوتی)

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ بالاخر سفیر روم کو ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ دیر تک کھڑا کانپتا رہا کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک پردیسی اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلی دی۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دبدبہ و ہیبت

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہو گئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق ہے۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا یہ تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت تھی ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ کا رعب و دبدبہ

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا

سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے' حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے تھے اور ڈرتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہ کی تیزی

اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آ جاتا ہے اس لئے ان کے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب تھے یا آج کل بھی ایک بدنام ہے (ہائے ہزار نام فدائے تو وبدنامی تو۔ تجھ پر اور تیری بدنامی پر ہزار نام فدا ہیں ۱۲ جامع) مگر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہو جاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیاء کرام اپنے اصحاب و احباب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت ومحبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے اسی لئے اہل آداب نے لکھا ہے کہ مہمان کے سامنے اپنے ملازمین پر بھی غصہ نہ ہو کیونکہ اس سے مہمان کو وحشت ہوگی اور وہ گھبرائے گا کہ نہ معلوم اس شخص کا میرے ساتھ کیسا معاملہ ہو اور شاید اس وحشت کی وجہ سے وہ کھانا بھی کم کھائے کہ نہ معلوم یہ کیسے مزاج کے ہوں گے ان کو زیادہ کھانا کہیں ناگوار نہ ہو۔ واقعی یہ ہیں آداب اور ہم نے تو اخلاق کا محض نام سن لیا ہے مگر بھائی کیا کریں کھٹے ہیں یا میٹھے سب اسی باغ کے پودے ہیں جب کوئی باغ لگاتا ہے تو سارے درخت میٹھے ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کوئی میٹھا ہوتا ہے کوئی کھٹا اور اس میں بھی حکمت ہے وہ یہ کہ سب میٹھے ہی پھل ہوں تو ان کے کھانے سے تخمہ اور ہیضہ کا اندیشہ ہوتا ہے جب میٹھے پھلوں کے ساتھ کوئی کھٹا بھی مل جائے تو سب ہضم ہوتے ہیں اسی لئے اکثر لوگ دیسی آموں کو پسند کرتے ہیں کہ ان میں کھٹے میٹھے ملے ہوئے ہوتے ہیں تو یہ ساتھ ہضم ہوتے رہتے ہیں اور مالدہ آم سب میٹھے ہوتے ہیں ان کو زیادہ کھالو تو ہیضہ ہو جائے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے باطنی باغ میں بھی کوئی درخت میٹھا رکھا ہے کوئی کھٹا باقی ہیں سب اسی باغ کے درخت اس لئے اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب حالانکہ بہت بڑے ولی و عارف تھے مگر فطرتی طور پر تیز مزاج تھے ان کی تیزی تکبر یا بناوٹ سے نہ تھی بلکہ طبعی تھی اور مشاہدہ سے یہ بات خود معلوم ہو جاتی ہے کہ کس میں طبعی تیزی ہے اور کون تکبر کی وجہ سے تیزی کرتا ہے چنانچہ شاہ صاحب کے یہاں ایک مرتبہ ایک شخص آیا اس نے مسجد میں آ کر اپنا سامان رکھا۔ مولانا نے دیکھتے ہی فرمایا ارے نکالو وہ تھا کوئی دلیر۔ کہنے لگا دیکھوں تو وہ کون ہے جو مجھے نکالے گا۔ اب کسی خادم کی ہمت نہ ہوئی جو اسے نکالے اور مولانا بار بار

فرمارہے ہیں کہ ارے نکالو اس کو مگر کوئی نہ اٹھا آخر کو مولانا خود اٹھے اور اس کا سامان اٹھا کر مسجد سے باہر پھینک دیا اس نے اتنا ادب کیا کہ مولانا کو اسباب اٹھاتے ہوئے کچھ نہیں کہا جب وہ اسباب لے کر چلے خود بھی ساتھ ہولیا جب مولانا نے اسباب کو مسجد سے باہر رکھا اس نے اٹھا کر پھر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد میں اپنی جگہ لا رکھا۔ مولانا کو پھر غصہ آیا اور دوسری مرتبہ آپ نے پھر اسباب اٹھا کر مسجد سے باہر پھینک دیا۔ مسافر نے اٹھا کر پھر اندر رکھ لیا چند مرتبہ ایسا ہی ہوا آخر کو مولانا تھک گئے تو اپنی جگہ پر آ بیٹھے اور وہ مسافر اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا رہا۔ ان حضرات کے غصہ کی ادا ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا منشا تکبر نہیں اگر مولانا کے غصہ کا منشا تکبر ہوتا تو خود اٹھ کر اس کا اسباب لا د کر باہر نہ نکالتے متکبرین ایسا کبھی نہیں کر سکتے وہ جو کچھ کرتے ہیں خدام کے واسطے سے کرتے ہیں خود ایسا کام کبھی نہیں کرتے مگر مولانا نے اس کی پروا بھی نہ کی جب کوئی خادم نہ اٹھا تو خود اسے نکالنے چلے یہ تو ہولیا اور لیجئے کھانے کا وقت آیا تو مولانا نے اس مسافر کے لئے گھر سے کھانا بھجوایا اب اس نے نخرے شروع کئے کہ جاؤ میں نہیں کھاتا یہ روٹیوں ہی کی وجہ سے مسافروں کو دھکے دیئے جاتے ہیں کیونکہ گھر سے کھلانا پڑتا ہے تو میں ایسی روٹیوں سے باز آیا خادم نے جا کر اطلاع کی کہ حضرت مہمان نے کھانا نہیں کھایا اور یوں یوں کہتا ہے کوئی متکبر ہوتا تو یہ جواب سن کر خاموش بیٹھ جاتا مگر مولانا کی طبیعت نے مسافر کا بھوکا رہنا گوارا نہ کیا خود کھانا لے کر آئے اور اس کی خوشامد کی کہ بھائی تو میرے کہنے کا برا نہ مان میرے یہاں اکثر لوگ دنیا کے قصے لاتے ہیں کوئی مقدمہ کی باتیں لاتا ہے کوئی اولاد کے لئے دعا کراتا ہے دین کے طالب کم آتے ہیں اس لئے مجھے غصہ آ جاتا ہے غرض اس کو کھانا کھلایا مگر یاد رہے کہ یہ معاملہ لطف کا ان لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو صرف مہمان بن کر آئیں کہ ان کی خوشامد کر کے کھانا کھلایا جاتا ہے اور جو شخص مہمان بن کر نہ آئے بلکہ اپنی اصلاح کے لئے آئے اس کا یہ حق نہیں کہ شیخ اس کی خوشامد کر کے کھانا کھلائے بلکہ اس کے ذمہ ہے کہ اپنے کھانے کا خود انتظام کرے وہ اگر نخرے کرے گا تو دماغ کی اصلاح کی جائے گی اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تو تحصیلدار کے گھر مہمان ہو کر جائے اس کو تو تحصیلدار خاطر مدارات کے ساتھ کھانا کھلائے گا اور ایک شخص تحصیلدار کے یہاں مقدمہ لے کر جائے اس کا یہ حق نہیں ہے کہ تحصیل دار سے کھانا کھائے بلکہ اس کے ساتھ ضابطہ کا برتاؤ ہوگا اسے اپنے کھانے کا خود انتظام کرنا پڑے گا اور اوقات مخصوصہ پر عدالت کے اندر گفتگو کا موقعہ ملے گا ہر وقت بات چیت کرنے کی بھی اسے اجازت نہ ہوگی نہ اس کے ساتھ حاکم مزاح و دل لگی کرے گا کیونکہ وہ مہمان نہیں ہے بلکہ صاحب غرض ہے آج کل یہ بھی ایک

وجہ ہے بزرگوں کو بدنام کرنے کی کہ وہ مہمان اور طالب سب کے ساتھ یکساں برتاؤ چاہتے ہیں حالانکہ مہمان کا اور حق ہے طالب کا اور حق ہے۔ مہمان تو اگر فاسق بھی ہو بلکہ کافر بھی ہو تب بھی اس کے ساتھ خاطر مدارات کا معاملہ کیا جائے گا اور طالب کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوگا کیونکہ طالب سے مہمانوں کی طرح معاملہ کرنے سے اس کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

بزرگوں کے مزاح میں حکمت

غرض بزرگوں نے جو گاہے اپنے متعلقین سے مزاح کیا ہے اس کی حکمت یہ تھی کہ اس سے طالب کا دل کھل جاتا ہے تو وہ استفادہ بخوبی کرسکتا ہے مگر یہ حکمت ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جن کے ذمہ تبلیغ و اصلاح کا کام ہے اور بعضے ایسے بھی ہیں جو آزاد طبع ہیں وہ تبلیغ و ارشاد سے گھبراتے ہیں ان کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

احمد تو عاشقی مشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام عاشق رہے سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

وہ حضرات اس قاعدہ کے پابند نہیں ان کے مزاح میں ایک دوسری حکمت ہوتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع کو خاک میں ملانا چاہتے ہیں اس لئے مزاح و دل لگی کرتے رہتے ہیں تاکہ چھچھوراپن ظاہر ہو ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ کوئی ہم کو چھچھورا سمجھ کر چھوڑ دے گا معتقد نہ رہے گا ان کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر کرنی چاہئے)

مگر یہ رند وضع سوز ہوتے ہیں شرح سوز نہیں ہوتے وضع و ناموس کو جلا پھونک دیتے ہیں مگر شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور جو وضع سوز ہونے کے ساتھ شروع سوز بھی ہو وہ یا تو فاسق ہے یا مجذوب ہے ان دونوں کے مزاح کی حکمت بیان کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں فاسق تو ولی ہی نہیں اور مجذوب گو ولی ہوتا ہے مگر اس کے افعال میں حکمت کا قصد نہیں ہوتا گو واقع میں حکمت ہوا کرے۔ سو ان دونوں سے یہاں بحث نہیں یہاں گفتگو ان بزرگوں کے مزاح میں ہے جو اپنے افعال میں حکمت کا قصد کرتے ہیں تو ان میں جو آزاد ہوتے ہیں میں نے ان کے مزاح کی حکمت جتلادی کہ وہ اپنی وضع کو جلانے کے لئے اور ناموس کو خاک میں ملانے کے لئے مزاح کیا کرتے ہیں وہ ان مصالح پر نظر نہیں کیا کرتے جن پر اہل سلسلہ کو نظر ہوتی ہے کار ملک است الخ میں اہل سلسلہ ہی مراد ہیں کہ وہ انتظام سلطنت کرتے ہیں

ان کو مصالح کی رعایت کرنی پڑتی ہے سو وہ کریں رند کو اس کی ضرورت نہیں وہ تو ہر وقت اپنے مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور بعض دفعہ یہ صفت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ یوں کہنے لگتا ہے۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　　پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموختن

(روشن ہونا اور جلنا اور کپڑے پھاڑنا پروانہ ہم سے شمع نے ہم سے گل نے ہم سے سیکھا ہے) اور یوں کہتا ہے۔

جوش عشق است کاندر مے فتاد　　　آتش عشق است کاندر نے فتاد

(جوش عشق ہے جو شراب میں ہے اور آتش عشق ہے جو بانسری میں ہے)

اس وقت جوش میں کوئی اس کے برابر نہیں ہوتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ میرے ہی عشق کا اثر پروانہ اور شمع میں ہے اور میرے ہی جوش کا ظہور مے اور نے میں ہے اور یہ بات محض مبالغہ کے طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے بھی موافق ہے۔

انسان عالم اکبر ہے

کیونکہ انسان عالم اکبر ہے اور عالم ناسوت عالم اصغر ہے اور عالم اصغر عالم اکبر سے مستفید ہے اس لئے جن چیزوں کا عالم ظاہر میں ظہور ہو رہا ہے سب قلب عارف کے آثار ہیں اگر اس طرح نہ سمجھو تو یوں سمجھو کہ خلق عالم سے انسان مقصود ہے تو انسان سب کی اصل ہے اور یہ عالم انسان کی فرع ہے اس لئے عارف کا یہ کہنا درست ہے کہ میرے ہی سے تمام چیزوں نے جوش و مستی کا سبق سیکھا ہے یعنی میری ہی وجہ سے ان کا ظہور ہوا ہے جس کے بعد یہ صفات ان میں پیدا ہوئیں اگر میں نہ ہوتا تو کسی چیز کا ظہور نہ ہوتا نہ کسی میں جوش و مستی کا اثر ہوتا یہاں پر کسی کو لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس (بالیقین آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کی پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے) سے شبہ نہ پیدا ہو کہ اس آیت میں سموات وارض کی خلقت کو انسان کی پیدائش سے بڑا بتلایا گیا ہے تو پھر انسان کو عالم اکبر اور عالم ناسوت کو عالم اصغر کہنا کیونکر صحیح ہوگا اور یہ انسان سے مستفید یا اس کی فرع کیونکر ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس جگہ اکبریت مادہ کے اعتبار سے بتلائی گئی ہے یہاں معنی کے اعتبار سے اکبریت مقصود نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے معاد کو ثابت فرمایا ہے جس پر کفار کو اشکال تھا کہ انسان مر گل کر دوبارہ کیسے زندہ ہوگا اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں کو اور زمین وغیرہ کو پیدا کر دیا تو ایک مشت خاک انسان کا دوبارہ زندہ کر دینا اس پر کیا دشوار ہے کفار کو اعادہ جسم ہی پر اشکال تھا اس کو ایسی چیزوں کی خلقت سے دفع کیا گیا جو مادہ

میں انسان سے بڑھی ہوئی ہیں سو اس درجہ میں عالم ناسوت کے لئے اکبریت مسلم ہے۔ گفتگو معنی اور مقصودیت میں ہے اور اس میں انسان سب سے اشرف و اکمل ہے۔ چنانچہ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا (بھلا کیا تمہارا پیدا کرنا سخت ہے یا آسمان کا اللہ نے اس کو بنایا اس کی سقف کو بلند کیا اور اسکو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا) یہاں اشدیت محض خلقت ظاہری میں مراد ہے اور مقصودیت کے اعتبار سے دوسری جگہ ارشاد ہے هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان) جس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور ارشاد ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ (اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا تمہارے لئے) اور وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ. اور تمہارے نفع کے واسطے سورج اور چاند کو مسخر بنایا جو ہمیشہ چلنے ہی میں رہتے ہیں) اور سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (اور تمہارے نفع کے واسطے رات دن کو مسخر بنایا اور جو چیزیں تم نے مانگیں تم کو ہر چیز دی) اس کے علاوہ بہت سی آیات میں بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کو انسان کے لئے کسی نہ کسی کام میں لگا رکھا ہے پس اس درجہ میں انسان کا عالم اکبر ہونا نصوص کے خلاف نہیں (باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انسان اگر سب کی اصل ہے تو جسامت میں چھوٹا کیوں ہے کیونکہ اصل کے لئے جسامت میں فرع کے برابر یا بڑا ہونا لازم نہیں۔ دیکھو درخت کی اصل ایک گٹھلی ہے جو جسامت میں درخت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی مگر سارا درخت اسی ذرا سی گٹھلی کی فرع ہے ۱۲ جامع) پس اب کسی رند کے اس قول پر کچھ اشکال نہیں۔

افروختن و سوختن و جامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(روشن ہونا شمع نے اور جلنا پروانہ نے اور کپڑے پھاڑنا گل نے ہم سے سیکھا ہے)

ایک رند کی حکایت

اس پر مجھے ایک ایسے ہی رند کی حکایت یاد آئی وہ حج کو جا رہے تھے اور حالت یہ تھی کہ ایک ڈھپلی ہاتھ میں ناچتے کودتے ڈھپلی بجاتے جا رہے تھے۔ لوگوں نے کہا میاں تم حج کو جا رہے ہو

یہ کیا حرکت ہے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں تم کون ہو واقعی حق تعالیٰ سے اس کے بندوں کو ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس جواب کے بعد کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ہم جانیں اور ہمارے اللہ میاں۔ غرض وہ اس طرح حج کو جارہے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور مطوف کے ساتھ طواف کے لئے چلے جس وقت دروازہ حرم پر پہنچے تو مطوف نے کہا دیکھو وہ بیت اللہ ہے (بیت اللہ دروازہ کے باہر ہی سے نظر آجاتا ہے) پس بیت اللہ پر نظر کا پڑنا تھا کہ اس عاشق کو وجد طاری ہوا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور زبان پر یہ شعر تھا۔

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(اب تو محبوب کے در پر پہنچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کردو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

بس یہ شعر پڑھتے پڑھتے دروازہ ہی پر گر پڑے اور جان دیدی ہائے وصل کی بھی تاب نہ ہوئی بس صورت دیکھتے ہی ختم ہو گیا' عاشق کی بھی عجیب حالت ہوتی ہے نہ اسے وصل میں چین ہے نہ فصل میں قرار ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے۔

من شمع جاں گدازم و تو صبح دل کشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چورخ نمائی
نزدیک آں چنانم دور آں چناں کہ گفتم نے تاب وصل دارم و نے طاقت جدائی

(میں شمع ہوں تو صبح ہے اگر تجھے نہ دیکھوں تو تب بھی موت ہے کہ لوگ بجھا دیں گے اگر دیکھوں تب بھی ہلاکت ہے کہ جل جاوں گا اس محبوب کی نزدیکی ایسی ہے اور جدائی ایسی ہے جیسا کہ اوپر شعر میں ذکر کیا نہ جدائی کی طاقت نہ وصل کی تاب)

وصل کی تاب نہ تھی جب ہی تو دیکھتے ہی ختم ہو گیا اے صاحب! اگر وہ بیت کے پاس ہی پہنچ جاتا تو کیا ہوتا وہ بیت سے پہلے رب البیت سے جاملا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ جس کو ہم رند لا ابالی سمجھ رہے تھے یہ عاشق عارف تھا پس اپنی حالت چھپانے کے لئے اس نے یہ صورت بنا رکھی تھی تمام مصالح کو خاک میں ملا دیا تھا اس کی پرواہ نہ تھی کہ کوئی کیا کہے گا مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اوپر کا مصالحہ تو جلانے سے خاک ہو گیا اور یہ گرم مصالحہ جو اندر اندر پھونکتا ہے باقی رہ گیا اس نے خود اسی کو جلا پھونک دیا۔ تو ان رندوں کے مزاح و دل لگی میں یہ مصلحت ہوتی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے تمام مصالح کو مسالہ کی طرح پیس دیتے ہیں اور اپنی وضع و ناموس کو مٹا کر اپنی باطنی حالت کو پردہ میں رکھتے ہیں مگر اس غرض کے لئے ناجائز امور کا ارتکاب جائز نہیں ورنہ پھر وہ وضع سوز ہی نہ رہے گا شرع سوز بھی ہو جائے گا جس کے افعال قابل اعتبار نہیں نہ ان میں کوئی حکمت ہے تو اب ان حکمتوں پر نظر کر کے مزاح بھی لایعنی نہ رہا بلکہ مایعنی میں داخل ہو گیا اسی طرح تمام مباحات کو دیکھ لو

کہ وہ اپنے اثر کے اعتبار سے یا مفید ہوتے ہیں یا مضر تو اب ایسی کوئی قسم نہ رہی جو نہ مفید ہو نہ مضر پس مباحات کو تیسری قسم نہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے یا محمود یا مذموم تو اب دو ہی قسم کے افعال ہوئے ایک وہ جو معین آخرت ہیں دوسرے، وہ جو مضر آخرت ہیں۔

ایک مراقبہ کا القاء

اس کے بعد پھر ایک مراقبہ کی تعلیم کی گئی القاء کے طور پر تو جی چاہا کہ اپنے بھائیوں کو بھی بتلا دیا جائے اس وقت جو حالت میرے اوپر غالب تھی ویسی تو اب نہیں رہی مگر خدا تعالیٰ کی ناشکری کیوں کروں بحمد اللہ اب بھی بہت بڑا اثر قلب پر ہے وہ مراقبہ یہ ہے کہ ہر کام کے وقت یہ سوچ لیا جائے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں (یا کرنے والے ہیں) یہ آخرت میں مضر ہے یا مفید ہے۔ اس مراقبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں بلکہ یہ ایسا مراقبہ ہے کہ ہر وقت اس کا وقت ہے، چلتے پھرتے بھی اس کو سوچتے رہو اور کھاتے پیتے بھی اور باتیں کرتے ہوئے بھی اور رنج و غصہ میں بھی کوئی حرکت اور کوئی سکون اس مراقبہ سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ اس کے بعد آپ سے ان شاء اللہ تعالیٰ اول تو گناہ صادر ہی نہ ہوگا اور اگر بالفرض صادر ہوا بھی تو آپ اس وقت بیدار گناہ گار ہوں گے سرکش و غافل گناہ گار نہ ہوں گے اور یہ بھی ایک بڑی دولت ہے کہ انسان کو گناہ کے وقت متنبہ ہو جائے کہ میں نے یہ کام گناہ کا کیا اس سے دل پر ایک ایسا چرکہ لگتا ہے جس کے بعد معاً توبہ و استغفار کو دل چاہتا ہے۔ شاید یہاں کوئی ذہین بیٹھے ہوں اور وہ اپنے دل میں یوں کہتے ہوں کہ یہ تو اور بھی برا ہوا کہ جان کر گناہ کیا تو اس وقت یہ شخص ویل للجاھل مرۃ وللعالم سبعین مرۃ (جاہل کے لئے ایک خرابی جاننے والے کیلئے ستر خرابیاں) کا مصداق ہو جائے گا تو بات یہ ہے کہ جان کر گناہ کرنا یہ کس نے کہا ہے کہ مطلقاً اشد ہے بلکہ علم کے ساتھ وہ گناہ اشد ہے جس کے ساتھ جرات بھی ہو ورنہ اگر جرات نہ ہو تو جان کر گناہ کرنا غفلت کے گناہ سے اشد نہیں اور اس مراقبہ کے ساتھ جرات تو کبھی ہو سکتی ہی نہیں تو اب یہ شخص بیدار گناہ گار ہوگا کہ معصیت کو معصیت جانے گا غافل نہ ہوگا کہ یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں نے کوئی گناہ کا بھی کام کیا ہے یا نہیں اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معصیت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہوگی اور حضرت خشیت اور معصیت اگر دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو گو وہ خشیت کامل نہ ہوگی مگر اس کے ساتھ معصیت بھی کامل نہ رہے گی یہ خشیت ایسی چیز ہے کہ معصیت اس کے ساتھ کامل نہیں ہو سکتی اگر کامل خشیت ہے جب تو گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا اور اگر ناقص خشیت ہے تو اس کی وجہ سے معصیت بھی ناقص ہو جاتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ملا دو تو گو اس سے ٹھنڈا نہ ہو جائے گا مگر ویسا گرم

بھی نہ رہے گا تو خشیت کے ساتھ معصیت کی یہ کیفیت ہوگی کہ اس وقت آپ اگر غیبت کریں گے تو دل کو حظ حاصل نہ ہوگا زبان سے غیبت کریں گے اور دل میں جوتے پڑتے ہوں گے کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا تو یہ تھوڑا نفع ہے اس مراقبہ کا اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ اس مراقبہ کے بعد آپ سے گناہ کا صدور ہی نہ ہوگا بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر صدور ہوگا تو خشیت کے ساتھ ہوگا اور اس مضمون کے اظہار میں یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر کسی کو تجربہ ہوا ہو کہ خشیت کے ساتھ بھی گناہ ہو جاتا ہے اور وہ اس وقت مولویوں کو جھوٹا کہتا ہو کہ یہ مولوی بھی بے پر کی باتیں اڑایا کرتے ہیں کہ خشیت وخوف دل میں پیدا ہو جانے سے گناہ نہیں ہوتے حالانکہ ہم نے تو آیات و عید و احادیث عقاب کا بہت مطالعہ کیا اور ان سے خوف بھی پیدا ہوا مگر پھر بھی گناہ موقوف نہیں ہوتے تو وہ اس مضمون کو سن کر مولویوں کو جھوٹا نہ کہیں گے کیونکہ جیسا ان کو خشیت کے ساتھ گناہ صادر ہونے کا تجربہ ہوا ہوگا اس کے ساتھ یہ بھی تجربہ ہوا ہوگا کہ گناہ کے وقت دل میں ایک خلش بھی ساتھ ساتھ موجود تھی جس نے معصیت کو بھی ضعیف بنا کر گناہ بے لذت میں داخل کر دیا تھا تو صاحب جیسی خشیت آپ کو حاصل ہوئی تھی ویسا ہی اس نے اثر بھی کیا وہ بیکار تو نہ ہوئی پھر اب مولویوں کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں بات یہ ہے کہ خشیت کے تین درجے ہیں۔

خشیت اعتقادی

ایک خشیت اعتقادی یہ تو ہر مسلمان کو حاصل ہے کیونکہ ایمان نام ہی ہے خوف ورجا کا پس اس درجہ سے تو کوئی مسلمان خالی نہیں مگر اعتقادی خشیت گناہوں سے روکنے میں کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ استحضار خشیت کی بھی ضرورت ہے یہ دوسری قسم ہے پھر استحضار کے دو درجے ہیں ایک استحضار کامل دوسرے استحضار ناقص استحضار کامل کے ساتھ معصیت ہرگز نہیں ہو سکتی مگر ہم لوگوں کو استحضار کامل حاصل نہیں اور اسی کی ضرورت ہے لیکن استحضار کامل ایک دو دن میں حاصل نہیں ہوا کرتا اس کے لئے مشق کی ضرورت ہے پہلے آپ استحضار ناقص ہی کیجئے اس سے گو معصیت کا انعدام نہ ہوگا مگر تقلید ضرور ہو جائے گی اور وہی کیفیت ہوگی جو میں نے ابھی بیان کی ہے کہ خشیت ناقصہ کے ساتھ معصیت بھی ناقص ہی ہوگی اور معاً توبہ واستغفار کی توفیق ہوگی وہ حالت نہ رہے گی جو پہلے تھی کہ گناہ کر کے دل پر جوں بھی نہ رینگتی تھی پھر اسی حالت پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ استحضار ناقص سے استحضار کامل کی طرف ترقی کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ شدہ شدہ آپ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ میں نے اس لئے کہا شاید کوئی شخص اس مراقبہ پر عمل کرے اور ترک معاصی میں پوری کامیابی نہ ہو تو مایوس ہو جائے۔ تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ان حضرات کو سمجھ لینا چاہئے کہ دو چار

روز کی مشق سے استاد مشاق نہیں بنا کرتے بلکہ استاد بننے کے لئے عرصہ تک مشق کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے خوشنویسی حاصل ہو جاتی ہے چند روز کی کوشش سے مگر استاد بننے کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے اسی طرح قرآن حفظ کر لینا تو چند روز کا کام ہے مگر اس کا قابو میں آجانا ایک مدت چاہتا ہے پھر ان کاموں میں کمال حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے سب کو معلوم ہے کہ کام میں لگا رہنا اور مشق کا جاری رکھنا ہی اس کا طریقہ ہے پس یہی طریقہ عمل اس مراقبہ میں بھی جاری رکھئے چند روز میں کامیابی نہ ہو تو گھبراؤ نہیں ناامید نہ ہونا امیدی را خدا گردن زدہ است (ناامیدی کی خدا نے گردن ماردی ہے) مولانا فرماتے ہیں۔

کوئے نومیدی مرو کا میدہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امیدیں رکھو) اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اندریں رہ میتراش و می خراش　　تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری وقت ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو) یعنی یہ ایک دن کا کام نہیں ساری عمر کا کام ہے لگے رہو کوشش کرتے رہو ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہو گے اور یہ حال ہو گا۔

تا دمے آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہو گی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائیگی) اور یہ حال ہو گا۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور　　کلبہ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

(یوسف گم شدہ کنعان میں واپس آجائے غم مت کھا غموں کا تنگ و تاریک گھر کسی دن گلستاں ہو جائے گا غم مت کر)

ان شاء اللہ ایک دن یہ غم ختم ہو جاوے گا اور کامیابی سے مسرور ہو گا (رزقنا اللہ تعالیٰ و ایاکم الوصول الیہ امین جامع) (اللہ تعالیٰ ہم اور تم کو وصول الی اللہ نصیب فرمائیں) میں دعویٰ سے نہیں کہتا خدا کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ اس مراقبہ کو جاری رکھو ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن ضرور کامیاب ہو گے (وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) جولوگ ہماری راہ میں ہمیشہ مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو اپنے راستے ضرور دکھادیں گے وعدہ الٰہی ہے ۱۲ جامع) پس ہر کام پر اس حیثیت سے نظر کرو کہ یہ معین فی المقصود ہے یا مضر پھر جو معین ہو اس کو اختیار کرو اور جو مضر ہو اس کو ترک کر دو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ جو بات میرے دل میں ہے وہ سامعین کے دل میں ڈال دوں مگر کیونکر ڈال دوں یہ میرے

اختیار سے باہر ہے اور الفاظ اس کے لئے کافی نہیں اور یہ ان لوگوں کے اعتبار سے کہتا ہوں جن کے دل میں یہ وارد پہلے سے نہ ہو اور جو پہلے سے اس کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اشارہ ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر جو بات دل میں نہ پہنچائی جا سکے کم از کم اس کو کانوں میں تو ڈال دیا جاوے شاید کسی وقت ذوق حاصل ہو تو یہ کان میں پڑی ہوئی بات کام آئے گی اور چونکہ طویل مضمون یاد نہیں رہا کرتا اس لئے میں خلاصہ بیان کرتا ہوں کہ بس ہر کام سے پہلے اتنا سوچ لیا کرو کہ یہ نجات آخرت میں معین ہے یا نجات سے مانع ہے اور اس کا استحضار ہر کام میں رکھو خواہ مباح ہو یا فرض و واجب یا اور کچھ۔

وعظ الاسعاد والابعاد کا مفہوم

اور اسی غرض کے لئے میں نے اس وعظ کا نام (الاسعاد والابعاد تجویز کیا ہے اسعاد کے معنی ہیں اعانت اور ابعاد کے معنی ہیں تنحیہ یعنی دور کرنا کذا فی القاموس) تو یہ نام آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرائے گا کیونکہ وہ مراقبہ بھی اسی بات کا ہے کہ کون سا کام مقصود آخرت میں معین ہے اور کون سا مقصود سے دور کرنے والا ہے تو اب آپ کو لمبا مضمون یاد کرنا نہ پڑے گا بلکہ محض اس وعظ کا نام تصور معانی کے ساتھ اس مراقبہ کی یاد دہانی میں کافی ہو جائے گا اور یہ محض دو لفظ ہیں جن کا یاد کرنا دشوار نہیں یہ تجربہ ہے کہ الفاظ مختصرہ سے بڑے بڑے مضامین مستحضر ہو جاتے ہیں میں نے تو مختصر الفاظ سے طالب علمی کے وقت میں بہت علوم حاصل کئے ہیں مجھے ابتداء سے اختصار محبوب ہے۔ کچھ طبیعت ہی اختصار پسند واقع ہوئی ہے جس کا سبب میری کاہلی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ مجھے طول طویل کاموں کی ہمت نہیں خیر کچھ ہی سبب ہو باقی یہ تجربہ بالکل صحیح ہے کہ بعض دفعہ مختصر الفاظ سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں اور میں نے تو اس سے بہت ہی کام لیا ہے۔ چنانچہ جس زمانہ میں میں جلالین پڑھتا تھا تو اس وقت میں نے یہ چاہا کہ جلالین کے جو دو حصے دو مصنفوں کے ہیں اس کو یاد رکھوں کہ پہلا کس کا ہے اور دوسرا کس کا کیونکہ جلالین ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ سورہ کہف سے اخیر تک جلال الدین محلی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے اور انہوں نے اول حصہ کی بھی تفسیر شروع کی تھی؛ چنانچہ سورہ فاتحہ کی تفسیر لکھ بھی چکے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی اور انتقال ہو گیا تو سورہ بقرہ سے سورہ اسراء تک علامہ جلال الدین سیوطی نے تکمیل کی۔ چونکہ دونوں کا نام جلال الدین ہے اس لئے یہ یاد نہ رہتا تھا کہ پہلا حصہ کس کا ہے اور دوسرا کس کا تو میں نے دونوں کے لقب سے اول حرف لے لیا۔

اعیاحکم میں ترتیب معراج

چنانچہ سیوطی کے اول میں سین ہے اور محلی کے شروع میں میم ہے اور سین حروف ہجا میں میم سے مقدم ہے تو میں نے یہ جملہ یاد کر لیا **الاول للاول و الاخر للاخر** یعنی پہلا حصہ اس کا ہے

جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب ہجا میں مقدم ہے اور دوسرا اس کا ہے جس کے لقب کا پہلا حرف ترتیب میں موخر ہے۔اس طرح سے یہ مضمون ہمیشہ یاد رہا۔اسی طرح حدیث معراج میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں خاص خاص انبیاء سے ملاقات کی اور اس کی ترتیب بھی احادیث میں مذکور ہے کہ پہلے آسمان میں آپ نے آدم علیہ السلام سے ملاقات کی اور دوسرے میں حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات کی۔تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے میں موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔مگر یہ ترتیب یاد نہ رہتی تھی تو میں نے اس کے یاد کرنے کے لئے ایک مختصر لفظ بنالیا یعنی اعیاھم جس میں ہمزہ آدم علیہ السلام کے لئے اور عین عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہے اسی طرح ہر نبی کے نام میں جو حرف اول تھا وہ اس جملہ میں لے لیا گیا ہے اور ہر ایک سے ملاقات کی ترتیب وہی ہے جو ترتیب حروف کی اس جملہ میں ہے مگر اس میں دو باتیں قابل تنبیہ ہیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کا کوئی حرف اس میں نہ آسکا اس جملہ میں صرف چھ حرف ہیں جس سے چھٹے آسمان تک کی ترتیب معلوم ہوسکتی ہے ساتواں حرف ایک اور ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کی ترتیب پر بھی دلالت ہو جاتی اور اس کے لئے صرف یہ ممکن تھا کہ آخر میں الف بڑھا کر اعیاھما کر دیا جاتا مگر اس کے معنے کچھ موزوں نہ ہوئے کیونکہ اعیاھم کے معنی تو یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب انبیاء کو سبقت سے عاجز کر دیا اور یہ ایک عمدہ معنی ہیں اور اعیاھما میں ضمیر تثنیہ لانے سے یہ معنے ہوتے ہیں کہ آپ نے دو کو عاجز کر دیا سو یہ معنے کچھ موزوں نہ معلوم ہوئے کیونکہ اس میں دو کی تخصیص بلا وجہ کرنی پڑتی ہے سو اتنی بات خود یاد رکھ لی جائے کہ اس میں ساتویں نبی کا نام مذکور نہیں جن سے ساتویں آسمان پر ملاقات ہوئی تھی اور یہ بھی یاد رکھ لیا جائے کہ ان کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے دوسری بات یہ بھی یاد رکھ لی جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یحییٰ علیہ السلام بھی ہیں کہ وہ بھی دوسرے ہی آسمان پر ہیں ان کے لئے کوئی لفظ مستقل نہ آسکا اور اس جملہ میں جو تیسرا حرف یاء ہے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کی علامت ہے جو ترتیب میں تیسرا حرف ہے وہ تیسرے ہی آسمان پر ہیں سو حرف عین سے ایک نبی کی طرف اشارہ ہو گیا اور دوسرے کو زبانی یاد رکھا اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ یہ جو مشہور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فلک چہارم پر ہیں یہ غلط ہے نہ معلوم یہ کس طرح بے اصل مشہور ہو گیا۔زیادہ تر یہ بات شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے جن میں بعض وہ شعراء بھی ہیں جو محقق ہیں مگر انہوں نے اس غلطی میں عوام کا اتباع کر لیا ہے اس لئے ہمیں ان کے کلام میں تاویل کی ضرورت نہیں۔

شاعروں کا مبالغہ

بلکہ صاف بات یہ ہے کہ بعض دفعہ شاعری میں محقق بھی مذاق عوام کی رعایت کر کے غیر محقق بات استعمال کر لیتا ہے مگر بحرالعلوم نے ان کی رعایت کر کے یہ تاویل کی ہے کہ فلک چہارم سے مراد آسمان چہارم نہیں بلکہ کرہ چہارم مراد ہے اور آسمان دوم عدد کرات علویہ میں چوتھے نمبر پر ہے کیونکہ اس کے نیچے آسمان اول ہے اور اس کے نیچے کرۃ النار ہے اور اس کے نیچے کرۃ الہوا ہے اس طرح آسمان دوم چوتھا کرہ ہوا اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ہوا کے نیچے کرۃ الماء اور اس کے نیچے کرۃ الارض بھی ہے تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ کرات سفلیہ ہیں اور گفتگو کرات علویہ میں ہے اس لئے ان دونوں سے نقض وارد نہیں ہوتا۔ دوسرے متکلم خود دو کرہ کے اوپر ہے اور اس کے اوپر صرف عناصر کے دو ہی کرے ہیں ہوا و نار۔ خیر کسی کو یہ تاویل پسند ہو تو وہ یہ تاویل کر کے مولانا رومی وغیرہ کے کلام کو درست کر لے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان چہارم پر مانا ہے بعض شعراء تو ایسا غضب کرتے ہیں کہ ایک شاعر نے عیسیٰ علیہ السلام کو فلک چہارم پر مان کر انہیں بیمار بھی مانا ہے کہتا۔

بر آسمان چہارم مسیح بیمار است تبسم تو برائے علاج در کار است

(چوتھے آسمان پر نعوذ باللہ) عیسیٰ علیہ السلام بیمار ہیں تیرا تبسم ان کے علاج کے لئے درکار ہے)

یعنی وہ اپنی معشوق چرمی سے کہتا ہے کہ آسمان چہارم پر مسیح بیمار ہیں بھلا مسیح اور بیمار۔ وہ تو مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے وہ بیمار ہوں گے۔ اور خیر زمین پر رہتے ہوئے تو بیمار ہونا کچھ تعجب خیز نہ تھا یہ تو ان کو آسمان پر بیمار مانتا ہے بھلا وہاں بیماری کا کیا گزر۔ جب وہاں عیسیٰ علیہ السلام نہ زمین کی غذائیں کھاتے ہیں نہ وہاں ان کو بول و براز کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ وہاں کسی قسم کا تعفن ہے تو وہاں بیمار ہونا کیسا۔ پھر بیماری کا علاج بھی ان کے معشوق چرمی کا تبسم ہی میسر ہوا۔ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ ایک نبی (علیہ السلام) کا علاج اپنے محبوب کے تبسم کو بتلاتا ہے مگر شعراء کو اس کی کچھ پرواہ نہیں بس انہیں تو یہ چاہئے کہ شعر بن جائے چاہے عقل و شعور پر اس سے پردہ ہی پڑ جائے اور غضب یہ اس مرض میں بعض عارفین بھی مبتلا ہیں وہ کسی معشوق چرمی کے مقابلہ میں تو انبیاء کی توہین نہیں کرتے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے دوسرے انبیاء کی توہین ہو جاتی ہے چنانچہ جامی فرماتے ہیں۔

غلامے بود یوسف زر خریدہ " (یوسف زر خریدہ ایک غلام ہے)

خدا معاف کرے ان حضرات کو میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے اس معنی کے تصور سے بھی بھلا یوسف علیہ السلام کو غلام کہنا اور زرخرید کہنا کیا یہ تھوڑی بات ہے۔ بہت سخت بات ہے مگر شعرا اس

کی پروانہیں کرتے۔ میں ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے ہر شخص آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ انبیاء کی شان میں کونسی بات کہنے کی ہے اور کون سی بات کہنے کی نہیں وہ یہ کہ یہ تصور کرلیا جائے کہ اگر کسی مجمع میں وہ نبی موجود ہوں جن کی شان میں ہم نے یہ بات کہی ہے تو کیا اس مجمع میں ان کے سامنے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں۔ یا کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کے بھائیوں کے متعلق ہم یہ مضمون پڑھ سکتے ہیں۔ بس جو بات ایسی ہو جس کے متعلق دل گواہی دے کہ اس کو ہم ان پیغمبر کے سامنے کہہ سکتے ہیں وہ تو کہو اور جس میں کھٹکا پیدا ہو کہ سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتے اس کو اپنے کلام میں سے نکال دینا چاہئے۔ یہ بہت بڑا معیار میں نے آپ کے ہاتھ میں دیدیا ہے اس کو مستحضر رکھ کر شعراء اپنے کلام میں اصلاح کر سکتے ہیں۔ الغرض میں نے لفظاً اعیا ہم سے اس ترتیب کو یاد کیا تھا جس ترتیب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں حضرات انبیاء سے آسمانوں پر ملاقات فرمائی ہے تو میں نے مختصر الفاظ سے بہت کام لیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس وعظ کا نام ایسا تجویز کیا جو اختصار کے ساتھ آپ کو اس مراقبہ کی یاد دہانی کرے گا میں نے بہت دیر میں اس بات کو کہا جو مجھے اس وقت کہنی تھی اور بات بھی مختصر ہی تھی جس کے لئے اتنی دیر کی ضرورت نہ تھی نہ اتنی دیر کی نیت تھی مگر خود بخود دیر ہوگئی لیکن حرج ہی کیا ہے یہ وہ باتیں نہیں ہیں جن کے زیادہ ہونے سے ہیضہ ہو جب ماکولات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جن کے زیادہ کھانے سے ہیضہ نہیں ہوتا جیسے خربوزہ کو لوگ بتلاتے ہیں تو کیا معقولات میں ایسا ہونا کچھ دشوار ہے۔

انطباق آیت متلوه

اب میں اس مضمون کا انطباق آیت متلوہ پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پر چلو) یہ معنی معطوف ہے قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ (آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے) جو قل کے تحت میں ہے تقدیر یہ ہوئی قُلْ تَعَالَوْا الخ وقل وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا الخ (آپ کہہ دیجئے یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اس جگہ ان مکسورہ ہوتا کیونکہ قول کے تحت میں ان مکسورہ ہی آیا کرتا ہے اور ایک قرات میں مکسورہ ہے بھی مگر ہماری قرات میں ان مفتوحہ ہے جس کی وجہ صحت یہ ہے کہ اس قرات میں یہاں اخبر (خبر دیدیجئے) مقدر ہے جس کے ملانے کے بعد لفظاً یہ قل کے اوپر معطوف ہے اس لئے منصوب ہوگیا گو معنا تعالوا پر عطف ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ (لوگوں کو) بتلا دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو۔ ہذا سے مذکور سابق کی طرف

اشارہ ہے اور تقریباً دس احکام اوامر و نواہی کا مجموعہ مذکور ہے چنانچہ ارشاد ہے

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا الی آخرہ

ترجمہ: یہ ہے کہ آپ (ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے وہ (چیزیں یہ ہیں ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور دوسرے یہ کہ ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کیا کرو (زمانہ جاہلیت میں اس کی عادت تھی کہ اولاد کو زندہ درگور کردیتے تھے (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو دونوں کو رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہارے رزق مقدر میں شریک نہیں ہیں پھر کیوں قتل کرتے ہو پس قتل کرنا حرام ہوا) اور (چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ ہو یا پوشیدہ اور (پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کردیا ہے اس کو قتل مت کرو ہاں مگر حق (شرعی) پر قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں پس قتل ناحق حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تاکہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو) اور (چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف نہ کرو) مگر ایسے طریقے سے (تصرف کی اجازت ہے) جو شرعاً مستحسن ہے (مثلاً اس کے کام میں لگانا اس کی حفاظت کرنا اور بعض اولیاء و اوصیا کو اس میں یتیم کے لئے تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جس کا حکم فقہ میں مذکور ہے) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جاوے (اس کے بعد اس کا مال اس کو دیدیا جائے گا بشرطیکہ سفید یعنی بے وقوف نہ ہو پس تصرف غیر مشروع مال یتیم میں حرام ہوا) اور ساتویں یہ کہ (ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے اور نہ آوے پس آپس میں دغا کرنا حرام ہوا۔ اور آگے بتلاتے ہیں کہ یہ احکام کچھ دشوار نہیں جن پر عمل دشوار ہو کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کی کیا وجہ) اور آٹھویں یہ کہ جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق)

کوئی بات کیا کروتو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو گو وہ شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا نذر) اس کو پورا کیا کرو (بشرطیکہ وہ نذر و قسم خلاف شرع نہ ہو پس اس کا عدم ایفاء حرام ہوا) اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ اسی کا اتباع کرو پس گو ہذا کا مرجع یہ امور مذکورہ ہیں لیکن یہ اشارہ علی سبیل التخصیص نہیں بلکہ علی سبیل التعمیم ہے یعنی وہ دین جس کے یہ احکام بطور نمونہ کے ہیں سب کا سب واجب الاتباع ہے اور اشارہ میں تعمیم کی وجہ ظاہر ہے کہ وجوب اتباع کچھ انہی احکام میں منحصر نہیں اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ انہی کے ساتھ مخصوص پس ہذا کے بعد صراطی فرمانا خود قرآن میں ان کے علاوہ اور بہت سے احکام مذکور ہیں اور احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ کچھ انہی احکام کی تخصیص نہیں بلکہ دین اسلام اور اس کے سب احکام جن میں سے بعض اوپر مذکور ہوئے ہیں میرا سیدھا راستہ ہے اس کا اتباع کرو پس ہذا سے حقیقت میں دین اسلام کی طرف اشارہ ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اور ان احکام تسعہ مذکورہ کے ذکر کے بعد ھذا سے مجموعہ دین کی طرف اشارہ کی وجہ صحت یہ بھی ہے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں یہ سارے اسلام کا خلاصہ ہے کیونکہ ان میں عقائد و معاملات و معاشرات و عبادات کے مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام سب محکوم ہیں جو کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہے پھر وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ (یہ دین میرا راستہ ہے) میں صراحۃً تعمیم کر دی گئی جس سے بقیہ احکام غیر محکمہ بھی اجمالاً سب مذکور ہو گئے اور صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حق تعالیٰ نہیں ہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ یہ آیت متعلق تعالوا پر معطوف ہے جو قل کے تحت میں ہے اور لفظ یہاں اخبر محذوف ہے پس خطاب قل واخبر (آپ کہہ دیں اور خبر دیدیں) کے بعد ضمیر متکلم کا مرجع قائل ہی ہو سکتا ہے اور قائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو اس ضمیر کا مرجع بھی آپ ہی ہیں چنانچہ اس نظیر دوسری جگہ بھی مذکور ہے۔ کہ وہاں بھی دین اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہا گیا ہے۔

صراط الرسولؐ دراصل صراط اللہ ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (آپ فرما دیجئے یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے

ساتھ والے بھی) اور اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہنا بطور دعوت کے ہے کہ آپ اس طریق کے داعی ہیں ورنہ حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے چنانچہ بعض جگہ حقیقت کے موافق ارشاد ہے اِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ ایک سیدھے راستہ کی ہدایت کر رہے ہیں یعنی اس خدا کے راستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) اس پر یہ سوال وارد ہو گا کہ جب حقیقت میں یہ صراط اللہ ہے تو پھر ہر جگہ حقیقت کے موافق کلام کیوں نہیں فرمایا بعض جگہ مجازاً اس کو صراط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض جگہ حقیقت کے موافق صراط اللہ کیوں فرمایا تو جواب اس کا یہ ہے کہ بعض جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا کہ یہ خدا کا راستہ ہے اس پر چلو تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے۔

حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان

کیونکہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے تو ان کی تو یہ شان ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ۔ و ز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر ۔ ماہمچناں در اول و صف تو ماندہ ایم

(اے اللہ آپ وہم و گمان و قیاس سے بالاتر ہیں جو کچھ بزرگوں نے کہا تھا اور ہم نے سنا اور پڑھا اس سے بھی بالاتر ہیں۔ دفتر تمام ہو گیا اور عمر اختتام کو پہنچی ایک وصف بھی آپ کا بیان نہ کر سکے)

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

در تصور ذات او را گنج کو ۔ تا در آید در تصور مثل او

(اس کی ذات کے تصور میں کہاں گنجائش ہے تاکہ اس کا مثل تصور میں آجائے)

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس کنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی۔ صرف حضرت حاجی صاحب ہی کے پاس اس کی کنجی تھی حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ مکرمہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو گنج پڑھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے معنے بنانے میں وہ بہت تاویلیں کر رہے تھے مگر کوئی بات نہ بنتی تھی حضرت نے صلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجائش کے بس اس کو سن کر وہ شیخ پھڑک ہی تو گئے۔ اب شعر کے معنے بے تکلف ظاہر ہو گئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی کے تصور میں گنجائش نہیں یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے جس کی تفصیل کتب معقول میں

مذکور ہے جب حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں تو اگر ابتداء ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا یعنی حق تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کی جاتی تو لوگ گھبرا جاتے اور اس سوچ میں پڑ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں پس اسی طرح ان کا راستہ بھی نہ معلوم کتنا دور دراز ہوگا اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف کیا گیا کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے اس پر چلو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سب کی رسائی ممکن ہے آپ عیاناً سب کے سامنے ہیں پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں اس لئے یہ سن کر ہمت بندھی کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں تو آپ کا راستہ بھی دور نہ ہوگا بلکہ نزدیک ہوگا یہ فائدہ ہوا آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ کا نزدیک و سہل ہونا معلوم ہو گیا پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی ہو گئی اور اس راستہ پر چلنا شروع ہوا اب حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیقت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف داعی ہیں آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس راستہ کو طے کر لیا ہے معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں خصوصاً جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین و رفیق ہیں۔ واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ خدائی راستہ ہے۔ جس کو وہی طے کر سکتا ہے۔ جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہیں اسی لئے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ یہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے اس وقت وہ بڑا پریشان ہوتا ہے اور اس کے طول و لاتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست — آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

(دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے اس جگہ جان سونپنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے)

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے جس پر آپ چل رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے۔

تو دستگیر شوائے خضر پے خجستہ کہ من — پیادہ می روم و ہمرہاں سوار انند

(اے خضر راہ تو ہی میرا ہاتھ پکڑ کہ میں پیدل ہوں میرے ہمراہی سوار ہیں)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت و رفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہو چکی ہے۔

مشائخ کا دامن صراط الرسولؐ پر چلنے کا وسیلہ ہے

اور جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان

مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں (جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہنچا ہو اس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں ۱۲ جامع) شیخ فرید فرماتے ہیں۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق ۔ عمر بگذشت نشد آگاہ عشق

(بے پیر اور رہبر کامل کے جو شخص اس عشق کے راستہ میں چلا عمر گزر گئی مگر عشق سے باخبر نہ ہوا)

گر ہوائے ایں سفر داری ولا ۔ دامن رہبر بگیر و پس برآ

(اے دل اگر اس سفر محبت کے طے کرنے کی خواہش رکھتا ہے تو رہبر کامل کا دامن پکڑ اور پیچھے آ)

اور مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ را تنہا مرو ۔ بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

قلاؤز سے مراد قل اعوذ یا مولوی نہیں بلکہ قلاؤز کہتے ہیں رہنما کو یہ ترکی لغت ہے گو وہ قلاؤز ہو گا قل اعوذ یا ہی۔ مطلب یہ ہے کہ اس راستہ کو رہنما کے بغیر طے نہ کرو ورنہ بہت پریشان ہو گے اور راستہ طے نہ ہو سکے گا۔ آگے فرماتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ را برید ۔ ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر کسی نے شاذ و نادر اس راہ سلوک کو تنہا بے صحبت پیر قطع کر بھی لیا تو وہ بھی غائبانہ پیروں کی توجہ سے پہنچا ہے۔)

اس میں جواب ہے اس سوال کا کہ ہم تو بعض اولیاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ بدوں رہنما کے واصل ہو گئے ظاہر میں ان کا کوئی شیخ نہ تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اول تو یہ نادر ہے والنادر کالمعدوم (نادر مثل معدوم کے ہوتا ہے) اس لئے تو اس سے نقض وارد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جس کو تم ظاہر میں بدوں کسی رہنما کے واصل دیکھتے ہو وہ حقیقت میں ایسا نہیں واقع میں وہ بھی کسی رہنما کے واسطہ سے واصل ہوا ہے گو ظاہر میں اس کا کوئی شیخ نہیں مگر وصول اس کو بھی عون ہمت مردان طریق سے ہوا ہے یعنی اہل اللہ میں سے کسی نے اس پر نظر کی ہے جس کی برکت سے وہ واصل ہو گیا ہے گو اس شخص کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ مجھ پر کس نے نظر کی ہے۔ حضرات اہل اللہ کے احسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ بہت لوگوں کو ان کے احسان کی خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ ان کے لئے دعائیں کرتے تھک گئے ہیں۔

حضرت مجدد قدس سرہ کا ایک واقعہ

حضرت مجدد صاحب قدس اللہ سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت مجدد صاحب کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا۔ پس حضرت مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ

میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کے لئے دعا کرنی چاہی مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اس کے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر میں شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے حتیٰ کہ آپ کو مکشوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گزر رہی ہے راتوں کو نینداس کی اڑ گئی ہے۔ خیر یہ واقعہ تو ہو گیا مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (میرے نزدیک قول نہیں بدلتا)

حضرت مجدد صاحب نے اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقع میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید تھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ تقدیر اصل میں علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیونکہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا رہتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجہ میں ہے اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت قرب ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی حکیم ہے اور قرآن کا جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق

قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی حکیم دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا (ہم نے اس کو قرآن عربی کر دیا) اس کا جعل کا مفعول ہونا اور عربیت کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اسی سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہو گیا خیر یہ تو بیچ میں ایک علمی لطیفہ تھا مقصود میرا یہ تھا کہ اہل اللہ بعض دفعہ اس طریقہ سے بعض لوگوں پر احسان فرماتے ہیں کہ ان کو خبر نہیں ہوتی بھلا اگر مجدد صاحب بیان نہ فرماتے تو ان بزرگ کو اس احسان کی اطلاع کیسے ہوتی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ حضرت مجدد صاحب کے معتقد ہوں گے اگر معتقد نہ ہوتے تو اس احسان کو تسلیم کرنے کے بجائے مجدد صاحب پر نہ معلوم کیا کیا اعتراض کرتے یہ ہے ہم بعون ہمت مردان رسید (مردان خدا کی توجہ سے پہنچے) اور یہ بھی ان بزرگ کی سعادت کی علامت تھی کہ انہوں نے مجدد صاحب پر اعتراض نہیں کیا بلکہ تسلیم سے کام لیا ان حضرات پر انکار نہ کرنا بھی بڑی دولت ہے اہل اللہ کے ساتھ انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار سے پیش آنا بڑا وبال ہے بلکہ کام کی بات تو یہ ہے کہ اپنے چھوٹوں پر بھی حقیر سمجھ کر انکار اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں خدا کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت و تعلیم بھی نہ کرو کیونکہ تعلیم میں تحقیر و بے ادبی نہیں بلکہ تعلیم تو ادب ہی ہے کیونکہ ہر چیز کا ادب اس کے مناسب ہوتا ہے چھوٹوں کا ادب یہی ہے کہ ان کی تربیت و تعلیم کی جائے۔ یہاں تک تو لفظ صراطی کے متعلق بیان تھا آگے فرماتے ہیں مستقیما یعنی یہ راستہ مستقیم ہے۔ لفظ مستقیم کے معنی ایک تو لغوی ہیں یعنی اقصر الخطوط الواصلة بين النقطتين (دو نقطوں کے درمیان میں جو خطوط واصل ہو سکیں ان میں جو سب سے چھوٹا ہو وہ مستقیم لغوی ہے) اور ایک معنی عرفی ہیں یعنی بے خوف و خطر راستہ۔ عرف میں راہ راست کو کہتے ہیں جس میں کوئی خطرہ نہ ہو چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں گاؤں کا سیدھا راستہ یہ ہے کہ اس کو چلے جاؤ حالانکہ اس میں موڑ بھی آتے ہیں مگر مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ راستہ بے خطر ہے اس میں تم کو غلطی پیش نہ آئے گی۔ صاف سڑک پڑی ہوئی ہے اور یہی عرفی معنی اس شعر میں مراد ہیں۔

راہ راست برو اگرچہ دو راست

(بے خطر راستہ پر چلو اگرچہ دور ہو)

بے خطر راستہ صراط حق ہے

اگر راہ راست کے معنی عرفی نہ لئے جائیں تو لغوی معنی کے اعتبار سے اگرچہ دو راست (اگرچہ

دور ہو) نہیں بن سکتا کیونکہ جو راستہ لغۃً مستقیم ہوگا وہ اوروں سے دور کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے اقصر الطرق ہونا لازم ہے جن لوگوں کو مستقیم کے لغوی اور عرفی معنی میں فرق معلوم نہیں وہ اس شعر کو حل نہیں کر سکتے مگر اس تحقیق کے بعد مطلب صاف ہے کہ بے خطر راستہ کو اختیار کرو اگر چہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو یہ تو لفظ کی تحقیق تھی اب میں کہتا ہوں کہ صراط حق یعنی اسلام کے متعلق یہ دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ صراط مستقیم بے خطر بھی ہے اور وصول الی اللہ میں وہ تمام طرق سے اقرب واقصر بھی ہے تو آپ کو اختیار ہے کہ چاہے مستقیم کو لغوی معنی پر محمول کیجئے یا عرفی پر (یا دونوں پر ۱۲) یہاں سب کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ یعنی اس راستہ (اسلام) کا اتباع کرو اور دوسرے مختلف راستوں کا اتباع نہ کرو ورنہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا اور دور کر دیں گے اور دور ہونا اس طرح کا نہیں ہے کیونکہ وہ موصل تو ہوتے ہیں نقطہ مقصودہ سے دور تو نہیں کرتے بلکہ اس طرح کی دوری ہے۔ جیسے مثلث کی ایک ساق کو چھوڑ کر اگر دوسری ساق پر چلنے لگے تو ساق اول سے وقتاً فوقتاً بعد ہی بڑھتا جاتا ہے جیسے اقصر الخطوط کے سوا تمام خطوط واصلہ دور دراز ہوا کرتے ہیں اور جدا ہونا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ بے خطر راستہ کو چھوڑ کر خطرناک راستہ اختیار کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ مقصود تک وصول میسر نہیں ہوتا بیچ ہی میں ہلاک ہو جاتا ہے اور ایک بات یہاں اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ پہلے تو صراطی میں ضمیر متکلم کا مرجع حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے جس میں اس راستہ کی طرف اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھی اور یہاں عن سبیلہ بضمیر غائب فرمایا گیا ہے اس کا مرجع حق تعالیٰ ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں ورنہ سبیلی بیاء متکلم فرماتے ہیں سو اس کی توجیہ کی اس لئے کوئی ضرورت نہیں کہ یہ اضافت تو حقیقت کے موافق ہے۔ توجیہ کی ضرورت تو صراطی میں تھی جس کا نکتہ میں بیان کر چکا ہوں اس کے بعد ارشاد ہے۔

وَصّٰكُمْ کا مفہوم

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس کی خدا تعالیٰ نے تم کو وصیت فرمائی ہے تا کہ تم تقویٰ حاصل کر سکو۔ وصیت کرنے سے مراد تاکیدی حکم دینا ہے کیونکہ وصیت اصل میں اس بات کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مرنے کے وقت عزیزوں اور وارثوں سے کہا کرتا ہے چونکہ وہ انسان کا آخری وقت ہوتا ہے اس لئے اس وقت جو بات کہتا ہے وہ خاص ضرورت کی باتیں ہوتی ہیں جن کی تعمیل کو وہ بہت موکد ولازم کیا کرتا ہے چونکہ حق تعالیٰ عدم وفنا سے پاک ہیں اس لئے یہاں پر وصیت کے معنی متعارف تو ہو نہیں سکتے بلکہ اس کا لازم مراد ہے یعنی حکم تاکیدی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یہ نتیجہ ہے اتباع صراط مذکور کا مطلب یہ ہے کہ تم اس راستہ پر چلو تو امید ہے کہ تم

کو وصال مقصود حاصل ہو جائے گا اس طرح سے تم نجات آخرت سے کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ تقویٰ کے معنے لغت میں بچنے کے ہیں تو حاصل یہ ہوا کہ تم عذاب سے بچے رہو گے۔

خلاصہ نجات

اور یہی خلاصہ ہے نجات کا اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کمال دین کو کہتے ہیں چنانچہ موارد نصوص میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس تفسیر پر مطلب یہ ہوا کہ اس راستہ پر چلنے سے تم کو کمال دین حاصل ہو جائے گا اور یہی حاصل ہے مقصود پر پہنچنے اور منزل پر وصول ہو جانے کا اس کے بعد میں اس آیت کو مضمون پر منطبق کرنا چاہتا ہوں گو اس تفصیل کے بعد تقریر انطباق کی ضرورت نہیں رہی مگر میں تبرعاً اس کو بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ پوری تسلی ہو جائے کہ آیت مضمون مقصود پر بسہولت منطبق ہے۔ سو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ھٰذَا صِرَاطِیْ سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور اسلام گو نالغتہ ہے مجموعہ اعمال کا اور عقائد اس میں مجازاً داخل ہیں اور حقیقۃً عقائد ایمان کا مدلول ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان فعل قلب ہے اور اسلام فعل جوارح اور یہ اطلاع لغوی ہے کیونکہ ایمان کے معنے تصدیق کے ہیں جو اولاً بالذات قلب سے صادر ہوتی ہے اور اسلام کے معنے گردن نہادن بطاعت ہیں جس کا محل جوارح ہیں اور بعض نصوص میں بھی اسلام و ایمان کا اطلاق اس حقیقت کے موافق وارد ہے۔ قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا (اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ ہم اسلام لائے) لیکن یہ حقیقت لغویہ ہے اصطلاح شرعی میں اسلام نام ہے۔ مجموعہ عقائد و اعمال کا اور ایمان نام ہے مجموعہ عقائد کا تو شرعاً اسلام عام ہے اور ایمان خاص اور ایمان پر ہذا صراطی سے جو اسلام کی طرف اشارہ ہے اس سے یہی اسلام شرعی مراد ہے جو عقائد و اعمال سب کو شامل ہے جس کا قرینہ یہ ہے کہ اوپر قل تعالوا (آپ کہیے کہ آؤ) میں عقائد و اعمال دونوں کا ذکر ہے اس کے بعد وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) فرمایا گیا ہے تو اس میں مجموعہ عقائد و اعمال کی طرف اشارہ ہونا مناسب ہے اور ان اعمال و عقائد کو جو صراط فرمایا گیا تو تخصیص ان ہی اعمال و عقائد کی مقصود نہیں یہ تو بطور تمثیل کے فرمایا ہے مقصود اتباع صراط اسلام کا ہے جو تمام اصول و فروع کو شامل ہے۔ البتہ ایک تحقیق سمجھنے کی یہاں ضرورت ہوگی وہ یہ کہ اوپر بعض نواہی کا ذکر ہے جیسے لَا تُشْرِکُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلَا تَقْرَبُوْا (مت شریک کرو اور مت قتل کرو اور نہ قریب جاؤ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کرو) اور بعض مامورات کا ذکر ہے جیسے بالوالدین احسانا و اوفوا الکیل و اذا قلتم فاعدلوا (والدین

کے ساتھ احسان کرو ناپ تول پوری کرو) اوران سب کو صراطی فرمایا۔اس کے اتباع کا امر فرمایا تو صراطی کہیں فعل ہوگا کہیں ترک اوراتباع فعل سے ہوگا کہیں ترک سے غرض ھذا صراطی سے مراد تمام وہ اعمال و مامورات ہیں جو معین آخرت ومفید مقصود ہیں جن کا مفید ہونا مستقیما میں مدلول ہے کہ استقامت کے لئے موصل الی المقصود ہونالازم ہے۔اور وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط (دوسری راہ پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کواللہ کی راہ سے جدا کردیں گی) میں تمام وہ اعمال آ گئے جو مانع عن الاخرت ومضر للمقصود ہیں اور مضر ہونا متفرق سے ظاہر ہے۔پس ان مقدمات سے حاصل یہ ہوا کہ ہم کو ہر کام میں یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ فعل معین آخرت ہے یا مضر آخرت ہے اب اس میں تمام شریعت آ گئی کوئی مضمون شریعت اس کا اس سے خارج نہیں رہا۔اس لئے اس آیت کے تحت میں تمام شریعت کا ذکر ہوسکتا ہے۔اسی واسطے میں نے ابتداء میں کہا تھا کہ اس آیت کی تفصیل عمر بھر میں بھی بیان نہیں ہوسکتی اور وہ ایک شخص کی عمر نہیں بلکہ ایک جماعت کی عمر جو فی نفسہ گو متناہی ہو مگر بمعنی لاتقف عند حد غیر متناهی (غیر متناہی کہ کسی حد پر نہ ٹھہرے) ہو پس اس میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو اس ماہ رواں یعنی شعبان کے متعلق یا ماہ آئندہ رمضان کے متعلق شریعت میں وارد ہیں۔

احکام شعبان

لہٰذا میں احکام شعبان کو بھی اس کے تحت میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور رمضان کے متعلق اگر موقعہ ملا تو پھر کبھی بیان ہوجائے گا۔شعبان کی بابت حدیث میں یہ خاص فضیلت مذکور ہے۔

اذا كانت ليلة النصف من شعبان فقوموا ليلها وصوموا نهارها فان الله تبارك و تعالىٰ ينزل فيها لغروب الشمس الى السماء الدنيا فيقول الامن مستغفر فاغفرله الامن مسترزق فارزقه الامن مبتلى فاعافيه الا كذا الا كذا حتى يطلع الفجر رواه ابن ماجه سنده ضعيف كمايدل عليه تصدير المنذرى اياه بلفظ روى وهو علامته الضعف كما صرح به فى خطبته كتابه اه ترغيب ص ۱۷۹ لكنه تجمل فى فضائل الاعمال. جامع) (سنن ابن ماجة: ۱۳۸۸)

یعنی حق تعالیٰ اس مہینے کی پندرھویں رات میں غروب ہی کے وقت سے آسمان اول کی طرف نزول فرماتے ہیں۔

جیسا نزول ان کی شایان شان ہے اس میں ہم کو کاوش کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ممانعت بھی ہے

کیونکہ یہ قشابہات میں سے ہے پھر فرماتے ہیں کہ کوئی مغفرت کا طالب ہے؟ کہ میں اس کی مغفرت کروں کوئی روزی کا طالب ہے کہ میں اس کو روزی دوں کوئی بیمار (طالب شفا) ہے کہ میں اس کو عافیت دوں اسی طرح بہت سے امور کے متعلق فرماتے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا ہے کوئی ایسا ہے یہاں تک کہ طلوع فجر تک یہی معاملہ رہتا ہے سبحان اللہ یہ اس رات کی کتنی بڑی فضیلت ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ اس رات حق تعالیٰ ہمارے گھر پر تشریف لاتے ہیں کیونکہ آسمان اول ہمارے گھر کی چھت ہے اور محبوب کا چھت پر آ جانا گھر ہی میں آ جانا ہے تو بس ہمارا حال اس شعر کے مصداق ہوتا ہے۔

امروز شاہ شاہاں مہماں شد است مارا جبریل باملائک درباں شد است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل وملائک ہمارے دربان ہیں)

اب اس کو خود سوچ لو کہ جب محبوب گھر میں مہمان ہو تو عاشق کا کیا حال ہوتا ہے جناب خوشی کے مارے رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہی جی چاہا کرتا ہے کہ ساری رات محبوب سے باتیں کرتا رہوں خصوصاً جس کا محبوب ایسا ہو جو اپنے عشاق کی باتیں سننے سے گھبراتا بھی نہ ہو نہ اس کو نیند آتی ہو نہ غنودگی ستاتی ہو ایسے محبوب کا عاشق تو ہرگز اس رات میں نہ سوئے گا۔ جس میں محبوب اس کے گھر پر آیا ہو پس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس رات میں قیام کا امر بھی نہ فرماتے جب بھی صرف اس خبر کا کہ حق تعالیٰ اس رات آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں مقتضا یہی تھا کہ ہم اس رات کو عبادت و ذکر میں گزاریں اور رات بھر بیدار رہیں چہ جائیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے۔ **قوموا لیلھا وصوموا نہارھا** (اس کی رات میں شب بیداری کرو اور دن میں روزہ رکھو) مگر وہ شاہ شاہاں ایسا مہربان ہے کہ مہمان ہو کر بھی تمہیں سونے سے نہیں روکتا تم کو سونے کی اجازت مگر باوجود اس طرف سے اجازت ہونے کے پھر بھی یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ جیسے اور ویسے ہی اس روز کچھ تو کرنا چاہئے۔ رات بھر جاگنے کی ضرورت نہیں بلکہ اچھا بھی نہیں کیونکہ حدیث میں ہے۔

احب الاعمال الی اللہ ادومھا (الصحیح لمسلم' المسافرین: ۲۱۸)

بہتر عمل خدا تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس پر دوام کیا جائے سو شعبان کی اس شب میں اتنا جاگنا چاہئے جس پر نباہ ہو سکے یہ نہیں کہ ایک مرتبہ تو ساری رات جاگ لئے اور دوسری مرتبہ کچھ بھی نہیں شاید کوئی صاحب اس حدیث کو سن کر یہ کہیں کہ یہ دوام تو بڑا اسرلگا سال میں ایک رات تو کچھ دیر جاگنا آسان تھا سال بھر کون جاگے ارے صاحب! آپ گھبرائیں نہیں میں سال بھر کی راتوں میں آپ کو نہیں جگاتا بلکہ آپ سال میں ایک ہی رات جاگ لیا کیجئے رہا یہ شبہ کہ اس صورت میں دوام کہاں ہوا تو میں کہتا ہوں یہ بھی ایک صورت دوام کی ہے کہ سال میں ایک رات

ہمیشہ جاگ لیا کرے جیسے روٹی پر آپ کو دوام ہے مگر اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر وقت کھایا کرے یا کپڑے بدلنے پر دوام ہے کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار بدلا کرتے ہیں اس دوام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہر وقت کپڑے بدلے جائیں پس اسی طرح سال بھر میں ایک رات جاگنے کا التزام کر لینا یہ بھی دوام ہے بشرطیکہ یہ ایک رات ناغہ نہ ہو تو اس رات میں اتنی مقدار بیداری کے لئے معین کرنی چاہئے کہ جس پر ہمیشہ کم از کم اس رات میں تو دوام ہو جایا کرے چاہے ایک ہی گھنٹہ ہو۔

عمل قلیل کے دوام میں برکت

بلکہ میں اس سے ترقی کر کے کہتا ہوں کہ چاہے دو ہی رکعت ہوں کچھ تو ہوں پس قلیل عمل بھی دوام کے ساتھ عمل کثیر بغیر دوام سے بہتر ہے اگر دو رکعت بھی کسی سے نہ ہو سکیں تو کم از کم ایک مرتبہ استغفار ہی اس رات میں کر لیا کرے التزام کے ساتھ یہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب کا شعر ہے۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں　　گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

سبحان اللہ یہ علوم ہیں حاجی صاحب کے حق تعالیٰ نے حاجی صاحب کو کتنا سہل راستہ الہام فرمایا تھا۔ بس وہی انبیاء کا راستہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جس کی شان یہ ہے **سہلته بیضاء نقیة لیلها ونهارها سواء** حضرت حاجی صاحب کی یہی تعلیم تھی کہ کچھ کرنا چاہئے چاہے قلیل ہی ہو پس تم ہر شعبان میں اس رات کے لئے کچھ کام مقرر کر لو یہ بھی دوام ہے اگر تمام رات بیدار نہ رہ سکو تو جتنا ہو سکے پانچ منٹ ہی سہی اور حدیث میں آتا ہے اس رات سب کی مغفرت ہو جاتی ہے (جو بھی مغفرت طلب کرے ۱۲) سوائے مشرک اور مشاحن کے یعنی جن دو شخصوں میں دنیوی عداوت و کینہ ہو ان کی بھی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ کہہ دیا جاتا ہے ان کو ابھی رہنے دو جب تک یہ صلح کر لیں **قلت رواه البيهقي من طريق العلاء بن الحارث عن عائشة رضی اللہ عنہا وقال هذا مرسل جيد يعني ان العلاء لم يسمع من عائشة والله سبحانه وتعالیٰ اعلم كذا في الترغيب ص ۱۰ ج)**

اللہ اللہ کینہ بھی کتنا گناہ ہے کہ اس کو شرک کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ جس طرح مشرک کی مغفرت اس رات میں نہیں ہوتی اسی طرح کینہ ور کی بھی مغفرت نہیں ہوتی اب تو مسلمانوں میں کینہ بہت ہی بڑھ گیا ہے حالانکہ اس میں ہر مسلمان کا وہ مشرب ہونا چاہئے تھا جو صوفیہ کا ہے وہ یوں کہتے ہیں۔

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

(ترجمہ: ہمارے طریق میں کینہ رکھنا کفر ہے ہمارا آئین ہے سینہ کو مثل آئینہ صاف رکھنا)

(کینہ کو کفر کہنا کا مطلب یہ ہے کہ وہ قریب بکفر ہے اوراس کی دلیل حدیث مذکور میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشاحین کو مشرک کے ساتھ جمع فرمایا۱۲) مگر اب تو صوفیوں میں بھی یہ بات نہیں رہی ان میں کینہ و بغض کی کثرت ہونے لگی حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ دعا تعلیم کی گئی ہے وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے اللہ ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ پیدا نہ کیجئے ۱۲) تو اس مرض سے بچنا چاہئے مگر آج کل مسلمان اپنے بھائیوں ہی سے کینہ بہت رکھتے ہیں غیروں سے تو اتحاد کی کوشش کی جاتی ہے ان کو غیر قوموں سے اتنا کینہ نہیں ہوتا جتنا اپنے بھائیوں سے ہوتا ہے افسوس! پس اس رات سے پہلے ہر شخص کو اپنے دل میں سے مسلمانوں کی طرف سے کینہ نکال دینا چاہئے ورنہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اس دن کے ختم ہونے کے بعد (اس دن چودھویں تاریخ تھی) جو رات اب آ رہی ہے وہی لیلۃ النصف من شعبان ہے۔ جس کا نام شب برات ہے۔ مگر حلوے مانڈے والوں کے یہاں آج ہی شب برات ہے واقعی ان بدعات کے ساتھ عقل بھی خبط ہو جاتی ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ دن کو شب کہتے ہیں شاید چودھویں تاریخ کو اہتمام کرنے سے پندرہویں رات ہی مقصود ہوتی ہوگی اسی اہتمام کے سبب چودھویں تاریخ ہی کو شب برات کہنے لگے۔

دوسری غلطی یہ کہ بقرعید کی طرح شب برات کا بھی عرفہ کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ تو عرفہ کو نہ جانتے ہوں گے مگر لکھنؤ وغیرہ میں آج سے ایک دن پہلے آفت شروع ہوگئی ہوگی پھر وہ عرفہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس میں صرفہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ سب قصہ پیر جیون کا نکالا ہوا ہے انہوں نے اپنے کھانے کے واسطے ایک تو چودھویں ہی تاریخ سے شب برات شروع کر دی پھر اس کا عرفہ نکالا تاکہ بار بار مٹھائی حلوا ملے واللہ اگر ان کو مٹھائی وغیرہ نہ دو تو یہ خود بدعات سے توبہ کرلیں۔ ان کا آسان امتحان یہ ہے کہ ان سے فاتحہ خوب دلواؤ۔ مولود خوب پڑھواؤ اور کچھ دو دلاؤ نہیں۔ پھر دیکھو جب ان پر مفت کی مشقت پڑے گی وہ خود ان کو بدعات کہنے لگیں گے۔

کانپور میں ایک مولوی صاحب کسی رئیس کے یہاں مولود پڑھنے گئے درمیان میں آپ نے ایک شعر پڑھا اور وجد ظاہر کر کے اپنا کرتہ جھر سے پھاڑ ڈالا۔ یہ معاملہ دیکھ کر گھر والے نے اسی وقت بزاز کے یہاں سے اس بدذات کے واسطے کپڑا منگایا (کیونکہ اس میں ان کی سبکی تھی کہ مولوی صاحب ان کے گھر آئے تھے سر ننگے اور جائیں گے ننگے ۱۲) تو یہ لوگ دنیا وصول کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں کرتے ہیں اگر ان کو کچھ نہ دیا جاوے اس وقت سب بدعات کی

حقیقت خود ہی کھل جائے گی۔ لوگ خواہ مخواہ دلائل سے ان کو طے کرنا چاہتے ہیں حالانکہ حق وناحق کا امتحان اس ترکیب سے با آسانی ہو سکتا ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی گو معقولی تھے مگر خوش عقیدہ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مولود پڑھنا کیسا ہے' فرمایا بڑی برکت کی چیز ہے اس کی ادنیٰ برکت تو یہ ہے کہ مولود خواں کو کم از کم دو حصے تو ضرور ہی ملتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک خان صاحب مولانا کے پاس آئے تھے وہ اس زمانہ میں مستاجری کرتے تھے جس کا بھوپال وغیرہ میں بہت رواج تھا تو مولانا نے خان صاحب سے پوچھا کہ آج کل تو وصولیابی کے دن ہیں آپ یہاں کیسے آگئے۔ خان صاحب بولے کہ میں تو گاؤں کو بڑے پیر صاحب کے سپرد کر آیا ہوں۔ مولانا نے فرمایا اچھا ہم تو اب تک یہ سمجھتے تھے کہ بڑے پیر صاحب ولی ہیں مگر آپ کے قول سے معلوم ہوا کہ پٹھان بھی ہیں جو زمین وجائیداد کا بھی انتظام کر لیتے ہیں۔ غرض ان بدعات کا کچھ خاصہ ہے کہ ان سے عقل بھی خبط ہو جاتی ہے۔

بدعات کا خاصہ

اور منشا سب کا وہی پیٹ کا دھندا ہے۔ یہ پیٹ انسان سے سب کچھ کراتا ہے۔ چنانچہ بدعات شعبان میں بھی انہی حضرات کی برکت کا ظہور ہوتا ہے مسلمان کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جو کام کرے یہ دیکھ لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو کیا ہے یا نہیں یا اشارۃً دلالۃً اس کی ترغیب دی ہے یا نہیں چنانچہ شعبان کی اس رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا حلوا وغیرہ کچھ نہیں پکوایا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا تو تم کیوں کرتے ہو۔ شیخ سعدی نے خوب فرمایا ہے۔

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ۔۔۔ و لیکن میفزائے بر مصطفا

(یعنی زہد و ورع وصدق وصفا میں کوشش کرو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بڑھ نہیں سکتا بلکہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھنا چاہتا ہے وہ اور نیچے کو گر جاتا ہے ۱۲ جامع)

بھلا ان بدعات میں تو بعض منکرات ایسے مختلط ہیں جن کی وجہ سے ان کو مباح بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر کوئی کام منکرات سے خالی بھی ہو اور فی نفسہ مباح ہو لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اختیار نہ کیا ہو تو عارفین اس کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ان ہی کاموں کو پسند کرتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً ثابت ہیں۔

کھانے میں حضرت ضامن شہید کا اتباع سنت

چنانچہ مولانا گنگوہی (قدس سرہ) فرماتے تھے کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ بھائی بزرگوں نے تو ہر لقمہ اور ہر گھونٹ پر الحمد للہ کہنے کی ترغیب دی ہے اور یہی ان کا معمول بھی ہے مگر ہم کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے محبت ہے کہ بس ایک بار شروع کھانے میں بسم اللہ کہہ لے اور ایک بار فراغت کے بعد الحمد لله الذى اطعمنا وسقانا و جعلنا من المسلمين) (الصحيح لمسلم كتاب الذكر والدعاء: ۶۴)

سب تعریف ہے اللہ ہی کے لئے جس نے ہم کو کھلایا اور پلایا اور مسلمانوں میں سے کیا)

کہہ لیا مولانا گنگوہی نے فرمایا کہ حافظ صاحب نے یہ کیا اچھی بات فرمائی اھ اتباع سنت اس کا نام ہے مگر ہم لوگوں نے تو محض نام ہی یاد کر لیا ہے پس اتباع سنت اسی میں ہے کہ اس زمانہ کے متعلق جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہی کیا جائے اور اپنی طرف سے کچھ زیادتی نہ ایجاد کی جائے شعبان کے مہینہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک تو یہ ثابت ہے کہ پندرھویں رات کو کچھ اور راتوں سے زیادہ بیدار رہا جائے۔ دوسرے یہ ثابت ہے کہ پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا جائے اس روزہ کا بہت ثواب ہے اور حکمت اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ نصف شعبان کا وقت مقدار و کیفیت وغیرہ میں رمضان کے وقت کے مماثل ہوتا ہے چنانچہ اس کے بعد رمضان تک دن کی زیادتی کمی میں نمایاں فرق نہیں ہوتا چند منٹوں ہی کا تفاوت ہوتا ہے نیز موسم میں بھی کچھ زیادہ تغیر نہیں ہو سکتا پندرہ دن میں کوئی معتد بہ تفاوت نہیں ہوا کرتا جیسی گرمی ۱۵ شعبان کو ہوگی بس قریب قریب اسی کے کیم رمضان کو ہوگی تو اس دن کے روزہ کی اور اس کی رات کے قیام کی ترغیب میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس دن کا روزہ رکھ کر اور اس کی رات کو جاگ کر امتحان کر لو کہ بس رمضان کا روزہ بھی ایسا ہی ہوگا اور تراویح کی نماز بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اس رات کا جاگنا پھر گھبراتے کیوں ہو میں اس حکمت کا دعویٰ تو نہیں کرتا مگر مجھے یہ حکمت معلوم ہوتی ہے اور گو یہ حکمت مقصود نہ ہو مگر اس دن کے صیام اور رات کے قیام پر یہ فائدہ مرتب تو ضرور ہوتا ہے کہ اس سے رمضان کے صیام و قیام کا نمونہ معلوم ہو کر اس کی ہمت بندھ جاتی ہے اور مجھے یہی حکمت معلوم ہوتی ہے۔

حدیث اذا انتصف شعبان فلا صوم الا عن رمضان (کشف الخفاء للعجلونی ۱:۷۸)

(جب نصف شعبان گزر جائے تو سوائے رمضان کے روزہ نہ رکھا جائے) کی (جب شعبان نصف گزر جائے اور گزر جانے کے ترجمہ سے خود پندرھویں تاریخ کا اس سے خارج ہونا مفہوم

ہو گیا کیونکہ نصف متیقن پندرہویں کے بعد ہی گزرتا ہے نہ اس سے پہلے'' تو رمضان کے سوا اور روزہ نہیں) کہ اس سے بھی رمضان کے لئے ہمت کا تازہ رکھنا مقصود ہے اگر نصف شعبان کے بعد روزے رکھے گئے تو ان سے لحوق ضعف کا اندیشہ ہے جس سے شاید رمضان کے روزوں کی ہمت پست ہو جائے اور اگر نصف شعبان کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہے گی تو وہ ہمت جو ایک روزہ کے امتحان سے پیدا ہو چکی تھی کمزور نہ ہوگی باقی احکام شرعیہ کی مصالح کا احاطہ کون کر سکتا ہے یہ بھی حق تعالیٰ کا انعام ہے کچھ تھوڑی بہت حکمتیں ہم جیسوں کو بھی بتلا دی جاتی ہیں جن سے ضعیف الایمان لوگوں کو تسلی ہو جاتی ہے ورنہ مسلمان کا اصل مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

اب میں ایک مضمون اور بیان کرنا چاہتا ہوں اور اسی پر بیان کو ختم کر دوں گا کیونکہ وقت بہت گزر گیا عصر کی نماز بھی قریب ہے یہ مضمون پہلے ایک علمی رسم سے ظاہر ہو چکا ہے اور اس کی اجمالی کیفیت ایک مختصر تقریر سے معلوم ہو چکی ہے میں مضمون کو بھی اسی آیت میں داخل کرتا ہوں یہ مضمون دستار بندی علما ہے گو اس میں ہم لوگوں کی اغراض مختلف ہو گئی ہیں جن میں بعض اغراض خراب بھی ہیں کہیں اس سے اپنی کارگزاری کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہیں چندہ کی کوشش کے لئے اس قسم کے جلسوں کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اور چندوں میں حدود شرعیہ کا لحاظ نہیں کیا جاتا کہیں اس کی حقیقت اور اس فعل کے درجہ کو واضح نہیں کیا جاتا جس سے عوام کو غلطی اور خود فارغ شدہ جماعت کو بھی دھوکہ ہوتا ہے لوگ ان لوگوں کو ابھی سے مقتدا اور معتمد سمجھنے لگتے ہیں اور خود فارغ شدہ جماعت بھی اپنے متعلق یہ اعتقاد کر لیتی ہے کہ بس ہم آج سے مقتدا ہو گئے باقی اصل مقصود اس تقریب سے تعلیم کا اہتمام اور غیر فارغ شدہ جماعت کو تکمیل کی رغبت دلانا ہے اور حقیقت اس کی وہ ہے جس کو میں عنقریب بیان کروں گا۔ رہا یہ کہ ہماری غرض اس وقت اس تقریب سے کیا تھی سو یہ بات گو مجھے اپنے آپ نہ بیان کرنی چاہئے تھی مگر خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر بیان کرتا ہوں کہ بحمد اللہ یہاں اس تقریب سے نہ مدرسہ کی شہرت مقصود ہے اور اس مختصر جلسہ سے جس کے لئے کوئی تداعی و اہتمام مطلق نہیں کیا گیا اس کا وہم ہی کیا ہو سکتا ہے نہ مدرسہ کی کارگزاری کا اظہار مقصود ہے اور یہ کارگزاری ہی کیا ہو سکتی ہے کہ ساری عمر میں مدرسہ سے ایک طالب علم کی تکمیل ہوئی نہ اس سے کچھ چندہ کی کوشش مقصود ہے کیونکہ یہ دفتر ہی یہاں بند ہے نہ یہاں اس کی سعی ہے نہ مدرسہ سے چندہ کی فہرست اور حساب کی روداد شائع ہوتی ہے محض توکل پر کام چل رہا ہے نہ اس تقریب سے عوام پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ ان فارغ شدہ طالب علم کو آج ہی سے مقتدا اور عالم فاضل سمجھنے لگیں بلکہ محض یہ بتلانا ہے کہ ان صاحب نے ہمارے مدرسہ میں درسیات کی تکمیل

کر لی ہے اور ہمارے نزدیک ان میں استعداد اور مناسبت علوم سے پیدا ہو گئی ہے جس کی شہادت مدرسین مدرسہ نے سند دیکر ظاہر کی ہے باقی محض استعداد و مناسبت سے مقدائیت اور فضل و کمال پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لئے شغل درس تدریس اور کتب دینیہ کا مطالعہ کرتے رہنا ضروری ہے (اور یہی مطلب ہے مدرسین کا سند دینے سے کہ ہمارے نزدیک ان میں استعداد مقتدائیت موجود ہے اگر یہ اس استعداد سے کام لیتے رہیں گے تو ان شاء اللہ ایک دن مقتدا اور معتمد عالم ہو جائیں گے ۱۲) اور دوسری غرض اس تقریب سے وہ ہے جو آیت متلوہ پر اس مضمون کے انطباق سے ظاہر ہو گی۔

دستار بندی وصیت عملی ہے

اس آیت کے اخیر میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ذالکم وصکم به لعلکم تتقون (اللہ تعالیٰ نے تم کو ان کا حکم دیا ہے تا کہ تم متقی ہو جاؤ) میں اس مضمون کو ذلکم وصکم بہ میں داخل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جس طرح اس جملہ میں حق تعالیٰ نے صراط مستقیم کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے اسی طرح دستار بندی اور اعطاء سند بھی وصیت عملی ہے جس سے مقصود فارغ شدہ طالب علم کو اتباع صراط مستقیم کی وصیت مقصود ہے اور ان کو بتلانا ہے کہ تم ہمارے نزدیک عامل شریعت ہو اور مقتدا بننے کی تم میں استعداد پیدا ہو گئی ہے اب ہم تمہاری اس قابلیت کو عملاً ظاہر کرتے ہیں کیونکہ عادۃً حیا دار طبائع کو اس عملی صورت کی لاج بہت ہوا کرتی ہے جس سے وہ اپنے اوپر ایک بار گراں محسوس کرتے ہیں نیز عوام کو بھی اس صورت سے یہ وصیت مقصود ہے کہ یہ فارغ شدہ طالب علم اب عالم ہو گئے ہیں اب ان کا ادب کرنا چاہئے اور ان سے مستفیض ہونا چاہئے (بشرطیکہ یہ اسی شغل میں لگے رہیں) پس جس طرح کہ آیت میں اصل مقصود تاکیدی حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا جس کو مجازاً وصیت سے تعبیر کیا گیا اسی طرح یہاں اس عملی صورت (دستار بندی وغیرہ) سے اصل مقصود تاکیدی حکم ہے ان صاحب کو جن کی دستار بندی کی گئی ہے جس کو مجازاً میں وصیت سے تعبیر کرتا ہوں۔ اب اس مضمون کا تعلق آیت کے اس جزو سے واضح ہو گیا ہو گا۔

نیز انطباق کی ایک تقریر یہ ہو سکتی ہے کہ جن اعمال کی یہاں وصیت ہے ان پر عمل کرنا موقوف ہے علم پر تو عمل کی تاکید مستلزم ہے تحصیل علم کی تاکید کو تو تحصیل علم کو موجب اسعاد سمجھ کر اختیار کرے اور جہل کو موجب ابعاد سمجھ کر ترک کرے اور تیسرے مضمون کے اعتبار سے میں اس بیان کے نام میں ایک اضافہ کر کے الاسعاد والابعاد مع مجلس قباد رکھتا ہوں گو نام لمبا ہو گیا مگر مولوی قباد کے دوست اتنی مشقت برداشت کر لیا کریں گے۔ لمبے نام پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک شخص کی کنیت ابو عبداللہ تھی کسی نے اس سے پوچھا کہ تیری کنیت کیا ہے تو صرف ابو عبداللہ کہتے ہوئے اسے شرم

آئی کہ یہ تو ذرا سا نام ہے تو وہ جواب میں کہتا ابو عبداللہ السمیع العلیم الذی امسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ اس پر ظریف نے کہا مرحبا بک یا ابا نصف القران واقعی خوب ہی ظرافت کا جواب دیا تو ایسے ہی اس وعظ کا نام بھی لمبا ہو گیا اتنا فرق ہے کہ وہاں طول بے ضرورت تھا اور یہاں بضرورت ہے۔

تینوں آیات کے آخر میں ذالکم وصکم کا عجیب نکتہ

اب یہاں آیت کے متعلق ایک نکتہ ہے اس کو بیان کر کے میں ختم کیے دیتا ہوں نکتہ یہ ہے کہ اس جگہ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے) سے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا (یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے) تک تین آیتیں ہیں اور ہر آیت کے ختم پر حق تعالیٰ نے ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا ہے لیکن پہلی آیت کے اخیر میں تو ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) فرمایا اور دوسری آیت کے ختم پر ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (اللہ نے تم کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو) فرمایا اور اس تیسری آیت کے اخیر میں ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب وصیت سب کی مقصود ہے تو اس تفرق عنوان کی کیا ضرورت ہے گو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ مقصود تفنن کلام ہے جو ایک شعبہ ہے بلاغت کا اور کسی نکتہ کے بیان کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی مگر بعض لوگ چلبلے ہوتے ہیں وہ اتنی بات پر کفایت نہیں کرتے بلکہ ان کا ذہن اس سے آگے چلتا ہے تو انہوں نے اس تفرق عنوان میں یہ نکتہ بتلایا ہے کہ پہلی آیت میں جن پانچ امور کا ذکر ہے ان میں سے بجز اساءۃ بالوالدین کے اہل عرب اعتقادی غلطی کرتے تھے کہ امور قبیحہ کو مستحسن سمجھتے تھے صرف اساءۃ بالوالدین (یعنی ماں باپ کے ساتھ برا سلوک کرنے) کو اعتقاداً اچھا نہ سمجھتے تھے اس کے سوا سب میں ان کی اعتقادی غلطی تھی اس لئے باعتبار اکثر کے وہاں تعقلون فرمایا کیونکہ اعتقادیات کا تعلق زیادہ تر عقل سے ہے اور دوسری آیت میں مخاطبین کی کوئی اعتقادی غلطی نہ تھی بلکہ وہ احکام عمل کے متعلق ہیں جن میں وہ تغافل وسہو کرتے تھے اس لئے وہاں تذکرون مناسب ہوا۔ اور تیسری آیت میں کسی خاص حکم کا بیان نہیں بلکہ عام حکم ہے اتباع صراط مستقیم کا تو وہاں

تکوین مناسب ہوا کیونکہ تقویٰ بھی شرعاً عام ہے جس کا تعلق عقائد و اعمال وغیرہ سب سے یکساں ہے تو بعض عقلاء نے یہ نکتہ بیان کیا ہے اگر کسی کو پسند ہو تو اس کو اختیار کرے۔

گناہوں سے بچنے کی ہمت کی آسان ترتیب

ورنہ اس کی کوئی ضرورت ہے نہیں اور بظاہر یہ نکتہ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو لطائف تھے مگر اصل مقصود میرا وہی مراقبہ ہے کہ ہر کام اور ہر حرکت وسکون میں یہ سوچا جائے کہ یہ فعل آخرت کے لئے معین ہے یا مضر اگر معین ہو تو اس کو کیا جائے اگر مضر ہو تو نہ کیا جائے اس طرح ان شاء اللہ بہت جلد معاصی سے اجتناب کی ہمت پیدا ہو جائے گی اور جو اس سہل ترکیب سے بھی کام نہ لے تو وہ اپنے ہاتھوں محروم ہونا چاہتا ہے اس کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمادیں اور عمل کی توفیق دیں اور ان فارغ شدہ طالب علم کے لئے بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان کو صراط مستقیم پر چلائے اور ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں۔ آمین۔

وصلی اللہ علی سیدنا و مولانا محمد و علی اٰلہ واصحابہ اجمعین

اشرف المواعظ

(حصہ دوم)

الخلط

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ارشاد فرمایا۔

اعمال صالحہ میں نیت حق تعالیٰ کے خوش کرنے کی اور اصلاح باطن کی رکھے اور گناہ اگر ہو جائیں تو ندامت اور اعتراف کرے اور بزرگوں کی صحبت اختیار کرے۔ اس سے ان شاء اللہ خلط کی حالت جاتی رہے گی' اور اعمال صالحہ ہی کو غلبہ ہو جاوے گا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِھِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْھِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (التوبۃ آیت ۱۰۶)

ترجمہ: اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم آنے تک ملتوی ہے کہ ان کو سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا حکمت والا ہے۔

شان نزول

یہ ایک آیت ہے سورہ توبہ کی اس کا شان نزول ایک خاص قصہ ہے مگر مجھ کو اس سے ایک عام مضمون استنباط کرنا مقصود ہے اور وہ مضمون ہے فی نفسہ قدیم۔ مگر چونکہ کانوں میں اس عنوان اور طرز خاص سے نہیں پڑا اس لئے نیا معلوم ہوگا۔ اور یہ میں نے اس لئے کہہ دیا کہ عوام کو عادت ہوگئی ہے کہ سن کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ تو میں اول ہی کہہ دیتا ہوں کہ گو باعتبار معنوں کے یہ مضمون نیا ہو لیکن یہ مضمون جو کہ ان کی امیدوں کے باغ کو سرسبز کرنے والا اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنے والا اور شکستہ دلوں کو قوی کرنے والا ہے۔ اس معنی کو جدید ہوگا کہ اس اسلوب خاص سے ان کے کان اس کے آشنا نہیں ہوئے اور اگرچہ میری طبیعت آج مضمحل تھی۔ اور ارادہ بھی بیان کا نہ تھا۔ لیکن اس مضمون کی جدت اور بعض عزیز مہمانوں کا آنا اس کا باعث ہوا کہ اس کو بیان کروں۔ اور اس

وجہ سے ممکن ہے کہ مختصر ہو۔اور ممکن کا لفظ اس لیے کہا کہ اختصار وتطویل غیر اختیاری ہے۔اس لئے شاید کچھ تطویل بھی ہو جائے تو عجب نہیں۔اولاً میں اس آیت کا شان نزول بیان کرتا ہوں۔اس کے بعد اس مقصود کو مصرحا بیان کروں گا۔مصرحا اس لئے کہا کہ شان نزول سے اس کی اشارۃ تعیین ہو جاوے گی۔اور نیز شان نزول سے یہ آیت حل بھی ہو جاوے گی۔اور اسی پر میرا مقصود موقوف ہے۔

قصہ یہ ہوا تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مقام تبوک کا سفر فرمایا تھا۔یہ مقام مدینہ طیبہ سے دور ہے شام کی جانب ہے اور گرمی کی اس زمانہ میں شدت تھی۔اور نیز مسلمانوں پر اس وقت تنگی بھی تھی۔غرض بہت سے موانع جمع تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ میں معمول سے زیادہ اہتمام فرمایا۔اور روانگی اس طرف ہوگئی۔بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم ساتھ گئے اور بعض رہ گئے۔رہنے والے اکثر تو منافقین تھے ان کے رہنے کی وجہ تو نفاق تھا۔اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی بوجہ کسل کے رہ گئے اور نیز بعضے کام کرنے والے بوجہ قرائن مقامیہ وحالیہ یہ بھی سمجھا کرتے ہیں کہ سب کی شرکت اس واقعہ میں ضروری نہیں۔لیکن چونکہ حضور نے اس سفر کا مزید اہتمام فرمایا تھا۔اس لئے متخلفین پر ملامت بھی ہوئی۔لیکن منافقین پر تو اور قسم کی ملامت ہوئی۔اور متخلفین پر ملامت بطور شکوہ کے ہوئی اس لئے کہ شکایت محل ود پر ہی ہوا کرتی ہے۔لیکن اس سے متخلفین کی شان میں کسی قسم کا شبہ نہ کرنا چاہئے۔اس لئے کہ ایسا عتاب منافی محبت کے نہیں۔

خود حضور جو کہ احب الخلق الی اللہ ہیں کہ ملائکہ اور جنات اور انسانوں میں کوئی آپ سے افضل نہیں۔خود آپ کے بھی ایسے شکوے ہوئے ہیں۔اور چونکہ اس وقت میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضور کی رسالت کو تسلیم کئے ہوئے ہیں۔یعنی اہل اسلام اور ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں شبہات نکالتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں اس لئے ان پر احتجاج کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قسم کی شکایت کا ہونا کافی ہے۔چنانچہ سورہ عبس میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف ملتفت نہ ہونے پر حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی۔پھر جب حضرت عبداللہ تشریف لاتے تو حضور فرماتے مرحبا بمن عاتبنی فیه ربی. یعنی آیئے آیئے میاں تمہاری وجہ سے تو مجھ پر میرے رب کا عتاب ہوا تھا۔پس ایسا عتاب موجب نقص شان تو کیا ہوتا بلکہ زیادتی خصوصیت کی علامت ہے اور اس میں بڑا لطف ہے۔وہ شخص خوب جانتا ہے جو محبت کی چاشنی سے آشنا ہے کہ محبوب کے عتاب وشکایت میں کیا مزہ ہوتا ہے۔بنو سلمہ وبنو حارثہ دو قبیلے ہیں۔غزوہ احد میں جبکہ ہزیمت ہوئی تو کچھ ان میں بھی سستی آ گئی تھی۔لیکن بظاہر میں کوئی امر مقتضاء سستی کا واقع نہ ہوا تھا۔حق تعالیٰ نے ان کے بارہ میں نازل فرمایا اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا یعنی یاد کرو جبکہ دو جماعتوں نے تم میں سے ارادہ کم ہمتی اور بزدلی کا کیا تھا۔اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے۔یعنی ان سے اس کا ظہور نہیں ہونے دیا۔

شان مرادیت

یہاں سے بطور جملہ معترضہ کے ایک کام کی بات سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ اس سے ایک مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ جس کو صوفیہ کرام نے لکھا ہے وہ یہ ہے کہ بعض بزرگوں کے اندر مرادیت کی شان ہوتی ہے۔ اس کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ گناہ کرنا بھی چاہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو محفوظ رکھتے ہیں۔ گناہ کا صدور ان سے ہونے نہیں دیتے ایسے حضرات کو محفوظ کہا جاتا ہے۔ بنوسلمہ اور بنوحارثہ کی بھی یہی شان معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یوں نہیں فرمایا اذا فشلت بلکہ یہ فرمایا همت ان تفشلا یعنی ان سے فشل کا وقوع نہیں ہوا بلکہ هم فشل ہوا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے اس لئے ان کی حفاظت فرمائی۔ پس اس آیت میں ان پر ایک عتاب کی صورت اور بظاہر ان کے ایک نقص کا اظہار ہے مگر وہ واللہ ولیھما کے نزول سے اس قدر بشاش تھے کہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم سے هم فشل نہ ہوتا اور یہ آیت نازل نہ ہوتی تو ہم کو اس قدر مسرت نہ ہوتی جس قدر کہ اب ہے۔ پس ایسا عتاب اور ایسے شکوے شکایت سے تو ان حضرات کی اور زیادہ علوشان ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وان رغم انف ابی ذر یعنی ضرور ایسا ہی ہوگا اگرچہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی ناک مٹی میں ملے یعنی کو تمہاری مراد کے خلاف ہو۔ جب ابوذر رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان فرماتے تو مزہ لینے کے لئے وان رغم انف ابی ذر بھی فرمادیا کرتے تھے۔

حکایت حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ ان کے ایک خلیفہ خاص حج کو جانے لگے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب تم بارگاہ نبوی میں حاضر ہو تو میرا بھی سلام عرض کر دینا جب پہنچے تو سلام عرض کیا جواب میں ارشاد ہوا کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ بدعتی اس لئے فرمایا کہ شاہ صاحب کبھی کبھی دو چار شعر سن لیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کی طرح مجلس جما کر کہ جس میں عوام اور ہوا پرستوں کا ہجوم ہوتا ہے نہیں سنتے تھے۔ اس لئے آج کل کے اہل سماع اس سے استدلال نہیں کر سکتے۔ اور ان مجالس مخترعہ پر کسی طرح دلیل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر غور کیا جاوے تو جیسا حضرت شاہ صاحب نے سنا ہے اس پر بھی انکار حضرت کی نبوت سے سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ یہ جواب حضور کا جیسے شاہ صاحب کی علوشان کی طرف شعر ہے ایسے ہی اس فعل کی ناپسندیدگی کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ گو شاہ صاحب نے غلبہ حال میں سنا ہے اور وہ معذور بھی ہیں۔ لیکن سنت کے خلاف تو ضرور کہا جاوے گا۔ القصہ جب وہ خلیفہ حج

کر کے واپس آئے تو حضرت شاہ صاحب نے پوچھا کہ ہمارا سلام بھی عرض کیا تھا کہا کہ حضرت عرض کیا تھا۔ حضور نے بھی سلام فرمایا ہے۔ فرمایا کہ نہیں اسی طرح کہو جس طرح ارشاد ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ کو تو معلوم ہی ہے پھر آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ فرمایا کہ نہیں میں وہی لفظ سننا چاہتا ہوں سننے میں اور ہی مزہ ہے انہوں نے اسی طرح کہہ دیا کہ یوں ارشاد ہوا تھا۔ شاہ صاحب پر اس وقت ایک حالت طاری ہوئی اور یہ شعر پڑھا ۔

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خارا

(مجھ کو تو نے برا کہا، میں خوش ہوں، اللہ تجھے معاف کرے تو نے صحیح بات کہی تیرے شیریں ہونٹوں کیلئے یہی تلخ جواب مناسب ہے)

غرض اہل محبت ایسے عتاب کا لطف جانتے ہیں۔ پس اگر صحابہ رضی اللہ عنہم پر عتاب ہوا بھی ہے تو وہ اس قسم کا تھا۔ الحاصل جب ان متخلفین کی جماعت نے سنا کہ حضور واپس تشریف لا رہے ہیں تو جو ضعیف الایمان یا منافق تھے ان کو تو خیالات اور وساوس نے گھیرا کہ کیا بات بناویں جس سے ہماری نجات ہو۔ کسی نے کوئی عذر تراشا کسی نے کوئی حیلہ گھڑا اور جو متخلفین تھے ان میں بعض تو حیران رہ گئے کہ کیا کہیں۔ اور بعض وہ تھے کہ انہوں نے عزم کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو جو امر واقعی ہے وہ عرض کر دیں گے۔ چنانچہ جب حضور تشریف لائے تو یہ متخلفین حاضر ہوئے۔ پہلی جماعت نے تو جو حیل اور اعذار سوچ تھے عرض کر دیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بالکل تعرض نہ فرمایا۔ اور بعض نے سچا حال عرض کر دیا کہ یا رسول اللہ کوئی عذر نہ تھا۔ ہم کو کسل رہا اور بعض نے اپنے عزیزوں سے کہا کہ ہم کو کھمبوں سے باندھ کر کھڑا کر دو۔ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ حضور کو منہ دکھلاویں۔ وہ عزیز بھی ایسے تھے کہ انہوں نے کچھ مزاحمت نہیں کی۔ آج کل تو جو اللہ تعالیٰ کے رستہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بزرگوں کی خدمت میں آمد ورفت رکھتا ہے یا کسی کی اولاد انگریزی چھوڑ کر علم دین پڑھتی ہے یا کوئی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو اس سے مزاحمت کرتے ہیں ہاں اگر کوئی شخص سچا نائب ہو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور وہ اپنے اتباع کی کسی افراط یا تفریط پر مزاحمت کرے تو دوسری بات ہے۔ لیکن عزیزوں کی مزاحمت اس قبیل کی نہیں ہے اور اکثر لوگ تو ان مزاحمتوں اور روک ٹوک سے کچے ہو جاتے ہیں اور ہٹ جاتے ہیں۔ اور بعض کے اندر اور پختگی زیادہ ہو جاتی ہے۔

حکایت حضرت شیخ عبدالحق ردولوی

حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ بچپن میں رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے تھے اور ذکر اللہ کیا

کرتے تھے۔ ماں دیکھ کر کڑھتی تھی اور مزاحمت کرتی تھی۔ اگرچہ وہ براہ شفقت ہی کرتی تھی لیکن حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہ ماں کدھر سے ہے یہ تو راہزن اور ڈاکو ہے۔ اس جگہ کا رہنا چھوڑ دیا اور دہلی تشریف لے آئے۔ وہاں طالب علمی شروع کی۔ نحومیر یا ایسی ہی کسی کتاب میں مثال آئی ضرب زید عمرواً۔ مارا زید نے عمرو کو پوچھا عمرو نے کیا قصور کیا تھا کیوں مارا استاد نے کہا کہ صاحبزادہ یہ تو فرضی مثال ہے۔ فرمایا تو جھوٹ ہے۔ فرمایا میں ایسی کتاب نہیں پڑھتا جس میں جھوٹ یا ظلم کی تعلیم ہو اس زمانہ کے ایک شاہزادہ تھے انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ ان کو چھوڑ دو یہ اور کام کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ شاید اس قصہ کو سن کر بعض لوگ خود رائی کر کے ماں باپ کو اس بناء پر چھوڑ دیں کہ اپنے آپ کو بھی ان پر قیاس کرنے لگیں تو یاد رکھنا چاہئے کہ نہ تو نیک کام ماں باپ یا کسی کے کہنے سے چھوڑنا چاہئے اور نہ ماں باپ سے مہاجرت اور قطع تعلق چاہئے۔ وہ تو مغلوب الحال تھے اس لئے معذور تھے۔ کوئی اور اگر ایسا کرے گا تو چونکہ خود رائی سے ہوگا اس لئے وہ مذموم اور منہی عنہ اور رائے کا اتباع ہوگا۔ اور منشا اس کا خود بینی و خود رائی ہوگا اور خود رائی کی نسبت حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　کفر است دریں مذہب خود رائی و خود بینی

(اپنی فکر اور اپنی رائے عالم رندی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی خود رائی اور خود بینی اس مذہب میں مضر ہے)

حاصل یہ ہے کہ مزاحمتوں سے متاثر بھی نہ ہو اور نہ عزیزوں سے بدون وجوب شرعی قطع تعلق کرے۔ البتہ اگر وہ کچھ زیادتی کریں یا قطع کر دیں تو دوسری بات ہے۔ غرض اس وقت کے عزیز بھی ایسے تھے کہ انہوں نے کہا کہ ہم کو ستونوں سے باندھ دو۔ انہوں نے باندھ دیا ان کے بارے میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی چنانچہ ارشاد ہے وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ شروع رکوع سے ان مخلفین کی فضیلت کا بیان ہے کہ جو ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گئے اور اس کے بعد منافقین کا ذکر ہے۔ اس کے بعد یہ آیت ہے جس کا حاصل یہ ہے اور ایک گروہ اور ہے جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا۔ گو فعلاً سہی۔ انہوں نے عمل صالح اور عمل بد دونوں کو خلط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عنقریب ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرما دیں گے اور اللہ بخشنے والے رحم فرمانے والے ہیں۔ اور بعض ایسے تھے کہ پہلے سے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا کریں مگر تشریف آوری کے بعد سچ کہہ دیا اور ان کو مہلت دی گئی ان کی شان میں ارشاد ہے وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ یعنی ایک گروہ اور ایسا ہے کہ اللہ کے حکم کے واسطے میعاد دیئے گئے ہیں یا تو ان پر اللہ تعالیٰ رجوع فرما دیں یعنی ان کی توبہ قبول فرما دیں اور یا ان کو عذاب دیں۔ اور ان کے لئے

یہ حکم ہوا کہ ان سے کوئی نہ بولے نہ بیوی نہ بچے نہ دوست۔ اب جدھر جاتے ہیں سناٹا ہے جماعت کی نماز پڑھنے کے لئے جاتے تھے۔ لیکن کوئی ان سے نہ بولتا تھا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور انکے احباب کے واقعات

ان میں سے ایک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دو دوست تھے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں تو جری تھا اپنے سب کام کرتا تھا اور سب جگہ آتا تھا جاتا تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی جاتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم منہ پھیر لیتے تھے۔ لیکن جس وقت میں نہ دیکھتا تھا تو حضور مجھ کو دیکھتے تھے اور میرے جو دو دوست تھے وہ ذرا ضعیف تھے انہوں نے یہ کیا کہ بس گھر میں بیٹھ کر رونا شروع کیا۔ اور فرماتے ہیں کہ مجھ کو زیادہ فکر اس کا تھا کہ اگر اس مدت میں میں مر گیا تو کیا حشر ہوگا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر اس میعاد میں وفات ہوگئی تو پھر اس حکم کو منسوخ کرنے والا کون ہوگا۔ یہ تصور بندہ کر سخت قلق تھا۔ حق تعالیٰ نے بھی ان کی اس حالت کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ یعنی ان پر تنگ ہوگئی زمین باوجود اس کی کشادگی کے اور تنگ ہوگئی ان پر ان کی جانیں اور انہوں نے یقین کرلیا کہ کوئی ٹھکانا نہیں اللہ سے مگر اس کی ہی طرف۔ اللہ اکبر ان حضرات کو کیا عشق تھا اور کیا استقامت تھی۔ اسی مدت میں شاہ غسان کو اس واقعہ کی خبر ہوئی اس نے کعب بن مالکؓ کے نام خط لکھا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا ہے۔ اور تمہاری قدر نہیں جانی۔ آپ یہاں آجایئے آپ کی قدر افزائی کی جاوے گی۔ اور منشا اس کا یہ تھا کہ یہ سازش تھی اس بات کے لئے کہ ان میں سے بڑے بڑے آدمیوں کو میں توڑ لوں پس جب آدمی خط لے کر آیا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہاں ہیں۔ تو لوگ بولے نہیں۔ اللہ اکبر اتباع اور اطاعت اور احتیاط اس کو کہتے ہیں کہ ان کے متعلق بھی اگر کوئی شخص پوچھتا تو جواب نہ دیتے تھے۔ اشارہ کردیا کہ یہ ہیں اسی طرح کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ایک اور قصہ بیان فرماتے ہیں کہ میرا ایک چچازاد بھائی تھا ایک مرتبہ وہ باغ میں تھا میں بھی وہاں جا پہنچا تو مجھ سے بولے نہیں۔ مجھ کو سخت رنج ہوا پس جب انہوں نے یہ خط دیکھا تو بہت پھوٹ کر روئے کہ اللہ اکبر اب میں اس حالت کو پہنچ گیا کہ غیر لوگ میرے بارہ میں طمع کرنے لگے ہیں۔ اور کچھ جواب نہیں دیا اور خط تنور میں جھونک دیا۔ غرض اس طرح پچاس دن گزرے اس کے بعد حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی چنانچہ آیت وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللّٰهِ کے بعد آیت لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ الخ میں ان ہی کی قبول توبہ کا ذکر ہے اور آیت واخرون اعترفوا الخ میں ان ستون سے بندھنے والوں کے لئے قبول توبہ کی بشارت ہے اخرون اس

آیت میں مبتدا ہے اور تصحیح ابتدائیت کے لئے قوم مقدر ہے خلطوا حال ہے اعترفوا کی ضمیر سے ترجمہ آیت کا پہلے گزر چکا ہے یہاں اس کی کچھ تفسیر عرض کی جاتی ہے اعتراف یہاں اعتراف فعلی کو فرمادیا کہ ستونوں سے اپنے آپ کو بندھوادیا۔ عملاً دکھلادیا کہ ہم سے بڑا جرم ہوا ہے۔ اور حالت ان کی یہ ہے کہ عمل صالح یعنی اعتراف ذنوب کو عمل بد یعنی تخلف عن غزوہ تبوک کے ساتھ ملادیا۔

جہاد فرض عین اور فرض کفایہ

اس مقام پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاد میں جانا تو فرض کفایہ ہے جب ایک جماعت نے اس فرض کو ادا کرلیا تو سب کی طرف سے ادا ہوگیا۔ پھر وَّاٰخَرَ سَیِّئًا کے کیا معنی ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کے لئے امر عام فرمایا تھا اس لئے وہ فرض عین ہوگیا تھا اور حضور کی شان تو اعلیٰ وارفع ہے۔ اگر امام المسلمین کسی امر مباح کا بھی امر کردے تو وہ فرض عین ہوجاتا ہے آگے ارشاد ہے عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رجوع فرمادیں گے۔ یہ شاہی محاورہ ہے چنانچہ حکام کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تمہارا یہ کام ہوجاوے۔ اور مقصود وعدہ حتمی ہوتا ہے اور یہاں تو وعدہ سے بڑھ کر وقوع ہوگیا تھا۔ چنانچہ ستونوں سے کھلوادیئے گئے تھے۔ اور اس محاورہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بادشاہی عطا فرماتے ہیں۔ اس میں ایک خاص شان اور آن پیدا ہوجاتی ہے۔

کلام الٰہی کی ایک عجیب شان

جس کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اس کے فعل اور قول میں ایک انداز حاکمانہ ہوتا ہے۔ پس وعدہ بھی اگر کسی سے کرتے ہیں تو وعدہ کے صیغہ سے نہیں کرتے۔ اس لئے کہ وعدہ ہو تو پھر دوسروں کو مطالبہ کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اور یہ ایک قسم کی مغلوبیت ہے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ تم کو امید رکھنا چاہئے اور کہتے ہیں کہ شاید ہم ایسا کردیں۔ اور چونکہ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین اور سب بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اس لئے بھی ان کے کلام کا بھی انداز ہے بلکہ مخلوق کے کلام میں خواہ وہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہو کسی نہ کسی جگہ مغلوبیت اور مقصودیت کا انداز ضرور آجائے گا اس لئے کہ وہ فطرۃً ایک زبردست قوت کا مغلوب ہے اور حق تعالیٰ کے کلام میں اول سے آخر تک دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے دبنے والا نہیں اور سب پر غالب ہے۔

ترجمہ قرآن شریف کیلئے ایک ضروری ہدایت

یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن شریف کا ترجمہ اگر کیا جاوے تو اس میں اس شان

کلام کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہئے کہ شاہی محاورات آ دیں۔ بازاری محاورے سے نہ ہوں۔ آج کل ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ قرآن شائع ہوا ہے۔ اور لوگ اس پر بامحاورہ ہونے کی وجہ سے فریفتہ ہیں۔ لیکن انہوں نے علاوہ مضامین میں غلطیاں کرنے کے محاورہ کے اس قدر پیچھے پڑے ہیں کہ اس شاہی انداز کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ **یعمھون** کا ترجمہ کیا ہے کہ ٹامک ٹوئیاں مارا کریں۔ یہ نہایت گنوار محاورہ ہے۔ اس کے محاورہ ہونے میں تو کلام نہیں۔ لیکن یہ محاورہ ہے گنواروں بلکہ سڑیل عورتوں کا۔ جیسے قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ غالی غیر مقلدوں کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہتے ہیں اس میں شک نہیں کہ عامل بالحدیث ہیں لیکن کلام اس میں ہے کہ کس کی حدیث مراد ہے۔ حدیث الرسول پر عامل نہیں حدیث النفس پر عامل ہیں ایک شعر بھی مجھے اسی مضمون کا یاد آیا۔

واعظ شہر کہ مردم ملکش میخوانند ۔۔۔ قول ما نیز ہمیں است کہ آوردم نیست

(واعظ شہر کو لوگ جس کو بادشاہ کہتے ہیں ہمارا قول بھی یہی ہے مگر یہ لایا ہوا قول نہیں ہے)

بس ایسا ہی یہ ترجمہ ہے کہ بامحاورہ تو ہے لیکن گنوار محاورہ ہے۔ شاہی محاورہ نہیں ہے۔ اور یہاں سے ایک اور اشکال بھی حل ہوا وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں عسی یا لعل آیا ہے وہاں مفسرین نے اشکال کیا ہے حق تعالیٰ کو تو علم ما کان وما یکون پھر عسی اور لعل کے کیا معنی۔ پھر اس کے مختلف جواب دیئے ہیں لیکن تقریر مذکور پر کوئی اشکال ہی نہیں۔ نہایت بے تکلف اور لطیف معنی ہیں پس عسی اس آیت میں وعدہ ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ میں خلاف نہیں ہوتا چنانچہ اس وعدہ کے ساتھ ہی توبہ بھی قبول ہوگئی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خود تشریف لے جا کر اپنے دست مبارک سے کھول دیا۔ اور اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں کچھ مال بھی لائے کہ ہماری طرف سے نیک راہ میں صرف فرما دیجئے۔ اور اس پر آیت خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (ان کے اموال میں سے صدقہ لیں) نازل ہوئی جیسا وَاٰخَرُوْنَ مرجون کے مورد میں بھی کعب بن مالک نے اپنی توبہ قبول ہونے کی خوشی میں اپنا تمام مال حضور کے سامنے پیش کر دیا تھا کہ اس کو جہاں چاہیں صرف کریں کہ اسی کی وجہ سے مجھ کو تخلف کی نوبت آئی۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان

سبحان اللہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کیا ایمان تھا۔ ہمارے مقبول ہونے کے کچھ آثار ہم کو اگر موہوم ہو جاویں۔ اور کوئی بات بزرگی کی اپنے اندر پاویں تو برعکس ہم اوروں ہی سے امیدوار ہوں کہ ہم کو کچھ نذر پیش کریں۔ اس لئے کہ ہم اب بزرگ اور مخدوم ہو گئے۔ غرض دین کا کام کر کے بھی اس کے عوض میں متوقع دنیا ہی کے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک سب انسپکٹر

کی بیوی نماز پڑھا کرتی تھی تو وہ اس کو کہا کرتے تھے کہ نیک بخت تجھ کو نماز پڑھنے سے کیا ملا کرتا ہے۔ افسوس ہم لوگوں کے اندر دنیا ایسی رگ و ریشہ میں گھسی ہے کہ ہر امر میں اسی کو قبلہ و کعبہ بنا لیا ہے۔ اگر کوئی توبہ کر کے اعمال صالحہ میں مشغول ہوتا ہے تو اسی دن سے منتظر ہو جاتا ہے کہ میرے مال میں برکت ہو گی۔ کہیں سے کچھ ملے گا۔

ہمارے اعمال کی مثال

حالانکہ صاحبو کیا ہمارے اعمال اس قابل ہیں کہ ہم کو ان پر اجر کی توقع ہو۔ واللہ اگر سزا ہی نہ ہو تو غنیمت ہے۔ کیونکہ ہمارے ان اعمال کی تو ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی نمک حرام باورچی کھانا روزمرہ بگاڑ دیا کرے۔ اور آقا اس کو بجائے سزا کرنے کے اس کا قصور معاف کر دیا کرے۔ اور وہ بزعم خود یہ سمجھ کر کہ میں نے کھانا پکایا ہے یہ کہے کہ کچھ دلوایئے آقا جواب دے گا کہ کس بات کا مانگتا ہے۔ ارے اسی کو غنیمت سمجھ کہ میں نے سزا نہیں کی۔ یہی حالت ہمارے اعمال کی ہے کہ جب وہ موافق شرائط کے نہیں ہوتے تو گویا ہم بگاڑ رہے ہیں پھر انعام کی توقع کیسی۔ البتہ ہم کو اس شکر کے طور پر کرنا چاہئے کہ ہم کو عمل کی توفیق ہوئی۔

کلام اللہ کی شان بلاغت

بلکہ بعض آیات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے اگرچہ وہ آیت درجہ وجوب میں منسوخ ہے کہ اگر اعمال صالحہ کی نیت بھی ہو جب بھی کچھ خرچ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَةً۔ یعنی اے ایمان والو جب تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوشیدہ بات کرنا چاہو تو پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔ مناجات رسول ظاہر ہے کہ اعمال صالحہ میں سے ہے۔ پس اس کے ارادہ پر صدقہ دینے کا حکم ہوا۔ اور سبحان اللہ کیا بلاغت ہے۔ یوں نہیں فرمایا فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نفقة (کچھ پہلے صدقہ دیا کرو) اس لئے کہ اس میں کسی ملحد کو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ ان کے رسول نے بھی اپنی کمائی کے بھی خوب ڈھنگ نکال رکھے تھے۔ اب یہ شبہ ہی نہیں ہو سکتا اس لئے کہ صدقات واجبہ کا مال جیسا کہ صیغہ امر سے اس صدقہ کا وجوب معلوم ہوتا ہے حضور اور حضور کی اولاد کے لئے بلکہ مطلق بنی ہاشم کے لئے حرام تھا۔ اس لئے کہ صدقہ کو اوساخ الناس فرمایا ہے۔ ہاں صدقات نافلہ بنی ہاشم کے لئے جائز ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ بھی حرام تھے۔ آج کل جن لوگوں نے سادات کے لئے زکوٰۃ دینے کا فتویٰ دیا ہے سخت غلطی کی ہے۔ حضور کا یہ شرف ہے کہ آپ اور آپ کی اولاد کے لئے اموال زکوٰۃ و صدقات واجبہ حرام کئے گئے ہیں غرض ان احکام کے بعد اب کس منہ سے کوئی بیاعتراض کر سکتا ہے اور اگر کوئی کہے کہ گو صدقات واجبہ حرام کر دیئے

لیکن صدقات نافلہ تو جائز ہیں۔ تو اپنی اولاد کے لئے یہ مد تو رکھا تو جناب نے اس کے لئے حق تعالیٰ سے عرض کر کے ایک بند لگا دیا ہے۔ چنانچہ دعا فرمائی ہے اللھم اجعل رزق ال محمد قوتاً (الصحیح المسلم: ۳۰۷ بلفظ آخر) یعنی اے اللہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رزق قوت کیجئے۔ یعنی ان کو اتنا ہی ملے جس سے گزر کر لیں۔ پس حق تعالیٰ سے بھی عرض کر گئے کہ ان کو زیادہ نہ ملے۔

تسبیحات سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کا شان ورود

حدیث شریف میں قصہ وارد ہوا ہے کہ سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دست مبارک میں چکی پیسنے سے چھالے پڑ گئے تھے ان سے کہا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں غلام باندی بہت آتے ہیں ایک آپ بھی مانگ لیں۔ چنانچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لے گئیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ میں اس وقت تشریف نہ رکھتے تھے۔ جب حضور تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت صاجزادی صاحبہ کا تشریف لانا ذکر فرمایا۔ حضور خود ان کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت لیٹی تھیں۔ اٹھنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اسی حالت سے رہو۔ فرمایا اے فاطمہ رضی اللہ عنہا تم لونڈی غلام کی درخواست کرتی ہو کیا تم کو اس سے اچھی اور بہتر شئے نہ بتاؤں۔ جب تم سونے لگو تو سبحان اللہ (۳۳ بار) الحمد للہ (۳۳ بار) اور اللہ اکبر (۳۴ بار) پڑھ لیا کرو۔ یہ لونڈی غلام سے بہتر ہے سیدۃ النساء اس پر راضی ہو گئیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے نعم اور دنیا کو مطلقاً پسند نہیں فرمایا۔ چہ جائیکہ صدقات واجبہ وہ تو حرام تھے ہی اس لئے آیت میں لفظ صدقہ فرمایا جس کا صرف کرنا اپنے لئے آپ کو اور آپ کے اہل بیت کو جائز ہی نہ تھا تا کہ یہ شبہ ہی بالکل زائل ہو جاوے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ اپنے لئے آمدنی کا طریقہ نکالا تھا اس لئے کہ صدقہ کا قانون اور ایکٹ معلوم ہے کہ وہ رقم حضور کے یہاں نہ آوے گی پس جب یہ قانون ہوا تو لوگ ڈر گئے اس لئے کہ بعضوں کے پاس روپیہ تھا اور بعضوں کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنے کے سب دلدادہ اور شیفتہ تھے۔ اس قانون پر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ عمل کرنے پائے تھے کہ فوراً دوسری آیت اس کی ناسخ نازل ہوئی۔ ءَ اَشۡفَقۡتُمۡ اَنۡ تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىكُمۡ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذۡ لَمۡ تَفۡعَلُوۡا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيۡكُمۡ الخ یعنی کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے صدقات پیش کرو۔ پس جب تم نے نہ کیا (بوجہ غیر مستطیع ہونے کے) اور اللہ تعالیٰ نے تم پر رجوع فرمالیا (یعنی اس حکم کو منسوخ کرنے سے تم پر رحمت فرمائی الخ) سبحان اللہ قرآن شریف کی کیا بلاغت ہے اول آیت میں تو صدقہ لفظ مفرد سے فرمایا اور دوسری آیت میں صدقات کو جمع کے صیغے سے لائے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ہمارے بندے ہمارے رسول صلی اللہ

علیہ وسلم کے ایسے چاہنے والے ہیں کہ ان کو بغیر رسول سے بات کئے ہوئے چین نہ آوے گا اور بہت سے صدقات دینے پڑیں گے۔ خیر میری غرض اس آیت اور اس کے شان نزول کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ اعمال صالحہ کی توفیق ہونے کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ اس پر کچھ خرچ کرنا چاہئے۔ چنانچہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سورہ بقرہ ختم ہوئی ہے تو انہوں نے ایک ایسی اونٹنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذبح کی تھی جس کی ان کو تین سو اشرفیاں ملی تھیں۔ آج تو سارا قرآن شریف یاد ہونے پر اگر حافظ جی کو پانچ روپیہ دے دے تو گویا حافظ جی کو خرید لیا۔ اس زمانہ میں مولوی اور معلم قرآن اور مسجد کے موذنوں کی کچھ قدر نہیں۔ خیر مولویوں کی تو کچھ تھوڑی بہت ہے بھی لیکن قرآن شریف پڑھانے والوں کی تو کچھ بھی نہیں، بہت سے بہت تنخواہ حافظ کی مقرر کریں گے تو چار یا پانچ روپیہ۔

موذن کی فضیلت

اور بیچارے موذنوں کو تو کون پوچھتا ہے ان کو تو بہت ذلیل اور اپنا خادم سمجھتے ہیں۔ سب کام موذنوں کے ہی ذمہ ہے۔ پانی گرم کرنے کے لئے۔ گوبر اور کوڑا لانا بھی اسی کے ذمہ ہے۔ اور محلہ بھر کے گھروں کا کام کرنا بھی اس کے ذمہ سمجھا جاتا ہے۔ صاحبو! موذنوں کی حدیث شریف میں بڑی فضیلت آئی ہے۔ ان کی قدر کرنا چاہئے۔ یہ سرکاری آدمی ہیں سمن الٰہی لانے والے ہیں۔ دیکھو اگر سمن لانے والے چپڑاسی کی کوئی اہانت کرے تو سخت جرم ہے۔ اسی طرح ان کی عزت کرنا چاہئے اور موذنوں کو بھی چاہئے کہ اپنے منصب کی حفاظت کریں۔ یعنی افعال ناشائستہ سے احتراز کریں۔ اور قرآن شریف کے پڑھانے والوں کی بھی قدر کرنا چاہئے۔ حدیث شریف میں ہے تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن شریف کی تعلیم کرے۔ ہمت سے زائد ان کی خدمت کرو۔ یہ نہیں کہ پانچ روپیہ میں ٹال دو۔ دیکھو ابھی معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف سورہ بقرہ کے ختم پر تین سو دینار کی اونٹنی کہ ایک دینار دس درہم کا ہوتا ہے اور ایک ایک درہم تقریباً سوا چار چار آنے کا اتنے کی ذبح کر دی جو آج کل یہاں کے سکہ سے ایک ہزار روپیہ سے زیادہ کی ہوتی ہے اس وقت کوئی تمام قرآن شریف کے ختم پر ایک ہزار پیسے بھی نہیں دیتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ حضرات اس کی قدر جانتے تھے اور اس کو ہی دولت سمجھتے تھے۔ اور زبان حال سے کہتے تھے۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ۔۔۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(اپنی قیمت دونوں عالم کے برابر بتلائی ہے مگر تمہارا یہ نرخ ابھی سستا ہے ذرا اسے اور مہنگا کریں)

صاحبو! اس نعمت کے مقابلہ میں تو ساری دنیا بھی ہیچ ہے۔

الحاصل جن حضرات کی تو بہ قبول ہوئی تھی اس خوشی میں وہ اپنا سب مال روپیہ پیسہ بٹور

لائے اور حضور کی خدمت میں جمع کر دیا۔ حق تعالیٰ کی رحمت دیکھئے فوراً آیت نازل فرمائی خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا یعنی ان کے مالوں میں سے تھوڑا سا صدقہ لے لیجئے کہ اس سے آپ ان کو پاک کریں اور ان کو صاف کر دیں۔ بِهَا اس آیت میں علی سبیل التنازع تطہر اور تزکی دونوں کے متعلق ہے۔ یہاں پر ایک سوال ہوتا ہے کہ تطہیر اور تزکیہ تو ایک ہی شے ہے اگر صرف تطہر پر ہی اکتفا فرماتے تو کافی تھا تزکی میں کیا نکتہ ہے۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ دو چیزیں ہیں ایک تو آگ دوسرے آگ کا اثر یا یوں کہو کہ دیا سلائی اور ایک اس سے آگ نکلنا یعنی ایک تو معصیت ہے جو آگ ہے اس کا ازالہ تو تطہیر ہے اور دوسرے معصیت کا مادہ ہے اس کا ازالہ تزکیہ ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ صدقہ قبول کرنے سے ان کے گناہ بھی پاک کیجئے اور گناہوں کا مادہ بھی دور کر دیجئے۔ آگے ارشاد ہے وَصَلِّ عَلَيْهِم اور ان کے لئے دعا بھی کیجئے۔ یہاں سے ایک بات کام کی معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ آج کل جو یہ رواج ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مصرف خیر میں کچھ روپیہ دیتا ہے تو کھڑے ہو کر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ بالکل بے موقع ہے ہم کو ایسے موقع میں اس کے لئے دعا سکھلائی گئی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا وَصَلِّ عَلَيْهِم اس لئے کہ شکریہ وہ ادا کرے جس کے ساتھ احسان کیا ہو۔ وہ شخص ہم کو نہیں دیتا ہے اسلام کی خدمت کرتا ہے اور اسلام کے ساتھ اس کو ہم کو برابر تعلق ہے۔

اھل یورپ کی تقلید

اس کی تو ایسی مثال ہے کہ ایک باپ کے چند بیٹے ہوں اور ایک بیٹا باپ کی کچھ خدمت کرے تو اور بیٹے اس کا شکریہ ادا نہ کریں۔ اس لئے جیسا ہمارا باپ ہے ایسے ہی اس کا بھی ہے ہم پر اس نے کیا احسان کیا ہے جو شکریہ ادا کریں۔ پس شکریہ ایسے مواقع پر بالکل بے محل ہے۔ شکریہ تو جب ادا کیا جاوے جبکہ ان کو کوئی کچھ دے شکریہ ادا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود کھا جائیں گے۔ یا یہ شخص سمجھتا ہے کہ اسلام میرا ہے دوسرا مسلمان ہی نہیں۔ اہل یورپ کی تقلید ہے کہ وہ اپنے جلسوں میں شکریہ ادا کرتے ہیں۔ تو ان کی دیکھا دیکھی یہ بھی ایسا ہی کرنے لگے۔ اور اس پر کیا منحصر ہے اب تو ہر کام انہیں کے طریقہ پر کرنا چاہتے ہیں چنانچہ کسی کی تقریر میں جب کوئی مضمون پسند آتا ہے تو اس پر تالیاں بجاتے ہیں۔ حالانکہ تالیاں تو اہانت کے موقع پر بجائی جاتی ہیں یہ اچھی تہذیب ہے۔ تہذیب کیا تعذیب ہے۔ ہماری تہذیب اس موقع پر یہ ہے کہ سبحان اللہ کہیں بلکہ سب سے بڑھ کر تہذیب تو یہ ہے کہ کچھ بھی نہ کہیں اس لئے کہ خاموش رہنے میں جو سماں پسندیدگی کا چہروں اور قلب سے اور جوش بیان سے معلوم ہوتا ہے اظہار میں وہ لطف نہیں ہوتا۔ خصوصاً جبکہ وہ اظہار بھی تصنع سے ہو جیسا

اب ہوتا ہے کہ زبان سے تو اظہار خوشی کا ہو رہا ہے لیکن دل میں کچھ بھی نہیں تو اس اظہار کا کیا اعتبار بڑی چیز تو دل سے رغبت اور قدر کرنا ہے خواہ زبان سے کچھ نہ کہے۔ دیکھئے جب بچہ پستان سے منہ لگا دیتا ہے تو دودھ اترتا ہی ہے خواہ زبان سے کچھ نہ کہے اس طرح متکلم کی بشارت کے لئے بس رغبت سامعین کی کافی ہے۔ زبانی مدح کی ضرورت نہیں خصوص جب غیر مسلم کے طریق پر ہو جیسا شکریہ کا ایک طریق شائع ہو رہا ہے۔ جو محض تقلید ہے یورپ کی۔ ہاں سنت ایسے مواقع کی یہ ہے کہ دعا دی جاوے۔ آگے ارشاد ہے اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ یعنی بیشک آپ کی دعا ان کے لئے اطمینان کا باعث ہے۔ مکرر متنبہ کرتا ہوں کہ اس سے جیسا پہلے بھی عرض کر چکا ہوں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مذاق معلوم ہو گیا کہ ان کو اگر اعمال صالحہ کی توفیق ہوتی تھی تو وہ خرچ کرتے تھے۔

ایک بزرگ کی حکایت

ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی نیک عمل کی توفیق ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے بھی اور مخلوق سے بھی برعکس اس کی امید رکھتے ہیں کہ ہم کو کچھ ملے ایک بزرگ تھے وہ بازار میں کسی شے کے خریدنے کو گئے۔ قیمت پوچھی اس نے کہا کہ قیمت تو اس قدر ہے لیکن آپ چونکہ بزرگ ہیں اس لئے آپ کو اس قدر کم ملے گی سن کر بہت روئے کہ بس جی میری بزرگی کی قیمت ایک ٹکہ ہے۔ اور فرمایا کہ میں دین فروش نہیں کیا بزرگی اس لئے اختیار کی ہے کہ دنیوی نفع ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان تو یہ تھی کہ وہ یوں کہتے تھے لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا (میں تم سے معاوضہ نہیں مانگتا) لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا (میں تم سے مال کا سوال نہیں کرتا)۔ وہ حضرات نہ اپنی ذات کے لئے کچھ طلب فرماتے تھے نہ اور کسی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر کبھی چندہ کی ترغیب بھی دی ہے۔ تو خاص اپنے مخلصین کے مجمع میں دی ہے اور غیروں سے کبھی آپ نے امداد نہیں لی۔ اور خود تو کیا درخواست فرماتے اگر دوسرے نے خود بھی چاہا ہے تو آپ نے گوارا نہیں فرمایا۔ چنانچہ ایک غزوہ میں ایک مشرک نے چاہا تھا کہ میں بھی شریک ہوں اور وہ بڑا پہلوان تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لن نستعین بمشرک کہ ہم مشرک سے ہرگز مدد نہیں چاہتے حالانکہ وہ ہر طرح خادم اور تابع ہو کر شریک ہونا چاہتا تھا اس سے قیاس کیجئے کہ اگر کہیں اس کی شرکت یا اس کے ساتھ شرکت بطور متبوعیۃ یا مساواۃ ہو اور خصوصاً جبکہ وہ شرکت اس کے مذہبی عمل میں ہو تو کس قدر قبیح ہوگا۔

آج کل کی ایک بیہودہ رسم

جیسا آج کل یہ بیہودہ رسم نکلی ہے کہ مسلمان کفار کے میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے ہیں اوران کو اپنی عید بقرعید کے موقع پر شریک کرتے ہیں۔ یہ تو وہی قصہ ہے جیسا کہ اہل شرک نے حضور سے کہا تھا کہ اے محمد ہم اور آپ صلح کرلیں ایک سال آپ ہمارے دین کو اختیار کرلیں اور دوسرے سال ہم آپ کے دین کو اختیار کرلیں گے اسی وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ

یعنی آپ فرما دیجئے کہ اے کافرو میں اس شے کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم عبادت کرو گے اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں۔ اس شے کی جس کی تم نے عبادت کی ہے اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس شے کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے میرے لئے میرا دین۔ یعنی نہ میں تمہارا دین اختیار کروں گا اور نہ تم میرا دین قبول کرو گے یہ بطور اخبار کے فرمایا پس لَكُمْ دِيْنُكُمْ الخ کو اس تقریر پر منسوخ کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پس کفار سے تو بالکل علیحدہ ہی رہنا چاہئے۔ ہاں چونکہ ایک جگہ رہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ آپس میں لڑیں نہیں باقی ان کے مذہبی مجامع یا رسوم میں شریک ہونا بالکل بند کرنا چاہئے۔ ایک ہیڈ کلرک ہندو بھی اکبر علی صاحب سے ملتے تھے۔ انہوں نے ہولی میں بھائی پر رنگ ڈالنا چاہا۔ بھائی نے کہا ذرا ٹھہرو تم یہ کیا کرتے ہو۔ اس نے کہا ہم تم دونوں دوست ہیں دوستوں میں یہ ہوا ہی کرتا ہے۔ بھائی نے کہا اچھا ڈالئے مگر یاد رکھئے کہ ہمارے یہاں ابھی بقرعید ہوگی میں گائے کا گوشت منہ میں دوں گا۔ اس وقت برا نہ مانئے گا وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ صاحبو ان کی ہولی دیوالی میں شریک ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے بس اتنا کافی ہے کہ لڑو بھڑو مت اور مذہبی گفتگو بھی ان سے کرنا مناسب نہیں۔ ہاں البتہ اگر ان کی تقریر سے مسلمانوں کو اشتباہ میں پڑنے کا خوف ہو تو ان مسلمانوں کے قلب سے ان شبہات کو دفع کر دو۔ باقی ان سے کوئی گفتگو نہ کرو۔ ہاں اگر شادی بیاہ میں وہ تمہارے یہاں کچھ بھیج دیں۔ اور تم ان کے یہاں بھیج دو تو مضائقہ نہیں ہے۔ باقی مذہبی مجامع میں یا مذہبی کام میں نہ وہ تمہارے شریک ہوں اور نہ تم ان کے یہاں ایک مندر بن رہا تھا اس میں ایک شخص نے دس روپیہ چندہ اس لئے دیا کہ پھر ہندوؤں سے یونیورسٹی میں بہت سالیں گے اور اپنی اس تدبیر پر بہت خوش تھے اور یہ نہ سمجھے کہ دس روپیہ خرچ کر کے جہنم مول لی ہے۔ مذہب کے بارہ

میں بڑی حمیت اور غیرت ہونا چاہئے اور اس وقت تو مسلمانوں کو خوب ثابت ہو گیا ہے کہ ہم پر جو کچھ آفت آئی ہے اور جس قدر تنزل ہے مذہب کے چھوڑنے سے ہے۔ پہلے سے علماء پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ علماء ضرورت زمانہ سے واقف نہیں ہیں اس لئے مذہب پر قائم ہونے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن اب ان کو بھی روشن ہو گیا کہ ترقی کا مدار مذہب کو مضبوط پکڑنے میں ہے۔ یہ کلام اعطر اد آ گیا تھا۔ اوپر سے یہ مضمون چلا آتا تھا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وحضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ تھا کہ دین کے عوض دنیا کبھی نہیں چاہی۔ اور یہ تو بہت بھاری بات ہے ان حضرات نے اپنے دین اور بزرگی سے دنیوی معاملات میں اتنا بھی منتفع ہونا نہیں چاہا کہ اپنی بزرگی کے اثر سے کسی پر کسی قسم کا ذرا دباؤ بھی ڈالیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک اعرابی سے ایک گھوڑا خریدا تھا کوئی ناواقف اس کو کچھ زیادہ دام دینے لگا تو بعد خریدنے کے وہ اعرابی کہتا ہے کہ یا رسول اللہ اگر خریدنا ہو تو خرید یئے ورنہ میں بیچتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تو خرید لیا۔ اعرابی نے کہا گواہ لایئے اور معاملہ کے وقت اتفاق سے کوئی موجود نہ تھا۔ آپ نے فرمایا من یشھدی حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے گھوڑا خریدا ہے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آسمانی خبروں میں جبکہ ہم آپ کی تصدیق کرتے ہیں تو کیا اس میں نہ کریں گے۔ حضور نے اسی وقت آئندہ کے لئے قانون مقرر فرما دیا کہ خزیمہ کی گواہی دو شخصوں کے برابر کر دی۔ خیر ان کو یہ شرف ان کی قوت ایمانی کی برکت سے حاصل ہوا لیکن اس اعرابی پر آپ اس اختلاف پر ناخوش نہیں ہوئے۔

آج کل کسی شاہ صاحب یا کسی مولوی صاحب سے تو یہ معاملہ کر کے دیکھو فوراً کہیں گے کہ کیا ہمارا اعتبار نہیں جو ہمارے ساتھ ایسی باتیں کرتے ہو۔ اور حضور قانون کے موافق برتاؤ کرنے میں تو کیوں برا مانتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو اگر کسی نے خلاف قاعدہ اور کج خلقی کا بھی برتاؤ کیا ہے تو اس سے بھی چین بجبیں نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ چند بدیوں نے آپ کو آ گھیرا کہ کچھ دلوایئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہو گا تو دینے سے انکار نہیں۔ بدیوں نے چادر مبارک پکڑ کر گھسیٹا جس سے کنی کے نشان گردن مبارک پر پڑ گئے۔ اور آپ فرماتے ہیں ردوا علی ردائی یعنی میری چادر تو دے دو۔ نہیں معلوم آج کل کیسی بزرگی بزرگوں میں آ گئی ہے کہ اگر کسی سے اپنے نفس کے خلاف کوئی بات سنتے ہیں تو قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی تعلیمیں دی جاتی ہیں کہ جس سے کبر بڑھے۔ یاد رکھو کہ یہ سب سنت کے خلاف ہے۔ بزرگی اس لئے نہیں ہے کہ اس سے کچھ دنیوی نفع ہو۔

حکایت حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری رحمہ اللہ

جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بازار میں جوتا خریدنے کے لئے تشریف لے گئے ایک دکان دار نے کہا کہ میں آپ سے نفع نہیں لوں گا۔ ساتھیوں سے فرمایا کہ چلو بھائی آگے اس کے یہاں سے ہم نہ لیں گے اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ سچ بولتا ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ بولتا ہے تو ہم اپنے بھائی کے لئے یہ نہیں چاہتے کہ وہ بازار میں چار پیسہ کے لئے بیٹھے اور اس کو وہ بھی نہ ملیں۔۔ اور اگر جھوٹا ہے تو یہ ہم کو الو بنا کر لینا چاہتا ہے۔ کہ آج کل اس کے برعکس معاملہ ہے کہ اگر دوست سے کوئی شے خریدیں گے تو کہیں گے کہ بندہ خدا ہم سے بھی نفع لیتے ہو۔ آج کل بس اس پر عمل ہے خانہ دوستاں بروب کہتے ہیں کہ دوستوں کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں جانی۔ ونانی۔ نانی وہ ہیں کہ بس نان پیارا ہے۔ ہزاروں روپیہ کا تاجروں کا مال اسی دوستی کی بدولت دبا پڑا ہے لے کر دینا جانتے ہیں نہیں اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ دوست کو کبھی قرض نہ دے۔ اور نہ قرض اس سے لے۔ چنانچہ کسی نے کہا ہے۔

مدہ شان قرض مستاں نیم جب   فان القرض مقراض المحبہ

یعنی نہ ان کو قرض دے نہ لے۔ کیونکہ قرض محبت کے لئے مقراض ہو جاتی ہے۔ اور قرض سے محبت منقطع ہو جاتی ہے۔

عام مسلمانوں کی تین حالتیں

الحاصل میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ نیکی کر کے چاہتے ہیں کہ کوئی دنیوی نفع ہو درمیان میں تناسب سے اور مضامین آ گئے تھے۔ اب میں مقصود عرض کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے اس آیت کی رو سے جو ہم لوگ اپنی حالت میں غور کرتے ہیں تو ہم کو استقرار سے عام مسلمانوں میں تین قسمیں نظر آتی ہیں ایک وہ کہ جن کی سیئات غالب ہیں کہ رات دن فسق و فجور کبائر صغائر میں مبتلا رہتے ہیں۔ بھول کر بھی کبھی نماز نہیں پڑھتے۔ جیسے ایک شخص مولوی شیخ محمد صاحب کے پاس چاند کی گواہی دینے آیا۔ مولوی صاحب نے اس سے پوچھا کہ نماز بھی پڑھتے ہو کہنے لگا کہ مولوی جی ایک دفعہ یہ سن کر کہ بے نمازی کی جنازہ کی نماز نہیں ہوتی پڑھ لی تھی پھر تو ہماری توبہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک مولوی دہلوی ساڈھورہ گئے۔ ایک شخص کو نماز کی تاکید کی اس نے نیت نماز کی اس طرح باندھی۔ نیت کرتا ہوں نماز کی واسطے اللہ تعالیٰ کے ظلم اس مولوی صاحب کا۔ اللہ اکبر۔ سو ایک قسم تو ایسے لوگ ہوئے......

اور دوسرے وہ ہیں جن پر حسنات غالب ہیں اور سیئات مغلوب ہیں نماز پڑھتے ہیں روزہ

رکھتے ہیں۔غرض عقائد معاملات۔اخلاق، عادات سب ان کے موافق شریعت کے ہیں لیکن بمقتضائے بشریت کبھی کبھی ان سے کوئی گناہ بھی ہو جاتا ہے۔

تیسرے وہ لوگ ہیں کہ خلط کرتے ہیں۔یعنی ان کے حسنات اور سیئات دونوں برابر ہیں۔نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔روزہ بھی رکھتے ہیں۔مقدور ہو تو حج زکوۃ بھی ادا کرتے ہیں اور گناہ بھی ہو جاتے ہیں۔یہ معلوم کرنا کہ غلبہ کس شے کو ہے حسنات کو یا سیئات کو اس کا اندازہ مشکل ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں اعمال صالحہ غالب ہیں حالانکہ یہ گمان ان کا غلط ہوتا ہے۔اور منشاء اس کا یہ ہوتا ہے کہ ان کو گناہوں کی فہرست معلوم نہیں یا یہ بعض اعمال کو وہ گناہ ہی نہیں سمجھتے۔بعض ایسی خرابیاں ہیں کہ ہم کو ان کا پتہ بھی نہیں۔

خود کو مقدس سمجھنے کی عجیب مثال

اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ سمجھتے بھی ہیں کہ ہم میں فلاں باتیں گناہ کی ہیں۔لیکن باوجود اس کے محض اس وجہ سے کہ لوگ ہم کو مقدس سمجھتے ہیں۔ہم کو بھی اپنی نسبت تقدس کا گمان ہوتا ہے۔ہماری مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص باہر پردیس میں تھے۔ان کے گھر سے ایک نائی آیا اور اس نے یہ خبر دی کہ آپ کی بیوی بیوہ ہو گئی۔سنتے ہی رونے پیٹنے لگے۔یاروں دوستوں نے سمجھایا کہ ان کے گھر کوئی موت ہو گئی۔یہ سمجھ کر تعزیت کے لئے جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا فرمایئے تو سہی۔کہنے لگے کہ گھر سے خبر آئی ہے کہ ہماری بیوی بیوہ ہو گئی۔لوگوں نے کہا کہ آپ بھی بڑے بیوقوف ہیں آپ تو خود زندہ بیٹھے ہیں پھر بیوی کے بیوہ ہونے کے کیا معنی؟ کہنے لگے کہ یہ تو صحیح ہے لیکن نائی معتبر ہے۔

گو کہ میں جانتا ہوں اے بھائی ایک آیا ہے معتبر نائی

پس صاحبو یہی حالت ہماری بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ اپنی حالت سے خوب واقف ہیں کہ ہمارے اندر یہ خرابیاں ہیں لیکن چار آدمیوں کے کہنے سے دھوکے میں آ گئے۔پھر جب تقدس مشہور ہو جاتا ہے تو بعض اوقات اپنے افعال کو تقدس کے خلاف سمجھ کر بھی لوگوں کے سامنے بننے لگتے ہیں۔حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو کہتے ہیں۔

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر میکنند چوں بخلوت میروند آن کار دیگر میکنند

(واعظ جو کہ محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب تنہائی میں جاتے ہیں تو دوسرے کام کرتے ہیں)

بعض واعظوں نے اس کے معنی یہ گھڑے ہیں کہ ظاہر میں خشک واعظ ہیں مگر جب خلوت میں جاتے ہیں تو ذکر و شغل کرتے ہیں ایک تو شرارت کریں پھر اس کے ساتھ نصیحت میں تاویلیں کریں۔اچھا پھر اس آئندہ شعر کے کیا معنی ہوں گے۔

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند
(مجھے یہ مشکل درپیش ہے کہ مجلس کے خردمند شخص سے پوچھوں کہ دوسروں کو توبہ کی نصیحت کرنے والے خود کیوں توبہ نہیں کرتے)

الحاصل تین قسمیں تو یہ ہیں اب دو قسمیں اور باقی رہی ہیں ایک وہ کہ سیئات ہی ہوں حسنہ بالکل نہ ہوں دوسرے وہ کہ حسنات ہی ہوں سیۂ بالکل نہ ہوں۔ یہ کل پانچ قسمیں ہوئیں۔ لیکن اخیر کی دو قسمیں عام مسلمانوں میں منتفی ہیں اس لئے کہ محض اعمال صالحہ ہی کا ہونا اور سیۂ بالکل نہ ہو یہ تو شان انبیاء علیہم السلام کی ہے کہ گناہ سے وہ بچائے گئے ہیں۔

معصیت کی صورت اور حقیقت

اگر کوئی کہے کہ انبیاء سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں اور حق تعالیٰ نے ان کو معصومیت فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ جواب یہ ہے کہ ان سے ان کی شان کے موافق لغزش ہوتی ہے لیکن اس کو معصیت کہنے کا کسی کا منہ نہیں ہے حق تعالیٰ اگر اس کو اس لئے معصیت فرمادیں کہ وہ صورت معصیت کی ہے تو ان کو زیبا ہے اور تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ معصیت کی ایک تو حقیقت ہے اور ایک صورت ہے حقیقتاً معصیت یہ ہے کہ واقع میں بھی وہ امر شر ہو اور ارتکاب بھی اس کا قصد اور اختیار کرے اور صورت معصیت یہ ہے کہ قصد تو خیر کا تھا اور وہ فعل باعتبار خاص اجتہاد کے شر بھی نہیں تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عصمت کی دلیل

لیکن چونکہ وہ کسی خاص وجہ سے نامناسب تھا اس لئے اس کو صورۃ معصیت کہہ دیا جائے پس حقیقت معصیت کا صدور تو انبیاء سے بوجہ عصمت متعذر ہے اور دلیل عصمت کی یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ ہوا کہ میں آپ کو لوگوں کا مقتدا بناؤں گا تو ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میری اولاد سے بھی ایسے لوگ پیدا فرمایئے حکم ہوا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ یعنی میرا عہد ظالموں کو نہ ملے گا۔ یہاں امامت سے مراد نبوت ہے جس پر دو قرینے ہیں ایک تو ان کو اس وعدہ کے ایفا میں نبوت کا عطا ہونا دوسرا جعل کی اسناد خاص اپنی طرف کرنا اور نبوت ہی ایسی چیز ہے جس کا جاعل خاص حق تعالیٰ ہے بخلاف دوسرے معنی امامت کے یعنی خلافت وسلطنت کہ اس کے جاعل عامہ ناس ہیں کہ ان کے اتفاق سے اس کا وجود ہوتا ہے پس عہد سے بھی مراد یہی ہوگا اور اس کا عدم اجتماع ظلم کے ساتھ معلوم ہوتا ہے جو عام ہے معاصی کو پس معلوم ہوا کہ نبوت و معصیت جمع نہیں ہوتی۔ یہ عصمت کی نقلی دلیل ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے معصوم ہونے کی عقلی دلیل

اور عقلی دلیل یہ ہے کہ حاکم اپنا نائب اس شخص کو بناتا ہے جو بڑا لائق ہو۔ خود بھی قوانین کے

خلاف نہ کرے اور دوسروں کو بھی اطاعت کی ہدایت کرے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی منصب رسالت ایسے ہی شخص کو عنایت فرماتے ہیں کہ جو علمی و عملی قوت رکھتا ہو اور جو خود ہی قوانین پر عمل نہ کرتا ہو اس سے دوسروں کو کیا ہدایت ہوگی۔ پس انبیاء سے ہمیشہ حسنات ہی ہوں گے سیئہ بالکل نہ ہوگا۔ چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔ اسلئے یہ قسم اب منفی ہے دوسری قسم وہ ہے کہ حصر سیئات ہی ہوں حسنہ بالکل نہ ہو سو اس قسم کا وجود مسلمانوں میں تو ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسلمان کتنا ہی بدعمل ہو لیکن حسنہ سے خالی نہیں کم از کم توحید رسالت کا قرار ہی اس میں پایا جاتا ہے۔ ہاں یہ قسم کفار میں متحقق ہو سکتی ہے اس لئے کہ ان میں شرعاً حسنہ کا وجود ہی نہیں۔ اور بظاہر اگر اس سے کوئی عمل صالح صادر بھی ہو جیسے صدقہ خیرات وغیرہ چونکہ وہ بغیر ایمان معتبر نہیں اس لئے یہ قسم کفار میں تو واقع ہے مگر یہاں منفی ہے اس لئے کہ اس تقسیم کا مقسم مومن ہے۔ پس تین ہی قسمیں باقی رہ گئیں غالب الحسنات غالب السیئات خالطین جن پر حسنات غالب ہیں یا وہ جن پر سیئات غالب ہیں مجھ کو اس وقت ان کا ذکر کرنا منظور نہیں ہے خالطین یعنی جو حسنات اور سیئات میں خلط کرتے ہیں۔ ان کا ذکر منظور ہے اور دین داروں میں بیشتر ایسے ہی لوگ پائے جاتے ہیں اور ان لوگوں میں بھی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہیں کہ سیئات کرتے ہیں اور اس کی ان کو کچھ پرواہ نہیں ہے اس طرح نیک عمل بھی کرتے ہیں لیکن اس نیک عمل کی بھی ان کو کچھ وقعت اور عظمت نہیں ہے۔ غرض نیکی اور بدی دونوں میں ان کو قلت مبالاۃ ہے ان لوگوں کی طرف بھی اس وقت میرا روئے سخن نہیں ہے۔

حسنات اور سیئات کے خلط کا سبب

دوسری قسم ان خالطین کی وہ ہے کہ سیئات کو برا سمجھتے ہیں اور اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ اور اسکی سعی بھی کرتے ہیں کہ کسی طرح یہ چھوٹ جاوے۔ روتے بھی ہیں کڑھتے بھی ہیں اور افسوس و حسرت بھی ہے لیکن گناہ چھوٹتے نہیں۔ اس لئے کہ ہمت ضعیف ہے پھر اس سے یہ خرابی ہوتی ہے کہ اس کا نزلہ حسنات پر گرتا ہے۔ یا تو یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ اے بے حیا جبکہ تجھ سے گناہ نہیں چھوٹتے تو اس ذکر و شغل سے کیا فائدہ ہے اور بزبان حال یہ کہتا ہے

سبحہ بر کف توبہ برلب دل پرز ذوق گناہ　معصیت راخندہ می آید بر استغفار ما

(ہاتھ میں تسبیح، لب پر توبہ مگر دل شوق گناہ سے بھرا ہے ایسی توبہ پر گناہ کو بھی ہنسی آتی ہے)

یہ ذکر و شغل تیرے کس کام آوے گا۔ نمازیں تیری برباد۔ قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل اگر گھنٹہ دو گھنٹہ پڑھ لئے تو اس سے کیا ہوا۔ غرض ان خیالات کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ حسنات کو چھوڑ دیتا ہے یا ان حسنات کو ضعیف الاثر اور بیکار سمجھتا ہے۔ زیادہ تر اس بلا میں صلحا مبتلا ہیں۔

اور ایک وسوسہ اور ہوتا ہے وہ یہ کہ جبکہ حسنات اور سیئات دونوں مجھ سے صادر ہوتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ حسنات کو غلبہ نہیں ہوتا ہے اور سیئات کیوں نہیں چھوٹتے پس مجھ کو اس وقت زیادہ مقصود اس مرض کے متعلق بیان کرنا ہے تو غور کرنا چاہئے کہ خلط کی کیا وجہ ہے اور ان لوگوں کے حسنات میں قوت کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرماویں گے اور وہ مورد رحمت ہوں گے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں کی ساری عمر اسی میں گزر جاتی ہے۔ اور اس راحت خاصہ کا ظہور نہیں ہوتا۔ اور نیز دوسرے مقام پر ارشاد ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ یعنی بیشک حسنات سیئات کو دور کر دیتی ہیں اس پر نظر کرنے سے بھی اس شبہ کو تقویت ہوتی ہے۔ بلکہ اس آیت کے معنے اگر یہ مان لئے جاویں کہ ملکہ اور مادہ گناہ کا جاتا رہتا ہے تو شبہ اور زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اور ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ

اور حدیث شریف میں ہے ان رحمتي سبقت علی غضبي (الدر المنثور للسیوطی ۶:۳)

ان آیات سے اور اس حدیث کے عموم سے یہ شبہ بہت ہی قوی ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ حسنات کے ہوتے ہوئے سیئات کیوں رہتے ہیں۔ حسنات کا مقتضا تو یہ ہے کہ سب دور ہو جائیں چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر یہ خلط نہیں تھا۔ پس ایسی تدبیر کون سی ہے جس سے یہ خلط کی حالت نہ رہے اور حسنات کو غلبہ ہو جائے۔ سو دلائل شرعیہ اور نیز اس آیت میں غور کرنے سے اس کا معالجہ سمجھ میں آتا ہے اگر قرآن مجید کو تدبر سے نہیں دیکھتے۔ حق تعالیٰ نے اس کی شکایت بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ افلا یتدبرون القران قرآن شریف ہی میں سب کچھ ہے۔ جہاں امراض کا ذکر ہے وہاں ہی اس کا معالجہ بھی ہے۔

مرض خلط کا علاج

تھوڑے سے غور کی ضرورت ہے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ اس کا معالجہ بھی خود اسی آیت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس میں غور فرمایئے کہ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ کا ترتب اللہ تعالیٰ نے کس شئے پر کیا ہے وہ کیا شئے ہے کہ جس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے۔ جب تم اس پر عمل درآمد کرو گے یقیناً مورد رحمت ہو گے اور ہرگز تخلف نہ ہوگا۔ اور وہ ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ذنوب اور سیئات کے ساتھ تو اعترفوا فرمایا اور اس ترکیب کو صالحاً کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔ پس حاصل معالجہ کا یہ ہوا کہ ذنوب کے ساتھ تو اعتراف ہونا چاہئے۔ اور عمل کے اندر صلاحیت کی صفت ہونا ضروری ہے۔ پس معالجہ دو جزو سے مرکب ہوا۔ عمل صالح اور اعتراف ذنوب شاید کسی کو شبہ ہو کہ ہمارے اندر تو یہ دونوں صفتیں ہیں پھر بھی مرض نہیں جاتا۔ صاحبو! میں اسی واسطے کہتا ہوں کہ تدبر سے کام نہیں لیتے۔ واقع میں ہمارے اندر دونوں جزو مفقود ہیں۔ اگر یہ دونوں جزو ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ

عسی اللہ ان یتوب علیھم کا ظہور نہ ہوتا غور کیجئے کہ صالح عمل کی صفت ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ صالح کس کو کہتے ہیں۔ صالح صلاح سے مشتق ہے اور صلاح کے معنی درستی کے ہیں۔ درست شئے وہ ہے کہ اس کے کسی جزو میں کسر نہ ہو۔ درست گاڑی وہ کہلائے گی جس کے پہیے اور تمام کل پرزے درست ہوں۔ اگر ایک جزو کے اندر بھی خرابی ہے تو پھر وہ درستی کے ساتھ موصوف نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ ناقص اور کامل کا مجموعہ ناقص ہی ہے۔ اگر کسی کو ذرا زکام یا سر میں درد ہو تو کہتے ہیں کہ آج طبیعت درست نہیں۔ پس عمل کو صالح جب کہیں گے جب کہ وہ من کل الوجوہ درست ہو۔ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ عمل کس شئے سے درست ہوتا ہے۔ سو اس کے معنے بھی کلام اللہ ہی سے تلاش کرنا چاہئے۔ حق تعالیٰ نے اس کو دو لفظوں میں بیان فرمادیا ہے۔ اگر جنید وشبلی جیسے بھی ہو کر برسوں فکر کرکے بیان کرتے تو ایسا جامع بیان نہ کرسکتے۔ ارشاد ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۤءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ

یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی رضامندی اور اپنے نفسوں کے اندر استقلال پیدا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کا حال ایسا ہے جیسے کسی ٹیلہ پر ایک باغ ہو کہ اس پر بارش ہووے تو وہ اپنا پھل دوچند دے۔ ابتغاء مرضات اللہ اور تثبیتاً من انفسھم یہ دونوں ینفقون کے مفعول لہ ہیں اور من انفسھم بواسطہ من کے تثبیتاً مصدر کا مفعول بہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ درستی عمل کے دو جزو ہیں جب وہ دونوں پائے جاویں تو صلاحیت کامل ہوگی وہ دو جزو ابتغاء مرضات اللہ اور تثبیتاً من انفسھم ہیں یعنی جو عمل کرے اس میں دو باتوں کی نیت ہونا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوں۔ دوسرے یہ کہ نفس کے اندر اس عمل کا ملکہ ہوجائے کہ جس سے نفس کے اندر استقلال پیدا ہوجاتا ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی تو مقصود اصلی ہے اور تثبیت اس کا ذریعہ ہے اب ہم لوگ اپنا حال دیکھیں کہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ تلاوت قرآن بھی کرتے ہیں۔ روزہ بھی رکھتے ہیں صدقہ خیرات بھی بقدر وسعت دیتے ہیں لیکن ان اعمال میں ہماری نیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ پس اعمال تو ہیں لیکن صلاحیت ان میں نہیں ہے اسی واسطے عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ (امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر توجہ فرمائیں) اس پر مرتب نہیں ہوتا۔

گناہ کا علاج ندامت اور اعتراف ہے

اور دوسرا جزو علاج کا اعتراف ذنوب ہے اور اعتراف ذنوب سے مقصود منشاء اعتراف ہے وہ کیا ہے ندامت اور حسرت اور افسوس اور اپنے کئے پر حزن ورنج اور اپنے نفس سے ناخوشی کا پیدا ہونا یہ

ہم لوگوں میں مفقود ہے۔ زبانی اعتراف تو ہے کہ جس کو لغۃً اعتراف کہہ سکتے ہیں لیکن مقصود یہاں صرف یہی نہیں ہے بلکہ مقصود ندامت ہے جیسے ان صحابہ رضی اللہ عنہم نے کر کے دکھلا دیا کہ اپنے آپ کو ستون سے بندھوا دیا۔ چونکہ ندامت سے اعتراف ناشی ہوتا ہے اس لئے اس کو اعتراف سے تعبیر فرمایا ورنہ اصل میں مقصود ندامت ہے لفظ اعتراف مراد نہیں ہے۔ پس اس وقت خالطین میں یہ جز بھی مفقود ہے۔ یعنی فرد کامل ندامت کی نہیں ہے اس وجہ سے عمل صالح کا غلبہ جو اثر ہے توبہ علیہم کا نہیں ہوتا پس ندامت کو پیدا کرنا چاہئے۔ جب گناہ ہو نادم ہونا چاہئے اور صدق دل سے توبہ کر لینی چاہئے میں یہ نہیں کہتا کہ گناہ ہونا محال ہو جاوے ہاں یہ کہتا ہوں کہ علاج اس کا کر لیا کرو اور وہ علاج ندامت اور اعتراف ہے۔ جب کوئی گناہ ہو جایا کرے فوراً وضو کر کے دو رکعت پڑھ کر توبہ کر لیا کرو۔ اگر پھر وہی گناہ ہو جائے پھر یہی عمل کرو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں وہ گناہ چھوٹ جائے گا۔ میں تجربہ کر کے کہتا ہوں کہ اگر دو رکعت فی گناہ مقرر کر لو کہ جب گناہ ہوا کرے دو رکعت پڑھ کر توبہ کر لی تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلدی وہ گناہ چھوٹ جائے گا۔ اگر گناہ کرنے کے وقت کوئی دوسرا کام سامنے ہو اور وقت فرصت کا نہ ہو تو وہ گناہ لکھ لیا کرو۔ جب کام سے فارغ ہوئے حساب کر کے فی گناہ دو رکعت کے حساب سے پڑھ لی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ایک ہی ہفتہ میں نفس و شیطان تم سے صلح کر لیں گے۔ اور یہ بلقانی گروہ مطیع ہو جائے گا۔ اور واقع میں شیطان ہے بھی بلقانی یعنی ابلق یعنی دورنگا ہے کہ کبھی کسی رنگ میں بہکاتا ہے کبھی کسی رنگ سے اس لئے بلقانی کہہ دیا۔ سو نماز پڑھنا چونکہ نفس کو بہت بھاری ہے اور شیطان کو سخت ناگوار ہے اس لئے ایک ہی ہفتہ میں بلکہ ایک ہفتہ تو میں نے زائد کہہ دیا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی کم میں کامیابی ہو جاوے گی۔

بھولنے کی دو علتیں

شیطان کو نماز کے ناگوار ہونے پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی۔ ایک شخص امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا کہ میں نے اپنے گھر میں کچھ مال دفن کیا تھا اور اب یاد نہیں رہا کہ کہاں دفن کیا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ نماز پڑھنا شروع کر دو اور جب تک یاد نہ آوے پڑھتے رہو۔ چنانچہ اس نے نماز شروع کی پس فوراً ہی یاد آ گیا۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو خوب نسخہ ہاتھ آیا۔ بہت سی چیزیں ہم کو یاد نہیں رہتیں اب اس تدبیر سے یاد ہو جایا کریں گے۔ تو خوب یاد رکھو کہ بھولنے کی دو علتیں ہیں ایک تو یہ ہے کہ وہ شے متخیلہ کے اندر رہے۔ لیکن شیطان نے محزون کرنے کے لئے دماغ میں تصرف کر کے اس کو بھلا دیا کقولہ تعالیٰ وَمَآ اَنۡسٰنِيۡهُ اِلَّا الشَّيۡطٰنُ اَنۡ اَذۡكُرَهٗ (اور مجھ کو شیطان ہی نے بھلا دیا کہ میں اس کا ذکر کرتا) سو ایسی بھولی ہوئی شے بعلت مذکورہ نماز سے یاد آ سکتی ہے۔ دوسری علت یہ ہے کہ

متخیلہ ہی میں کچھ فتور ہے سو اس کے لئے یہ تدبیر موثر ہوگی۔ سو اس کا پہچاننا صاحب بصیرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ کا کام ہے۔ اس لئے نماز کو نسیان کا عام علاج سمجھنے کا شبہ جاتا رہا۔

صالحہ نیت اعمال میں

خلاصہ یہ ہوا کہ اعمال صالحہ میں تو یہ نیت رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے اور نفس کے اندر اس کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ اب تک ہم میں مفقود ہے۔ چنانچہ ہم نیکیاں تو کرتے ہیں لیکن اس نیت سے نہیں کرتے کہ ہماری حالت درست ہو جائے۔ اس لئے ان حسنات کو غلبہ نہیں ہوتا۔

ہمارے حسنات کی مثال

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے ان حسنات کی مثال لکھی ہے کہ کسی کے یہاں چور آیا۔ وہ شخص آہٹ پا کر اٹھا اور چاہا کہ چقماق سے روشنی کرے (چقماق ایک پتھر ہے جس کے رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ پہلے زمانہ میں دیا سلائی کا کام اس پتھر سے لیا جاتا تھا) چنانچہ چقماق رگڑا اور کسی سوختہ میں آگ لگی۔ وہ چور بھی پاس ہی تھا۔ جب اس چقماق سے کچھ آگ جھڑتی تھی چور اس پر انگوٹھا رکھ کر بجھا دیتا تھا۔ آخر وہ تنگ ہو گیا اور چقماق کو چھوڑ کر لیٹ گیا۔ چور اسباب لے کر چل دیا۔ اس مقام پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اے شخص تیری نیکیاں بھی مثل اس چقماق کے ہیں کہ نور ان میں پیدا ہوتا ہے لیکن چور یعنی نفس و شیطان ہر وقت تیرے قریب ہیں وہ تجھ سے معصیت کراتے ہیں پس جو نور ان حسنات سے پیدا ہوا تھا وہ گم ہو جاتا ہے یہ وجہ ہے کہ حسنات کو غلبہ نہیں ہوتا۔

پس اس تقریر سے معنی اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کے بر تفسیر اذہاب کے اذہاب ملکہ کے ساتھ واضح ہو گئے کہ حسنات سے مراد وہ ہیں کہ جن میں بالمعنی مذکور صلاحیت ہو اور وہ سیئات سے وہ ہیں جن کے ساتھ اعتراف بمعنے ندامت بھی ہو اس وقت وہ اذہاب ضروری ہے اور اسی طرح اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے) کے معنی بھی روشن ہو گئے کہ مقصود یہ ہے کہ جو صلوٰۃ صلاحیت کے ساتھ موصوف ہو وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ الحاصل نیکیاں بے اثر یا ضعیف الاثر نہیں ہیں۔ بعض آدمی جو یہ سمجھ کر اور مایوس ہو کر اعمال صالحہ چھوڑ بیٹھتے ہیں ان کی سخت غلطی ہے۔ اعمال صالحہ کو ہرگز نہ چھوڑنا چاہئے۔ گناہ ہو جائے تو اس کا معالجہ کر لینا چاہئے اور نیکیوں میں جو نیت پہلے مذکور ہو چکی ہے وہ کرتا رہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اعمال صالحہ ہی کو غلبہ ہو جائے گا۔ اور وہ نیکیاں کو مخلوط بالذنوب ہوں ایسا کام کریں گی کہ سب خرابیاں دھوڈالیں گی۔ اور اس وقت عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ کا ظہور ہو جاوے گا۔

نیکیاں نہ چھوڑنے کی نصیحت

یہ میں بلا دلیل نہیں کہتا بلکہ قاعدہ اور قانون شریعت سے کہتا ہوں دیکھو ارشاد ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا یعنی جو شخص ایک نیکی لاوے گا اس کے لئے اس کا دس گنا ہے پس گناہ کہاں تک نیکیوں پر بڑھیں گے۔ ضروری ہے کہ غلبہ اعمال صالحہ ہی کو ہوگا۔ اگر غلط میں گناہ اور نیکیاں برابر عدد میں بھی صادر ہوئیں۔ مثلاً پچاس گناہ اور پچاس نیکیاں تب بھی غلبہ حسنات ہی کو ہوگا۔ کیونکہ یہ پچاس نیکیاں برابر پانچ سو کے ہوں گے تو غلبہ بہر حال عمل صالح کو ہی ہوگا اور کسی نہ کسی وقت ضرور ہی اثر پیدا کریں گی اور رحمت متوجہ ہو جاوے گی۔ اور بالفرض اگر نیکیاں گناہوں سے کم بھی ہوں تب بھی اگر اصلاح کی فکر ہے تو اس نیت پر حق تعالیٰ خلاف قاعدہ و قانون بھی فضل فرما دیتے ہیں۔ اور فضل کے سامنے بے شمار گناہوں کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

گر جہاں پر برف گردد سر بسر ۔۔۔ تاب خور بگذاردش از یک نظر

(اگر دنیا سر بہ سر برف سے بھر جائے تو قاس کو دیکھو اور ایک نظر ڈال کر چھوڑ دے)

اس لئے نیکیوں کو بھی نہ چھوڑنا چاہئے۔ اور یوں نہ کہنا چاہئے کہ جب گناہ نہیں چھوٹتے تو تہجد سے کیا فائدہ اور تلاوت قرآن سے کیا نفع ہے۔ یاد رکھو جب کام بنے گا نیکیوں ہی سے بنے گا۔ ان کو ہرگز نہ چھوڑو۔ بعض مرتبہ ایک نیکی ایسی ہوتی ہے کہ کام بنا دیتی ہے۔

ایک نجومی کی حکایت

کسی نجومی کو مرنے کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ بتلاؤ کیا معاملہ ہوا۔ کہا کہ حکم ہوا کہ ہم نے تجھ کو اس وجہ سے بخش دیا کہ تو نے ہمارے نام کو اعرف المعارف کہا ہے۔

گناہوں میں الجھے ہوؤں کو وصیت

جو لوگ سیئات میں الجھے ہوئے ہیں ان کو میں دو باتوں کی وصیت کرتا ہوں کہ جو وقت فرصت کا ملے اس میں ذکر اللہ کی کثرت کریں۔ کہ اس سے عمل میں برکت ہوتی ہے۔ اور عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ اور ہر عمل صالح میں اس کی نیت رکھیں کہ اس سے باطن کی اصلاح ہو کہ اس سے وہ عمل موصوف بصالح ہوتا ہے۔ پھر ممکن نہیں کہ اس کا اثر مختلف ہو۔ اور دوسرے یہ کہ گناہ ہو جائے تو فوراً توبہ کرلیا کریں کہ یہ اعتراف ہے۔ حدیث شریف میں ہے

کلکم خطاؤن وخیر الخطائین التوابون (سنن الترمذی: ۲۴۹۹ بلفظ آخر)

یعنی تم سب خطا کار ہو اور بہتر خطا کاروں کے توبہ کرنے والے ہیں۔ سبحان اللہ کیا شفقت

ہے کہ خطا اور جرائم بھی کریں۔ اور ان کو خیر بھی کہا جاوے۔ یہ صرف برکت توبہ کی ہے اور حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ یعنی وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی سخت گناہ کرتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی صغائر کا ارتکاب کرتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اس کے بعد اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ صاحبو! ایسا بھی کوئی آقا اور مولیٰ دیکھا ہے کہ اس کی نافرمانی کریں اور وہ خود تعلیم کرے کہ ہم سے معافی چاہو۔ اور اسی پر بس نہیں۔ اگر کوئی توبہ کرنے اور بخشش چاہنے سے شرمائے کہ کس منہ سے توبہ کروں میرا کیا منہ رہا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگوں تو اس کو ارشاد ہے وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی شرمانے کا موقع تو جب تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا ہوتا۔ خدا کے سوا کون گناہوں کو بخشنے والا ہے۔

ایک عجیب حکایت

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص آلودہ نجاسات چلا جا رہا تھا۔ دریا نے کہا کہ میرے پاس آئیں تجھے پاک کردوں۔ اس نے کہا کہ میں تو آلودہ ہوں کیسے آؤں پاک ہوکر آؤں گا۔ دریا نے کہا کہ میاں صاحب شرم کو چھوڑو جب پاک ہوگے مجھ ہی سے یا میرے کسی جزو سے ہوگے۔ اور اگر شرم ہی شرم میں رہوگے تو تمام عمر ناپاکی اور آلودگی میں گزر جاوے گی۔ تو صاحبو خدا تعالیٰ کا تعلق ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تم کو پاک صاف کرے گی۔ پھر تعلق وتوجہ میں پاکی کا انتظار کیا معنے۔ پس کیسے ہی برے ہو جاؤ مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق نہ چھوڑو۔ گناہوں کا ہو جانا عجیب نہیں۔ مگر خدا کے ساتھ تعلق اور اللہ والوں سے تعلق یہ بھی خدا ہی سے تعلق رکھنا ہے۔

اہل اللہ سے ہر حال میں وابستگی کی ضرورت

پس کسی حال میں اہل اللہ سے بھی قطع تعلق نہ کرو بعض آدمی شرمایا کرتے ہیں کہ ہماری داڑھی کٹی ہوئی ہے۔ پائنچے ٹخنوں سے نیچے ہیں۔ شب و روز گناہوں میں مبتلا ہیں ہم بزرگوں کی خدمت میں کس طرح جاویں تو اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیے تم اسی حال میں ان کے پاس حاضر ہوا کرو۔ اور اگر اس کا انتظار کروگے کہ جب حالت درست ہوگی تو جاویں گے تو ساری عمر اسی حالت میں گزر جاوے گی۔ اس لئے کہ حالت تو درست ان کے پاس جانے ہی سے ہوگی۔ جب آتے جاتے رہوگے تو ضرور شرم آوے گی۔ اور ان گناہوں کا ترک آسان ہو جائے گا۔ اور ان کو بھی ان کے حال پر توجہ ہوگی۔ کبھی نہ کبھی دعا کردیں گے۔

بزرگوں کی محبت کا ثمرہ

اور بالفرض اگر اصلاح بھی نہ ہوئی ہے تو حدیث شریف میں ہے کہ
المرء مع من احب (الصحیح البخاری ۸: ۴۸)
یعنی آدمی اس کے ساتھ ہے جس کو وہ چاہتا ہے تو جب بزرگوں سے محبت ہوگی اور وہ بزرگ ہیں مقام مقبولیت میں تو یہ شخص بھی ان کے ساتھ مقام مقبولیت میں ہوگا۔ اور مقبول ہونا موقوف ہے مغفور ہونے پر پس ضرور یہ مغفور بھی ہو جائے گا۔ غرض بزرگوں کی معیت کسی وقت نہ چھوڑے۔ ایک چیونٹی کو ہوس ہوئی کہ کعبہ شریف پہنچے۔ لیکن بیچاری ضعیف ننھی سی چیونٹی اگر سینکڑوں ہزاروں برس بھی چلے تو وہاں تک رسائی نہ ہو۔ لیکن شوق اس کو بے حد ہوا۔ دیکھتی کیا ہے کہ کبوتران حرم میں سے ایک کبوتر آیا اس نے اس کو غنیمت سمجھا اور فوراً اس کے پاؤں کو لپٹ گئی۔ اس نے جو ایک جست کی تو داخل حرم ہو گیا۔ چیونٹی نے جو آنکھ کھولی تو دیکھا سامنے بیت اللہ شریف جلوہ گر ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد — دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسد

(ایک چیونٹی کو حرم پہنچنے کی آرزو ہوئی اس نے اپنا ہاتھ کبوتر کے پاؤں سے باندھ دیا اور فوراً حرم پہنچ گئی)

اسی طرح اگر کسی کو ہوس ہو کہ میں حق تعالیٰ تک پہنچ جاؤں تو اس بیچارے ضعیف کی کیا ہمت اور مجال ہو سکتی ہے کہ وہاں تک پہنچ سکے۔ اس لئے اس کو چاہئے کہ کسی وہاں کے رہنے والے کا دامن پکڑے یعنی کسی کامل کے قدموں سے لگ جاوے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیعت ہی ہو جاوے۔ اصل شے محبت اور صحبت ہے۔

بزرگوں کی صحبت اختیار کرنے کی ضرورت

بزرگوں کی صحبت اور ان کی توجہ وہ شے ہے کہ تھوڑے دنوں میں حالت درست ہو جاتی ہے۔ جب ان سے محبت ہوگی تو عقائد میں خیالات میں اعمال میں ہر شے میں ان کا اتباع کرنے کو دل چاہے گا۔ غرض ایسے اسباب جمع ہو جائیں گے کہ جس سے حالت خود بخود روز بروز درست ہوتی جائے گی۔

اور وہ امراض جن کے علاج سے یہ عاجز ہو گیا تھا ان کی ادنیٰ توجہ سے جاتے رہیں گے۔

خلاصہ تمام تر تقریر کا یہ ہوا کہ اعمال صالحہ میں نیت حق تعالیٰ کے خوش کرنے اور اصلاح باطن کی رکھے اور گناہ ہو جائیں تو ندامت اعتراف کرے۔ اور بزرگوں کی صحبت اختیار کرے۔ اس معالجہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ خلط کی حالت جاتی رہے گی۔ اور اعمال صالحہ ہی کو غلبہ ہو جائے گا۔

یہ مضمون تھا جو مجھ کو آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا الخ سے مستنبط کرنا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ عمل کی توفیق عطا فرما دیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ونبینا محمد والہ واصحابہ وسلم امین۔

اشرف المواعظ

(حصہ دوم)

المباح

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ بروز جمعہ ۲ گھنٹہ ۳۵ منٹ بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰۰ تھی جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب نے قلم بند فرمایا۔

معاصی کے علاوہ قساوت کے دو سبب اور ہیں، مباحات کے اندر وسعت کرنا اور مباحات میں حد سے زیادہ تنگی کرنا اور علاج اس کا استغفار اور مجاہدہ ذکر ہے۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ط وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (الحدید آیت ۱۶، ۱۷)

ترجمہ: کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت اور جو دین حق نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر ایک زمانہ دراز گزر گیا پھر ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے آدمی ان میں کافر ہیں یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے ہم نے تم سے نظائر بیان کر دیئے ہیں تا کہ تم سمجھو۔

سامعین کو ان تخشع کے لفظ سے خیال ہوا ہوگا کہ شاید خشوع کا بیان ہوگا اور فی نفسہ یہ مضمون بھی ضروری ہے اور مقصود بھی اس آیت کا یہی ہے لیکن مجھ کو اس سے ایک اور مفید مضمون کا استنباط منظور ہے اس کے ضمن میں اگر خشوع کا بھی بیان آ جاوے وہ امر آخر ہے لیکن وہ مقصودیت

کے درجہ میں نہ ہوگا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خشوع کی طرف تو کسی درجہ میں لوگوں میں التفات ہے بھی اگر چہ جس درجہ میں اس کا اہتمام ضروری ہے اس مرتبہ میں اس کا بھی نہیں لیکن تاہم اس کو مقصد اور محمود اور مطلوب سمجھا جاتا ہے اور جس مضمون کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایسا ہے کہ اس کا یا تو علم نہیں اور اگر ہے تو کم ہے اور اس قدر کم ہے کہ اکثر خواص کو بھی اس سے ذہول ہے اور اس کے فقدان کا نہ کچھ قلق ہے نہ اس کی تحصیل کی طرف توجہ ہے بلکہ قریب قریب یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ خواص کو اس کا علم ہی نہیں اگر استفتاء کے وقت جواب دے دیں بلکہ میں تو ترقی کر کے کہتا ہوں کہ شاید اس وقت بھی جواب کافی نہ دیں بخلاف خشوع کے کہ اس کی تحصیل کو کسی درجہ میں ضروری تو جانتے ہیں کہ پس لامحالہ یہ مضمون اہم ہوا بہ نسبت خشوع کے۔

شان نزول

اب اس کی حقیقت سنئے لیکن اس سے پہلے اس آیت کا شان نزول سن لیجئے اس لئے کہ اس کی حقیقت سمجھنا اس پر موقوف بھی ہے۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں ہنسنا بولنا شروع کیا تھا اور ظاہر بات ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہنسنا بولنا معصیت کے درجہ میں ہرگز نہ تھا۔ اس لئے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے جری نہ تھے کہ ایک جماعت کی جماعت معصیت میں جان بوجھ کر مبتلا ہوں اور نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو معصیت کی خبر نہ ہو اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہوں کی فہرست صاف صاف بتادی تھی حدیث میں ہے الحرام بینٌ والحلال بین وبینھما مشتبھات (جمع المسانید ۲: ۱۴۴: ۶۱۴) (حرام ظاہری اور حلال ظاہری اور اس کے درمیان مشتبہات ہیں) حلال وحرام میں کسی قسم کا خفاء وغموض نہ تھا پھر علاوہ اس کے یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا علم ومعرفت ایسا نہ تھا کہ ان کو کسی معصیت کے معصیت ہونے کی خبر نہ ہو وہ حضرات تو دقائق اور حقائق تک پہنچتے تھے میرا یہ دعویٰ نہیں کہ کوئی دقیقہ ان سے مخفی نہ تھا یا یہ کہ وہ معصوم تھے میرے دعوے کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ جس امر میں ان کی جماعت کی جماعت شریک ہو وہ امر ہرگز معصیت نہ ہوگا۔ پھر یہ کہ ایک جماعت اس میں شریک ہو اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ اگر یہ ہنسنا بولنا معصیت ہوتا تو ضرور اس پر انکار تو ہوتا اور ہنسنا بولنا کوئی ایسا امر مخفی ہے نہیں کہ کونہ میں چھپ کر کرتے ہوں ظاہر ہے کہ کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے یہ سب دلائل وقرائن ہیں اس بات کے کہ یہ ہنسنا بولنا ہرگز معصیت نہ تھا مگر اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جو میں نے اس وقت تلاوت کی ہے اس آیت میں اس فعل کے اثر سے تعرض ہے خود نفس فعل پر کوئی گرفت نہیں چنانچہ ارشاد ہے کہ کیا وہ وقت نہیں آیا ایمان والوں کے لئے کہ ان کے دل نرم ہو جاویں یعنی

کسی شے کا انتظار ہے کیا ان کے نزدیک بھی دل کے نرم ہونے کا وقت نہیں پہنچا اور نرم ہونا کسی شے کے واسطے اللہ کی یاد کے لئے اور جو حق بات نازل ہوئی ہے حق سے مراد وعدہ وعید انذار و تبشیر ہے یعنے ان امور کا مقتضی یہ ہے کہ دلوں کے اندر خشوع ہو جانا چاہئے اور اگر پیدا نہ ہو تو بتکلف پیدا کرنا چاہئے یعنی خاشعین کی شکل بنانا چاہئے اس سے رفتہ رفتہ خشوع پیدا ہو جائے گا۔

ظاہر کا اثر باطن پر

اس لئے کہ جس طرح باطن ظاہر میں موثر ہے اسی طرح ظاہر کا اثر بھی باطن میں پہنچتا ہے۔ جس طرح دل کے اندر اگر غم ہو تو اس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا عکس یہی ہے کہ اگر رونے کی شکل بنائی جاوے تو دل میں بھی کیفیت غم کی پیدا ہو جاوے گی اسی واسطے تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر رونا نہ آوے تو رونے کی شکل ہی بنالو تو شکل بنانا مقصود اصلی نہیں ہے مقصود تو یہ ہے کہ دل میں خشوع پیدا ہو اور اگر خشوع ہے اور رونا نہ آوے تو کچھ حرج نہیں۔

مامور بہ دل کا بکا ہے

ایک دوست نے مجھ کو لکھا کہ میں جب حج کرنے نہیں گیا تھا تو رونا ہی آتا تھا اور جب سے حج کر کے آیا ہوں رونا نہیں آتا اس کا بہت افسوس ہے۔ میں نے لکھا کہ مراد دل کا رونا ہے وہ تم کو حاصل ہے۔

خشوع کی ضرورت

حاصل آیت کا یہ ہے کہ ذکر اللہ وما نزل من الحق کا مقتضا یہ ہے کہ خشوع ہو اور حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر خشوع پیدا نہ ہو تو رونے کی شکل بنائے اور آیت میں اس کو بطور استفہام کے فرمایا کہ کیا اس کا وقت نہیں آیا مطلب یہ ہے کہ وقت آنا چاہئے آگے ارشاد ہے وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ الخ یعنی نہ ہو جاویں وہ مثل ان لوگوں کے کہ جن کو پہلے کتاب دی گئی ہے پس ایک زمانہ دراز ان پر گزرا اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ کے مقابلہ میں ہے بظاہر تو یوں فرماتے ہیں ان لا تخش قلوبهم کہ ایسا نہ ہو کہ قلب میں خشوع نہ رہے یہ نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد ہے کہ اہل کتاب جیسے نہ ہوں کہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دل سخت ہو گئے تھے۔ یہ تخویف و انذار ہے کہ اگر تم نے غفلت کی تو تمہارے دلوں کے اندر قساوت نہ ہو جاوے جس کا اثر یہ ہے۔ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ کہ بہت سے ان میں حد سے متجاوز ہیں۔ اس اثر کا ظاہر فرما دینا بڑی رحمت ہے اس لئے کہ جو معاصی ظاہرہ میں ان کو برا سمجھتے ہیں مگر قلب کے احوال کی اطلاع کم ہوتی ہے پس اگر یہ اثر ظاہر نہ فرماتے تو اس سے بچنے کا زیادہ

اہتمام نہ ہوتا حالانکہ یہ اہتمام اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ خود افعال جوارح کا مناط بھی افعال و احوال قلب ہیں۔ اور تفصیل اس اجمال کی ہے کہ غور فکر کرنا چاہئے کہ جو عمل انسان کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کیا چیز جو اس کو برانگیختہ کرتی ہے۔ وہ کیا شے ہے کہ جو اس کو پانچوں وقت نماز کے لئے کھڑا کر دیتی ہے اور کبھی تخلف نہیں ہوتا ہے بظاہر تو ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جب ارادہ کسی کام کا کرلیا اس کے اندر کسی اور محرک کی ضرورت نہیں یہ بالکل غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو ایک آدھ مرتبہ وہ کام ہوتا باقی دواماً اور استمراراً کوئی عمل نہ ہوتا کیونکہ خود ارادہ ہی کا دوام دشوار ہے ہاں محض ارادہ سے گاہ گاہ عمل ہو جاتا ہے لیکن دوام کے لئے کسی اور ہی شے کی ضرورت ہے وہ کیا ہے قلب کا تقاضا پس فاروق تقاضائے قلبی ہے جس شے کا تقاضہ قلب میں پیدا ہو گیا ہے اور کیفیت تقاضے کی راسخ ہو گئی ہے وہ کام ہمیشہ ہوتا رہتا ہے اور جس کا تقاضا نہیں ہے اس پر دوام نہیں ہوتا اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ اعمال کی مداومت کے اندر ان بزرگوں کا کوئی کمال نہیں ہے۔ ان کے قلوب میں ایک داعیہ پیدا ہو گیا ہے وہ ان سے کام لیتا ہے آدمی سمجھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ فلاں کام میں نے کیا ہے اور اس کو یہ خبر نہیں ہے کہ کام مجھ سے لیا گیا ہے۔ کمال تو حق تعالیٰ کا ہے کہ جس نے قلب میں تقاضا پیدا کیا ہے۔ کمال تو مشین چلانے والا کا ہے مشین کا کیا کمال ہے ہاں جس کی نظر صرف مشین پر ہے وہ مشین کا معتقد ہوگا پس یہ تقاضا اور شوق ایسی شے ہے کہ جب یہ پیدا ہو جاتا ہے تو آدمی کام کرتا ہے اور اس کو تکان نہیں ہوتا اسی واسطے ارشاد ہے۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا. قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر یہ لوگ اس بات کا احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے آپ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان مت رکھو بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا احسان جتلاتے ہیں کہ تم کو ایمان کی ہدایت دی اگر تم سچے ہو حضرت تقاضا وہ شے ہے کہ جب یہ غالب ہو جاتا ہے تو آدمی رسیاں اور بیڑیاں توڑ کر بھاگ جاتا ہے اور اہتمام زنجیروں کو توڑ دیتا ہے اور بجائے ان زنجیروں کے صرف زنجیر زلف میں مقید ہونا پسند کرتا ہے۔

گر دو صد زنجیر آری بگسلم — غیر زلف آن نگار مقبلم
اسیرش نخواہد رہائی زبند — شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس محبوب کی زلف کے علاوہ اگر دو سو زنجیریں بھی لاؤ گے تو توڑ ڈالوں گا اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں چاہتا)

جب ایسا تقاضا پیدا ہو جاتا ہے تو ایسے شخص کو مجذوب کہتے ہیں اور اس قسم کی کشش کو جذب

کہا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں سلوک ہے یعنی اختیار اور ارادہ سے عمل کیا جاوے اور بدون جذب کے صرف یہ حالت ہونا خطرناک ہے اس لئے کہ جب قلب میں کوئی داعیہ نہیں ہے تو خواہ کتنے ہی اعمال و ذکر و شغل ہوں وہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ خدا جانے یہ شخص کب بدل جاوے اور جذب پیدا ہو گیا ہے تو وہ خطرہ سے نکل گیا ہے۔ اسی حالت کی تمنا میں عراقی فرماتے ہیں۔

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی   کہ دار زو دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے صنم اگر تو مجھ کو قلندرانہ راہ دکھائے تو وہ میرے لئے موزوں ہے کیونکہ پارسائی کی رہ و رسم انتہائی دور بھی ہے اور طویل بھی)

رہ قلندر سے مراد طریق جذب ہے اور رہ رسم پارسائی سے سلوک نرے سلوک کی یہ حالت ہے۔

بزمین چو سجدہ کردم ززمین ندا برآمد   کہ مرا خراب کر دی تو بسجدہ ریائی

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند   تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

(جب میں نے زمین پر سجدہ کیا تو زمین سے آواز آئی تو نے اپنے ریاکارانہ سجدہ سے مجھ کو بھی خراب کیا۔ طواف کعبہ کیلئے گیا تو مجھے اندر داخل ہونے نہیں دیا گیا کہ باہر تو نے کون سے نیک کام کئے کہ گھر کے اندر آ کر کرے گا)

اور اگر جذب کی حالت ہوتی ہے۔ تو پھر عبادات میں خواہ کتنی ہی کلفت ہو وہ سب برداشت کر لیتا ہے اور اس کلفت کی نسبت بزبان حال کہتا ہے جو عراقی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(تیری تیغ سے ہلاک ہوا ایسا دشمن کا نصیب نہ ہو تیری خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت رہے)

بعض لوگ جو کسی بزرگ کی مدح میں کہا کرتے ہیں کہ انہوں نے سلطنت اور ملک قبول نہیں کیا تو میں کہا کرتا ہوں یہ ان کا کمال نہیں ان کے اندر حق تعالیٰ نے کشش ایسی رکھ دی تھی اس نے ان کو بجز اپنے کسی کا نہیں چھوڑا بلکہ دوسری شے میں ان کا دل پریشان ہوتا ہے۔

زاہد نداشت تاب جمال پری رخاں   کنجے گرفت و ترس خدارا بہانہ ساخت

(زاہد کو پری رخوں کے جمال کی تاب نہیں تھی اس لئے کونہ میں بیٹھ گیا اور خدا کا خوف رکھنے کا بہانہ بنالیا)

ان کے قلب میں ایک داعی ہے کہ اس نے ان کو سب سے آزاد کر کے ایک جگہ آرام سے بٹھا دیا ہے ان کا کوئی کمال نہیں ہے اور میرا مقصود اس کمال کی نفی سے یہ ہے کہ کوئی شخص دعویٰ نہ کرے کہ میرے اندر یہ کمال ہے اس کا کوئی کمال نہیں ہے جملہ کمالات حضرت حق کے لئے ہیں

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک تقاضا قلب میں نہ ہو کوئی عمل دوامانہیں ہوسکتا اور تقاضے کا حاصل وہی تاثر ہے جو کہ قساوت کی ضد اس لئے قساوت کا اثر وہ ہوگا جس کو بیان فرمایا کہ وہ بے حکمی کرنے لگے پس ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ۔ یہ تو حاصل ہوا آیت کا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ خشوع بھی مقاصد سے ہے اور مقصود اعظم ہے اس لئے کہ گویا موقوف علیہ ہے طاعت کا لیکن مجھ کو اس وقت اس کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے میرا مقصود جدا ہے اور موقوف ہے ایک مقدمہ پر۔ وہ یہ ہے کہ عمل تین قسم کے ہیں۔ طاعت، معصیت، مباح۔ اول کی دو قسموں میں تو کچھ غلطی واقع نہیں ہوتی سب جانتے ہیں کہ طاعت کرنے کی شے ہے۔ اور معصیت ترک کے قابل ہے۔

مباح کی دو قسمیں

اب رہ گیا مباح اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مفضی ہو جاتی ہے۔ معصیت کی طرف اور ایک وہ جو معصیت کی طرف مفضی نہیں ہوتی جو قسم معصیت کی طرف مفضی ہوتی ہے مجھ کو یہ بھی بیان کرنا مقصود نہیں اس لئے کہ یہ غلطی خواص کو نہیں ہوتی گو عوام کو ہوتی ہے ہاں جو خواص کالعوام (بلکہ کالانعام) ہیں ان کو اس میں بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بدعات کے اندر مبتلا ہونے کا سبب یہی ہوا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ افعال تو مباح بلکہ بعضے مندوب ہیں ان کو کیوں منع کرتے ہیں اگر کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھ لی تو کیا حرج ہو گیا جو بدتہذیب ہیں وہ تو کھلم کھلا مانعین پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور جو مہذب ہیں وہ متعجبانہ اعتراض کرتے ہیں چنانچہ ایک غیر مہذب کی حکایت بیان کرتا ہوں کہ گنگوہ میں میں نے عید کے دن معانقہ کرنے کو منع کیا ایک شخص کہنے لگے کہ بس جی اب تو مردوں پر کفن پڑنا موقوف ہو جائے گا۔ میں نے کہا ہاں بیشک خبر بھی ہے کفن کس پر نہیں پڑتا شہید پر کفن نہیں پڑتا وہ سن کر جھلاتے ہوئے چلے گئے۔ اور بعضے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ لوگ جناب کی تعظیم اور آپ پر ایمان لانے سے روکتے ہیں یہ تو غیر مہذبین کی حکایت ہے اور جو مہذب اور بھولے بھالے ہیں وہ متعجبانہ اعتراض کرتے ہیں چنانچہ ایک شخص کہنے لگے کہ ہم نے برادری کو کھانا کھلا دیا اس میں کیا برائی ہوئی ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا برائی ہے میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سیر بھر لڈوؤں میں تولہ بھر سنکھیا ملا کر کھلا دی تو اس کو جو منع کیا جائے گا کہ یہ لڈو مت کھاؤ تو یہ فی الواقع لڈو کھانے سے ممانعت نہیں ہے بلکہ سنکھیا کھانے سے منع کیا جاتا ہے اسی طرح یہاں برادری کے کھلانے کو منع کیا جاتا ہے اس کے اندر جو زہر اتباع رسوم کا ملا ہوا ہے اس سے روکا جاتا ہے اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو معاصی کی فہرست ہی معلوم نہیں۔

شریعت کی سنت و رحمت

چنانچہ بدعات و رسومات میں جو مابہ المنع ہے وہ یہ ہے کہ جو شے سبب قریب ہو جاوے معصیت کا وہ معصیت ہے اور سبب قریب اس لئے کہا کہ یوں تو ہر امر بسبب بعید مفضی الی المعصیۃ ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے نکاح کیا اور اس کے لڑکا پیدا ہوا اور وہ لڑکا مرتد ہو گیا تو دیکھو یہ نکاح سبب بعید اس کے ارتداد کا ہے لیکن اس سببیت کی وجہ سے نکاح کو حرام نہ کہا جاوے گا شریعت میں بہت وسعت اور رحمت ہے پس غالب حالات میں جو شئے بلاواسطہ سبب معصیت ہو وہ معصیت ہے بہت لوگ اس مسئلہ سے غافل ہیں عوام تو ہیں ہی لیکن خواص میں بھی بہت ناواقف ہیں حالانکہ یہ مسئلہ خود قرآن سے ثابت ہے اور اگر بالفرض قرآن سے یہ مسئلہ ثابت بھی نہ ہوتا تو فقہ سے تو ثابت ہی ہے چنانچہ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ جو مندوب و مباح سبب ہو جاوے معصیت کا وہ ممنوع ہے۔

سجدہ شکر کی ممانعت کا سبب

چنانچہ فقہاء نے بہت سی ایسی چیزوں کو کہ بظاہر وہ سنت ہیں محض اس بناء پر منع کیا ہے کہ وہ امر سبب بن گیا ہے معصیت کا۔ چنانچہ سجدہ شکر کو مکروہ کہا ہے حالانکہ ثابت ہے کہ احیاناً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ شکر کیا ہے جیسا حدیثوں میں خرا ساجداً صاف وارد ہے گو اس میں تاویل اصلی صلوٰۃ کی گئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ تاویل ہے بعید سیدھی بات یہی ہے کہ آپ نے کبھی کبھی سجدہ شکر کیا ہے اور اکثر نہیں کیا پس فقہاء نے اس سے سمجھا کہ سجدہ شکر مقاصد دین سے نہیں ہے فی نفسہ مندوب ہے۔ لیکن مفسدہ یہ دیکھا کہ اس کو ضروری سمجھنے لگیں گے اور اس کو اپنی حد پر نہ رکھیں گے اس لئے اس کو مکروہ ٹھہرا دیا۔

دوسری نظیر اور لیجئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ حضور نے صبح کی نماز میں جمعہ کے روز اول رکعت میں سورۃ الم سجدہ اور دوسری میں سورۃ دھر پڑھی ہے مگر فقہاء نے دیکھا کہ لوگ اس کو اپنی حد پر نہ رکھیں گے اس لئے تعین سورت کو مکروہ کہہ دیا پس جو مباح بلکہ مندوب بھی سبب ہو جاوے معصیت کا اور تجاوز عن الحد کا وہ مکروہ ہوگا۔ غرض ہمارے عمل کے لئے کتب فقہیہ میں بھی اس کا مذکور ہونا کافی ہے۔

مسئلہ مذکور کا قرآن سے ثبوت

لیکن تبرعاً کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ دیکھو حق تعالیٰ فرماتے ہیں

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًام بِغَیْرِ عِلْمٍ یعنی اے مومنو ان بتوں کو کہ جن کو یہ مشرکین سوائے اللہ کے پکارتے ہیں سب وشتم مت کرو کیونکہ یہ اللہ کو حد سے متجاوز ہو کر بغیر علم کے برا کہیں گے۔ دیکھئے بتوں کی برائی کرنا مباح بلکہ طاعت ہے تاکہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو مگر جب احتمال اس کا ہو کہ یہ سبب ہو جاوے گا اللہ تعالیٰ کو برا کہنے کا اس حالت میں منہی عنہ ہے یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ جو مباح بلکہ مندوب بھی سبب ہو جاوے معصیت کا وہ بھی معصیت ہے اس سے زیادہ کونسی دلیل ہوگی کہ سب اصنام عین طاعت تھا اور وہ ممنوع ہو گیا۔ اور حدیث لیجئے حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سب سے برا وہ شخص ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ماں باپ کو کون گالی دیا کرتا ہے فرمایا کہ یہ کسی کے ماں باپ کو گالی دے اور وہ اس کے ماں باپ کو گالی دے معلوم ہوا کہ جو فعل سبب معصیت کا ہو وہ بھی اسی کے حکم میں ہے۔ یہاں کوئی طالب علم شبہ نہ کرے کہ اس حدیث سے اس مسئلہ پر تو استدلال جب ہو سکتا ہے جبکہ وہ فعل مباح ہو اور حدیث میں تو کسی کے ماں باپ کو گالیاں دینا ہے جو خود بھی معصیت ہے بات یہ ہے کہ میرا مطلب قاعدہ کو ثابت کرنا ہے اور قاعدہ کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ معصیت کا سبب من حیث السببیت معصیت ہے خواہ پہلے سے مباح ہو یا معصیت اس سے بحث نہیں۔ علاوہ اس حدیث و آیت کے اگر میں غور کروں تو بہت احادیث و آیات اس مدعا پر ملیں گی غرض قرآن سے حدیث سے فقہ سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔

جملہ بدعات کی وجہ ممانعت

اب اس قاعدہ کے سمجھنے کے بعد تمام بدعات کی وجہ ممانعت سمجھ میں آوے گی مثلاً چنوں پر کلمہ پڑھنا اور قرآن پڑھنا سبب ہے ایک عقیدہ فاسدہ کا کہ عوام الناس یوں سمجھتے ہیں کہ یہ بھی مقاصد دین میں سے ہے پس یہی غلطی رسوم کی پابندی میں ہے کہ جس میں بعض اہل علم سے بھی بسبب رواج کے غلطی ہو جاتی ہے گو جو معصیت مسبب ہو جاتی ہے وہ مختلف ہے کہیں فساد عقیدہ جیسے ان بدعات میں جو برنگ دین ہیں اور کہیں ریاء و تفاخر وغیرہ جیسے ان رسوم میں جو برنگ دنیا ہیں۔ اور اگر وہ دعوے کرے کہ میری نیت تفاخر کی نہیں لیکن جب برنگ رسم کرے گا تو دوسرے تو متضرر ہوں گے اس لئے یہ عذر مسموع نہ ہوگا۔ پس مجھ کو ایسے مباح کو بھی اس وقت بیان کرنا مقصود نہیں ہے جو مفضی ہو جاوے معصیت کی طرف اب صرف وہ مباح رہ گیا جو سبب بعید ہو جاوے معصیت کا سو وہ شرعاً معصیت نہیں ہے مباح ہے مگر مطلوب الترک اور ندباً ترک کے قابل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مباح کی تین قسمیں ہیں۔ طاعت بوجہ افضاء الی الطاعۃ کے اور

معصیت واجب الترک بوجہ افضاء الی المعصیۃ کے۔ اور مندوب الترک بوجہ عدم سببیت قریبہ للمعصیۃ کے۔ مجھ کو اس وقت صرف آخر الذکر مباح کا ذکر کرنا مقصود ہے یعنی جو کہ بواسطہ یا بواسطتین یا بوسائط مفضی الی المعصیۃ ہو جاتا ہے۔ سو اس باب میں لوگوں کو کچھ غلطی واقع ہوتی ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مباح کے باب میں لوگوں کی حالت مختلف ہے بعضے تو اس میں بہت تنگی کرتے ہیں اور بہت سے مباحات سے منتفع ہونا انہوں نے چھوڑ دیا ہے اور بعض توسع بہت کرتے ہیں اور یہ ذکر ان لوگوں کا ہے جو متقی ہیں عوام الناس یا غیر محتاط لوگوں کا ذکر نہیں بلکہ اتقیاء اور جو دیندار کہلاتے ہیں ان کا ذکر ہے کہ ان میں بھی اکثر لوگ مباحات کے اندر بے حد وسعت کرتے ہیں گو معصیت میں مبتلا نہیں ہیں چوری نہیں کرتے غیبت نہیں کرتے کسی اور معصیت میں مبتلا نہیں۔ مباحات میں بے حد وسعت کرتے ہیں مثلاً فضول ملاقاتیں بہت کرتے ہیں سیاحت بے حد کرتے ہیں جہاں بیٹھیں گے باتوں کا ایسا چرخہ چلا دیں گے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ تذکرے اور حکایتیں اور فلاں اخبار میں یہ لکھا ہے اور فلاں پرچہ میں یہ مضمون ہے۔ بعضوں کو کھانے پینے کا بے حد شوق ہوتا ہے ہر وقت کھانوں کا ہی تذکرہ ہر وقت اسی کا اہتمام ہے اور سمجھتے ہیں کہ ہم کیا برا کرتے ہیں اور اس کثرت کو مضر نہیں سمجھتے اور اس سے طبیعت میں اپنی رکاوٹ نہیں پاتے کپڑا جو بناویں گے چھانٹ چھانٹ کر منگا دیں گے اور اس کا ضرورت سے زیادہ اہتمام کریں گے۔

مباحات میں عورتوں کا انہماک

اور عورتوں کو تو پوچھو ہی مت کوئی عورت اگر دوسری کے پاس کوئی زیور دیکھے گی تو پوچھتی ہے بہن یہ کہاں سے بنوایا تھا اور کب بنوایا ہے مجھ کو بھی بنوا دو بس اس کی دھن میں لگ گئی۔ اور خاوند سے فرمائش شروع ہو گئی کہ ہم کو بھی ایسا ہی بنوا دو میں تو اسی واسطے کہا کرتا ہوں کہ ان عورتوں کا بلا ضرورت شرعیہ جمع ہونا ہی جائز نہیں۔ یہ جمع ہونا ہزاروں خرابیوں کا باعث ہے جہاں یہ جمع ہوتی ہیں ایک نظر میں ایک دوسری کو تاڑ لیتی ہے بڑی دقیقہ رس ہوتی ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ دقیقہ رس ہی ہیں یعنی کھوئی کا پٹھا ہیں ایسی دقیقہ رس ہیں کہ ایک نظر میں ہر عورت کا سراپا دوسری کو یاد ہو جاتا ہے چنانچہ اگر پوچھو تو پٹ پٹ بیان کر دیں گی کہ فلاں کے سر میں یہ تھا پاؤں میں یہ تھا اور ہاتھ میں یہ تھا اور پیٹ تک خبر پوچھ لو چنانچہ کہتی ہیں کہ فلانی پیٹ سے ہے دوپٹہ ایسا تھا کرتہ ایسا پاجامہ ایسا۔ مرد تو اگر یاد بھی کریں تو یاد نہ ہو ان کی نگاہ ایسی غضب کی ہے کہ ایک نگاہ میں سب ازبر ہو گیا۔ اور پھر ایک دوسری سے حرص کرتی ہیں۔ ایک کورٹ انسپکٹر تھے ان کی بیوی اپنے ہاتھ سے چکی پیستی تھی اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی تھی وہ ایک اور شخص کے پڑوس میں آ کر رہے ان کی تنخواہ بہت کم تھی یعنی

کل ایک سوبیس روپے مگر ان کی بیوی کو جو دیکھا تو سر سے لے کر پاؤں تک زیور میں لدی ہوئی اور کام کرنے کے لئے مامائیں بچوں کے لئے انائیں غرض سب سامان ہیں پوچھا بہن تمہارے خاوند کی کیا تنخواہ ہے کہا ایک سوبیس روپے یہ سن کر جل گئی کہ ان کی اس تنخواہ میں یہ حالت اور میرے خاوند کی اس سے بہت زیادہ تنخواہ اور میں اس حالت میں بس خاوند سے لڑنا اور فرمائشیں کرنا شروع کر دیں۔ زیور بنواؤ اور مکان بنواؤ چنانچہ وہ کورٹ انسپکٹر صاحب ایک بار ملے تھے کہ صاحب غضب میں جان آ گئی دیکھئے کیا بُری تاثیر صحبت تھی کہ ایک توجہ میں کامل بنا دیا اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان کو جمع ہی نہ ہونے دو۔ غرض یہ عورتیں رات دن اسی میں کھپتی رہتی ہیں کہیں چادرہ کا حساب ہو رہا ہے کہیں زیور کا تخمینہ ہے شب و روز سوائے اس دھندے کے کوئی کام نہیں مرد بھی اس قسم کے کام کرتے ہیں لیکن بہت اترے دل سے ان کے تو کام کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس سے فارغ ہو کر اور کام بھی کرنا ہے اور عورتوں کی مشغولی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بس دنیا میں یہی کام ہے کوئی اور کام دنیا یا دین کا ان کے متعلق نہیں مجھ کو تو ان کو دیکھ کر بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اور بعضے بعضے مرد ہی اس دھن میں رہتے ہیں کہ اگر اچکن ایسا ہو تو صدری ایسی ہونی چاہئے اور ٹوپی اس قسم کی مناسب ہے بعض لوگوں کو آرائش کا بہت شوق ہوتا ہے کہیں کمرہ سجا رہے ہیں اس کے لئے بڑا اہتمام ہے گلدستے منگا رہے ہیں فوٹو اور نقشے منگانے کی بڑی فکر ہے کوئی اپنے بدن کو سنوار رہا ہے گھر سے باہر اس وقت نکلیں گے۔ جب پہلے کنگھی چوٹی سے آراستہ ہولیں گے حالانکہ یہ تن آرائی و تن پروری وہ شئے ہے جس کی نسبت کسی حکیم کا قول ہے۔

این تن آرائی واین تن پروری عاقبت سازد ترا از دین بری

(یہ بناؤ سنگار آخر کار دین سے بیگانہ بنا دیتا ہے)

سو ان کو تو ان کا ضرر ہی نہیں محسوس ہوتا اور ان کے مقابلہ میں بعض وہ لوگ ہیں کہ ان کو اس کا ضرر محسوس ہوا لیکن وہ دوسری جانب میں بڑھ گئے یعنی تنگی بہت کرنے لگے کسی سے بات نہیں کرتے چپ بیٹھے ہیں کھاتے نہیں ہیں چنانچہ مشہور ہو جاتے ہیں کہ فلاں بزرگ اناج روٹی نہیں کھاتے لوگ اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں غرض مباحات میں یا تو وہ وسعت یا اس قدر تنگی۔ دونوں حالتیں مذموم۔ مولانا نے خوب فرمایا ہے۔

چوں کہ خوردی تند و بدرگ می شوی چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی

(جب تو بھوکا ہوتا ہے تو کتا بن جاتا ہے اور جب تو شکم سیر ہوتا ہے تو تیز اور بدمزاج ہو جاتا ہے)

خدا تعالیٰ نے دونوں کا علاج ان مختصر جملوں میں خوب فرمایا کلوا و اشربوا و لا تسرفوا

(کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو) مگر پھر بھی بعضے افراط کرتے ہیں بعضے تفریط مباحات کے اندر افراط وتوسیع کرنے والوں کی نسبت کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

گرچہ خدا گفت کلوا واشربوا لیک نفرمود کلوا تا گلو

(خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ کھاؤ اور پیو مگر یہ نہیں فرمایا کہ گلے تک کھاؤ)

اور تفریط اور تنگی کرنے والوں کے متعلق دوسرا شعر کہا ہے۔

گرچہ خدا گفت ولا تسرفوا لیک نفرمود بکلیہا وضو

(خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ خرچ کرو مگر یہ نہیں فرمایا کہ بالکل صفایا کردو)

ایک شعر میں غالب نے بے ہودگی کی تھی

ہم توبہ جب کریں گے شراب وکباب سے قرآن میں جو آیا کلوا واشربوا نہ ہو

ایک شاعر نے اس کا خوب جواب دیا ہے۔

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب جب آگے واشربوا کے ولا تسرفوا نہ ہو

قرآن کا عجیب معجزہ ہے کہ جب کسی نے ایسا استدلال کیا ہے وہاں ہی اس کا جواب بھی موجود ہے۔ غرض توسع ہوا تو ایسا ہوا کہ بس جب یہ اطمینان کرلیا کہ یہ امر گناہ تو نہیں بس کھل کھیلے۔ اور تنگی ہوئی تو ایسی کہ مباح ضروری سے بھی اجتناب کرنے لگے۔ یہ تو کھانے پینے کے متعلق کلام تھا۔ اب لیجئے معاملات میں تجارت میں اگر لگے تو ایسے کہ اسی میں کھپ گئے شب وروز اسی کا خیال ہے وہی دھن ہے جہاں بیٹھیں گے وہی تذکرہ ہے ہاں اگر تجارت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یاد بھی ہو تو مضائقہ نہیں ایسے ہی لوگوں کی نسبت ارشاد ہے۔

يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ. وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

یعنی ان گھروں میں اللہ کی تسبیح صبح وشام ایسے مرد کرتے ہیں کہ جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد اور نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ کے دینے سے غافل نہیں کرتی وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں کہ جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہوں گی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے اچھے اعمال کی جزا دیں اور ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب رزق دیتے ہیں۔ پس تجارت کرو زراعت کرو نوکری کرو لیکن جو مقصود اصلی ہے وہ ہاتھ سے نہ جانے دو یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت غفلت نہ ہو اس پر شاید کسی کو تعجب اور حیرت ہو کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک وقت میں دو کام کریں خرید وفروخت بھی کریں اور ذکر بھی کریں مگر واقع میں تعجب کی کوئی بات نہیں دیکھو تم نماز پڑھتے ہو۔ اور عین نماز کی حالت میں

تجارت کی یاد کرتے ہو پس ایسے ہی اس کا عکس ہی ہو سکتا ہے اور اگر نہیں تو فرق بتلا دو کیا ہے بات یہ ہے کہ جس شے کا آدمی کو شوق ہوتا ہے وہ ہر وقت دل میں بسی رہتی ہے پھر آدمی خواہ کسی کام میں لگ جاوے مگر وہ کام اس چیز کے دل میں ہونے کو مانع نہیں ہوتا چونکہ ہم کو دوسری چیزوں کا شوق ہے اس لئے ہماری حالت یہ ہے کہ نماز پڑھ رہے ہیں اور دل دوسری طرف ہے۔

چوں بطواف خود بدی خود مرتدی چوں بخانہ آمدی ہسم باخودی

(جب تک تو اپنا طواف کر رہا تھا تو مرتد تھا اور جب تو گھر میں آیا تو بھی غرور کے ساتھ)

میں یہ نہیں کہتا کہ مباحات کے اندر اس قدر مشغولی ناجائز ہے یا گناہ ہے لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مضر ہے اور مفضی ہو جاتا ہے معاصی کی طرف اور ایسے شخص کی حالت دیکھ کر اول ہی سے کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کا انجام اچھا نہیں جیسے اس کی نظیر میں کسی نے کہا ہے۔

من از آں حسن روز افزوں کو یوسف داشت دانستم کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخارا

(یوسف علیہ السلام کے اس روز افزوں حسن سے میں نے یہ جانا ہے کہ عشق زلیخا کو پردہ عصمت سے باہر کھینچ لایا ہے)

اس مشغولی سے بعضوں کی یہاں تک حالت ہوتی ہے کہ مرنے کے وقت ہی وہی شئی ان کو یاد رہتی ہے ابن قیمؒ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک تاجر کو مرنے کے وقت کلمہ تلقین کیا گیا تو وہ جواب میں کہتا تھا دس کا خریدا گیارہ میں دوں گا۔ شاید اس حکایت کو سن کر آپ یہ سمجھے ہوں گے کہ اس شخص کا خاتمہ برا ہوگا مگر میں یہ نہیں کہتا اس لئے کہ وہ وقت بے ہوشی کا ہوتا ہے اس وقت جو منہ سے نکلے معاف ہے جیسے سوتے وقت جو کچھ منہ سے نکلے خواہ وہ کلمات کفر ہی ہوں کچھ مواخذہ نہیں۔ یہاں سے جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی بیان کرتا ہوں کہ کسی مرتے ہوئے کی حالت دیکھ کر جو فتوے لگا دیا جاتا ہے کہ بری حالت میں مرا یہ سخت بات ہے اس لئے کہ مرنے کا وقت بڑی مصیبت کا وقت ہے اس وقت آدمی کے حواس صحیح نہیں رہتے تو اس وقت جو کچھ اس کے منہ سے نکلے وہ قابل اعتبار نہیں بلکہ ان کلمات کے صدور کا ذکر بھی نہ کرنا چاہئے ہاں اگر کوئی شخص فاسد الاعتقاد ہو اور لوگوں کو فاسد عقائد سکھلاتا ہو اس کی بدحالی کو البتہ شائع کرنا چاہئے تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور صحت عقائد کو ضروری جان کر عمل کریں اور جو شخص صحیح العقیدہ ہو اس کو بدنام نہ کرو بلکہ اس کی حالت اور قول کی تاویل کرلو۔ اس کی بری بات اور بری حالت کو اچھی حالت میں داخل کرو۔ جس شخص کو تاویل کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ اولیاء اللہ پر اعتراض نہیں کرتا اور اسی واسطے کہتے ہیں کہ موت کے وقت سمجھدار دینداروں کا پاس ہونا ضروری ہے۔ ایک بزرگ کا انتقال ہوا انہوں نے بجائے کلمہ کے یہ پڑھا لا الٰہ الا اللہ موسیٰ کلیم

اللہ۔لوگوں نے کہا کہ یہودی ہو کر مرے ہیں۔ایک محقق نے سن کر کہا ارے ظالمو! یہ تو بڑے پایہ کی بات ہے یہ بزرگ قدم موسیٰ پر تھے یہ اس کا ظہور ہے۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بزرگوں کی شانیں مختلف ہیں جیسے انبیاء کی شان مختلف ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے اندر جلال کا اس قدر غلبہ تھا کہ جب ان کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تو ارشاد ہوا **فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا** یعنی فرعون کو بات نرم کہو۔ چونکہ تیز تھے تو حکم نرمی کا ہوا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی یہ شان ہے کہ ان کا ارشاد ہے کہ اگر تمہارے ایک رخسارہ پر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا رخسارہ بھی اس کے سامنے کر دو چونکہ ولایت بھی شعبہ اور ظل نبوۃ کا ہے اس لئے اولیاء اللہ کی بھی شان مختلف ہوئی ہے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے یہاں وزیر حیدر آباد آئے حکم ہوا نکال دو خدام نے عرض کیا کہ حضور وزیر ہیں فرمایا میں کیا کروں اگر وزیر ہے جب بہت عرض کیا گیا تو فرمایا اچھا دو بجے رات تک اجازت ہے۔ امرائے حیدر آباد بھی بزرگوں کے ایسے معتقد ہیں دو بجے کے بعد فوراً وہ خود چلے گئے۔ غرض یہاں تو یہ تیزی۔ اور ایک ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ تھے اللہ اکبر رحمت مجسمہ تھے کیسا ہی کوئی بدحال ہو جس پر ہم کفر کا فتویٰ لگا دیں وہ اس کے فعل کی بھی تاویل فرماتے تھے۔ حضرت کا مذاق طبیعت ہی اس قسم کا تھا اور سبب اس کا غلبہ تواضع تھا کہ کسی کو اپنے سے کم نہ سمجھتے تھے تواضع کی یہ کیفیت تھی کہ ایک شخص نے حضرت کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھا تھا پڑھنا شروع کیا اور حضرت کے چہرہ سے برابر آثار کراہت کے ظاہر ہو رہے تھے جب قصیدہ پورا پڑھ لیا تو حضرت نے فرمایا کہ میاں کیوں جوتیاں مارا کرتے ہو۔ سو کوئی بزرگ فطرۃً نرم مزاج ہوتے ہیں اور بعضے طبعاً تیز ہوتے ہیں۔ اور مقبول ہونے سے مزاج نہیں بدلتا اگر پہلے سے کوئی شخص تیز مزاج ہے تو وہ تیزی اس کی بعد مقبولیت کے بھی زائل نہ ہوگی فرق اس قدر ہوگا کہ پہلے تیزی میں حدود سے بڑھ جاتے تھے اب حدود کے اندر رہیں گے پہلے غیروں پر ناحق تیزی کرتے تھے اب اپنے نفس پر تیز ہوں گے اور تیز خلاف شرع امر پر غصہ کریں گے پس اولیاء اللہ کو ان شیون مختلفہ کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہوتی ہے اور حدیث سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ بدر کے قصہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اساری بدر کے متعلق مشورہ لیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ آپ کی قوم ہے اور امید ہے کہ اسلام لا دیں گے آپ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیجئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ان کی گردن ماریئے مجھ کو حکم دیجئے میں اپنے اقارب کو قتل کروں اور آپ اپنے عزیزوں کو قتل

کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا اے ابوبکر تمہاری مثال تو ابراہیم کی سی ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ. وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جو شخص میری راہ چلے گا وہ میرا ہی ہے اور جو شخص میرا کہنا نہ مانے پس آپ کثیر المغفرت کثیر الرحمت ہیں) اور اے عمر تمہاری مثال نوح علیہ السلام کی سی ہے کہ انہوں نے دعا کی تھی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اس حدیث سے اس مسئلہ تصوف کا پتہ چلتا ہے پس اولیاء اللہ کو علی حسب الاستعداد انبیاء کی ان شیون مختلفہ سے فیض ہوتا ہے جس کی تفسیر عنقریب آتی ہے اور جس ولی کو جس شان سے فیض ہوتا ہے اس کو اس نبی کے قدم پر کہا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بزرگ قدم موسیٰ علیہ السلام پر ہیں اور فلاں قدم ابراہیم پر ہیں اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان بزرگ کو یہ فیض نہیں ہوا اور موسیٰ علیہ السلام سے ہوا بلکہ وہ فیض تو حضور سے ہے مگر یہ ایک اصطلاح ہے۔ اور تفسیر اس کی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام شیون کے جامع ہیں حضور میں شان موسویت عیسویت سب کچھ ہے۔ کوئی شاعر کہتا ہے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

(حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مسیح نفسی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا جو لوگوں میں الگ الگ تھا وہ سب تیرے پاس ہے)

چنانچہ حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے حضور نے لوگوں سے سنا کہ کوئی کہتا ہے موسیٰ کلیم اللہ ہیں اور کوئی کہتا ہے ابراہیم خلیل اللہ ہیں حضور نے فرمایا کہ میں نے سب سنا اور سب درست ہے لیکن الا ان صاحبکم حبیب اللہ یعنی تمہارا صاحب یعنی میں حبیب اللہ ہوں محبوبیت خاصہ کا وہ مرتبہ ہے کہ تمام مراتب کو جامع ہے اور حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء علیہم السلام میرے جھنڈے کے نیچے ہیں اور یہ کوئی فخر نہیں (یعنی فضل ہے) اس سے بھی جامعیت کی طرف اشارہ ہے۔ پس کسی ولی کو تو فیض ہوتا ہے اس شان محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مسمی بہ شان موسوی ہے اور کسی کو فیض ہوتا ہے اس شان محمدی کے جو مسمی بہ شان ابراہیمی ہے جس کو جس شان سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے اسی شان کا اس میں ظہور ہوتا ہے پس ان بزرگ محقق نے ظاہر فرمادیا کہ ان کا قدم موسیٰ پر انتقال ہوا ہے۔

حضرت نجم الدین کبریٰ کی حکایت

حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی حالت معلوم نہ تھی کہ میں کس مرتبہ میں ہوں اور اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے اگر کسی بچہ کے نام سے دس ہزار روپے بینک میں جمع کر دیئے جاویں اور

اس کو اطلاع نہ ہو تو دیکھئے وہ بچہ دولتمند ہے۔ اور اس کو کچھ خبر نہیں کہ میری ملک میں اس قدر روپیہ ہے۔ غرض وہ جویاں تھے کہ مجھے معلوم ہو جاوے کہ کس مقام سے مجھ کو نسبت ہے اس زمانہ میں ایک مشہور بزرگ تھے حضرت نجم الدین کبریٰ کے ایک مرید نے چاہا کہ ان بزرگ کی زیارت کریں اپنے پیر سے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی انہوں نے اجازت دے دی محقق وہی ہے کہ اپنے مریدوں کو کسی سے نہ روکے جس سے چاہیں ملیں لیکن علاج ایک ہی سے کرانا چاہئے ایسی مثال ہے کہ مریض علاج تو ایک ہی طبیب سے کراتا ہے لیکن مطب میں اوروں کے بھی چلا جاتا ہے اور گاہے مشورہ بھی لے لیتا ہے چنانچہ وہ مرید ان بزرگ کی خدمت میں پہنچے اور ان کی زیارت سے مشرف ہوئے انہوں نے پوچھا کہ تمہارا یہودی پیر اچھا ہے مرید کو سن کر بہت غصہ آیا کہ یہ بڑے مہمل آدمی ہیں میرے پیر کو یہودی کہتے ہیں لیکن چونکہ خود پیر بھی ان کا ادب کرتے تھے دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا کر رہ گئے۔ یہاں سے رخصت ہو کر پیر کے پاس پہنچے پیر نے پوچھا کہ کچھ ہمارا بھی ذکر آیا تھا مرید نے کہا کہ حضرت آیا تو تھا مگر انہوں نے حضور کی شان میں ایک بہت بُرا لفظ کہا حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ کہو تو سہی کیا کہا انہوں نے نقل کر دیا کہ انہوں نے یہ پوچھا کہ تمہارا یہودی پیر بھی اچھا ہے یہ سن کر حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ پر ایک حالت طاری ہو گئی اور کہا کہ الحمدللہ میں قدم موسیٰ پر ہوں۔ غرض مرنے کے وقت جو حالت مردہ کی ہو اس کو چھپانا چاہئے اور گمان نیک رکھنا چاہئے اس کی کسی حالت سے اس کے برے ہونے پر استدلال نہ کرے۔ ایک قصہ اور یاد آ گیا ہمارے دادا پیر حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی قدس سرہ کے ایک پیر بھائی تھے مگر وہ مثل مرید کے تھے شیر خاں ان کا نام تھا جب ان کا انتقال ہونے لگا تو وہ چپ تھے کلمہ ان سے پڑھواتے تھے اور وہ نہ پڑھتے تھے لوگوں کو بڑی وحشت ہوئی کہ ایسے ذاکر شاغل آدمی اور ایسی حالت میں دنیا سے جا رہے ہیں حضرت میانجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اطلاع ہوئی حضرت ان کے پاس تشریف لائے اور پوچھا کہ کیسے ہو فرمایا بہت اچھا ہوں مگر ان کو منع کر دیجئے کہ مجھ کو پریشان نہ کریں یہ مجھ کو مسمّٰی سے اسم کی طرف لاتے ہیں میں غافل نہیں ہوں حضرت نے لوگوں سے کہا کہ بھائی ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو یہ بڑے مقام پر ہیں تجھ کو ان کی کیا خبر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے ایک خادم کی حکایت

ایک اور بزرگ تھے انبہٹہ میں ان کی حکایت مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم گنگوہی بیان کرتے تھے کہ وہ دو بھائی تھے ایک بھائی تو نقشبندیہ سلسلہ میں کسی سے بیعت تھے اور دوسرے جن

کی یہ حکایت ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے بھائی ان کو ہمیشہ ترغیب دیا کرتے تھے کہ تم مجھ سے بھی فیض حاصل کرو ورنہ محروم رہو گے پچھتاؤ گے یہ ٹال دیتے تھے اتفاق سے ان کا انتقال ہونے لگا مگر اس وقت وہ چپ تھے کلمہ وغیرہ نہ پڑھتے تھے جب بھائی نے یہ حالت دیکھی تو کہا دیکھو میں کہا کرتا تھا کہ محروم رہو گے اب کہاں گئی وہ نسبت حاجی صاحب کی کہاں گیا وہ فیض یا تو وہ بے ہوش تھے یا بیساختہ جوش میں ان کی زبان پر جاری ہو گیا یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ کاش میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے مجھ کو بخش دیا۔ اور مجھ کو عزت داروں میں شامل کر دیا۔ حالانکہ وہ عربی بھی نہ جانتے تھے اور اس کے بعد ذکر جاری ہوا اور اسی میں انتقال ہو گیا۔ مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم کہتے ہیں کہ میں اس وقت موجود تھا جب یہ ہوا تو میں نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا کہ دیکھو یہ ہے نسبت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اور افسوس ہے تمہارے حال پر شیخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اور ان کی حالت کو نہ سمجھ سکے غرض انتقال کے وقت اس قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں کہ ہر شخص ان کو نہیں سمجھ سکتا کسی حالت کو دیکھ کر کوئی حکم اس پر نہیں لگا سکتے پس اسی طرح اس تاجر کے اس حال سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ بری حالت میں مرا لیکن یہ ضرور کہا جاوے گا کہ اس کے دل میں کچھ اور شے بسی ہوئی ہے کہ وہ زبان پر آ گئی۔ اسی طرح سوتے ہوئے جو آدمی بڑاتا ہے وہ بھی قابل افسوس نہیں ہے اور اسی طرح برے خواب سے بھی غمگین نہ ہونا چاہئے خواب کے اندر یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ کسی بیداری کی حالت کی تو دلیل نہیں اگر بیداری کی دلیل ہو تو واقعی قابل تاسف ہے ورنہ خواب ایسی کوئی شے نہیں۔ مجھ سے تو اگر کوئی خواب کی تعبیر پوچھتا ہے تو میں صاف کہہ دیتا ہوں کہ مجھے خواب سے مناسبت نہیں اور یہ شعر لکھ دیتا ہوں۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

نہ میں رات ہوں نہ شب پرست ہوں کہ خواب کی باتیں کروں
چونکہ میں آفتاب کا غلام ہوں اس لئے آفتاب کی باتیں کرتا ہوں

ہاں خواب بعض مرتبہ جو کسی بیداری کی حالت پر دلیل ہو اور وہ حالت ہو افسوسناک تو وہ خواب بھی واقعی افسوس کے قابل ہے نہ خواب ہونے کی حیثیت سے بلکہ حالت بیداری کی حیثیت سے کیونکہ بیداری کی حالت میں جب آدمی کو کسی شے کے اندر انہماک ہوتا ہے تو ہر وقت وہی شے دل میں بسی رہتی ہے اور اس قدر غلبہ اس کا ہوتا ہے کہ اس کو احساس بھی اس کا نہیں ہوتا کہ میری یہ حالت ہے خواب میں بھی وہی دیکھتا ہے تو وہ خواب اس کی بیداری کی حالت پر دلیل ہے

جیسے کسی طالب علم سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے تو اس نے کہا چار روٹیاں غرض آدمی کے دل میں بری شے یا اچھی شے جو بھی سما جاوے اس کی بھی حالت ہوتی ہے اس لئے مباحات میں بھی اتنا انہماک نہ کرے کہ ہر وقت وہی دل میں بس جاوے اور گو اس کو فتویٰ میں گناہ نہ کہا جاوے لیکن مضر ضرور ہے اور ابھی تک میں نے اس انہماک فی المباحات کی مضرت بیان نہیں کی کہ وہ کیا مضرت ہے اب بیان کرتا ہوں کہ اس آیت کے شان نزول کو ترجمہ کے ساتھ منضم کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہماک مذکورہ مضر خشوع ہے اس لئے کہ سبب نزول کا اثر بیان فرمانا مقصود ہے اور سبب نزول ہے ہنسی اور دل لگی جیسا اوپر ذکر ہوا اور وہ مباح ہے اور اس کا یہ اثر بیان فرمایا کہ اس سے قساوت پیدا ہو جاوے گی کہنا تو یہ تھا کہ کیا ہنسی دل لگی چھوڑنے کا وقت نہیں پہنچا اور فرمایا یہ کہ کیا خشوع کا وقت نہیں پہنچا اس سے معلوم ہوا کہ یہ حالت خشوع کے خلاف ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص زیادہ ہنسی دل لگی کرتا ہے اس کے قلب سے حلاوت اور بہار و لطف جاتا رہتا ہے جس کو ذرا احساس و تمیز ہو وہ دیکھ لے کہ زیادہ ہنسنے اور زیادہ باتیں کرنے سے لوح قلب بالکل ایسی ہو جاتی ہے جیسے دھلی ہوئی جن سے تھوڑی سی خلوت حاصل کی ہو وہ محسوس کر سکتا ہے کہ جب وہ مباحات میں انہماک کرتا ہے تو واللہ اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بجائے دل کے ایک پتھر رکھا ہوا ہے چنانچہ ایسے لوگ یہ حالت دیکھ کر مغموم بھی ہوتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ دیر کے بعد پھر قلب اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے مولانا فرماتے ہیں۔

بردل سالک ہزاراں غم بود   چوں زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر ذرہ بھر بھی اس کی باطنی حالت میں کمی ہوتی ہے)

بعض لوگوں پر ایسا غم سوار ہوا ہے کہ انہوں نے اس غم میں خودکشی کر لی ہے اس حالت کو قبض کہتے ہیں۔ مولانا ایسے شخص کو تسلی دیتے ہیں اور اس کا غم گھٹاتے ہیں۔

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو   آں صلاح تست آلیس دل مشو
چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں   تازہ باش وچیں میفگن بر جبیں

(اگر مجھ پر قبض اور انبساط کی حالت آجائے تو تیرے لئے بہتر ہے کہ دلگیر نہ ہو چونکہ تجھ پر قبض طاری ہوتا ہے تو اسکے اندر کشادگی تلاش کر اور تازہ ہو جا اور پیشانی پر شکن مت ڈال)

عارف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

باغباں گر پنج روزی صحبت گل بایدش   بر جفائے خار ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

(اے باغباں اگر پانچ روز بھی گل کی صحبت میسر ہو جائے تو جدائی کے کانٹوں کی تکلیف پر

بلبل کو بھی صبر آ سکتا ہے۔ اے زلف تو اس کی زلفوں میں گرفتار ہو کر پریشان مت ہو کیونکہ عقل مند پرندہ جب جال میں پھنستا ہے تو اس کو صبر کرنا چاہئے)

یہ تسلی ان لوگوں کے لئے ہے جو پہلے سے غم میں مبتلا ہیں اور جو پہلے سے بے غم ہیں جیسے ہم لوگ ایسوں کے لئے غم وفکر کی تعلیم کی جاتی ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

اے برادر عقل یکدم باخود آر دمبدم در تو خزان است و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے عقل سے کام لے کیونکہ ہروقت تیرے اندر خزاں بھی ہے بہار بھی)

مطلب یہ ہے کہ ظاہری بہار کو کیا دیکھتے ہو تمہارے اندر خود ایک بہار ہے اس کو دیکھو کہ بدل بخزاں تو نہیں ہوگئی کسی اور کا شعر ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سرو وسمن درآ تو زغنچہ کم ندمیدہ دردل کشا بچمن درآ

(یہ ستم ہے کہ تجھ کو ہوس سرو وسمن کی سیر کیلئے کھینچے حقیقت یہ ہے کہ تو خود غنچہ سے کم نہیں ہے اپنے دل کا دروازہ کھول اور چمن کا نظارہ کر)

اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت است چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت است

(جو خلوت گزیں ہوگیا اس کو تماشا کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے دوست ہے اس کو صحرا کی کیا ضرورت ہے)

واقعی جنگل میں کیا رکھا ہے جو شخص اپنے قلب کا مطالعہ کرتا ہے اس کو تو وہ لطف حاصل ہے کہ وہ کہیں بھی نہیں۔ یہ مضمون تو تبعاً مذکور ہوگیا مقصود اصلی یہ تھا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مباحات کی کثرت مضر خشوع ہے اور یہ ہنسی دل لگی کے ہی ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ جس شے میں بھی حد سے زیادہ مشغولی ہوگی اس کا یہی اثر ہے مثلاً کپڑا پہننے میں تعمیر میں تجارت میں سب کا اثر یہی ہے کہ قلب کے اندر کدورت اور سختی پیدا ہوگی یہ تو قرآن مجید سے ثابت ہوا۔

مباحات کے انہماک کے مضر ہونے کا احادیث سے ثبوت

اب احادیث لیجئے حدیث میں ہے **لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ قسوۃ وان ابعد الشیء عنداللہ القلب القاسی** (سنن الترمذی:۲۴۱۱)

یعنی اللہ کی یاد کے سوا کلام کی کثرت نہ کر اس لئے کہ کثرت کلام بدون ذکر اللہ کے قساوت ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ دور قلب قاسی ہے۔ اور ارشاد ہے

لاتکثروا الضحک فان کثرت الضحک تمیت القلب (سنن الترمذی:۲۳۰۵)

یعنی ہنسی زیادہ مت کرو کیونکہ کثرت ہنسی کی دل کو مردہ کردیتی ہے۔ حضرت شیخ عطار فرماتے ہیں۔

دل زپر گفتن میرد در بدن　　گرچہ گفتارش بود در عدن
گر خبر داری زحی لایموت　　برزبان خود بنہ مہر سکوت

(دل زیادہ بولنے سے بدن کے اندر مرجاتا ہے اگرچہ اس کی گفتار عدن کے موتی کے ہی برابر کیوں نہ ہو۔ اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ کی خبر بھی ہے تو اپنی زبان پر مہر سکوت لگالے)

یہ بزرگوں کے ارشادات بھی حدیثوں ہی کے ترجمے ہیں۔ اور ایک حدیث اس مسئلہ پر سب سے زیادہ دال ہے گو اس میں ذرا فکر کی ضرورت ہے اور اس میں بہت بڑی مضرت کی تصریح ہے اور نیز طلبہ کے کام کی بات ہے وہ یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ عید کا دن تھا حضور دولت خانہ میں تشریف رکھتے تھے دو لڑکیاں دف لئے بجا رہی تھیں اور گا رہی تھیں اور ایک روایت میں ایک قصہ جشن کا آیا ہے کہ لڑکے جمع تھے اور وہ اچھل کود رہے تھے۔ میرٹھ میں ایک شخص نے ایک روایت سے دعویٰ کیا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گانا بجانا سنا اور ناچ دیکھا بات یہ ہے کہ برے آدمی کی نظر بھی بری ہی طرف جاتی ہے چونکہ اپنے دماغ میں خباثت ہے اس قصہ میں بھی اسی طرح ذہن گیا۔ ایک بددین نے جنت کی حوروں کے اعتقاد کے متعلق طعن کیا ہے کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جنت میں عورتیں ہیں وہ چاندی کے کنگن پہنیں گی جیسے ہمارے یہاں کی گھوسنیں۔ مولوی محمد علی صاحب بچھرایونی نے خوب جواب دیا ہے کہ چونکہ خود گندہ تھا خیال میں بھی گندی ہی عورتیں آئیں۔ الخبیثات للخبیثین والخبیثون للخبیثات (خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں) اسی طرح ان میرٹھی صاحب نے بات کہی چونکہ طبیعت میں ناپاکی ہے اس لئے کسبیوں ہی کی طرف ذہن گیا اگر شرافت اور سادگی اور پاکی طبع میں ہوتی تو اس طرف ذہن نہ جاتا۔ جناب من یہ لڑکیاں جوان نہ تھیں یہ نابالغ چھوٹی چھوکریاں تھیں جو اکثر گھروں میں ادھم مچایا کرتی ہیں اور ان کا گانا بھی ایسا ہی تھا جیسے گھروں میں بسا اوقات ان کو شور مچاتے دیکھا ہوگا گانا ان کو کیا ہوتا ہے یہ گانا ہے "میری مہندی کے چوڑے پات ری بو واری واری جا" نہ ان کے گانے میں کچھ لطف ہوتا ہے اور نہ ان کے دف میں کوئی فتنہ۔ اسی طرح وہ جشن یونہی سڑی بسی پاگلوں کی طرح کود رہی تھی جس سے بجائے لطف کے اور تکدر ہوتا تھا محض لڑکوں کا ایک کھیل تھا جیسے ایک ڈوم حج کرنے گیا تھا بدوؤں کا گانا سن کر کہنے لگا قربان جاؤں اپنے حضرت جی کے ایسوں ہی کا راگ سنا ہے جو حرام کر دیا میرا راگ سنتے تو ثواب کا وعدہ فرما لیتے۔ بہر حال انہیں بدوؤں کی طرح سے دو چھوکریاں تھیں اور وہ کچھ گا بجا رہی تھیں۔ اور حضور چادرہ اوڑھے لیٹے ہوئے تھے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور وہ برابر اسی طرح گاتی رہیں اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو وہ بھاگ گئیں حضور نے فرمایا کہ دیکھو میں لیٹا تھا یہ لڑکیاں گاتی رہیں۔

اس کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے پھر بھی گاتی رہیں پھر اے عمر رضی اللہ عنہ تم آئے تمہارے آتے ہی بھاگ گئیں تم سے شیطان بھاگتا ہے۔ اس حدیث میں طلبہ کو سخت اشکال ہوتا ہے کہ وہ فعل جائز تھا یا ناجائز اگر ناجائز تھا تو حضور نے کیسے گوارا فرمایا اور اگر ناجائز نہیں تھا بلکہ جائز تھا تو شیطان کی طرف اس کو کیوں نسبت فرمایا۔ میری اس تقریر سے یہ اشکال حل ہو گیا بات یہ ہے کہ تھا تو یہ فعل مباح لیکن بوسائط اس کی کثرت مضرت ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تشریف لانے تک تو کثرت نہ تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے وقت آئے کہ اس وقت کثرت ہو گئی شیطان کا دخل آ گیا اور اس کا وقت آ پہنچا کہ اس فعل سے شیطان اپنا کچھ کام نکالے حتیٰ کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی نہ آتے تو خود حضور بھی اس وقت اس کو روک دیتے مگر پھر بھی یوں نہ کہیں گے کہ اس حالت میں یہ فعل مباح نہیں رہا تھا لیکن یہ مباح ایسا ہے کہ احیاناً واسطہ ہو جاتا ہے کسی امر ناجائز کا اب کوئی اشکال نہیں ہے اور یہاں سے اس حدیث کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ہوں گے کہ ابغض المباحات طلاق ہے کیونکہ بنا بر تقریر مذکور ممکن ہے کہ بعض چیزیں حلال اور مباح ہوں اور مضر ہوں مثلاً کسی نے طلاق دی تو دیکھو طلاق مباح ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ سبب ہو جائے۔ دو خاندانوں کی باہمی کدورت کا چنانچہ ایسا ہوتا بھی ہے اور نیز ممکن ہے کہ مرد کو بیوی کے ملنے میں دیر ہو اور وہ مبتلا ہو جائے حرام میں اسی طرح ممکن ہے کہ اس عورت کے اندر آوارگی آ جائے اس لئے طلاق مباح بھی اور ابغض بھی ہے۔ بہر حال میرا مقصود یہ ہے کہ جو لوگ مباحات میں کثرت رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ ذرا اپنے نفس کو روکیں گو وہ امر مباح ہی ہو کیونکہ مباح ہونے سے یہ تو ضروری نہیں کہ اس میں حد سے بڑھ جائے دیکھو کھانا فی نفسہ مباح ہے لیکن دو لقمہ اگر زیادہ کھائے جاویں گے تو تخمہ ہو جائے گا۔ وہی نفیس غذا سبب ہو جاتی ہے تکلیف اور مرض کا اور اس واسطے چونکہ مباح کی کثرت باوجود مباح ہونے کے مورث قساوت اور منافی خشوع ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مجلس سے اٹھتے تھے تو پڑھتے تھے۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا
انت استغفرک واتوب الیک (سنن الترمذی:۳۴۳۳)

(اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور تیری ثناء کے ساتھ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں تجھ سے استغفار کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں) اس لئے کہ شاید مجلس میں کوئی امر ایسا ہو گیا ہو جو بوسائط بعیدہ سبب ہو جاوے کسی محذور کا تو اس کا یہ کفارہ ہو جاوے گا۔ جب حضور باوجود اس پاکی اور عصمت کے اس قدر احتیاط فرماتے ہیں

تو ہم کو تو بطریق اولی اس کا اہتمام ضروری ہے۔ اور یہاں سے ایک حدیث کی بھی شرح ہوتی ہے جس کے اندر شراح حدیث کو حیرانی ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے

انه ليغان على قلبي (الصحيح المسلم الكتاب الذكر : ۴۱)

وانی لاستغفر اللہ فی الیوم مائة مرة (مسند احمد ۲ : ۳۹۷)

(میرے دل پر حیرانی ہوئی اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں) اس میں حیرانی ہوئی ہے کہ یہ غین جس کے معنی ابر اور گرد وغبار کے ہیں کیا تھا خدانخواستہ معصیت کا تو تھا نہیں تو ممکن ہے کہ وہ ایسے مباح کا اشتغال ہو کہ جو فی نفسہ معصیت نہیں لیکن کثرت اس کی گو وہ مباح ہو بلکہ ہمارے اعتبار سے عبادت سے بھی بڑھ کر ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کے اعتبار سے خشوع کے کسی درجہ کے منافی ہو کیونکہ بعضی بات مباح ہوتی ہے مگر چونکہ حد سے ذرا بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لئے اس کا اثر بھی صحیح الادراک کو محسوس ہوتا ہے جس طرح جو لطیف المزاج اور ذکی الحس ہوتا ہے اس کو دور کی آواز محسوس ہوتی ہے مشہور ہے کہ بوعلی سینا اس قدر ذکی الحس تھا کہ بارہ بارہ میل کی آواز سنتا تھا یہ حکم تھا کہ بارہ بارہ میل چاروں چکی نہ چلے اس لئے کہ چکی کی آواز سے شیخ کو نیند نہ آتی تھی۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی لطافت ونفاست مزاج کے قصے بہت مشہور ہیں۔ سنا ہے کہ ایک شخص نے انگور ہدیہ بھیجے اپنے نزدیک اس نے نہایت نفیس چھانٹ کر بھیجے تھے حضرت نے ایک دانہ چکھ کر چھوڑ دیا۔ ایک روز وہ مہدی صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں نے انگور بھیجے تھے پہنچے بھی۔ حضرت نے فرمایا پہنچ گئے۔ اب یہ رئیس صاحب منتظر تھے کہ کچھ داد ملے گی حضرت فرما کر خاموش ہو گئے اس نے اپنے دل میں کہا کہ حضرت نے معلوم ہوتا ہے کچھ التفات نہیں فرمایا پھر پوچھا حضرت آپ نے کھائے بھی کیسے تھے۔ فرمایا کہ میاں کیا بتلاؤں ان میں مردوں کی بو آتی تھی وہ شخص حیران ہوا کہ انگوروں کو مردوں سے کیا تعلق کچھ سمجھ میں نہ آیا بہت تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ان انگوروں کے درخت مدت دراز ہوئی کہ مرگھٹ میں لگائے گئے تھے پس ادراک باطنی میں چونکہ حضور سے زیادہ کوئی لطیف المزاج نہیں آپ نے اس مضرت کو محسوس فرما کر غین سے تعبیر فرمایا اور اس سے استغفار کیا۔ اس کی ایک دلیل اور لیجئے ایک شخص تھے ابوجہم انہوں نے ایک منقش چادر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بھیجی تھی حضور نے اس کو اوڑھ کر نماز پڑھی اور نماز کے بعد یہ فرمایا کہ یہ چادر واپس کر دو اور اس کے پاس سے یہ سادہ چادر لے آئے۔ دیکھئے محتمل افضاء الی الالہاء سے آپ نے کس درجہ احتیاط فرمائی پھر فرمایا کہ فانها كادت ان تلهيني انفا یعنی قریب تھا کہ وہ ابھی میرا دل ہٹا

دیتی۔ اور جب حضور قرب وقوع یعنی احتمال افضاء کا پہلے سے انسداد وانتظام فرمادیں تو ہم کو تو بہت زیادہ ضرورت ہے کہ بہت ہی پہلے سے اس کا انتظام کریں اس لئے کہ آپ تو عین وقت پر بھی نفس کو روک سکتے تھے آپ کا نفس تو بالکل قابو میں تھا اور ہمارا نفس تو منہ زور گھوڑے کی طرح ہے کہ جب نکل جاتا ہے پھر قابو میں نہیں رہتا پھر جو کچھ بھی اس سے صادر ہو بعید نہیں اس لئے ہم کو بہت انتظام کی ضرورت ہے ورنہ وقت پر بچنا ایسا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس دشواری کو دیکھ کر بعض متحدوں نے شریعت پر الزام لگا کر یہ شعر بک دیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ   باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(تو نے دریا کی گہرائی میں مجھے تختہ بند کر دیا ہے اور پھر مجھ سے تو یہ کہہ رہا ہے کہ ہوشیار رہنا دامن نہ بھیگے)

جواب یہ ہے کہ ہر کام تدبیر سے ہوتا ہے۔ تم کو جو کچھ کش کش شریعت میں پیش آتی ہے۔ وہ تمہاری سوء تدبیر سے ہے۔ اسلئے کہ نفس کو اول سے روکا نہیں جاتا جب اس کے اندر مواد خبیثہ پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے اس وقت رکنے کی دشواری دیکھ کر شریعت پر الزام دیتے ہیں جب مادہ کے اندر فساد آ جاتا ہے تو اس کا زوال سہل نہیں بہت سے تنقیح مسہل و منضج کا استعمال کرنے کے بعد صلاح پر آوے گا دیکھو اگر گلے میں روٹی کا ٹکڑا اٹک جاوے تو یہ خرابی سوء استعمال سے ہے پکانے والی کی خرابی نہ سمجھی جاوے گی۔ شروع سے نفس کو روکو تدبیر کرو تو بہت سہولت سے وہ رک جاوے گا اور خیر اگر اول نہیں روکا تو اب بھی تدبیر ہو سکتی ہے گو کچھ دشواری پیش آوے مادہ نفس کا درست کرو تدبیر کرو آج تو تم پر یہ احکام شاق ہیں اور بعد معالجہ کے یہی احکام تمہاری طبیعت ثانیہ بن جاویں گے آج نماز تم پر وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ ہے اور بعد اس مجاہدہ وریاضت کے جعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ (کنز العمال:۱۸۹۱۲)

(میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) کا مصداق ہو جائے گا۔ غرض ایک غلطی تو مباحات میں یہ تھی جو مفصل طور سے عرض کی گئی کہ اس میں اس قدر وسعت کر لی گئی۔

مباحات میں اعتدال کی ضرورت

دوسری غلطی اس سے زیادہ سخت ہوتی ہے پہلی غلطی تفریط تھی اور دوسری افراط ہے۔ پہلی غلطی ان لوگوں کی تھی جو اس کے ضرر سے آگاہ ہی نہیں اور دوسری ان لوگوں کی ہے جو توسع کے ضرر سے آگاہ تو ہوئے لیکن یہ نہیں کیا کہ اعتدال پر آجائے انہوں نے اس قدر تنگی شروع کی کہ ہر امر میں ان کو شک اور وہم ہو۔۔۔ لگا کھانے میں پینے میں برتن میں کنوئیں میں ہر شے میں وہم اور زیادہ تر ایسے لوگوں کا تقویٰ طہارت وغیرہ سب میں ہوتا ہے ایک حافظ جی تھے اس قدر وہمی تھے کہ جب ان

کو غسل کی ضرورت ہوتی تھی تو تالاب یا نہر پر جا کر غوطہ لگاتے تھے اور غوطہ کے بعد لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ میرا کوئی بال خشک تو نہیں رہ گیا لڑکے دق کرنے کے لئے کہہ دیتے تھے کہ حافظ جی بہت بال خشک رہ گئے بیچارے پھر غوطہ لگاتے تھے اور بڑی دیر میں سر نکالتے تھے۔ لڑکے بھی ایسے شریر ہوتے ہیں کہ استاد کے ساتھ بھی شرارت سے باز نہیں آتے ایک اور حکایت لڑکوں کی شرارت کی یاد آ گئی ایک حافظ جی کے پاس لڑکے پڑھتے تھے حافظ جی کے پاس کہیں سے بتاشے آ گئے۔ حافظ جی تھے بڑے لالچی اور وہمی ان بتاشوں کو ایک لوٹے میں بند کر کے اس کا منہ آٹے سے بند کر دیا کہ اگر اسمیں سے لیں گے تو ضرور خبر ہوگی۔ لڑکوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا تدبیر کی جاوے کہ منہ بھی نہ کھولنا پڑے اور بتاشے بھی ہاتھ آ جاویں۔ آخر سوچنے سے ایک تدبیر سمجھ میں آ گئی ٹونٹی کی راہ سے اس میں پانی بھر دیا وہ سب شربت بن گیا۔ سب تھوڑا تھوڑا پی گئے۔ ایک اور وہمی تھے وہ جب وضو کرتے تھے پورا چہرہ حوض میں گردن سمیت ڈبو دیتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا کہ آج میں تمہارا وضو کراؤں گا چنانچہ لوٹے میں پانی لیا اور ان کو وضو کرایا کہنے لگا کہ آج تو میرا وضو ہو گیا انہوں نے کہا کہ بس ایسے ہی ہمیشہ کر لیا کرو جب نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو نیت توڑ کر پھر حوض پر گئے اور منہ اس کے اندر ڈبویا جب چین ہوا۔ اللہ بچاوے ایسے تقوے سے۔ درمختار میں ایک جزئیہ لکھا ہے کہ جس شخص کو دیکھو کہ ایک دانہ گیہوں کا لئے ہوئے تحقیق کرتا ہوا پھر رہا ہے کہ یہ کس کا ہے۔ (یعنی ایسے شخص کو سزا دی جاوے گی اس لئے کہ یہ شریعت میں کہاں ہے کہ ایک دانہ کی جو بالکل متقوم نہیں تحقیق کرو۔ اس نے حدود سے تجاوز کیا اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے فقہاء کو انہوں نے قرآن و حدیث کو خوب ہی سمجھا ہے اور فقہ اسی سمجھ کا نام ہے نہ کہ کتب بینی کا۔

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

(معشوق وہ نہیں جسکے پاس اچھے بال اور کمر ہو بلکہ تو اس چہرہ کا غلام بن جا جس میں آن پائی جاتی ہو)

یہ ہر شخص کا کام نہیں۔ اور مجتہد و فقیہ اسی کو نہیں کہتے جس کو بہت سے مسائل یاد ہوں قوۃ اجتہاد تو ایک خداداد نعمت ہے کہ جوان کا ہی حصہ تھا ختم ہو گیا۔ پس زیادہ تقویٰ کرنا اور بہت خشکی کرنا دینداری نہیں ہے بہت لوگ دینداروں کے طبقہ میں اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ اب میں اس غلطی کے دلائل بیان کرتا ہوں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ کس نے حرام کی ہے اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اور کس نے حرام کی ہیں پاکیزہ چیزیں رزق سے۔ اس میں رد ہو گیا ان جہلاء صوفیہ کا جو کھانے پینے کی چیزوں میں اپنے نفس پر

تنگی کرتے ہیں میوہ نہیں کھاتے گوشت نہیں کھاتے اور اناج نہیں کھاتے صرف دودھ پی لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم لوگ زاہد ہیں ہم کو دنیا کے تنعمات سے کیا علاقہ ہے لیکن ان کو یہ خبر نہیں کہ ایک حظ سے تو نفس کو روکا اور دوسرے حظ میں اس کو مشغول کیا وہ کیا ہے حب جاہ اس لئے کہ ان چیزوں کے ترک کرنے سے شہرت ہوتی ہے اس سے عجب اور کبر پیدا ہوتا ہے اور سخت تر ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ جب ساتھ میں کھانے کے لئے بیٹھتے تھے تو اخیر تک کھاتے رہتے تھے اور کھاتے تھے اوروں سے کم تو حضرات بزرگان دین کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اور حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص کسی کے پاس اللہ کے واسطے کوئی شے لاوے تو ضرور کھانا چاہئے اس سے نور پیدا ہوتا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے واسطے ایک شخص ایک ٹوپی لایا چھینٹ کی ٹوپی تھی اور قند کی اس پر گوٹ لگی ہوئی تھی اور گوٹہ اس پر لگا ہوا تھا دیہاتی بیچارے ایسے ہی ہوتے ہیں تمیز تو ان کو ہوتی نہیں کہ کون شے کس کے لائق ہے اس پر ایک اور حکایت یاد آ گئی ایک رئیس پیر کسی گاؤں میں اپنے مریدوں میں پہنچے ایک چوپال میں ان لوگوں نے ٹھہرایا اور ان کا سامان اسباب وغیرہ مکان پر بھیج دیا گاؤں والوں کے یہاں بڑی چیز دودھ کی کھیر ہے چنانچہ پیر کے واسطے دودھ کی کھیر تیار کی اب فکر ہوئی کہ برتن تو ہمارے یہاں عمدہ موجود نہیں کس چیز میں لے جاویں اتفاق سے پیر کے اسباب میں مراد آبادی اگلدان چمکدار اور سلفچی بھی موجود تھی گاؤں والوں نے ایسے چمکدار برتن کب دیکھے تھے اور نہ بیچاروں کو یہ خبر تھی کہ یہ برتن کس کام کے لئے ہیں انہیں میں کھیر بھرا اور پیر کے سامنے لائے پیر نے بہت گالیاں دیں تو ایسے ہی وہ دیہاتی حضرت کے واسطے چھینٹ کی ٹوپی قند کی گوٹ اور گوٹہ لگا کر لایا حضرت کے اخلاق اور دلجوئی کو ملاحظہ فرمایئے کہ اسی وقت اپنی ٹوپی اتار لی اور اس کے سامنے اس کی خوشی کے واسطے وہ ٹوپی پہن لی۔ اور خشک متقی ہوتے تو وضع کے خلاف ہرگز نہ کرتے۔ حضرت کیسی وضع اور کیسا فیشن مسلمانوں کی وضع تو اتباع احکام ہے بقول کسی کے

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندہ کرے تو یہ تیری عطا ہے اور تو مار دے تو بھی ہم تجھ پر فدا ہیں دل تیرا عاشق ہو چکا ہے اب جو چاہے کر)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد صاحب استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے ایک شخص دھوتر کا کرتہ لایا حضرت نے فوراً پہن لیا لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی فرمایا کہ وہ شخص ہوگا۔ ہمارے حضرت ہدیہ یہ سمجھ کر کھاتے تھے کہ اس کی دلجوئی ہوگی۔ غرض مباحات میں ہم کو تنگی بھی نہ کرنا چاہئے اور راز اس میں یہ ہے کہ اس

تناول مباح میں ایک شان افتقار وانکسار کی ہے جو کہ مطلوب ہے اور ترک وتضییق میں شائبہ استغنا کا ہے جو کہ پسندیدہ نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد فرماتے تھے الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا غیر مستغنی عنہ ربنا یعنی اے رب ہمارے ہم آپ کے رزق سے مستغنی نہیں ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے) اور ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (اے ایمان والو جو پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں (اپنے اوپر) حرام نہ کرو اور حد سے نہ نکلو) شان نزول اس کا یہ ہوا تھا کہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے بعض امہات المومنین رضی اللہ عنھن سے آپ کی سب کے حالات سے سوال کیا انہوں نے بیان فرمایا۔ انہوں نے سن کر اپنے خیال میں اس کو قلیل سمجھ کر کہا کہ حضور کی شان تو ارفع ہے آپ کو تو اتنی بھی ضرورت نہیں آپ کی شان تو یہ ہے اَللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اگلی پچھلی ساری خطائیں معاف فرمائے) اور ہم کو زیادہ ضرورت ہے اس لئے ان میں سے ایک نے تو یہ قسم کھائی کہ میں تمام عمر روزہ رکھا کروں گا ایک نے قسم کھائی کہ میں نکاح نہ کروں گا ایک نے قسم کھائی کہ میں رات کو نہ سوؤں گا حضور بھی تشریف لے آئے اور یہ سب قصہ سنا حضور نے فرمایا کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں سوتا بھی ہوں جاگتا بھی ہوں

وذلک من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (الصحیح للبخاری ۷: ۲)

یعنی یہ سب میری سنت سے ہے اور جو شخص میری سنت سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے ایک خرابی تو مباحات کے ترک میں یہ تھی کہ اس سے حق تعالیٰ کی نعمتوں سے استغناء کا شائبہ ہوتا ہے۔ دوسری خرابی اور ہے وہ یہ ہے کہ مباحات کے ترک سے بھی دل میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص چالیس دن برابر گوشت کھائے اسکے دل میں بھی قساوت ہو جاتی ہے اور جو نہ کھاوے اس کے دل میں بھی اس لئے جو ترک کرتا ہے اس کے دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ بھی منافی خشوع ہے اسی آیت سے میں اس کو بھی ناجائز کہتا ہوں کیونکہ مقصود تو آیت سے ایسے امر کا مذموم بتلانا ہے جس سے خشوع سے بعد ہوتا ہو خواہ وہ توسع فی المباح ہو یا تضییق فی المباح ہو گو شان نزول خاص ہو۔ اور لیجئے دوسری حدیث ہے۔ حضور نے ایک کام کیا فتنزہ اقوام یعنی بعض بعض قوم میں اس کام سے بچیں

فخطب وقال مابال اقوام یتنزھون عن شیء اصنعه وانا واللہ اخشاکم للہ واتقاکم للہ (الصحیح للبخاری ۸: ۳۱)

تو حضور ناراض ہوئے اور خطبہ پڑھا اور یہ فرمایا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ میرے فعل سے بچتے ہیں حالانکہ میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں پس اگر یہ تنگی کرنا ناپسند نہ تھا تو حضور ناخوش کیوں ہوئے اگر کوئی شبہ کرے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم تو یہ افعال ترک نوم وترک افطار وغیرہ اپنا درجہ کم سمجھ کر اختیار کرنا چاہتے تھے پھر اس پر اس قدر انکار کیوں فرمایا۔ بات یہ ہے کہ مباح کو تو حضور کے اتباع کی وجہ سے اختیار کرتے اور ان اعمال کو اپنی رائے پر پہلی صورت میں حضور کا اتباع تھا اور دوسری صورت میں اپنی رائے کا۔ اور ظاہر ہے کہ جو برکت اور قرب حضور کے اتباع میں ہے وہ اپنی رائے سے کسی عمل کے اختیار کرنے میں کیسے ہوسکتا ہے دوسرے اس سے وسوسہ ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اختیار مرجوح کا الحاصل مباحات میں نہ اس قدر تنگی کرنا چاہئے اور نہ اتنی وسعت توسط محمود ہے۔ یہ ہے وہ مضمون جو میں نے اس آیت سے استنباط کیا ہے جو باحسن وجوہ بفضلہ تعالیٰ بیان ہوگیا ہے اور اس کو اس معنی کہ علوم مخفیہ اور اسرار میں سے کہہ سکتے ہیں کہ قانون میں اب تک نہیں پڑھا تھا۔ اب میں بقیہ آیت کی تفسیر بقدر ضرورت کر کے اس بیان کو ختم کرتا ہوں جبکہ آیت سے بعموم لفظ یہ مضمون معلوم ہوا کہ مباحات کے اندر افراط اور تفریط دونوں سے قساوت پیدا ہوتی ہے تو سننے والوں کو فکر ہوئی کہ ہمارے اندر تو قساوت بہت پیدا ہوگئی اب اس کا کیا علاج ہو۔ حق تعالیٰ اس کا معالجہ ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ ترجمہ یہ ہے کہ جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ بیشک بیان کر دیں ہم نے نشانیاں شاید کہ تم سمجھو۔ مطلب یہ ہے کہ گو تمہارے قلب کی حیات معاصی اور مباحات کے کثرت اشتغال سے ضعیف ہوگئی ہے لیکن تم ناامید نہ ہو اس کی تدبیر اور علاج ہے کہ اس کے استعمال سے وہ دولت پھر عود کر سکتی ہے اور وہ تدبیر مجاہدہ ریاضت اور کثرت ذکر وشغل اور کثرت مراقبات ہے اس تدبیر سے قلب کی حیات رفتہ رفتہ پھر عود کر آئے گی اور اس کا نمونہ موجود ہے وہ یہ ہے کہ دیکھو زمین بالکل خشک ہو جاتی ہے کہ خشک ہو جانا بمنزلہ موت کے ہے پھر حق تعالیٰ اس کو سرسبز وشاداب فرما دیتے ہیں جو بمنزلہ اس کی حیات کے ہے اور قاعدہ ہے کہ نمونہ کے حال سے ذی نمونہ کا حال معلوم ہوا کرتا ہے تو نمونہ یعنی زمین کے اندر دیکھو

کہ کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں جس سے وہ زندہ ہو جاتی ہے جو تدبیر اس کی زندگی کی ہے اس کے مشابہ قلب کی حیات کی تدبیریں ہوں گی زمین کو اول کھودتے ہیں اس میں ہل چلاتے ہیں یہاں اس کے مشابہ مجاہدہ ریاضت ہے تخم پاشی کرتے ہیں یہاں ذکر کا تخم ڈالو جب اس میں کھیتی کم ہو جاتی ہے تو اس کی نگہداشت کی جاتی ہے یہاں بھی جب قلب میں کوئی دولت پیدا ہو جائے تو اس کی حفاظت کرو جس کو مراقبہ کہا جاتا ہے زمین میں پانی ڈالتے ہیں تا کہ کھیتی بڑھے یہاں پانی توبہ کا اور اخلاق حمیدہ کا دو اور نا امیدی مت کرو تدبیر کرو جس طرح خشک زمین تدابیر سے سرسبز و شاداب ہو گئی ہے اسی طرح تمہارا قلب بھی تدبیر سے زندہ ہو جائے گا۔ حاصل تمام تقریر کا یہ ہوا کہ معاصی کے علاوہ قساوت کے دو سبب اور ہیں مباحات کے اندر وسعت کرنا اور مباحات میں حد سے زیادہ تنگی کرنا اور معالجہ استغفار اور مجاہدہ وذکر ہے۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرماویں۔ آمین۔

واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین وصلی اللہ تعالی
علی خیر خلقه سیدنا ومولانا محمد واله واصحابه اجمعین.

دین کے مسائل کی تحقیق کے آداب، احکام شرعیہ سے جہل کا مرض، ظاہری مرض سے سخت تر ہے۔

السوال

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ کو بمقام تھانہ بھون مکان حضرت مولانا صاحب ۵۰ منٹ بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ۲۰ تھی مولوی محمد عبداللہ صاحب نے قلم بند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انما شفاء العی السوال.

(سنن ابی داؤد کتاب الطہارۃ ب ۱۲۶)

ایک ضروری امر

یہ ایک چھوٹی حدیث ہے یعنی ایک مختصر ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں نہایت مختصر لفظوں میں ایک بہت ضروری امر کی تعلیم فرمائی گئی ہے اور وہ امر ایسا ضروری ہے کہ کوئی شخص کسی وقت اس سے مستغنی نہیں اس لئے بھی اس کا بیان ضروری ہے اور دوسرے اس لئے ضروری ہے کہ باوجود اس قدر ضروری ہونے کے اس کی ضرورت سے عموماً بے التفاتی ہے نہ علماً التفات ہے نہ عملاً ہر طرح اس سے بے پروائی ہو رہی ہے پس یا تو ضرورت ہی کی خبر نہیں اور یا ضرورت کی خبر ہے لیکن اس پر عمل نہیں سو اس عارض کی وجہ سے اس مضمون کے بیان کرنے کی ضرورت اور بڑھ گئی کہ اس درجہ کا ضروری امر اور اس سے اس قدر غفلت۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ اس کو بہت غور سے سنا جاوے اور سن کر ہمیشہ اس پر عمل اور خیال رکھا جاوے یہ تو تمہید تھی۔ اب وہ مضمون سننا چاہئے اور ترجمہ حدیث کا کیا جاتا ہے اس سے اجمالاً وہ مضمون بھی معلوم ہو جاوے گا۔

جہل کا شفاء مرض سوال ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ شفاء مرض جہل کی سوال ہے۔ یعنی اگر کسی بات کی خبر نہ ہو تو اس سے شفا پوچھ لینا ہے اور الفاظ گو عام ہیں لیکن مراد حضور کی خاص ہے یعنی جہل سے ہر جہل مراد نہیں ہے بلکہ احکام الہیہ سے جہل مراد ہے اس لئے کہ حضور کو دنیا کے قصوں سے کیا بحث ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے بھیجے گئے ہیں اسی سے بحث ہوگی پس جہل کا مضاف الیہ وہی امر ہوگا کہ جس کا تعلق بواسطہ یا بلاواسطہ دین سے ہو پس جہل سے دین کا جہل مراد ہوگا اور یہ مطلب نہ ہوگا کہ تجارت یا زراعت میں کسی امر کو تم نہ جانو تو اس سے شفاء سوال ہے۔ پس حاصل یہ ہوگا کہ اگر اللہ جل جلالہ کے احکام سے ناواقفیت ہو۔ تو اس کی شفاء پوچھنا ہے۔ پس بے خبری سے مراد اللہ و رسول کے احکام سے بے خبری ہے۔ دوسرے یہ کہ جس موقع پر یہ حدیث وارد ہے وہ بھی اسی پر دال ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے فتویٰ دینے میں غلطی ہوگئی تھی اس پر حضور نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ جیسا آیت کے لئے اس کا شان نزول ہوتا ہے اسی طرح حدیث کے لئے سبب ورود ہوتا ہے جیسے شان نزول کے جاننے سے آیت کی تفسیر ہوتی ہے اسی طرح سبب ورود حدیث کے جاننے سے حدیث کی شرح ہوتی ہے۔ پس اس قصہ کو منضم کرنے سے مراد صاف طور سے متعین ہوگئی کہ یہی ہے کہ اگر احکام دینیہ سے بے خبری ہو تو اس سے شفاء پوچھ لینا ہے یہ حاصل ہے حدیث شریف کا اجمالاً اس سے اجمالاً مقصود معلوم ہوگیا ہوگا مگر اس اجمال سے اس مضمون کا جو درجہ ہے وہ ذہن میں نہ پہنچا ہوگا۔

جہالت خود مرض ہے

اس لئے بقدر ضرورت اس اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے تاکہ جس مرتبہ کا یہ مضمون ہے اسی مرتبہ پر ذہن میں ثابت اور متقرر ہو جاوے اور وہ تفصیل خارج سے منضم نہ کی جاوے گی بلکہ انہی لفظوں سے مستنبط کی جاوے گی وہ یہ ہے کہ ان الفاظ میں غور کیجئے کہ شفاء کی اضافت عی بمعنی جہل کی طرف کی گئی ہے اور شفا ہوا کرتی ہے مرض سے پس گویا جہل کو حضور نے مرض ٹھہرایا ہے اور پہلے عرض کیا گیا کہ جہل کے مضاف الیہ کے اندر عموم نہیں بلکہ احکام الہیہ سے جہل مراد ہے۔ پس ان دونوں امروں سے ثابت ہوا کہ جس طرح اور بیماریاں ہیں اسی طرح مسائل شرعیہ کا نہ جاننا بھی ایک بیماری ہے اس سے آپ کو اس جہل کا بیماری ہونا تو معلوم ہوا۔

امراض باطنیہ سے ہماری لاپروائی

اب اس میں غور کرنا چاہئے کہ جب کوئی بیماری آپ کو یا آپ کی اولاد کو پیش آتی ہے تو اس

کے ساتھ آپ کا کیا برتاؤ ہوتا ہے برتاؤ یہ ہے کہ سب سے پہلے تو ایک فکر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ اگر شبہ بھی بیماری کا ہو جاتا ہے تو اس سے بھی فکر ہو جاتا ہے۔ اور فکر بھی کیسا کہ آدمی کا دل دہل جاتا ہے کہ دیکھیے اس کا انجام کیا ہو اول مرحلہ تو یہ ہے کہ اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہو جاتا ہے کہ کس کو دکھلاؤ کسی سے دوا لکھواؤ اور اس دکھلانے میں یہ نہیں کرتے ہو کہ کیفما اتفق جس کو چاہا دکھلا دیا بلکہ تلاش اس کی ہوتی ہے کہ کسی ہوشیار طبیب کو جو فن سے واقف ہو دکھلانا چاہئے اس کی تلاش میں جس قدر بھی مشقتیں واقع ہوں سب برداشت کرتے ہو اور وہ جس قدر فیس مانگے اس کا بھی تحمل کرتے ہو۔

جو اس کے بعد جو کچھ وہ تجویز کرتا ہے اس کے سر مو خلاف نہیں کرتے ہو جس شے کا پرہیز بتلاتا ہے اس میں بہت اہتمام کرتے ہو اور بار بار اس سے مریض کا حال بیان کرتے ہو اگر اس نسخہ سے آرام نہ ہو تو وہ دوسرا نسخہ بدلتا ہے اس کو بھی اسی جدوجہد کے ساتھ تیار کرا کے استعمال کراتے ہو اور اگر اس معالجہ سے آرام نہ ہو تو اکتا کر علاج نہیں چھوڑتے بلکہ برابر کوشش کرتے رہتے ہو بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض بیماریوں سے شفا نہیں ہوتی پھر بھی برابر علاج کرتے ہو حتیٰ کہ موت آنے تک بھی مریض کے منہ میں دوا ٹپکاتے ہو یہ برتاؤ ہوتا ہے ہمارا مریض کے ساتھ۔ اب غور کیجئے اور واقع میں بھی بڑی غیرت اور ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ جس مرض کو ارسطو اور بقراط اور جالینوس مرض بتلا دیں اس کا تو تم کو اتنا فکر اور اس قدر اہتمام اور غضب کی بات ہے کہ جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض بتلا دیں اس کا اہتمام تو کیا کسی درجہ میں خیال تک نہ ہو بلکہ اس کو بیماری بھی نہیں جانتے۔

احکام شرعیہ سے لاعلمی خود مرض ہے

لیکن اب تو آپ نے سن لیا کہ یہ بیماری ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کو بیماری ایسی ذات مقدس نے فرمایا ہے کہ ان میں کذب کا احتمال بھی نہیں اطباء ظاہر میں تو احتمال کذب کا بھی ہے خود فن طب بھی ظنی ہے اور علاوہ ظنی ہونے کے ممکن ہے کہ وہ طبیب جس کو تم نے اپنا معالج قرار دیا ہے ناواقف ہو تشخیص اس کی صحیح نہ ہو بیماری کچھ ہو اور بتائی ہو دوسری اور ممکن ہے کہ بیماری ہی نہ ہو محض تمہارا وہم ہو اور اگر بیماری ہو بھی تو اس قدر فکر کے قابل نہ ہو جتنا فکر تم کو ہوا ہے باوجود اس قدر شبہات کے موجود ہوتے ہوئے تم کو اس قدر اہتمام ہے اور یہاں نہ یہ شبہ ہے کہ فن نہ جانتے ہوں ان کو تو خدا تعالیٰ نے فن تعلیم کیا ہے پھر نہ جاننے کے کیا معنی اور نہ یہ احتمال ہے کہ فن ظنی ہو اس لئے کہ وحی سے خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہیں ان کی وحی یقیناً صادق ہے اور نہ یہ احتمال ہے کہ آپ کو جو تعلیم کیا گیا ہے آپ نے اس طرح نہ بیان کیا ہو۔ آپ

کی شان تو یہ ہے وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى جو کچھ آپ کی زبان سے نکلا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر انکار نہ فرمایا وہ اللہ ہی کا بتلایا ہوا ہو گیا اس لئے کہ انبیاء قرار علی الخطاء سے معصوم ہوتے ہیں پس حضور کی زبان مبارک سے جو نکلے خواہ بعد بتلانے اللہ تعالیٰ کے یا پہلے جبکہ اس پر من اللہ انکار نہ ہو سب من اللہ ہے اور اسی سے یہ بھی احتمال مرتفع ہو گیا کہ آپ نے شاید سوچا نہ ہو اور نہ یہ احتمال رہا کہ کسی جزئی کو کلی پر منطبق کرنے میں خطا واقع ہو گئی ہو گی۔

جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر شفقت

اور یہ تو احتمال ہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بتلانے میں شفقت نہ ہو گی آپ کو تو کافروں پر بہت شفقت تھی حالانکہ اس قدر شفقت اور اتنا اہتمام اور اس قدر دل سوزی و ہمدردی آپ پر واجب تو کیا ہوتی اس سے تو براہ رحمت آپ کو روکا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَلَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم شاید آپ اپنی جان کھپائیں گے اس غم سے کہ یہ مومن نہیں ہیں۔ اور ارشاد ہے فاعرض عنھم آپ ان سے اعراض کیجئے اور فرماتے ہیں وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ یعنی آپ سے سوال نہ ہو گا دوزخیوں سے۔ مگر باوجود اس کے حضور کو وہ شفقت تھی کہ امت کے لئے کھڑے ہو کر دعا فرما رہے ہیں اور قدم مبارک ورم کر گئے ہیں حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات کامل حضور کو ایک آیت کے تکرار میں گزر گئی وہ آیت یہ ہے اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ یعنی اے اللہ اگر آپ ان کو عذاب کریں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ بخشیں تو بیشک آپ غالب ہیں حکمت والے ہیں۔ اور یہ بھی احتمال نہیں ہے کہ آپ نے جو علاج تجویز فرمایا ہے اس میں حضور کی کوئی غرض وابستہ ہو حضور کے برتاؤ کو حدیثوں کے اندر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے کبھی اپنے یا اپنی اولاد کے لئے دنیا کی فلاح نہیں چاہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ایسی پیاری بیٹی تھیں کہ باوجود اس کے کہ حضور کی عادت شریفہ نہ تھی کہ کسی کے لئے کھڑے ہوں مگر جب یہ تشریف لاتی تھیں تو حضور بے چین ہو کر جوش محبت میں کھڑے ہو جاتے تھے اور جب حضور سفر میں تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر میں ان سے ملتے تھے اور جب سفر سے تشریف لاتے تھے تو سب سے اول ان سے ملتے تھے ایسی چہیتی بیٹی کام کاج کے لئے ایک لونڈی مانگنے تشریف لائیں حضور اس وقت دولت خانہ تشریف نہ رکھتے تھے جب آپ تشریف لائے اور صاحبزادی صاحبہ کے اس غرض سے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپ خود ان کے پاس تشریف لے گئے اس وقت وہ لیٹی ہوئی تھیں اٹھنے لگیں تو حضور نے فرمایا کہ تم لیٹی رہو حضور ان

کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بیٹی لونڈی لیتی ہو یا لونڈی سے بہتر چیز۔ بیٹی بھی ایسی باپ کی چاہنے والی اور مطیع تھیں عرض کیا کہ لونڈی سے اچھی شے دیجئے فرمایا کہ سوتے وقت سبحان اللہ ۳۳ بار اور الحمد للہ ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو یہ تم کو لونڈی غلام سے بہتر ہے ایسے پیغمبر پر کسی کو غرض کا کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ حق تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ کیا آپ ان سے چندہ طلب کرتے ہیں۔ یعنی یہ جو آپ سے اعراض کرتے ہیں تو آپ ان سے چندہ تو نہیں مانگتے اور ارشاد ہے قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا کہہ دیجئے آپ کہ میں اس پر تم سے معاوضہ نہیں مانگتا۔ غرض آپ کے قلب مبارک کے اندر کسی غرض کا شائبہ تک نہ تھا محض خیر خواہی اور نفع رسانی اور مخلوق کو نار جہنم سے بچانا مقصود تھا۔ پس ایسے خیر خواہ پیغمبر جب کوئی مرض تشخیص فرماویں اس میں کیسے احتمال غلطی کا ہوسکتا ہے پس جس کو حضور مرض فرمادیں اور واقع میں سخت مرض ہے۔

امراض روحانی کا انجام

غرض احکام شرعیہ کے نہ جاننے کا مرض ہونا ثابت ہوگیا۔ اور یہ مرض ظاہری سے بدرجہا سخت ہے اس لئے کہ مرض ظاہری کا انجام تو بہت سے بہت یہ ہوگا کہ آدمی اس سے ختم ہو جائے گا جب ختم ہوگیا تو مرض سے نجات ہوگئی اور اس مرض کا اثر نار جہنم ہے اس لئے کہ جب احکام کی خبر ہی نہ ہوگی تو عمل خلاف شریعت کرے گا اور خلاف شریعت کرنے سے گناہ ہوگا اور گناہ کی سزا دوزخ ہے اور یہ نہ کہو کہ جب ہم کو خبر ہی نہ ہوگی تو گناہ بھی نہ ہوگا اس لئے کہ گناہ وہاں نہیں جہاں کوئی عالم مسائل بتانے والا نہ ہو اور کفار وہاں سے اس شخص کو نکلنے نہ دیتے ہوں اس وقت اول تو یہاں یہ بات نہیں ہے کہ عالم شریعت کے احکام بتانے والا موجود نہ ہو اور اگر کوئی جگہ اس قسم کی ہو بھی تو آس پاس بھی کوئی نہ کوئی واقف ہوگا اور بالفرض اگر کوئی بستی ایسی ہو کہ آس پاس بھی کوئی نہ ہو تو ایسی جگہ رہنا ہی خود منع ہے قرآن مجید میں صاف موجود ہے اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا یعنی بیشک وہ لوگ کہ فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہیں اس حالت میں کہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والے ہیں (یعنی گناہوں میں مبتلا ہیں) فرشتوں نے قبض روح کے وقت ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی تا کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ آگے ارشاد ہے فَاُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَـنَّمُ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا یہ لوگ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ پس اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسی جگہ رہنا ہی جائز نہیں باقی جہاں علماء

موجود ہیں کتابیں عربی اردو کی شائع ہیں یہاں تو کوئی عذر ہی نہیں۔ اور اگر ایسی جگہ بھی جہل عذر ہو تو چور چوری کر کے اور رہزن رہزنی کر کے کچہری میں جا کر کہہ دیا کرے کہ مجھ کو قانون معلوم نہ تھا اور اگر کوئی ایسا عذر کرے بھی تو ہرگز سماعت نہ ہوگی اور یہی کہا جاوے گا کہ جب تم گورنمنٹ کی رعایا ہو اور قانون کے بتلانے والے یہاں موجود ہیں تو تمہارے ذمہ ضروری تھا کہ قانون معلوم کرتے۔ اسی طرح اگر احکام شرعیہ کی خبر نہ ہو تب بھی گناہ سے گناہ ہی ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ سے ناواقف رہنا ان ظاہری بیماریوں سے بدرجہا سخت ہے۔ یہاں کی بیماریوں کا اثر تو یہی ہے کہ یا وہ اس کے لئے راحت ہے یا دوسروں کے لئے چنانچہ حدیث میں آیا ہے مستریح او مستراح منه (مشکوٰۃ المصابیح) یعنی مر کر یا تو یہ خود دنیا کے جھگڑوں سے راحت پانے والا ہے یہ تو اس وقت ہے جبکہ مردہ نیک عمل ہو اور یا اس سے لوگ راحت پائیں گے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ مخلوق اس سے تکلیف میں ہو۔ پس امراض ظاہری کا انجام تو راحت ہے اگر نیک ہو تب تو اس کی راحت ہے ہی اور اگر بد بھی ہو تو دوسروں کی راحت اور اس صورت میں گو اس کو راحت نہ ہوگی بلکہ تکلیف ہوگی لیکن وہ تکلیف موت کے سبب نہ ہوگی بلکہ اعمال سے ہوگی اسی واسطے آیا ہے لیس للماضین هم الموت انما علیهم حسرة الفوت یعنی مردہ کو موت کا افسوس نہ ہوگا۔ بلکہ نیک عمل کے فوت ہونے کی حسرت ہوگی کہ میں فلاں دن قرآن پڑھ سکتا تھا نماز پڑھ سکتا تھا لیکن نہ پڑھا اور اس کی حسرت ہوگی کہ ہم نے غیبت کیوں کی کہ فضول باتیں کیوں کیں خصوصاً ان لوگوں کے حال پر زیادہ افسوس ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے فراغت دی ہے کھانے پینے کو موجود ہے اور پھر اپنا وقت معاصی اور فضولیات میں ضائع کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو تو بہت ہی حسرت ہوگی۔ غرض یہ حسرت موت سے نہ ہوئی بلکہ موت تو حقیقت میں جیل خانہ سے رہائی ہے۔

دنیا کی مثال

حضرت کیا آپ کو معلوم نہیں یہ دنیا جیل خانہ ہے۔ ہم لوگ اس کو جیل خانہ نہیں سمجھتے گھر سمجھتے ہیں حالانکہ گھر ہمارا دوسرا ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو دنیا اسی کو سمجھتا ہے اور جب ماں کے پیٹ سے دنیا میں آتا ہے اس وقت اس کو علم ہوتا ہے کہ میں تو بہت تنگ و تاریک جگہ میں تھا اور اسی طرح اس کی نسبت جانتا ہے کہ اس سے زیادہ وسیع اور راحت کا مقام کوئی نہ ہو گا۔ پھر جب موت آئے گی اس وقت یہ کہ معلوم ہوگا کہ اللہ اکبر میں تو بہت تنگ جیل خانہ میں مقید تھا باقی جن کو خدا تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں ان کو یہ عالم مرنے سے پہلے ہی جیل خانہ نظر آتا ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک بڈھا روتا ہوا آیا کہ حضرت

میری بیوی بیمار ہے مرنے کے قریب ہے دعا کیجئے حضرت نے حاضرین سے فرمایا کہ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان جیل خانہ سے چھوٹ رہا ہے اور یہ رو رہا ہے۔ اور فرمایا کہ میاں روتے کیوں ہو تم بھی وہیں جا پہنچو گے۔ ہم لوگ اپنے دل میں کہنے لگے کہ اچھی دعا کرانے آیا تھا اپنی موت کی بھی بشارت لے چلا۔ تو وجہ اس کی کیا ہے کہ حضرت کی چونکہ باطنی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اس لئے وہ تو موت کو ایک تفریح کا شغل سمجھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک موت ذریعہ راحت تھی۔ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جاوے کہ فلاں عزیز ہمارا قسطنطنیہ میں جا کر وزیر ہو جائے گا تو اس کے رخصت کرنے کے وقت اس کی مفارقت کا تو غم ہوگا لیکن پریشانی نہ ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی ایک اعرابی نے عجیب عنوان سے ان کی تسلی کی کہ اے ابن عباس تم کیوں پریشان ہوتے ہو عباس کے انتقال سے کسی کا کچھ نہیں بگڑا بلکہ فائدہ ہی ہوا تمہارا تو یہ فائدہ ہوا کہ تم کو ثواب ملا اور ثواب ظاہر ہے کہ تمہارے لئے ثواب ان سے بہتر ہے اور عباس کو تم سے بہتر خدا مل گیا اب بتلائیے ثواب اچھا ہے یا باپ اور ان کے لئے تم اچھے ہو یا خدا۔ غرض دونوں کو ایک ایک اچھی چیز مل گئی۔ یہ بدووں کی عقل تھی آج کل بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی ایسا موثر اور بلیغ مضمون نہیں سوجھتا تو وجہ کیا ہے کہ یہ عقل کسی سکول یا مدرسہ میں رہ کر نہیں آئی تھی یہ اللہ و رسول کی اطاعت کی برکت ہے کہ جنگلیوں کی عقل ایسی ہوگئی تھی غرض مرض جسمانی کا انجام تو مرنا ہے جس کا ذریعہ راحت ہونا تم کو معلوم ہوا اور احکام شرعیہ سے جاہل رہنے کا جو مرض ہے اس کا انجام دوزخ ہے۔

دین سے بے فکری پر اظہار افسوس

افسوس کھانے کا فکر پینے کا فکر کپنے کا فکر لیکن فکر نہیں تو دین کا نہیں۔ کبھی برا کھانا کھا لیا ہو یا خراب کپڑا مل گیا ہو تو دل کو نہ سمجھا لیا بلکہ اس کی نسبت تو سوال کریں گے کہ کیا وجہ ہے کھانا بدمزہ کیوں ہوا۔ اور اگر نماز میں خشوع و خضوع فوت ہو گیا ہو تو کبھی اس کا علاج نہ پوچھا افسوس ہے۔

امراض جسمانی اور روحانی میں فرق

مرض جسمانی اور اس مرض میں ایک اور فرق بھی ہے وہ یہ ہے کہ جسمانی مرض تو محتمل ہے کہ تدبیر سے اچھا ہو یا نہ ہو اور اس مرض کا علاج جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں یقیناً شفا ہوگی۔ غرض باوجود اس قدر فرق کے پھر خیال نہیں سخت حیرت ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرض کو مرض ہی نہیں سمجھا اگر مرض سمجھتے تو ضرور فکر ہوتا اور وہی معاملہ اس کے ساتھ کرتے جو مرض جسمانی کے ساتھ کرتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ اس کا خیال ہوتا اور علاج کی طرف

ضرور توجہ ہوتی اور پھر علاج میں بھی اس قدر فرق ہے کہ مرض جسمانی کے علاج کے لئے تو بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے اور اس مرض کا علاج بالکل آسان۔

مرض جسمانی و مرض روحانی کے معالجین میں فرق

مرض جسمانی کے معالج فیس مانگتے ہیں اس کے معالج خود مفت معالجہ بتلاتے ہیں اور میں تو ایک بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں کہ ایک مسئلہ روز پوچھ لیا جاوے ایک مہینے میں تیس مسئلے ہو جاویں گے اور سال بھر میں تین سو ساٹھ مسئلے ہوں گے۔ اگر دس برس اسی طرح گزار دیئے تو اس قدر مسائل یاد ہو جائیں گے کہ کسی معمولی مولوی کو بھی اس قدر مسائل یاد نہیں ہوں گے اور کچھ محنت بھی نہ اٹھانی پڑے گی اور اگر اس وقت کوئی بتلانے والا موجود نہ ہوا تو اس کو ایک بیاض میں لکھ لیا جب کوئی بتلانے والا ملا اس سے سب مسائل کے جوابات پوچھ کر لکھ لئے۔ اور عورتوں کے لئے یہ مناسب ہے کہ گھر کے مردوں کی معرفت دریافت کرالئے۔ غرض جس بات کا آدمی کو فکر ہوتا ہے اس کے سینکڑوں طریقے خود ہی سوچ کر نکال لیتا ہے۔ عورتوں کو گہنے زیور کا فکر ہے پھر دیکھ لیجئے اس کے لئے کیسے کیسے فکر اور اہتمام کرتی ہیں دور دور سے چوڑیاں اور چھڑے اور کڑے بنوا بنوا کر منگاتی ہیں اگر ایک چوڑی ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا تاوان کو غم ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اگر دین کا ایک مسئلہ بھی ان کو یاد نہ ہو تو اس کا غم نہیں گویا دین بزبان حال شکایت کرتا ہے۔

قلق از سوزش پروانہ داری　　　　دلے از سوزما پروا نداری

(پروانے کے جلنے کا تجھ کو افسوس ہے مگر ہمارے جلنے کی تجھے پرواہ نہیں)

عورتوں کا دنیا میں انہماک واشتغال

میں دیکھتا ہوں کہ یہ عورتیں دنیا کے کاموں میں بے حد کھپتی ہیں۔ کپڑوں میں زیور میں جب یہ مشغول ہوتی ہیں اس وقت ان کو اس قدر انہماک ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی یاد بالکل ان کے قلب میں نہیں ہوتی اور پھر زیادہ شکایت اس کی ہے کہ وقت گزرنے کے بعد بھی اپنی اس حالت کا کچھ قلق ان کو نہیں ہوتا۔ چاہئے تھا کہ بعد اس حالت کے تو اپنے وقت ضائع ہونے پر کچھ کڑھتیں مگر حس تک نہیں ساری عمر جانوروں کی طرح گزر جاتی ہے۔ ہاں کپڑوں اور زیور سے لا دو۔ بڑا لائق خاوند وہ ہے جو ان کو چاندی سونے سے لا دے خواہ کہیں سے لائے حرام آمدنی سے یا حلال سے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں۔ جب کسی کا خاوند پردیس سے آتا ہے تو یہی سوال ہوتا ہے کیا کمال کرلائے اگر وہ بجائے روپیہ اور زیور کے یہ کہے کہ بی بی اب کی مرتبہ میں تو دین کے مسائل سیکھ کر آیا ہوں دین کی دولت لایا ہوں۔ تو بی بی صاحبہ اگر زبان دراز اور خاوند پر غالب ہوئیں تو

پوری خبر ان کی لیں گی کہ کیا مسئلوں کو لے کر ہم جائیں گے اور اگر کوئی نیک مزاج ہوئی تو سنتے ہی منہ ضرور سوکھ جائے گا۔ بیبیو یہ مسائل ایسا سکہ ہیں کہ تمہارے نزدیک ان کی قدر نہیں اس لئے کہ یہ سکہ یہاں نہیں چلتا اور جہاں یہ چلتا ہے وہاں تم کو معلوم ہوگا کہ جس کو ہم دولت سمجھتے تھے وہ واقع میں عذاب جان تھا اور جس کی ناقدری کرتے تھے حقیقی دولت وہ ہی ہے سچ یہ ہے کہ ان کو کسی درجہ میں بھی دین کی محبت نہیں اگر کچھ بھی خیال ہوتا تو کچھ تو قلق ہوتا کچھ تو دل کڑھتا۔

صرف رونا کارگر نہیں

اور اگر کسی کو دل کڑھنے اور رونے سے کیا ہوتا ہے اگر کسی کا بیٹا بیمار ہو اور وہ تدبیر تو کچھ کرے نہیں بس صبح اٹھ کر رو لیا کرے تو اس سے اس کو کیا نفع ہے رونے سے اچھا نہیں ہوگا تدبیر اور علاج کرو بس اسی طرح دین کے اندر سمجھ لو کہ دین رونے سے حاصل نہ ہوگا طریقہ کے موافق اس کو سیکھو جو تدابیر اور اسباب بتائے جاویں ان پر عمل کرو کام کرو تو طریقہ سے کرو دیکھو دنیا کا جو کام تم کرتی ہو ایک طریقہ سے کرتی ہو مثلاً روٹی ہی کھانا ہے کہ سراسر قوۃ اور نفع کی شئی ہے مگر اس کا بھی ایک طریقہ یہ نہیں کرتی ہو کہ مثلاً سفر میں جانا ہے اور سفر میں دقت ہوتی ہے پکانے پینے کی چلو چار دن کا آج ہی کھالو پھر چلنے میں حرج نہ ہوگا۔ جلدی منزل پر پہنچ جائیں گے اگر ایسا کرو گی وہاں تو پیچھے پہنچو گی پہلے اللہ میاں کے یہاں سے جا پہنچو گی کڑھنے کا نتیجہ تو یہ ہے کہ کام بھی کرو اور کام نری تمنا سے نہیں ہوتا ارادہ سے ہوتا ہے ارادہ یہ ہے کہ ہمت کرو ارادہ جب کرو گے اور نیک کام شروع کردو گے۔ ٹھنڈے چولہے ہی کام نہ ہوگا بلکہ اس میں نفس کے خلاف بھی کرنا پڑے گا۔ اب لوگ یوں چاہتے ہیں کہ کوئی ایسے بزرگ مل جاویں جو ایک نگاہ میں ولی بنا دیں۔ پھر وہ ہی توجہ کریں نگاہ کریں تم کچھ نہ کرو۔ یا در کھو اپنا ہی کیا کام آتا ہے۔ جب تم کچھ حرکت نہ کرو گے تو پیر ہزار چاہے کچھ بھی نہ ہوگا۔ کوئی پیر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تو نہیں دیکھ لو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کے لئے ہر چند چاہا کہ ایمان لے آویں مگر چونکہ انہوں نے نہ چاہا اس لئے کچھ بھی نہیں ہوا جب بھی کام چلے گا تمہاری ہی توجہ سے چلے گا۔

اور قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی ایک تفسیر پر یہ مضمون معلوم ہوتا ہے وہ آیت یہ ہے اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ (جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پسند فرماتے ہیں ہدایت نہیں دیتے لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے) اس آیت کی ایک تفسیر تو مشہور ہے اور ایک تفسیر اس کی یہ بھی ہے کہ یشاء کی ضمیر من کی طرف راجع ہو اور معنی آیت کے یہ ہوں کہ بیشک آپ نہیں راہ دکھلاتے جس کو آپ چاہیں لیکن اللہ ہدایت کرتے

ہیں اس شخص کو جو اپنی ہدایت کو چاہے اور دوسرے مقام پر یہ مضمون تصریحاً ارشاد ہے وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا (اور جو شخص آخرت کی نیت رکھے اور اس کے لئے جیسی سعی کرنا چاہیے ویسے ہی سعی بھی کرے گا۔ مدار آخرۃ کا بندہ کی سعی اور ارادہ پر رکھا ہے اور بیشک صحیح ہے کہ بغیر حق تعالیٰ کی مشیت سے کچھ نہیں ہو سکتا لیکن عادۃ اللہ یونہی جاری ہے۔ جب کہ بندہ ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی چاہتے ہیں یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کو کچھ بھی کرنا نہ پڑے اور آپ سے آپ کام ہو جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ یعنی کیا ہم تم کو اپنی رحمت یعنی ہدایت چپکا دیں اور تم اس کو ناپسند کرنے والے ہو۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تمہاری طرف سے تھوڑی توجہ ہو گی تو اس طرف سے بہت زیادہ ہو گی لیکن ابتدا تمہاری طرف سے ہونا ضروری ہے حدیث قدسی ہے

من تقرب الی شبر القربت الیه ذراعا و من

تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا (مسند احمد ۲: ۴۱۳)۔

یعنی جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہو میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب ہو میں اس کی طرف ایک باع (یعنی دو ہاتھ کھلے ہوئے) قریب ہوتا ہوں تو کوشش کرو اور اپنی ہمت خرچ کرلو اور پھر بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ کوشش اور سعی بیکار گئی بلکہ ثواب ضرور ملے گا کام پر تو ثواب ہوتا ہی ہے صرف ارادہ پر بھی ثواب ملتا ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ م بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ یعنی جو شخص اپنے گھر سے نکلے اس حالت میں کہ وہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرنے والا ہو پس اس کا ثواب اللہ تعالیٰ پر ثابت ہو گیا لیکن ارادہ سوچنے اور تمنا کرنے کو نہیں کہتے پس اے مردو اور اے بیبیو! اپنے دین کی فکر کرو اور اس جہل کو مرض سمجھو اور علاج جو بتلایا گیا ہے یعنی پوچھ پوچھ کر مسائل پر عمل کرنا شروع کر دو۔ بڑی کمی تو یہی ہے کہ پوچھتے ہی نہیں اگر پوچھیں اور علم ہو تو عمل کی بھی توفیق ہو جاوے۔ اصل مقصود جو مجھ کو بیان کرنا تھا وہ تو ختم ہو چکا ہے۔

دین کے مسائل پوچھنے کے آداب

اب اس حدیث کے اندر تھوڑا اور غور کرو تو سوال کے آداب بھی اسی حدیث سے نکلتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ دیکھو حکیم جی سے اول آدمی اپنے امراض کے متعلق پوچھتا ہے یہ نہیں کرتا کہ خود تو سینکڑوں بیماریوں میں مبتلا ہے اور اپنے پڑوسیوں کے امراض حکیم جی کے سامنے گا رہے ہیں اور وہ بھی بلا وجہ کیونکہ ان کا معالجہ اس کو مقصود نہیں اگر ایسا کوئی کرے تو اس کو بیوقوف کہا جاوے گا۔ اسی طرح طبیب روحانی یعنی عالم سے اگر ملنے کا اتفاق ہو تو اپنے متعلق جو مسائل ہیں جن کی تم کو

ضرورت ہے ان کا سوال کرو ایسا نہ کرو کہ دوسروں کی عیب جوئی کے واسطے مسائل پوچھو ورنہ اس کی تو ایسی مثال ہوگی کہ خود تو دق میں مبتلا ہے اور دوسرے کے پاؤں میں جو موچ آ گئی ہے اس کا نسخہ لکھوار ہے ہیں۔ اور اسی طرح مرض کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جو مرض واقع ہو اس سے سوال کرے یہ نہیں کرتے کہ مرض فرض کر کے اور گھڑ گھڑ کے حکیم جی سے بیان کریں ایسے ہی علماء سے وہ مسائل دریافت کرنے چاہئیں کہ جن کا وقوع ہو احتمالات کا اختراع مت کرو جیسا ایک شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا کہ ایک عورت اور اسکا بھائی اور خاوند چلے جا رہے تھے بھائی اور خاوند کو دشمنوں نے آ کر مار ڈالا اور سر کاٹ ڈالا۔ اس کے بعد کوئی اللہ کا بندہ آیا اس نے خاوند کے دھڑ میں تو بھائی کا سر اور بھائی کے دھڑ میں خاوند کا سر جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہ زندہ ہو گئے تو اب اس عورت کا خاوند کونسا ہے اور بھائی کونسا۔ بالکل مہمل بات ہے بھلا کہیں ایسا واقع بھی ہوا ہے۔

علاج کرانے کا ایک ادب

ایک اور ادب معلوم ہوا۔ وہ یہ ہے کہ دوا ایسے شخص سے پوچھا کرتے ہیں جس پر اطمینان ہو ہر کسی سے علاج نہیں کرایا کرتے اور جس پر اطمینان ہو وہ خواہ تلخ دارو بتادے یا میٹھی بدل وجان قبول کر لیتے ہیں اسی طرح مسائل دین کے بھی ہیں اس شخص سے پوچھو کہ جس پر کامل اطمینان ہو اور پھر وہ خواہ نفس کے موافق حکم بتاوے یا خلاف خوشی سے قبول کر لو۔ ایک ادب یہ معلوم ہوا کہ طبیب کے سامنے جو واقعہ ہے اور اصل مرض وہ بیان کر دیا کرتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ حالت تو کچھ ہے اور بیان کچھ اسی طرح مسائل دین کے بھی جس سے پوچھو تو جو واقعہ ہوا بے کم وکاست بیان کر دو پیچ پاچ نہ کرنا چاہئے کچا چٹھا بیان کر دینا چاہئے۔ غور کرنے سے اور بھی نکات اور آداب معلوم ہو سکتے ہیں چونکہ وقت کم ہے اس لئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلاصہ وعظ: خلاصہ یہ ہے کہ دین کا فکر اور اہتمام کرو اور مسائل کی تحقیق کر کے عمل کیا کرو اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرماویں۔ آمین۔

ذم المکروہات

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ کو بمقام میرٹھ کوٹھی حافظ غوث صاحب میں ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰۰ تھی، حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری نے قلم بند فرمایا۔

اس وعظ میں چار چیزوں سے ممانعت ہے۔ زیادہ قیل وقال، کثرت سوال (یعنی مانگنا) علماء کو لایعنی سوالات سے دق کرنا، اضاعت مال، اس کی اصل قلت شکر ہے اور اس کا علاج۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال۔ (مسند احمد ۲: ۳۲۹)

ترجمہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے ناپسند فرمایا ہے قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال کے ضائع کرنے کو۔

شریعت کی تمام تعلیمات ہمارے امراض کا علاج ہیں

یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ اس میں بڑے کام کی باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہیں اس بیان سے وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنے آپ کو واقعی مریض سمجھے۔ شریعت کی تمام تعلیمات ہمارے امراض کے علاج میں اور معالجات ہمیشہ کام کی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن نہ ہر شخص کے لئے بلکہ مریض کے لئے اور مریض بھی جبھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جب اپنے آپ کو مریض سمجھے دیکھئے شہر میں کیسے ہی بڑے طبیب موجود ہیں یا کسی کتب خانہ میں کیسی بڑی بڑی طبی کتابیں شیخ اور جالینوس کی موجود ہوں لیکن فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو ان کی طرف علاج کے لئے رجوع کرے ورنہ یہ بھی خبر نہ ہوگی کہ طبیب یا کتابیں شہر میں کہاں موجود ہیں اس صورت میں اگر کوئی ایسا شخص کہ جو مریض نہیں ہے اور جس کو ان کی طرف بھی رجوع

کرنے کی نوبت نہ آئی ہو یہ کہے کہ ہم تو نہیں جانتے کہ کوئی طبیب یا طب کی کتاب دنیا میں موجود ہے تو اس شخص کا یہ کہنا بالکل فضول ہے۔ اس کو طبیب یا طب کی کتاب کا وجود اور اس کی قدر جب معلوم ہوتی ہے کہ اس کو کبھی احتیاج پڑی ہوتی اور کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر ان کے پاس پہنچا ہوگا اس وقت دیکھتا کہ ان کے پاس کیسے کیسے چٹکلے ہیں کہ ان سے صحت جیسی زائل شدہ چیز خلاف امید کتنی جلد لوٹ آئی۔ اس وقت یہ کرشمہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ مگر جب کام ہی نہیں پڑا تو یہ کہنا اپنی حماقت جتاتا کہ طبیب یا طب کی کتاب کہیں موجود نہیں ہے۔

مریض کا خود کو مریض نہ سمجھنا حماقت ہے

اور اسی کے حکم میں وہ شخص بھی ہے کہ جو مریض تو ہے مگر اپنے آپ کو مریض نہیں سمجھتا بلکہ یہ شخص اس پہلے شخص سے بھی زیادہ بے وقوف ہے اس کو کبھی طبیب یا طب کی کتاب سے نفع ہونے کی امید نہیں۔ یہ پہلا شخص گو اس وقت کسی طبیب کا معتقد نہیں مگر امید ہے کہ اگر کام پڑے گا تو اس کے خیالات بدل جائیں گے اور یہ دوسرا شخص باوجود مرض جسمانی میں مبتلا ہونے کے ایک دوسرے مرض میں بھی گرفتار ہے جو مرض کے معالجہ سے مانع بھی ہے وہ مرض کیا ہے جہل مرکب ہے اس شخص کی نسبت کبھی امید نہیں کہ طب یا طبیب سے اس کو فائدہ پہنچ سکے تو اگر یہ شخص کہے کہ دنیا میں طب یا طبیب موجود نہیں تو کس قدر افسوس کے قابل حالت ہے۔ پہلا شخص تو صرف ایسی غلطی میں مبتلا تھا جس کی وجہ سے اس کو محقق نہ کہہ سکیں گے اس غلطی سے اس کا کوئی نقصان جسمانی وغیرہ نہ تھا اور یہ دوسرا شخص ایسی غلطی میں مبتلا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ تحقیق سے بھی بہت دور ہے اور مرض جسمانی بھی اندر اندر اس کو کھا رہا ہے۔ یہ شخص اگر حکیم محمود خاں کے پہلو میں بھی بیٹھا تب بھی اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی حالت کس قدر افسوس کے قابل ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ ان دونوں شخصوں کے طب یا طبیب کے قائل نہ ہونے سے کیا طب یا طبیب کو کچھ نقصان پہنچا، ہرگز نہیں۔ طب اور طبیب کی شان تو جو ہے وہی ہے ہاں یہ دونوں ان کی برکات سے خود محروم ہیں پس یہی مثال ہماری اور شریعت کی ہے اگر ہم قدر نہ جانیں تو شریعت کی شان میں کچھ بٹہ نہیں لگتا۔ شریعت وہ چیز ہے کہ مردہ کو زندہ کرتی ہے۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (کیا وہ شخص جو کہ مردہ تھا پس ہم نے اس کو زندہ کیا) ہاں ہماری حالت افسوس کے قابل ہے کہ ہم اس سے متمتع نہ ہوں اور ہماری مثال اس اول شخص کی سی نہیں ہے جس کو مرض نہ ہونے کی وجہ سے طبیب اور طب سے کام نہیں پڑا اور ان کی قدر نہ جان سکا کیونکہ اس مثال میں تو وہ شخص مریض نہیں اور ہم یقیناً مریض ہیں بلکہ ہماری

حالت دوسرے شخص کی سی ہے جس کے جسم میں مرض مہلک موجود ہے اور اس کے ساتھ اس کو مرض کا بھی علم نہیں یا طب اور طبیب کا بھی علم نہیں یعنی ہم کو جہل مرکب ہے۔

نبوت کو مذہبی خیال سمجھنا کفر ہے

میں اس بیان کو طول نہیں دیتا کیونکہ یہ مسئلہ ایسا بدیہی ہے کہ اگر کسی جاہل سے بھی پوچھیں کہ کیا تم ایسے سلیم القلب ہو کہ تم کو شریعت کی ضرورت نہیں تو کبھی یہ نہ کہے گا کہ میں ایسا ہوں۔ پس ثابت ہوا کہ امراض کا اپنے اندر موجود ہونا مسلم ہے اس صورت میں شریعت کی قدر نہ جاننا کس بات پر مبنی ہے اس جہل مرکب پر کیونکہ ہمارا یہ کہنا کہ ہم مریض ہیں صرف زبانی ہے اور دل میں اس کا اعتراف نہیں ہے ورنہ اگر مرض کو واقعی جانتے تو اس کی دوا کی بھی تلاش ہوتی یہ ہمارا زبانی اقرار تو ایسا ہوا جیسے کوئی مریض زبان سے کہتا رہے کہ میں مریض ہوں میں مریض ہوں اور رات دن اس کا وظیفہ رٹتا رہے مگر طبیب کے پاس نہ جائے تو ایسے شخص کو سب بے وقوف کہیں گے یا نہیں۔ لہذا ہمارا زبانی اقرار تو کسی شمار میں نہیں۔ پس دل سے عدم اعتراف بھی ثابت ہے اس لئے ہماری مثال اس دوسرے شخص کی سی ہوگئی جس کو باوجود مریض ہونے کے اپنے مرض کی خبر نہیں اور طب کا بھی قائل نہیں ہوتا بلکہ اس کو خیالی ڈھکوسلا بتلاتا ہے آج کل کے اکثر تعلیم یافتوں کی یہی حالت ہے۔ کہ اپنے امراض کو خود بھی جانتے نہیں اور شریعت کی بھی قدر نہیں پہچانتے بلکہ نعوذ باللہ، اس کو ایک امر زائد اور خیالی باتیں سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ توبہ توبہ ایک شخص نے صریح لفظوں میں کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے فارمر اور مصلح قوم اور بڑے دانشمند تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تہ دل سے معتقد ہوں وہی نبوت، سو وہ صرف ایک مذہبی خیال ہے۔

صاحبو! اپنے نزدیک اس شخص نے بہت مہذب الفاظ استعمال کیے لیکن کیا الفاظ کے بدلنے سے حقیقت بدل سکتی ہے یہ الفاظ حقیقت میں نبوت کے انکار کے لئے استعمال کیے گئے ہیں میں نے ایک ایسے ہی شخص کی نسبت فتویٰ دیا کہ یہ شخص اسلام سے خارج ہے۔ یہ حالت ان تعلیم یافتوں کی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ باوجود مریض ہونے کے جہل مرکب میں گرفتار ہیں مگر یہ اطمینان رکھئے کہ ان کے خیالات اور بکواس سے شریعت کی شان میں کمی لازم نہیں آسکتی۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ خود اس کی برکات سے محروم ہیں جیسا کہ مریض منکر طب، طب کی برکات سے محروم رہتا ہے اور اتنا فرق اور ہے کہ وہ مریض منکر طب زائد سے زائد نقصان اٹھائے گا کہ مرض اس کے جسم کو کھالے گا اور ایک دن موت آجائے گی پھر موت کے بعد کچھ بکھیڑا باقی نہ رہے گا اور ان تعلیم یافتوں کے امراض کے ظاہر ہونے کا جب وقت آئے گا اور وہ موت کا وقت ہے تو

ان کی کوئی میعاد نہ ہوگی وہ لازم ذات ہو کر چپٹیں گے اور کبھی ان کا خاتمہ نہ ہوگا موت بھی ان سے چھڑا نہ سکے گی تو کس قدر افسوس کے قابل حالت ہوئی غرض اس بات کو یقینی سمجھئے کہ شریعت بہت قابل قدر اور ضروری چیز ہے۔ ہاں ہم لوگ اس کی قدر جب جان سکتے ہیں کہ جب اپنے کو مریض سمجھیں (سمجھنے سے مراد دل سے سمجھنا ہے نہ صرف زبانی، جیسا کہ بیان ہوا) دیکھئے مال کی طلب وہ شخص کرتا ہے جو اپنے آپ کو اس کا حاجت مند سمجھے اور جو حاجت مند ہی نہ سمجھے وہ کیوں طلب کرے گا یہی حالت باطنی دولت کی ہے اس کی تلاش بھی وہی شخص کرے گا جو اپنے آپ کو اس کا حاجت مند سمجھے۔ شریعت کی ایک ایک بات اور قرآن وحدیث کا ایک ایک ٹکڑا دولتوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہاں طلب گار چاہئے اس حدیث میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے امراض ذکر فرمائے ہیں جو نہایت مہلک ہیں خدا ہم کو ایسی نظر دے جس سے ہم اپنی احتیاط اور عیبوں کو دیکھ سکیں۔ تب اس کی قدر معلوم ہو اور جب تک کہ احتیاج نظر میں نہیں تو اس حدیث سے کیا بلکہ تمام شریعت اور قرآن وحدیث سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا میں تشریف فرماتے ہوئے بھی بعضوں کو کچھ بھی نفع نہیں ہوا۔

امراض کی دو قسمیں

اب سمجھ لیجئے کہ امراض دو قسم کے ہوتے ہیں جسمانی اور روحانی۔ جسمانی کو تو سب جانتے ہیں جس کو بیماری کہتے ہیں اور مرض روحانی نام ہے گناہ کا، ان دونوں کا فرق بھی آپ کو معلوم ہے کہ مرض جسمانی کا خاتمہ موت ہے اور مرض روحانی کا خاتمہ موت سے بھی نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد بھی بہت عرصہ تک اور بعض کے لئے ابدالاباد تک بھی اس کے نتائج باقی رہیں گے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مرض جسمانی کا خاتمہ تو موت پر ہے اور مرض روحانی کی ابتداء یعنی اس کے نتائج اور تکلیف کا ظہور موت سے ہوگا دونوں میں کتنا فرق ہوا کہ ایک کے لئے تو معیاد اور بہت تھوڑی سی معیاد ہے اور ایک دائمی یا بہت طویل ہے۔ اس فرق کے لحاظ سے مرض روحانی کے علاج کا زیادہ ضروری ہونا بھی بہ نسبت مرض جسمانی کے ثابت ہوگیا تو یہ اجمال حکم ہوا امراض روحانی کی نسبت کہ وہ امراض جسمانی سے اشد اور قابل توجہ زیادہ ہے۔

گناہ کی دو قسمیں

پھر اگر نظر کو اور عمیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ امراض روحانی یعنی گناہ دو قسم کے ہیں، ظاہری اور باطنی جیسا کہ امراض جسمانی میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہر، ایک پوشیدہ۔ ظاہر کی مثال پھوڑا پھنسی ہے یا ہاتھ پیر کٹ جانا وغیرہ وغیرہ۔ کہ یہ امراض نظر آتے ہیں اور پوشیدہ کی مثال درد

سر اور درد شکم وغیرہ ہے کہ مریض کو تکلیف ہو رہی ہے لیکن دوسرے کو نظر نہیں آتا۔ ایسے یہ گناہ بھی دو قسم کے ہیں ایک ظاہری ایک باطنی جیسے نماز نہ پڑھنا کہ لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص غیر نمازی ہے اور باطنی جیسے حسد کہ ظاہر میں آدمی نماز روزہ سب کچھ کرتا ہے مگر باطن میں مرض موجود ہے ظاہر ہے کہ مرض ظاہری سے یہ دوسری قسم جس کا نام مرض باطنی رکھنا گیا ہے اشد ہے۔

امراض باطنی کی مثال

کیونکہ امراض باطنی بمنزلہ جڑوں کے ہوتے ہیں اور امراض ظاہری بمنزلہ شاخوں کے جن میں ایک جڑ بہت سی شاخوں کے لئے اصل ہوتی ہے اس کا علاج بہ نسبت امراض ظاہری کے زیادہ ضروری ہوا نیز ایک تقسیم اور ہے کہ بعضے گناہ ایسے ہیں جو مسلم ہیں اور اکثر لوگ ان کو گناہ جانتے ہیں اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کو ہم لوگ گناہ کی فہرست میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ اول کی مثال جوا ہے کہ ہر شخص اس کو گناہ سمجھتا ہے اگر چہ اس میں مبتلا بھی ہو اور دوسرے کی مثال کسب معاش وغیرہ کے ناجائز طریقے ہیں جن کی طرف سے بالکل غفلت ہے اور کلیتاً یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ دین اور شریعت کو کمائی میں کیا دخل اور کیا تعلق۔ خدا تعالیٰ نے ہمارے پیچھے دنیا کی ضرورتیں لگائیں اور عقل عطا فرما دیں کہ جس طرح ہو سکے ان ضرورتوں کو پورا کرو۔ دین تو عبادت کا نام ہے نماز روزہ پڑھتے رہو بس دین دار ہو، کیوں صاحبو! آلات حرب بیچ کر اور چھرہ بارود کی تجارت سے کیوں ہر شخص نفع نہیں اٹھاتا اور ان ضرورتوں کو بدوں لیسنس کے کیوں پورا نہیں کرتا۔ جو ان آلات سے پوری ہوتی ہیں گورنمنٹ سے کیوں نہیں کہہ دیتا کہ آپ کی اطاعت اور حکومت ماننے کے لئے بس یہ کافی ہے کہ ہم خراج دیتے ہیں آپ کو تجارت میں کیا دخل ہے۔ فما جوابکم فھو جوابنا (سو جو تمہارا جواب ہوگا وہی ہماری طرف سے جواب ہوگا) بات یہ ہے کہ گورنمنٹ کی عظمت ذہنوں میں کھب گئی ہے اور خدا تعالیٰ کی نہیں اور گورنمنٹ کے خلاف منشاء کرنے پر دست بدست سزا تیار ہے اور خدا تعالیٰ نے مہلت دے رکھی ہے سزا کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے لیکن عقلمند کا کام یہ ہے کہ جو چیز یقینی اور دلیل سے ثابت ہے اس کو مثل موجود کے سمجھے اور غفلت نہ کرے۔ بہر حال یہ صحیح نہیں ہے کہ شریعت اور دین کو معاش میں کیا دخل ہے۔

قانون الٰہی کو ہر کام میں مداخلت کا حق ہے

صاحبو سب چیز خدا تعالیٰ کی ہیں۔ قانون الٰہی کو ہر ہر کام میں مداخلت کا حق حاصل ہے۔ جب کہ حکام دنیا کو صرف سلطنت کے زعم پر ہر کام میں دخل دینے کا مجاز سمجھا جاتا ہے تو جس کو

مالکانہ اور خالقانہ وحاکمانہ ہر طرح کا اقتدار حاصل اس کو ہر کام میں مداخلت کا استحقاق نہ ہونا کیا معنی خدا تعالیٰ کو تو ہماری جانوں پر بھی اتلاف کا حکم دینے کا استحقاق ہے اگر ایسا کریں تو ظلم تو در کنار کسی درجہ میں بھی یہ حکم مذموم نہ ہوگا۔ نہ اس میں کسی کو چوں چرا کی گنجائش ہوگی اسی واسطے فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

یعنی اگر ہم ان کو حکم کرتے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو قتل کر دیا جلاوطنی اختیار کرو تو ان میں سے بجز تھوڑے آدمیوں کے کوئی اس کی تعمیل نہ کرتا لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو بہتر ہوتا دیکھئے، کتنی تصریح کے ساتھ یہ مضمون قرآن میں موجود ہے جب حق تعالیٰ کو جانوں پر یہ حق حاصل ہے تا با موال چہ رسد لیکن یہ رحمت ہے کہ نہ جانوں کے تلف ہونے کا حکم دیا نہ مالوں کے بالکل خرچ کر دینے کا ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں میں آزاد بھی نہیں کر دیا بلکہ خاص خاص اوقات میں جان کو بھی اپنی راہ میں خرچ کر دینے کا کچھ مطالبہ فرمایا ہے اور مالوں کو بھی مگر یہ دونوں مطالبے اتنے قلیل ہیں کہ خدا تعالیٰ کی عظمت کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ حکام دنیا کے مطالبوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ دیکھئے۔ مزدور کو کوئی ایک آنہ دیتا ہے تو کتنا کام اس سے لیتا ہے اور اس کام میں ذرا سی ابڑی ہو تو جرمانہ کر دیں یا اجرت بالکل سوخت کر دیں اور حق تعالیٰ کی رحمت عامہ کا برتاؤ دیکھئے کہ ہمارے کاموں کے اچھے برے پر نظر رکھنا تو درکنار وعدم پر بھی نظر نہیں ہم کچھ بھی نہ کریں تو کسی نعمت میں کمی نہ کرتے۔ واللہ مر جانے کی بات ہے پس معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ خیال کس درجہ بے جا اور بے اصل ہے کہ خدا تعالیٰ کے قانون کو دنیاوی امور میں مداخلت کا حق نہیں، مگر آج کل لوگوں نے ترقی قومی کے معنی یہی لئے ہیں کہ خوب روپیہ کماؤ، جس طرح بھی بن پڑے، حرام وحلال کچھ مت دیکھو۔ کسب مال میں بھی یہی حالت ہے اور بذل میں بھی یہی ہے کہ جہاں جی چاہے خرچ کر دو۔ اس کی ضرورت نہیں کہ کسی سے پوچھو شادی میں بیاہ میں جس طرح جی چاہے خرچ کرو بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نفس اور شیطان سے تو پوچھ لو اور خدا کا خیال بھی نہ آنے پاوے۔

اے گراں جاں خوارد دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

ترجمہ۔ (اے کاہل تو نے مجھ کو بے قدر سمجھ رکھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں تجھ کو مفت مل گیا ہوں)

صاحبو! تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہو جائے گا کہ جی سے پوچھ پوچھ کر جو آپ نے خرچ کیا ہے وہ ہرگز کام نہیں آئے گا اور جس کا مال تھا اور جس کی بلا اجازت تم نے خرچ کیا ہے اس کو جواب دینا ہوگا۔ غرض کسب مال اور بذل مال خرچ کرنے میں بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مگر یاد رکھئے کہ جو عند اللہ گناہ ہے وہ واقع میں گناہ ہے۔ آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے اسکی

ماہیت نہیں بدل جاتی۔ بیان یہ تھا کہ گناہ بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا گناہ ہونا معلوم نہیں بلکہ ان کے افراد پر نظر تو کیا بلکہ اس نوع گناہ سے بعضوں کو انکار ہے اور ان میں تمام دنیا مبتلا ہے الا ماشاء اللہ۔

دل کے امراض

وہ دل کے امراض ہیں۔ اس فن کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا دل میں کس قدر گناہ ہوتے ہیں اور یہ تحقیق ان کتابوں کی ہی نہیں بلکہ ان میں قرآن وحدیث سے مستنبط کر کے ان کو درج کیا گیا ہے، جیسے فقہ میں ظاہری احکام درج کیے گئے ہیں کہ وہ فقہ کی ایجاد نہیں بلکہ قرآن وحدیث سے نکال کر ایک جگہ کتاب کی صورت میں جمع کر دیئے گئے ہیں کہ وہ غرض قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ دل کے بھی امراض ہوتے ہیں چنانچہ آیات میں تصریح ہے۔ فی قلوبھم مرض (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اور فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں لیکن ان کے دل اندھے ہیں جو سینوں میں ہیں) وغیرہ وغیرہ صدہا نصوص میں ان کا ذکر ہے۔

امراض قلب اشد ہیں

اب ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ ہزار میں سے کتنے آدمی ان امراض کو جانتے ہیں اور کتنے ان کا علاج کرتے ہیں اچھے اچھے ظاہری پارسا اور عابد ہیں مگر دل کے مریض ہیں اور ان کو ایسا سخت مرض ہے جس نے ان کی پارسائی کو اندر ہی اندر غارت کر دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حسد نیکیوں کو ایسا کھا جاتا ہے جیسے لکڑی کو آگ۔ پھر اگر کسی پارسا کے قلب میں حسد موجود ہے تو بتائیے کہ اس کی پارسائی کس شمار میں ہے۔ اگر بھٹی میں ہزاروں لکڑیاں بھری جائیں لیکن ساتھ ہی اس میں آگ بھی موجود ہو تو انجام یہ ہوگا کہ ایک بھی لکڑی نہیں رہے گی اسی طرح یہ پارسا صاحب جب دنیا سے جائیں گے تو اپنے نزدیک تو بہت سی لکڑیاں جمع کر گئے ہوں گے لیکن وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ آگ ان کو جلا بھی چکی اور راکھ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہماری طاعات پر جو ثمرات اور نورانیت مرتب نہیں ہوتی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اول تو طاعات ہی تعلیم شرعی کے موافق نہیں ہوتے اور اگر ہوں بھی تب بھی کوئی ثمرہ اس واسطے نہیں ہوتا کہ ظاہر میں تو طاعات ہیں اور باطن میں ان کو ایک فنا کرنے والا مادہ بھی موجود ہے گویا ہم کوئلہ یا لکڑی کا ایک انبار جمع کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ یہ جاڑوں میں کام دیں گے لیکن اس کے اندر ایک چنگاری بھی آگ کی چھوڑ دی ہے کہ ساتھ ساتھ ان کو فنا بھی کرتی جاتی ہے ہم لکڑی ڈالتے جاتے ہیں مگر وہ انبار پر کو آتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ پھر یہ شکایت کرتے ہیں کہ کیسی لکڑیاں ہیں۔

صاحبو! پہلے آگ کو بجھاؤ، پھر لکڑی جمع کرو، دیکھو پھر کتنی جلدی ڈھیر نظر آتا ہے۔

اصلی مجاہدہ

یہ ہے اصلی مجاہدہ۔ جیسے اس چنگاری کو بجھایا جاتا ہے جو طاعات کو فنا کر رہی ہے غرض بعض امراض خفی ہے جو اندر ہی اندر قلب کو کھا رہے ہیں مثلاً کسی کے قلب میں تکبر ہے جو شخص دولت مند ہے وہ مفلس سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے جس کو شرافت نسبی حاصل ہے وہ اپنے آپ کو شریف اور دوسرے کو رذیل سمجھتا ہے حالانکہ یہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے عقل کے تو اس واسطے خلاف ہے۔ کہ دولت آنے جانے والی چیز ہے آج ہے تو کل نہیں۔ پھر ایسی چیز پر کیا اترانا۔ نیز دولت ایسی چیز ہے کہ کسی کے اختیار سے حاصل نہیں ہوئی۔ اور آپ اس پر تعجب نہ کریں مختصر بیان اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں کو آپ دولت مند دیکھتے ہیں اور خیال یہ ہے کہ انہوں نے دولت اپنے اختیار اور تدبر کے زور سے حاصل کی ہے۔ ان سے وہ تدبیریں مفصل پوچھ کر آپ بھی اختیار کیجئے۔ پھر دیکھوں کہ آپ بھی ان کے برابر دولت مند ہو جاویں گے یا نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر شخص دولت مند بن جاتا۔

اس سے ثابت ہوا کہ دولت مند بننا اختیاری نہیں اور دوسرے کا عطیہ ہے اس پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا کیا معنی ایسے ہی شرافت نسبی اختیاری یہ کام آباؤ اجداد کا تھا جنہوں نے نسل کو محفوظ رکھا کہ تم کو یہ شرف حاصل ہو گیا تمہارے اختیار کو اس میں کیا دخل اور جو شخص شرافت نسبی نہیں رکھتا اس نے اپنے اختیار سے اس شرف کو کب کھویا ہے تو اس پر جرم لگانا یہ کون سی عقل کا حکم ہے اور رہی نقل سو صاف موجود ہے۔

وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

اس آیت میں ایک بری حالت کا بیان ہے وہ یہ کہ آدمی اس بات پر تعریف کا خواہاں ہو جو اس نے اپنے اختیار سے نہیں کی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو عذاب سے بچا ہوا نہ سمجھو، بلکہ ان کے لئے سخت عذاب ہے دیکھ لیجئے، دولت مندی اور شرافت پر تکبر کی یہ حقیقت ہے۔

طلباء کا تکبر

پھر یہ دیکھئے کہ اس مرض سے کتنے آدمی خالی ہیں کوئی گروہ بھی خالی نہیں۔ چنانچہ ہم طالب علم دولت مند اور دنیا دار شرفاء کو اس مرض میں مبتلا سمجھتے ہیں حالانکہ خود بھی اس سے بری نہیں تکبر کچھ دولت اور شرافت پر نہیں ہوتا ہم لوگ اس تکبر میں مبتلا ہیں کہ ہم کو اپنے علم پر ناز ہے اور یہ تکبر اس سے بدرجہا بدتر ہے اس واسطے کہ دنیا دار لوگ اپنے عیوب پر بھی نظر رکھتے ہیں گو اجمالاً ہی کیونکہ جب بھی کسی دنیا دار سے کہا جاوے کہ تم میں فلاں فلاں عیب ہیں تو اقرار کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ

ہاں بھائی ہم میں تو صدہا عیب ہیں خدا اصلاح کرے بخلاف علماء کے کہ ان کو تو خود اپنے عیوب پر نظر نہیں ہوتی اگر بتلا دیا جاوے تب بھی اس عیب کو عیب نہ مانیں گے تاویل سے کھینچ تان کر اس عیب کو ہنر بنا دیں گے اور اس بتانے والے پر الٹا کوئی عیب لگا دیں گے خوب سمجھ لیجئے کہ دنیاداروں کا تکبر جہل تھا تو وہ جہل بسیط تھا اور یہ جہل مرکب ہے اب بتایئے کون گروہ اس مرض سے خالی ہوا۔

بعضے دلوں میں حسد موجود ہے چونکہ ان کی ماہیت معلوم ہے نہیں (اور معلوم اس واسطے نہیں کہ کبھی اس کے معلوم کرنے کا خیال نہیں ہوا) اس واسطے ہر شخص سمجھتا ہے کہ میں اس مرض سے پاک ہوں۔ دلوں کو ٹٹول کر دیکھئے۔ دوسرے شخص کی مصیبت دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے یا نہیں کم وبیش اس کا اثر عام قلوب میں موجود ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ یہی حسد ہے اور ہر وہ مرض ہے کہ نیکیوں کو ایسا کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ حدیث شریف میں تو مومن کی یہ شان آئی ہے کہ اپنے بھائی مسلمان کے واسطے وہی بات چاہئے جو اپنے واسطے چاہتا ہو۔ تو جب دوسرے کو مصیبت میں دیکھنا ایمان کی شان یہ تھی کہ دیکھنے والے کو وہی تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی خوشی بھی نہیں ہوتی تو کم سے کم یہ بات تو ہر شخص میں ہے کہ دوسرے کی مصیبت کی پرواہ بھی نہیں ہوتی یہ بھی ضعف ایمان ہے۔

حسد بہت مخفی مرض ہے

حسد بہت مخفی مرض ہے بہت ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے اور حسد اسی کا نام نہیں کہ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر جی خوش ہو بلکہ یہ بھی حسد ہے کہ دوسرے کی چیز دیکھ کر اس کے پاس سے زوال کی خواہش ہو تو دیکھئے ہم لوگوں کی یہ حالت ہے یا نہیں کہ کسی کا سامان دیکھ لیا یا گھوڑا دیکھ لیا یا زیور دیکھ لیا تو خواہش ہوتی ہے کہ یہی بعینہ ہمارے پاس آ جائے۔ اس کے کیا معنی ہیں سوائے اس کے کہ ان سے چھن جائے۔

حسد اور غبطہ میں فرق

ورنہ اس کے بعینہ منتقل ہونے کی خواہش کیوں ہے اور اگر یہ نہ ہو تو حسب حال تو جبلی چیز ہے اگر اس کو دوسرے کا زیور یا سامان دیکھ کر اس جبلی عادت کو ہیجان ہوتا ہے کہ مجھے بھی ایسا ہی مل جائے نہ کہ یہی آ جائے اس کا کچھ ڈر نہیں۔ اس کو غبطہ کہتے ہیں کہ دوسرے کی اچھی حالت کی تمنا کرے کہ یا اللہ ہم کو بھی ایسی حالت نصیب فرما۔ اور یہ کچھ گناہ نہیں بلکہ کہیں گناہ کہیں مستحب ہے۔ مگر ہم لوگوں کو اتنی تمیز کہاں کہ غبطہ اور حسد کو الگ الگ پہچانیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ اور یہ عجیب غلطی ہے۔ میں ایک موٹی سی بات پوچھتا ہوں کہ گناہ کا گناہ ہونا کیسے معلوم ہوا یقیناً اللہ تعالیٰ کے منع کرنے سے اور رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے بتانے سے۔اس کے سوااور کوئی بھی حقیقت گناہ کی ہے جب اس کی حقیقت پر اتفاق ہے تو اس کے افراد اور مصادیق میں کیوں اختلاف ہو جاتا ہے۔اب حدیث اور قرآن کو دیکھ لیجئے کہ حسد اور تکبر اور ریا و تفاخر وغیرہ سے منع کیا ہے یا نہیں تمام قرآن و حدیث ان کی ممانعت سے بھرے پڑے ہیں پھر اس کے کیا معنی کہ گناہ کی حقیقت تو تسلیم کر لی جاوے کہ جس کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم منع کریں وہ گناہ ہے اور جب اس کے افراد دکھائے جاویں کہ حسد بھی اس میں داخل ہے تکبر بھی اس میں شامل ہے ریا بھی اس کا شعبہ ہے تو اس کے گناہ ہونے میں کیا تامل کیا جاوے۔

دوزخ کی آگ

صاحبو! ان گناہوں کو حقیر نہ سمجھئے گا یہ دوزخ کی آگ ہیں جن کی صورت اس وقت بدل گئی ہے دنیا ختم ہو جاتے ہی یہ اصلی صورت پر آ جاویں گے اس وقت معلوم ہو گا کہ ہماری غفلت یا تاویلیں کچھ کارآمد ہو سکتی ہیں یا نہیں۔خدا تعالیٰ کے سامنے تو یہ بات بتانا کیسے ممکن ہے دنیا کے حاکم کے سامنے بھی بات بنانے سے جرم نہیں ٹلتا۔اتنا بیان بخوشی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں کہ ہم ان کو گناہ ہی نہیں سمجھتے جب یہ بات ذہن میں آ جائے گی کہ ہم اپنے آپ کو مریض سمجھیں گے اگر ان امراض کا بیان ہو گا تو دل میں وقعت ہو گی اور اس بیان سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا اور علاج کی طرف توجہ ہو گی اس حدیث میں بعضے ایسے ہی امراض کا بیان ہے جن کو مرض نہیں سمجھا جاتا۔اگر آپ کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہے کہ ہم میں کچھ امراض غیر محسوس بھی ہیں تو آپ کو اس حدیث کی قدر ہو گی اور ان امراض کے بیان کو اس امراض کے بیان سے جن کا مرض ہونا خود آپ کو معلوم ہے۔زیادہ اہم سمجھیں گے اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک زکام کا مریض کسی ماہر طبیب کے پاس پہنچے اور وہ طبیب زکام کا نسخہ لکھنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دے کہ تمہارا خون بھی بگڑ گیا ہے اس کا خیال رکھو وہ مریض کا کس قدر ممنون ہو گا کہ طبیب صاحب کیسے مہربان ہیں اور ان کو مجھ سے کوئی خاص خاصیت ہے کہ وہ مرض بتا دیا جس کا مجھے خیال بھی نہ تھا۔چند روز اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو اس کا استحکام ہو جاتا اور پھر علاج نہ ہو سکتا۔

امراض باطنی

اس طرح ہمارے مشفق طبیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزہ اور ظاہری احکام کے ساتھ باطنی امراض کا بھی ذکر فرمایا ہے تو یہ کس درجہ شفقت ہوئی کہ ہم کو ان امراض سے بھی بچا لیا جن کی ہم کو خبر نہ ہوتی اندر ہی اندر وہ ہمارے ایمان کو کھا لیتے۔چنانچہ فرماتے ہیں

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السوال واضاعۃ المال (مسند احمد ۲:۳۳۹)

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے ناپسند فرمایا قیل وقال کو اور کثرت سوال کو اور مال کے ضائع کرنے کو اس کی شرح آگے بتاؤں گا۔ اول یہ سمجھو کہ مسلمان کو کسی بات سے منع کرنے کے لئے یہ لفظ کیا اثر رکھتا ہے کہ یہ کام حق تعالیٰ کو ناپسند ہے۔ اس کی قدر اس شخص کو معلوم ہوتی ہے جس کا دل کسی سے پھنس چکا ہو اگر ایک مردار سے بھی تعلق ہو تو اس بات کے لئے جان و مال خرچ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ کوئی بات ہماری اس کے پسند آ جائے اور وہ التفات سے ایک نظر کر لے اور اگر کسی کام کی یا کسی چیز کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس کو چنداں پسند نہیں تو کبھی اس کے پاس بھی نہ جائیں اور وہ کام یا وہ چیز خاک کے برابر بھی نظر میں نہ رہے۔

چو در چشم شاہد نیاید زرت زرد خاک یکساں نماید برت

(جب محبوب کے نظر میں تمہارا مال وزر نہیں آتا تو خاک اور مال وزر تمہارے نزدیک برابر ہے)

اور کسی کام کی نسبت یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ اس کو پسند ہے اور اس سے اس کو چڑ ہے تو اس کی نسبت میں کونسا لفظ کہوں، آپ خود سمجھ لیجئے اور عشق تو بڑی چیز ہے، کسی معمولی شناسا اور سننے والے کے پاس بھی کوئی چیز لے جانا چاہئے اور یہ معلوم ہو جائے کہ مہدی الیہ کو ناپسند ہے تو اس چیز کا کبھی نام نہ لیں۔ خدا تعالیٰ سے مسلمان کو وہ تعلق ہے جو کسی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ شخص کیسا مسلمان ہے جس کو وہ کام جس کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا ہے ناپسند نہ ہو معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اللہ میاں سے عشق کا تعلق تو کہاں اتنا تعلق بھی نہیں جتنا شناسا سے ہوا کرتا ہے۔ دیکھئے بچوں سے محبت ہوتی ہے تو اس کو سو طریقوں سے راضی کرتے ہیں طرح طرح کے کھانے ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ ان کی لایعنی ضدیں پوری کرتے ہیں۔ اقوام میں افعال میں ان کے ساتھ بچے بن جاتے ہیں اور ایسی بے ہودہ حرکات کرتے ہیں جن کو نقل کرتے بھی شرم آتی ہے۔ اپنی فصیح زبان چھوڑ کر ان ہی جیسے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ان کے سامنے خود بھی بولتے ہیں وضع ان ہی کی سی اختیار کرتے ہیں واقف سے ناواقف بنتے ہیں منہ پر ہاتھ رکھ کر کرتے ہیں آنکھیں میچتے ہیں کہ دیکھیں کون آتا ہے کئی کئی نام ان کے بے معنی اور مہمل رکھتے ہیں۔ کبھی بدھو کہتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں اور اس کو اچھا سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیار کا نام ہے۔ اسکے راضی کرنے کے واسطے اقوام وافعال میں ان کی مجانست اختیار کی جاتی ہے تا کہ مجانست سے ان کو میلان وانبساط ہو، اور اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ بچے کو یہ چیز ناپسند ہے تو چاہے واقع میں کیسی ہی اچھی ہو اس کو نہ خریدیں گے۔ یہ ایک ذرا سی محبت کے آثار ہیں پھر اللہ میاں کی نسبت کیا خیال کیونکہ مسلمان کو کسی سے بھی اتنا تعلق نہیں ہے جتنا حق تعالیٰ سے ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اور ایمان والے اللہ کی محبت سے زیادہ شدید ہیں) تو جس چیز کی نسبت یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ خدا تعالیٰ کو ناپسند ہے اس

سے مسلمان کو کیا علاقہ ہو سکتا ہے میں کہتا ہوں وہ شخص کیسے چین سے صبر کرتا ہے جس کو یہ بھی معلوم ہو اللہ میاں مجھ سے راضی یا ناراض یا جانتا ہو کہ اللہ میاں مجھ سے ناراض ہیں اور کیسے ممکن ہے کہ ناراض ہونے کی وجہ معلوم ہونے تک اور اس کو کرنے تک اس کو کسی کروٹ بھی چین آ جائے۔ یہ ایسی بات ہے کہ دنیا کے نزدیک مسلّم اور عقلاً ایسی ثابت ہے جیسے آفتاب نیمروز کیونکہ دنیا بھر خدا کے وجود اور خدائی کا قائل اور تمام ماسواء سے اس کو افضل اور نسب کا مرجع اور مالک اور محبوب اور سب ہی کچھ مانتے ہیں پھر جب ذرا ذرا سے محبوبوں کے ساتھ وہ برتاؤ ہے جو اوپر عرض کیا گیا تو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا ہونا چاہئے۔ کس قدر کھلی ہوئی بات ہے مگر قدرت خدا ہے۔

ہماری انتہائی غفلت

کہ ایک چیز دنیا میں ایسی بھی ہے جو ایسی بدیہی اور کھلی ہوئی بات پر پردہ ڈال دیتی ہے اس کا نام غفلت ہے جو ہم لوگوں کی گھٹیوں میں داخل ہو گئی ہے کہ کسی کام میں بھی ہی خیال نہیں ہوتا کہ یہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے یا نہیں اور جب غلطی ہو جاوے تو اس کے تدارک کی فکر نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

اے کہ صبرت نیست از فرزند وزن صبر چوں داری زرب ذوالمنن
اے کہ صبر نیست از دنیائے دوں صبر چوں داری زنعم الماہدوں

(اے شخص تجھ کو بیوی بچوں سے صبر نہیں ہے رب ذوالمنن سے تجھ کو کیسے صبر آ گیا جب تجھ کو دنیائے حقیر سے صبر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ سے تجھ کو کیسے صبر آ گیا) ہم لوگوں کی حالت یہ ہے کہ دنیا کی تو ذرا ذرا سی بات کی فکر ہے مگر حق تعالیٰ کے احکام کی مطلق پرواہ نہیں سر سے پیر تک دل میں دنیا گھسی ہوئی ہے اور اس پر اعتماد کر کے ہر شخص کو بے فکری ہے۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ ہو تو وہ اسی پر بے فکر ہے کہ انٹرینس پاس ہوں۔ تحصیلداری کا امتحان دیا ہے۔ نماز روزہ کا چاہے کبھی خیال بھی نہ آیا ہو بلکہ ضروریات دین سے بھی نابلد ہیں تو کیا ہے۔ اللہ میاں ناراض ہوں گے تو کیا ہو گا رزق میرا میرے ہاتھ میں ہے۔ عورتوں کو یہ خوف تو ہوتا ہے کہ میاں ناراض ہو جائے گا یا دوسرا بیاہ کر لے گا اگر چہ اس سے ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے لیکن کم از کم جی تو برا ہوتا ہے مگر اللہ میاں کی ناراضی کا کسی کو بھی خیال نہیں۔ کیا مرد کیا عورت کیا بڈھے کیا جوان کیا خاص کیا عام الا ماشاء اللہ۔

خوف خداوندی کی ضرورت

یاد رکھو کہ خوف جس وقت بھی پیدا ہوتا ہے کسی نفع کے فوت ہونے کا یا کسی ضرر کے واقع ہونے کا ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر کوئی شخص کسی تجارت میں روپیہ لگاتے ڈرتا ہے تو کسی وجہ سے کہ خدا

جانے نفع ہوگا یا نہیں یا اصل رقم بھی محفوظ رہے گی یا نہیں یا تلف ہوجاوے گی نوکر اگر آقا سے ڈرتا ہے تو اسی وجہ سے کہ کام اگر اچھا نہ ہوگا تو ترقی نہ دے گا یا کوئی قصور نہ دے گا یا کوئی قصور کرے گا تو جرمانہ کردے گا یا برخاست کرے گا یا خوف فوت نفع یا وقوع ضرر ہی کا تو ہے کہ عورت خاوند سے ڈرتی ہے۔ تو اس وجہ سے کہ یا تو اس کا التفات کم ہوجائے گا۔ یہ خوف فوت نفع کا ہے یا مار پیٹ کرے گا یہ خوف وقوع ضرر کا ہے اور یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ خوف میں شدت اور خفت اسی قدر ہوتی ہے جتنی مخوف عنہ کے اختیارات میں شدت ہوتی ہے۔ دیکھو جتنا خوف بادشاہ کا ہوتا ہے اتنا سپاہی کا نہیں ہوسکتا۔ دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا بادشاہ اور سپاہی کے اختیارات میں فرق ہے۔ اب مسلمان غور کریں کہ مخلوق کے ساتھ میں محض برائے نام نفع وضرر ہے جب ان سے اتنا خوف ہوتا ہے تو جس کے ہاتھ میں حقیقتاً نفع ضرر ہے اس سے کتنا خوف ہونا چاہئے۔

ع۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک (عالم پاک کو خاک سے کیا نسبت ہے) جب ایک مخلوق کی ناراضی کا یہ نتیجہ ہوا ہے جس کام سے وہ ناراض ہوتا ہے اس کے پاس جاتے ہوئے جی ڈرتا ہے تو مالک حقیقی اور قادر مطلق کی ناراضی سے خوف کا کیا نتیجہ ہونا چاہئے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دل میں کوئی کام کرتے وقت یہ خوف نہ ہو کہ اللہ میاں ناراض ہوجائیں گے لیکن ہماری حالت ایسی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں نے دنیا ہی کے نفع اور ضرر کو نفع اور ضرر سمجھ رکھا ہے۔ اور غفلت نے حقیقی نفع اور ضرر پر پردہ ڈال دیا ہے حالانکہ دنیا کا نفع کیا نفع ہے۔ ابھی ہے ابھی ندارد اگر کوئی لکھ پتی اور بادشاہ بھی ہے اور ہر طرح کا اقتدار رکھتا ہے تب بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ اسے کبھی ناگوار بات پیش آئے۔ غرض کسی کا عیش بھی دنیا میں عیش خالص نہیں پھر دنیا کا نفع کیا نفع ہے حقیقت میں نفع آخرت کا ہی نفع ہے جو خالص دائمی ہے اور میں کہتا ہوں کہ دنیا کا نفع جو بغیر دین کے ہو وہ کچھ بھی نہیں کیونکہ اسکو تمام منافع کی جو جڑ اور غایت ہے یعنی اطمینان قلب وہ ہرگز حاصل نہیں ہوتی اور مطیع اور طالب خدا کے ساتھ ہی تکلف میں ہو مگر اطمینان قلب اس کو ہر حال میں رہتا ہے کیونکہ اس کا اطمینان عیش میں بھی اس چیز پر نہیں تھا جس کو اہل دنیا کے نزدیک عیش سمجھا جاتا ہے بلکہ عطاء خداوندی پر اعتماد تھا اس وجہ سے خوش تھا کہ خداوند تعالیٰ نے ایک چیز مجھ کو دی ہے اور عطا خداوندی مصیبت کی حالت میں بھی بجنسہ موجود ہے صرف اس کا متعلق بدل گیا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک بڑا ذی شان میزبان ایک وقت میں کسی مہمان کے سامنے پلاؤ رکھے ایک میٹھے چاول تو چونکہ دونوں کھانے اس کو محبت اور عزت کے ساتھ عطا ہوئے ہیں برابر ہیں یہ بھی ضیافت ہے اور وہ بھی ضیافت ہے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایک وقت پلاؤ دینے کے بعد جو

دوسرے وقت پلاؤ نہیں دیا اس کی اہانت ہوئی بلکہ اس کو زیادہ اچھا سمجھتے ہیں اور مہمان بھی اس کو زیادہ پسند کرتا ہے اور بہت زیادہ عزت کی بات سمجھتا ہے کہ میزبان رنگا رنگ کے کھانے کھلائے۔ ایک وقت کچھ دوسرے وقت کچھ، ہاں اگر کسی قرینہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ پلاؤ کی جگہ میٹھے چاول اس واسطے دیئے گئے ہیں کہ میزبان کشیدہ خاطر ہو گیا ہے مہمان کو پلاؤ کا اہل نہیں سمجھتا تو اس وقت ڈوب مرنے کی بات ہے میٹھے چاول تو کیا اگر مشک و عنبر بھی سامنے رکھا جاوے تو زہر ہے۔

مطیع کا حال

یہی حالت مطیع اور طالب خدا کی ہے کہ مصیبت اور راحت دونوں اس کے نزدیک عطیہ الٰہی ہیں دونوں میں کچھ فرق بھی نہیں کرتا، جیسا راحت میں خوش ہے اور اطمینان قلب رکھتا ہے ویسا ہی مصیبت میں خوش ہے اور اطمینان رکھتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ ع ہر چہ از دوست میر سد نیکوست (جو کچھ محبوب کی جانب سے پہنچتا ہے وہ اچھا ہے) بعض اہل اللہ پر عین تکلیف کے وقت ایسا خوشی کا غلبہ ہوا کہ بے اختیار ہنس پڑے ایسے لوگوں کو تو نزع کے وقت بھی جس کو جانکنی کہتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں ہوتی، اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے یہ نئی بات سی معلوم ہوگی لیکن بالکل صحیح ہے اور یاد رکھنے کی بات ہے اس کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھے کہ صلحاء کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی یا ان کا حس باطل ہو جاتا ہے نہیں ان پر مصیبتیں بھی آتی ہیں اور حس ان کا باطل نہیں ہوتا بلکہ اور تیز ہو جاتا ہے اور ان کو تکلیف بھی ہوتی ہے مگر یاد رکھو کہ صرف جسم کو تکلیف ہوتی ہے روح کو نہیں ہوتی اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچے کو ماں فرط محبت سے دبائے جس سے بچہ رو دیتا ہے اس رونے کی وجہ ناواقفیت اور کم عقلی ہے۔ ورنہ یہ وہ نعمت ہے کہ دوسرا دیکھنے والا جس کو یہ نعمت اب نصیب نہیں ہے یہ کہتا ہے کہ بچہ کیسا خوش نصیب ہے اور وہ بچپن بھی کیسی نعمت ہے۔ جس میں مادر مہربان کی گود نصیب ہوتی ہے جو اس زمانہ کے بعد کبھی نصیب نہ ہوگی یا جیسے کسی کو اس کا محبوب پیچھے سے آ کر زور سے دبائے تو اول تو اس کو تکلیف ہوگی اور جب پہچان لے گا کہ دبانے والا میرا محبوب ہے تو ہرگز نہ چاہے گا کہ وہ اس سے الگ ہو بلکہ چاہے گا کہ گھنٹوں تک دبائے رہے دیکھئے یہ وہی دبانا ہے جو پہچاننے سے پہلے موجب تکلیف تھا اور پہچان لینے کے بعد موجب راحت ہے یاد رکھو کہ تکلیف اسی وقت تک ہوتی ہے کہ جب تک اسے یہ خبر نہیں کہ کون تکلیف پہنچاتا ہے اور جب معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ باغ باغ ہو جاتا ہے اس وقت اس کو گویا یہ حالت ہوئی ہے۔

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے   کہاں نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اس سے کوئی صاحب تعجب نہ کریں کیونکہ جسم کی تکلیف کو روح کی تکلیف لازم نہیں دیکھئے اس

کی بہت ہی موٹی مثال یہ ہے کہ ایک شخص مریض ہے طبیب اس کو نہایت ہی کڑوی دوا ہتلاتا ہے اور وہ اس کو بخوشی پی لیتا ہے قوت ذائقہ کو تکلیف ہوتی ہے اور زبان ہرگز نہیں چاہتی کہ ایسی کڑوی دوا کو چکھے مگر مریض اپنے ہی ہاتھ میں لے کر اس کو پیتا ہے دیکھئے جسم کو تکلیف پہنچتی ہے لیکن باامید نفع جسم کو مجبور کر کے اس دوا کو استعمال کر لیتی ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ جسم کی تکلیف کو روح کی تکلیف لازم نہیں بس ایسے ہی اہل اللہ کی تکلیف کو سمجھ لیجئے کہ ظاہراً تکلیف ہوتی ہے لیکن روح ان کی اس وجہ سے کہ اس کو عطیہ الٰہی سمجھتی ہے بجائے تکلیف کے اس سے راحت پاتی ہے اور اس کی تخفیف نہایت اطمینان کے ساتھ ہوتی ہے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کے بدن پر زخم ہو رہے تھے جن پر مکھیاں کثرت سے لپٹی ہوئی تھیں ایک شخص کو ان پر رحم آیا اور اس نے پنکھا لے کر مکھیاں اڑانی شروع کیں بزرگ نے فرمایا کہ کون شخص ہے جو مجھ میں اور میرے محبوب میں آ کر حائل ہو گیا۔

صاحبو! ان لوگوں کو مصیبت میں بھی اس قدر لذت اور حلاوت ہوا کرتی ہے جو دوسروں کو نعمت میں بھی نہیں ہوتی یہ اور بات ہے کہ ہم کو یہ حالت حاصل نہیں اس لئے ہم اس کے قائل ہی نہیں ان کا سا تعلق حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا کر لیجئے۔ پھر دیکھئے وہی لذت اور حلاوت حاصل ہوتی ہے یا نہیں یہ کاہے سے حاصل ہوتی ہے اطاعت اور تابعداری سے مطیع کبھی پریشان نہیں ہوتا نہ مرنے سے گھبراتا ہے نہ مرض سے گو ہائے ہائے کرتا ہے ظاہراً اسے سارے آثار قریب وہی ہوتے ہیں جو غیر مطیع پر مصیبت میں ہوتے ہیں مگر بڑا فرق ہوتا ہے غیر مطیع پر مصیبت ظاہر میں بھی ہوتی ہے اور دل میں بھی اور مطیع کا ظاہر مصیبت میں ہوتا ہے مگر وہ دل میں باغ باغ ہوتا ہے دونوں کی مثال ایسی ہے کہ ایک تو وہ درخت ہے کہ گرم ہوا کے اثر سے خشک ہو گیا اور اس کی جڑ بھی ایسی زمین میں ہے جس میں نمی کا نام نہیں شاخوں میں کچھ نمی تھی وہ بھی ہوا کے اثر سے جاتی رہی اب سوکھی لکڑی اور ایندھن کے سوا کچھ نہیں رہا اور ایک وہ درخت ہے جس کی شاخیں ہری ہیں اور نہایت شاداب زمین میں جڑ پکڑے ہوئے ہے گرم ہوا ہے اس کی کچھ شاخیں مرجھائیں گئیں مگر جڑ اپنے حل پر ہے دو چار شاخیں مرجھائیں اور بجائے ان کے دس شاخیں ہری بھری نکل آئیں تو ان دونوں میں کتنا فرق ہے یہی حال مطیع اور غیر مطیع کا ہے تکلیف میں غیر مطیع کا تو ظاہر و باطن سب مرجھاتا ہے اور مطیع کا ظاہر مرجھاتا ہے باطن نہیں مرجھاتا وہ بحالہ شاداب رہتا ہے جس سے ظاہر بھی جلد شاداب نظر آنے لگتا ہے طاعت سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور بلا طاعت ہمیشہ پریشانی رہتی ہے خواہ لکھ پتی کیوں نہ ہو لیکن جب تک دیندار نہ ہو کبھی پریشانی سے خالی نہیں ہو سکتا پریشانی کے معنی بیمار ہونا یا لٹ جانا یا بربادی ہونا ہی نہیں ہے کبھی کوئی صاحب کہیں کہ مالدار آدمی کو

پریشانی کہاں ہوتی ہے مال تو ایسی چیز ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہر کام ہو سکتا ہے۔ جس کے پاس ایسی چیز موجود ہے اس کو پریشانی سے کیا واسطہ جس چیز کی اس کو ضرورت ہو فوراً مل جاتی ہے۔

ذاکر دین دار کو کبھی پریشانی نہیں ہوتی

صاحبو! پریشانی کے معنی دل کو یکسو نہ ہونا ہے یہ بات سوائے ذکر اور دیندار کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی اگرچہ مالدار آدمی ساری حاجتیں پوری کر سکتا ہے لیکن دل میں یکسوئی کیسے پیدا کر سکتا ہے مال ساری حاجتیں پوری کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن یکسوئی کے برباد کرنے کا ذریعہ ہے اس واسطے حب مال شغل قلب ہی کا تو نام ہے اور شغل و فراغ ضدین میں دونوں کا جمع ہونا کیسے ممکن ہے۔ علاوہ ازیں مالداری کا لفظ خوش کن ہے اور دیکھنے میں ذرا سا لفظ ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ کتنے دھندوں کا مجموعہ ہے کسب مال اور حفاظت مال یہ دونوں بڑے بکھیڑے کے کام ہیں مانا کہ مال سے سارے کام دنیا کے پورے ہو سکتے ہیں لیکن مال ہی کمانے اور حفاظت کے لئے کتنے اہتمام اور مصروفی کی ضرورت ہے پھر یکسوئی کیسے ممکن۔ بس اگر یکسوئی ہو سکتی ہے تو صرف ذکر اللہ سے ہو سکتی ہے ذکر اللہ میں بالخاصہ اثر ہے کہ اس سے قلب کو اطمینان ہوتا ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (یاد رکھو اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے) ظرف کی تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے مطلب یہ ہوا کہ اطمینان قلب کا ذریعہ صرف ذکر اللہ ہی ہے میں بہت موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ دلیل کو بہت گنجائش ہے مگر بداہت کے سامنے دلیل کوئی چیز نہیں چند افراد متمولین کے اور چند افراد اہل اللہ کے لے کر ان کے حالات ملائیے صرف ظاہر ہو جائے گا کہ اطمینان کس کو حاصل تھا متمولین میں صرف مالداروں کو نہ لیجئے بلکہ ان کو جو مالداری کے ساتھ ساتھ صاحب اختیار بھی تھے یعنی بادشاہوں کو لیجئے حکومت ایسی چیز ہے کہ وہ کام کر سکتی ہے جو مال بھی نہیں کر سکتا۔

کسی درویش نے فقیری چھوڑ کر سلطنت اختیار نہیں کی

ایک طرف دو چار بادشاہوں کے حالات رکھئے اور ایک طرف چند اولیاء اللہ کے (میں اس بیان کو طول نہیں دیتا کتابیں بھری پڑی ہیں) دونوں فریق کے قصے پڑھئے خود آپ کا قلب بول اٹھے گا کہ میرا کہنا کہاں تک سچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسا ہوا ہے کہ سلطنت چھوڑ کر کسی نے فقیری اختیار کی ہے لیکن ایسی نظیر ایک بھی نہ ملے گی کہ فقیری چھوڑ کر کسی نے سلطنت اختیار کی ہو۔ کوئی بات تو ہو جو فقیری کو سلطنت پر ترجیح دیتی ہے (فقیری سے مراد میری واقعی فقیری ہے بھیک مانگنا نہیں بھیک منگے تو سلطنت پر کیا پیسہ پیسہ پر جان دیتے ہیں) دنیا کا نفع چاہے کیسا ہی بڑا معلوم

ہوتا ہو لیکن جب آخرت کے نفع کے ساتھ مقابلہ کیا جاوے بشرطیکہ نظر بھی صحیح ہو تو ہیچ ثابت ہوگا۔ اسی وجہ سے اس کو دیکھ کر بعض بادشاہوں نے سلطنتیں چھوڑ دیں ہیں ہم لوگوں کو صرف دنیا کی نفع تک نظر محدود ہے اور اس طرح اٹھتی نہیں اس وجہ سے اسی کو منتہائے ترقی اور غایت عروج سمجھ رکھا ہے اور جس کی نظر اس طرف اٹھ گئی وہ اسی کا ہو گیا۔ بتاؤ بھائی مسلمانو یہ نفع ہے یا وہ اور دنیا کا نفع تو برائے نام ہی نفع ہے اگر کسی کو تمام دنیا بھی حاصل ہو جاوے تب بھی کلفت سے خالی نہیں ایک طرح سے چین ہے تو دس طرح سے بے چینی ہے اکثر غرباء امراء کو دیکھ کر حسرت کرتے ہیں کہ کاش ہم بھی ان جیسے ہوتے تو بڑے آرام سے گزرتی مگر نہیں غرباء کو از راہ نصیحت کہتا ہوں کہ جب ایسا موقع ہو تو امراء کے دو چار افراد کو منتخب کر کے ان کے نجی حالات معلوم کیجئے صرف ان کا ظاہری ٹھاٹ اور ساز و سامان دیکھ کر رال نہ ٹپکائے ان کے حالات اور تکلیف کے حالات خفیہ طور سے کسی طرح معلوم کیجئے ان شاء اللہ اگر آپ کو ایک تکلیف ہے تو ان کو دس تکلیفیں ثابت ہوں گی اور آپ کی تکلیف چھوٹی ہے تو ان کی تکلیفیں بڑی بڑی ہوں گی غرض کماً و کیفاً دونوں طرح ان کی تکلیفیں آپ کی تکلیفوں سے زیادہ ہوں گی جب چاہے تجربہ کر لیجئے میں اس قاعدہ کے کلیہ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا ممکن ہے کہ کوئی فرد امراء کا ایسا بھی ہو کہ اس کو تکلیف نہ ہو مگر النادر کالمعدوم کوئی فرد ایسا نکل آنا قادح مقصود نہیں علاوہ ازیں اگر ایسا بھی کوئی فرد نکلے تو اس کا عیش بھی تو فانی ضرور ہوگا اور جس عیش کا غرباء صابرین سے وعدہ ہے وہ ان شاء اللہ باقی ہے اس کے سامنے عیش فانی کالعدم ہے، غرض یاد رکھو کہ دنیا کا نفع کوئی نفع نہیں ہے اور نہ نقصان کوئی نقصان ہے۔ ایک ہوا ہے کہ ٹھنڈی چل گئی تو طبیعتیں خوش ہو گئیں مگر اس کے پیچھے گرم ہوا بھی ہے، یا گرم چل گئی تو طبیعتیں آزردہ ہو گئیں مگر اس کے پیچھے ٹھنڈی ہوا بھی آتی ہے اس پر کوئی شکر کرے یا کفر

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت تلخی و خوشی وزشت و زیبا بگذشت

مگر یہ سب کچھ (زندگی کا زمانہ صحرا کی کی طرح گزر گیا خوشی و غمی اچھائی و برائی گزر گئی) مگر یہ سب کچھ جب ہے کہ جب ہم نظر کو صحیح کر لیں اور عقل سے کام لیں کیا کوئی شخص کسی عقلمند کا کوئی ایسا مقولہ دکھا سکتا ہے جس میں اس نے یہ کہا ہو کہ دنیا کو باقی سمجھو۔ دین اور مذہب سے قطع نظر کر کے ان لوگوں کے اقوال دیکھئے جو حشر و نشر کے قائل بھی نہ تھے ان کے اقوال میں بھی یہی ملے گا کہ دنیا چند روزہ ہے۔

حال دنیا را بپرسیدم من از فرزانہ گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ

(ایک عقلمند سے میں نے دنیا کا حال دریافت کیا اس نے کہا یا تو خواب ہے یا ہوا یا افسانہ ہے) اور

باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست گفت یا غولیست یا دیویست یا دیوانہ

(پھر میں نے کہا اس شخص کا حال بیان کرو جس نے اس میں دل لگایا جواب دیا کہ وہ بھتنا ہے یا شیطان یا دیوانہ ہے)

بلائے عام

مگر ایک بلاء عام ہے کہ عقل اور نقل دونوں سے قطع نظر کر کے جو اٹھتا ہے وہ دنیا ہی کا نام لے کر اٹھتا ہے اگر مقصود اہم ہے تو دنیا ہے اور غایت اعظم ہے تو دنیا ہے جب یہی منتہائے نظر ہے تو اسی کے نفع اور نقصان پر تمام کاموں کی بناء ہوگی۔ اسی کے نفع کی رجاء ہوگی اور اسی کے ضرر کا خوف ہوگا۔ پھر یہ خیال کسی کام نہ آ دے گا کہ ایسا نہ ہو کہ اللہ میاں ناراض ہو جائیں۔

صاحبو! یہ کس قدر خطرناک حالت ہے۔ دنیا کے دل میں بس جانے ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ اگر اس کے ظاہری اور خیالی اسباب جمع ہو گئے تو ان پر تکیہ اور بھروسہ ہو جاتا ہے انٹرنس پاس کر کے اور تحصیلداری کا امتحان دے کر بے فکر ہو جاتے ہیں کہ اب ہم کو کیا پرواہ ہے ہماری روزی ہمارے ہاتھ میں آ گئی اب اگر معصیت بھی ہوگی تو کوئی کیا کرے گا۔ روزی بند ہونے سے رہی ہم کو ڈگری حاصل ہے۔ حق تعالیٰ قیامت کے دن اس کا جواب دینے کے لئے فرمائیں گے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (آج کس کا ملک ہے) اس روز اسباب کا پردہ اٹھا دیا جائے گا اور ظاہری نفع نقصان بھی کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگا۔ معتمدین علی الاسباب اسباب پر بھروسہ کرنے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کس غلطی میں تھے۔ اور وہ اسباب کچھ کار آمد ہیں یا نہیں مگر اس وقت اس غلطی کا حل ہونا کسی کام میں نہ آ دے گا ہوش کی بات تو یہ ہے دار العمل میں آدمی حقیقت شناس ہو جاوے اور مغالطوں میں بچے اور جب دار الجزاء سامنے آ گیا تو اب آنکھ کا کھلنا کیا کام دے گا۔

اسباب پردہ ہیں

خوب سمجھ لیجئے کہ اسباب پردہ ہیں ان کے پیچھے فاعل کوئی اور ہے اگر آپ کسی کو قلم سے لکھتے ہوئے دیکھیں اور وہ یہ لکھ رہا ہو کہ میں نے ایک قتل کیا ہے تو آپ قلم کو جرم میں نہیں پکڑیں گے بلکہ جس ہاتھ میں قلم ہے اس کو بھی نہیں پکڑیں گے بلکہ قلم اور ہاتھ والے کو پکڑیں گے اور قلم اور ہاتھ کے اقرار کو اسی کا اقرار سمجھیں گے۔ حالانکہ آپ کس طرح ثابت نہیں کر سکتے کہ بدون قلم اور ہاتھ کے یہ اقرار ہو گیا جب ایک ایسے شخص کو کہ جو قلم اور ہاتھ کے واسطہ کا محتاج ہے اور ان کے بغیر وہ مجبور بھی ہے کہ بدون ان کے واسطہ کے وہ یہ اقرار نہیں کر سکتا تھا آپ فاعل کہتے ہیں تو اس ذات کو جو کہ آلات کا محتاج نہیں اور بدون آلات کے بھی سب کچھ کر سکتا ہے فاعل کیوں نہیں کہتے اور اس کے ان آلات کو جو اس محتاج شخص کے آلات سے گرے ہوئے درجہ

میں ہیں کیونکہ وہ صدور آثار میں محتاج الیہ تھے اور یہ صدور آثار میں محتاج الیہ نہیں کیسے فاعل قرار دیتے ہیں۔اور فعل کو ان کی طرف مستقلاً کس طرح منسوب کر دیتے ہیں یہ کیسی صریح غلطی ہے۔ ہمارے یہ برتاؤ صاف بتلا رہے ہیں کہ ہم اسباب کو فاعل قرار دیتے ہیں ورنہ انٹرینس پاس کرنے اور تحصیلداری کا امتحان دینے پر کیسے تکیہ ہو جاتا ہے اور رزق کی طرف سے ایسا اطمینان ہو جاتا ہے جس سے معصیت کی جرأت ہونے لگتی ہے اگر ان کو سبب کے درجہ میں بھی رکھتے تو سبب الاسباب کی طرف نظر نہ اٹھتی اور اس کی عظمت ذہن سے نہ جاتی اور گو ان اسباب سے فی الجملہ اطمینان ہوتا لیکن معصیت کی تو جرأت نہ ہوتی بلکہ یہ بھی امید ہوتی کہ یہ اسباب کسی وقت موجب زیادت معرفت بن جاتے کیونکہ الانسان عبد الاحسان (انسان احسان کا بندہ ہے) اگر ان اسباب کو انعام الٰہی سمجھتے تو شکر الٰہی کے لئے گردن جھک جاتی پھر شکر کی دولت حاصل ہوتی اور معصیت سے خوف بھی قائم رہتا اور دن بدن قرب بڑھتا جاتا۔

اہل اللہ کس بناء پر نافرمانی نہیں کر سکتے

اور معصیت سے ایسا ڈرتے کہ کسی دنیاوی نفع یا نقصان کا خیال اطاعت میں مزاحم نہ ہو سکتا اور یہ حالت ہوتی۔

بہر چہ زدوست واماني چہ کفراں حرف و چہ ایماں — بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت ال نقش و چہ زیبا

(یعنی جس چیز کی وجہ سے محبوب سے دوری ہو وہ قابل ترک ہے خواہ وہ کچھ ہی ہو) یہ دنیا کے نفع ونقصان سب اسی وقت تک سوچتے ہیں۔جب تک ذکر اللہ قلب میں نہیں آیا ورنہ یہ حالت ہو جاتی ہے۔

ہرچہ جز ذکر خدائے احسن است — گر شکر خواست آنجاں کدن است

(خدا کے ذکر کے سوا ہر چیز خواہ شکر ہی کیوں نہ ہو موت کے برابر ہے) جب نظر خدا تعالیٰ کی طرف ہو تو آدمی حق تعالیٰ سے کسی حال میں بعد کو گوارا نہیں کر سکتا اس پر چاہے کتنی ہی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں اور اس سے پوچھا جاوے کہ یہ قبول ہیں یا حق تعالیٰ سے بعد تو وہ یہی کہے گا۔

از فراق تلخ میگوئی سخن — ہرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

از فراق تلخ میگوئی سخن — ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

از فراق تلخ میگوئی سخن — ہر چہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو مگر یہ نہ کرو) ہم لوگوں کو قرب کی حلاوت معلوم نہیں اور اس کے مقابل بعد کی بھی تلخی معلوم نہیں ورنہ جس کو ان کا احساس ہو گیا ہو اس کی بوٹیاں بھی کاٹ ڈالی جائیں تب بھی وہ بعد کا نام نہیں لے سکتا جدائی کا تو لفظ ہی برا ہے بعد عن اللہ (اللہ تعالیٰ سے دوری) اللہ تو وہ چیز ہے کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ اس سے خدا بچاوے۔

صاحبو! ذرا سے خیالی محبوب سے بھی کوئی جدائی نہیں چاہتا۔غرض یہ تو لفظ ہی ایسا ہے کہ ہر خاص وعام سے پوچھ لیجئے کہ جدائی کیسی چیز ہے اس کو کوئی بھی بھلائی سے یاد نہ کرے گا۔آپ جانتے ہیں کہ جدائی کاہے سے ہوتی ہے جدائی نافرمانی کی بدولت ہوتی ہے پھر کیا ممکن ہے کہ جس کے دل پر چوٹ لگی ہوئی ہو وہ جدائی کو یعنی نافرمانی کو اختیار کرلے اس کی تو یہ حالت ہوتی ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود گر زباغ دل خلالے کم بود

(سالک کے دل پر ہزاروں غم کا سامنا ہوتا ہے اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے) نافرمانی کا وہ فرد جس کو یقیناً عصیان کہہ سکیں صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو وہ بہت دور ہے جس کام کی نسبت یہ شبہ بھی ہو کہ یہ موجب ناخوشی ہوسکتا ہے جو طالب خدا ہے اس کے پاس نہیں بھٹک سکتا۔اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ طالب خدا اور مقربین سے گناہ ہوتا ہی نہیں۔گناہ سب سے ہوتا ہے سوا انبیاء علیہم السلام کے کوئی بشر نہیں مگر طالب خدا اور غیر طالب خدا میں یہ فرق ہے کہ طالب خدا کو گناہ ہوتے ہی متنبہ ہو جاتا ہے اور بلا توبہ کئے اور معافی چاہے چین ہی نہیں آتا۔بعض وقت گناہ کی معافی کے لئے وہ اتنی مصیبتیں گوارا کر لیتا ہے کہ وہ اس ایک گناہ کا تو کیا ایسے ایسے سینکڑوں گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کا عشق الٰہی

حضرت ماعز بن مالکؓ سے زنا ہو گیا تھا تو بمقتضائے بشریت ہو گیا اس میں تو وہ اور سب گنہگار برابر ہیں لیکن فوراً متنبہ ہو گیا اس متنبہ کو سنئے ذرا ہمیں بھی تو کوئی گنہگاران کے برابر کر کے دکھلاوے لیکن کیا منہ ہے کسی کا جو اس میں برابری کر سکے یہ ان ہی کی آتش ایمانی تھی کہ رک نہ سکی جیسے بارود ہوتی ہے کہ پہاڑ کے اندر بھی رک نہیں سکتی ذرا سی بارود سے سرنگ اڑائی جاتی ہے جو وزن میں کچھ ماشوں سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ہزاروں من کے پتھروں کو ایسا اڑا دیتی ہے جیسے روئی کے گالے اڑتے ہیں۔حضرت ماعز رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اپنے منہ سے اپنی خطا کا اقرار کیا ایسے حیادار آدمی سے ایسے گناہ کا اظہار ہی مشکل ہے مگر وہاں سب مشکلیں آسان تھیں وہاں تو عشق الٰہی تھا۔

مرحبا اے عشق خود سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما

(مرحبا اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں تجھ سے تمام امراض کا علاج ہو جاتا ہے نخوت وناموس کا دفعیہ ہوتا ہے گویا تو ہمارے لئے افلاطون وجالینوس ہے)

سب جانتے ہیں کہ جہاں عشق ہے وہاں ناموس کا کیا پتہ خود اپنے منہ سے اقرار کیا اور ایک اقرار نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ سن کر چہرہ مبارک پھیر لیا انہوں نے دوبارہ پھر اقرار کیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرہ مبارک پھیر لیا سہ بار پھر اقرار کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بمقتضائے شان رحمۃ للعالمین ان کو رجم سے بچانا چاہا تھا لیکن کیا کیجئے کہ عشق ان کی جان پر کھیل چکا تھا کسی طرح تسلی نہ ہوئی سوائے اس کے رجم کا حکم کیا جاوے تین دفعہ اقرار کیا پھر چوتھی دفعہ اقرار کیا اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجبور ہوئے اور رجم کا حکم دے دیا ان کے دل میں اس بات کا دوسرا تک نہ گزرا کہ توبہ کر کے خاموش ہو جاتے توبہ تو وہ چیز ہے کہ شرک تک کو مٹا دیتی ہے زنا تو کس درجہ میں کیا یہ مسئلہ ان کو معلوم نہ تھا کہ توبہ سے ہر گناہ بڑے سے بڑا بھی معاف ہو جاتا ہے ہم کو تو مسئلہ روایۃً معلوم ہے صحابہ پر تو خود گزرا ہوا تھا جو واقعہ اپنے اوپر گزر جاتا ہے اس کا حکم آدمی کو خوب یاد رہتا ہے بخلاف سنے سنائے اور کتاب میں پڑھے ہوئے مسئلہ کے حضرات صحابہ پہلے اسلام سے علیحدہ تھے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اسلام سے مشرف ہوئے سب سے پہلا جو ان کو مسئلہ معلوم ہوا وہ یہی تھا کہ توبہ سے کفر و شرک معاف ہو گیا پھر یہ کہے کہ کہاں گنجائش ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ توبہ سے گناہ معاف ہو سکتا ہے یہ ضرور معلوم تھا لیکن غلبہ خداوندی نے اس کو بھلا دیا جیسے کوئی شخص شیر کے شکار کو جائے اور بندوق اور کارتوس اور سب کچھ سامان اس کے پاس ہو لیکن شیر جس وقت سامنے آتا ہے تو اس کی ہیبت تمام دماغی خیالات کو مٹا دیتی ہے اور یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کی مدافعت کے لئے کیا آلات میرے پاس موجود ہیں میں بے ضرورت کلام کو طول دینا نہیں چاہتا بس اس مثال سے اس اشکال کا جواب بخوبی موجود ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے توبہ کیوں نہ کر لی اور رجم کی بلا کیوں سر لی خوف خدا تو وہ چیز ہے کہ تمام ضابطول کو بھلا دیتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کو رجم کیا گیا اور اس بندہ خدا نے ایک گناہ کے عوض جان دے دی اب اس کام میں بھی تو وہ لوگ ان کی برابری کریں جو ان کی برابری گناہ میں کرتے ہیں جان تو بڑی چیز ہے دو چار پیسہ جرمانہ ہی کے گناہ پر دے دیں تو ہم جانیں یہ فرق ہے طالب خدا اور غیر طالب خدا کے گناہ میں حق تعالیٰ نے نفس و شیطان سب کے ساتھ لگایا ہے کبھی اس کا داؤ نیک بندوں پر بھی چل جاتا ہے لیکن طالب کے اندر نفس و شیطان کے ساتھ ذکر رحمٰن بھی لگا ہوا ہے گناہ سرزد ہوتے ہی وہ بھی حرکت میں آ جاتا ہے اور بدون شیطانی اثر کے مٹائے چین نہیں لیتا۔

حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ کو خدا ترس ہونے کی بشارت

چنانچہ یہ مضمون بعینہ ایک آیت ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّہُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ

الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ. (یقیناً جولوگ خداترس ہیں جب ان کوکوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) جولوگ اہل علم ہیں اور علم معانی سے مس رکھتے ہیں۔ وہ اس آیت کے الفاظ میں غور فرمائیں کہ اذا اور ان میں فرق یہ ہے کہ اذا شرط یقینی پر آتا ہے اور ان شرط مشکوک پر ثابت ہوا کہ مس شیطان متقین کے لئے بھی یقینی الوقوع ہے ایک تو یہ اور دوسرے فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ. (سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کو خیال فرمایئے وہاں تو مس فرمایا اور نتیجہ میں فرمایا مبصرون معنی یہ ہوئے کہ متقین کی شان یہ ہے کہ جب ان پر شیطان کا ذرا بھی اثر ہو جائے تو فوراً ہی متنبہ ہو جاتے ہیں غیر متقین اور متقین میں یہ فرق ہو گیا کہ مس شیطان تو دونوں موجود ہے مگر متقین میں تنبہ بھی ہے اور غیر متقین میں تنبہ نہیں بلکہ مس کا لفظ بتلاتا ہے کہ متقین شیطان کے ذرا سے اثر سے بھی کامل طور پر متنبہ ہو جاتے ہیں۔ مس چھونے کو کہتے ہیں اور غیر متقین ہم جیسے چھونے سے تو کیا متنبہ ہوں گے صریح گناہ کرنے سے بھی ڈکار نہیں لیتے غرض اس آیت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نفس وشیطان کے داؤں میں متقین کا آجانا بھی تعجب کی بات نہیں اسی بناء پر حضرت ماعز بن مالک سے گناہ ہو گیا اس سے ان کی شان میں کوئی لازم نہیں آئی بلکہ اللذین اتقوا (جولوگ خداترس ہیں) کی بشارت ان کے واسطے ثابت ہے کیونکہ مس شیطان کے ساتھ ان میں فَاِذَاھُمْ مُّبْصِرُوْنَ (سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں) کا وجود بھی ہوا اور یہی شان ہے متقین کی اور ایسا تنبہ ہوا کہ گناہ کی توبہ میں بدون جان دیئے چین ان کو نہ آیا حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما اٹھے کہ ماعز نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ستر گناہ گاروں پر ڈال دی جائے تو سب کو کافی ہو جائے دیکھئے یہ ہے متنبہ۔

طالب خدا سے معصیت ہو جانے میں حکمت

اور یہاں سے اس شبہ کا جواب معلوم ہو گیا کہ جب طالب خدا سب چیزوں سے بدتر بعد عن اللہ کو سمجھتے ہیں تو اس سے معصیت کیسے ہوتی ہے میں کہتا ہوں کہ اس سے معصیت ایسے ہو جاتی ہے جیسے حضرت ماعز رضی اللہ عنہ سے ہوئی مگر اس کی اور غیر طالب کی معصیت میں فرق بھی وہی ہے جو حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی مکافات میں اور ان کی مکافات میں ہے۔ راز اس میں یہ ہے کہ دنیا دارالابتلاء ہے اور شان رحمت اور غفاریت کا ظہور صدور معصیت پر موقوف ہے اس واسطے معصیت ہو جاتی ہے لیکن چونکہ طالب کے دل میں نور ایمان ہے تو وہ بہت جلد بے چین ہو کر توبہ کرتا ہے اور ایسی تلخی اس کی محسوس کرتا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی بھی تلخی نہیں ہو سکتی غرض رضا مندی حق بڑی دولت ہے اور ناراضی بڑی معصیت ہے اور محب کے لئے کسی کام کی نسبت یہ

معلوم ہو جاتا کہ محبوب کو یہ کام ناپسند ہے اس سے روکنے کے لئے بہت کافی ہے اور یہ لفظ وہ اثر رکھتا ہے کہ مار پیٹ اور قید اور جرمانہ اور کوئی سزا بھی وہ اثر نہیں رکھتی۔

کراہت کا مفہوم اور اس کی تحدید

اس واسطے حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ عنوان اختیار فرمایا:

ان اللّٰہ کرہ لکم قیل وقال (مسند احمد ۴: ۲۴۹)

(اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے تمہارے لئے قیل وقال کو) کراہت کا ترجمہ بھی ناپسندیدگی ہے میرے بیان سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ جن باتوں سے اس حدیث میں منع فرمایا گیا ہے وہ باتیں معمولی نہیں اگرچہ منع کا عنوان ظاہراً بہت معمولی ہے کیونکہ اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے فلاں فلاں کام کو اور یہ ظاہراً بہت معمولی سی بات ہے اور اگر کوئی طالب علم اس کا ترجمہ کرنے لگے تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیزیں مکروہ ہیں اور خشک طالبعلموں کے نزدیک مکروہ کوئی بہت بڑی چیز نہیں لیکن وہ یاد رکھے کہ عنوان کی تبدیلی سے حقیقت کی تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔ مکروہ کہو یا حرام یا ناپسند سب کی حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ چیزیں بری ہیں۔ رہی یہ بات کہ ان میں برائی کتنی ہے آیا اس درجہ کی ہے کہ جس کو طالب علم اپنی اصطلاح میں مکروہ سمجھتے ہیں یا عام لوگ پسند کہتے ہیں یا اس سے زیادہ ہے۔ بلا دلیل اس کی تحدید کر لینا یہ اپنی ایجاد ہے حقیقت تو یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حد بیان نہیں کی تو ہم حد مقرر کرنے والے کون ہوتے ہیں اور جب تحدید نہ ہوئی تو اس لفظ کو بلا تقیید چھوڑ دینے سے سلیم الفطرۃ کی نظر میں اور بھی شدت منع کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس وقت اس کی ایسی مثال ہو گی جیسے ایک شخص آٹے کی نسبت یہ کہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے اس سے سننے والا بہت ڈر جائے گا اور کبھی اس کے کھانے کا قصد نہ کرے گا بخلاف اس صورت کے کہ وہ زہر کی مقدار بھی بیان کر دے کہ مثلاً تین ماشہ زہر اس میں ملا ہوا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اس میں بہت سا آٹا ملا کر استعمال کرے جس سے زہر کا اثر مغلوب اور معدوم ہو جائے اور مقدار بیان نہ کرنے کی صورت میں کسی طرح اس کے استعمال کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی اسی طرح اگر یہاں درجہ کراہت کی تحدید بیان ہوئی ہوتی تو کسی وقت میں ان کی جرأت ہونا ممکن تھی مثلاً جیسے وہاں زہر کی مقدار معلوم ہونے سے بہت سا آٹا ملا کر استعمال کی جرأت ہو سکتی تھی اسی طرح یہاں بھی بہت سے اعمال صالحہ کے انضمام سے ایسی جرأت ہو جاتی لیکن جب درجہ کراہت کی تصریح نہیں ہے تو کسی وقت میں بھی ان پر جرأت نہیں ہو سکتی یہ اور بات ہے کہ ان ممنوعات کے سارے افراد کا یکساں حکم نہ ہونا دوسری دلیلوں سے معلوم ہو چکا ہے

لیکن اس حدیث کالفظ فی نفسہ اس وجہ سے بہت سخت ہے کہ اس میں درجہ کراہت کی تحدید نہیں ہے خوف رکھنے والے کے لئے تو یہ لفظ ایسا ہی ہے جیسا کہ حرام اور کبیرہ کہہ دینا جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا، غرض اس حدیث میں ان باتوں کو جن کا بیان آگے آتا ہے بہت شدومد کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے۔ان کی مخالفت کو معمولی نہ سمجھئے۔اب سنئے کہ وہ ممنوعات کیا ہیں۔

حکمت کے تین اصول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں ارشاد فرمائی ہیں قیل وقال کثرۃ سوال اضاعت مال گنتی میں تین باتیں ہیں جو تعداد کے لحاظ سے تو بہت ہی کم ہیں لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تین جواہر ہیں جن کی قیمت بہت زیادہ ہے یا تین گر ہیں جو حکمت کے اصول ہیں کیونکہ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان اور جوارح اور قلب کے گناہوں سے بچایا ہے یعنی ان سب کا تزکیہ فرمایا ہے اور یہ چیزیں جس قدر قیمتی ہیں ظاہر ہے اور ان میں اختلال کس قدر افسوس ناک بات ہے چنانچہ قیل وقال کثرت سوال کی نہیں ہے زبان کے گناہوں سے بچایا ہے اور اضاعت مال کی نہی سے جوارح کے گناہوں سے بچایا ہے اور ان مکروہات کے مناسب ومناشی چونکہ قلب میں ہیں اور فساد نیت کے لئے عادۃ لازم ہے فساد نیت اس لئے ان مکروہات سے نہی مستلزم ہوگی ان مناسبت سے نہی کو بھی جس کا حاصل ہے تزکیہ قلب چنانچہ ساتھ ساتھ ہر فعل کے ساتھ ان مناشی کا بھی بیان ہوگا اس طرح یہ حدیث جامع ہوگئی سب انواع تزکیہ کی اور یہی خلاصہ اور مقصود ہے میرے وعظ کا اب سنئے ان تینوں ممنوعات میں پہلی چیز قیل وقال ہے یہ ایک محاورہ کا لفظ ہے جس کے معنی بک بک کرنا ہیں ہماری اردو زبان میں بھی بولتے ہیں۔کہ قیل وقال نہ کرو یعنی بک بک نہ کرو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کے گناہوں سے ہم کو بچایا ہے جن کو ہم نے ایسا معمولی سمجھ لیا ہے کہ ہمارا کوئی طبقہ بھی الا ماشاء اللہ ان سے خالی نہیں کیا علماء کیا عوام کیا مرد کیا عورت کیا بڑے کیا چھوٹے زبان کے گناہوں میں سب ہی مبتلا ہیں حدیث کی بلاغت دیکھئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا سے لفظ میں سب گناہوں کا سدباب فرمادیا اور ایسی جگہ سے پکڑا ہے کہ اس کے بعد زبان کے گناہ کا دخل ہی نہ رہے ممکن تھا کہ آپ یوں فرمادیتے ان اللہ کرہ لکم معاصی اللسان (بلاشک اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے تمہارے لئے زبان کے گناہوں کو) اس سے بھی یہ مطلب ادا ہوجاتا ہے کہ زبان کے گناہوں سے بچو لیکن آپ نے اس کو چھوڑ کر یہ لفظ اختیار فرمایا کہ زیادہ بولنے سے بچو۔

زبان کے گناہوں سے بچنے کا طریق

اس میں معاصی لسان سے روکنے کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ زبان کے

گناہوں سے بچنے کا طریقہ قیل وقال کو ترک کرنا ہے کیونکہ جب بولے ہی گا نہیں تو زبان سے گناہ کیسے ہوں گے اگر یوں فرماتے ان اللہ کرہ لکم معاصی اللسان (یعنی اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے تمہارے لئے زبان کے گناہوں کو) تو اس میں صرف مرض کا بیان ہوتا علاج کا بیان نہ ہوتا پس یہ کس قدر بلاغت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ ایک لفظ میں مرض اور دوا دونوں بتلا دیئے۔

زبان کے گناہ

اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی زبان کے گناہوں سے بچنا چاہے تو وہ جب ہی بچ سکتا ہے کہ زیادہ بولنا چھوڑ دے اس طرح نہیں بچ سکتا کہ صرف ناجائز کلام کو چھوڑ دے اور مباحات میں توسع رکھے چنانچہ تجربہ کر لیجئے کہ ایک دن ہر قسم کی باتیں کم کیجئے حتیٰ کہ مباح باتوں سے بھی بچئے اور بے ضرورت بالکل نہ بولئے اور ایک دن مباح باتوں میں زبان کو آزادی دے دیجئے اور بڑے اہتمام کے ساتھ خیال رکھئے کہ کوئی گناہ کی بات نہ ہونے پائے میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس دن گناہ کی بات ضرور ہو جاوے گی تو عمدہ طریق زبان کے گناہوں سے بچنے کا یہی ہوا جو اس حدیث میں مذکور ہے کہ زیادہ باتوں ہی سے بچے۔

سبحان اللہ یہ حدیث کی بلاغت ہے ایسی جامعیت غیر نبی کے کلام میں نہیں ہوسکتی۔
اب ذرا اپنی حالت کو دیکھئے کہ ہم لوگوں کا رات دن مشغلہ یہی ہے قیل وقال۔ زبان کو کسی وقت بھی فرصت نہیں دیتے ہر وقت بک بک میں رہتے ہیں اگر بات کرنے کا کوئی بھی موقع نہ ہو تو مقدمات یا اخباری خبریں لے کر بیٹھتے ہیں اور یہ بھی نہ ہو تو ہنسی مذاق اور فحش گوئی شروع کر دیتے ہیں زبان کی قدر ہم لوگوں کو معلوم نہیں۔ زبان حق تعالیٰ کی اس قدر بڑی نعمت ہے کہ شاید ہی کوئی نعمت اس کی برابری کر سکے اس کی قدر اس شخص سے پوچھئے جس کے زبان نہ ہو یا ہونے کے بعد جاتی رہی ہو اگر ایسے شخص سے یوں کہا جائے کہ تجھ کو زبان اس شرط پر مل جائے گی کہ سوائے اطاعت کے کسی کام میں استعمال نہ کرے تو وہ شخص بخوشی منظور کرے گا ہم کو چونکہ یہ نعمت مفت حاصل ہے اس واسطے ذرا بھی اس کی قدر نہیں اور یہ اسی نعمت کے خصوصیات میں سے ہے کہ اس کو کتنا ہی صرف کرو ختم ہی نہیں ہوتی ختم تو کیا ہوتی سست بھی نہیں ہوتی ہاتھ پیر یا اور کسی عضو سے کام لیجئے تو کچھ عرصہ میں تھک کر رہ جائے گا لیکن زبان سے صبح وشام تک اور شام سے صبح تک کام لئے جائیں زبان کبھی نہیں تھکے گی گویا بے زوال نعمت ہے قاعدہ عقلی تو یہ ہے کہ جتنی بڑی نعمت ہو اتنا ہی بڑا اس کا شکر ہو لیکن ہم لوگوں نے یہ شکر کیا کہ جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا گیا تھا ذکر کی ضد میں استعمال کیا۔

تخلیق زبان کا مقصد

زبان ذکر اللہ کے لئے اور اپنے اظہار مافی الضمیر کے لئے عطا ہوئی تھی۔ ذکر اللہ کا تو ذکر ہی کیا اب تو زبان کو گالیوں اور ناشکریوں اور غیبتوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو ذکر اللہ کے اضداد میں کیا ٹھکانا ہے اس ناشکری کا افسوس زبان کے گناہوں کی طرف سے اس قدر جہل ہو گیا ہے کہ لوگ یہ سن کر تعجب کرتے ہیں کہ زبان کے بھی گناہ ہیں اور بطور تمسخر کہتے ہیں کہ اگر گم صم ہونے کی ضرورت ہے تو خدا نے زبان ہی کیوں دی۔

صاحبو! میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں وہ یہ کہ جیسے زبان مافی الضمیر کے اظہار کا آلہ ہے ایسے ہی اظہار مافی الضمیر کے لئے ایک آلہ آپ کے ہاتھوں میں اپنا بنایا ہوا بھی ہے جس کا نام تار ہے جس سے آپ ہر قسم کی بات کر سکتے ہیں اور اس میں بھی یہ صفت ہے کہ صبح سے شام تک استعمال کرنے سے بند نہیں ہوتا اب میں اس شخص سے پوچھتا ہوں جو تار گھر میں بیٹھا ہوا ہے جس کے صرف انگلی کے اشارے سے تار کام کرتا ہے کیا اس کو جائز ہے کہ صبح سے شام تک جو چاہے بکتا رہے حالانکہ بک بک کرنے کا آلہ اس سے بھی سلب نہیں کیا گیا کیونکہ اس کے قابو میں ہے اور تار کی مشین سامنے کام دینے کے لئے تیار ہے لیکن اس کی ہر ہر بات کی نگرانی ہوتی ہے ظاہر میں تو وہ صرف انگلی کا اشارہ کر رہا ہے مگر وہ اشارات دوسری جگہ سب محفوظ ہو جاتے ہیں ایک وقت مقرر پر دوسری جگہ ہے اس کا حساب مرتب کر کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے کہ تم نے اس مہینہ یا اس دن میں اتنی اشارات استعمال کئے ہیں جن کی قیمت مقرر قواعد کے موافق اتنی ہوئی وہ داخل کرو۔ وہ قیمت اتنی ہوتی ہے کہ تنخواہ بھی اس کو کافی نہیں ہو سکتی۔ بتلایئے کیا وہ تار بابو اس کے جواب میں یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر مجھ کو گم صم کر کے بٹھانا تھا تو یہ مشین کا ہے کو میرے سامنے لگا دی ہے جو میرے اشارے پر کام کرتی ہے۔

صاحبو! یہ بہت واضح مثال ہے سب جانتے ہیں کہ جس کام کے لئے تار لگایا گیا ہے اس کے سوا اس کا استعمال درست نہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں کام ہی کیا ہے ایک انگلی ہی کو تو حرکت دینا پڑتی ہے اور ایک ذرا سا لوہے کا پرزہ ہی تو چلتا ہے اس میں دو چار باتیں کرنے سے کیا نقصان ہوا جاتا ہے اس کو یہ خبر نہیں کہ ظاہر میں گو اس میں ذرا سا پرزہ ہے مگر اندر کتنے آلات کام کر رہے ہیں اور یہ مشین کس قیمت کی ہے اور کس لاگت اور صرف سے یہ تار لگایا گیا ہے اور کتنی صناعتی سے بجلی بہم پہنچی ہے تمہاری انگلی ہلی مگر نہ معلوم کس قیمت کی بجلی اس ذرا سے ہلنے میں صرف ہو گئی اسی طرح زبان جس کو ہم اپنا مطیع اور بے عذر فرماں بردار سمجھتے ہیں ایسی ہی ہے جیسے تار کی مشین۔ بولنے میں تو ہم نے یہ سمجھا کہ صرف زبان ہلی اور در حقیقت بہت سے کام ہو گئے۔

حرکت زبان کتنے عضلات کی حرکت کے بعد ہوتی ہے

جن کے بیان کے لئے اور سمجھنے کے لئے کتابیں کی کتابیں اور بہت سے علوم اور ایک کافی وقت چاہئے یہ زبان جو بہت ہی بے تکان حرکت کرتی ہے نہ معلوم کتنے پٹھوں سے مرکب ہے جو دماغ سے آتے ہیں پھر وہ کس خوبی اور کس ترتیب کے ساتھ حرکت کرتے ہیں کہ اس سے ایک ایک حرف الگ الگ ادا ہو جاتا ہے۔ صرف تین حرف سے مرکب کلمہ میں زبان کے کتنے اجزاء کو انقباض اور کتنے کو انبساط ہو جاتا ہے اور کتنی دفعہ زبان عرض میں بڑھتی ہے اور کتنی دفعہ طول میں اور کتنے اجزاء کو انخفاض ہو جاتا ہے اور کتنے کو ارتفاع طب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ ہر عضو کو حرکت عضلات کی حرکت سے ہوتی ہے اور عضلات کی حرکت دماغی پٹھوں کی حرکت ہے۔ اور دماغی پٹھوں کی حرکت قوت ارادیہ کی حرکت سے ہوتی ہے تو کسی عضو کی حرکت اتنی حرکتوں کے بعد انجام پاتی ہے اب سمجھ لیجئے کہ ایک حرف کے ادا کرنے میں کس قدر آلات کو حرکت ہوتی ہے پھر ایک مرکب لفظ کے بولنے میں کتنی حرکتوں کی ضرورت ہوئی، اور ایک جملہ بولنے میں کتنی حرکتوں کی اور کسی چند جملوں سے مرکب تقریر ادا کرنے میں کتنی حرکتوں کی ضرورت ہوئی ذرا غور و انصاف سے کام لیجئے تار کی مشین میں تو دو چار ہی پرزے ہوں گے زبان میں نہ معلوم کتنے پرزے اور اجزاء ہیں پھر وہ کسی خوبی سے کام کرتی ہے کہ کسی جز کی حرکت کی ترتیب میں ذرا فرق نہیں آنے پاتا اور سارے آلات اپنا اپنا کام اس پھرتی سے کر جاتے ہیں کہ لکھنے والا اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سبحان اللہ کتنی اچھی مشین ہے ایسی مشین کی تو بڑی قدر کرنی چاہئے تھی اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جیسا تار کی مشین کو حرکت دینے سے صرف پرزے ہی حرکت نہیں کرتے بلکہ بجلی بھی خرچ ہوتی ہے ایسے زبان کو حرکت دینے میں بھی ایک بجلی خرچ ہوتی ہے جو اس بجلی سے زیادہ قیمتی ہے اس بجلی کا نام نور قلب ہے زبان سے بولنے میں قلب کی توجہ بٹتی ہے اور فراغ قلب نہیں رہتا جو بڑے کام کی اور ضروری چیز ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصیحت

یہاں اس حدیث کا مطلب واضح ہوتا ہے جس میں روایت عن عیسیٰ علیہ السلام آیا ہے کہ آپ نے نصیحت فرمائی کہ

لاتکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ الکلام بغیر ذکر اللہ یقسی القلب وابعد شیء من اللہ القلب القاسی او کما قال (سنن الترمذی: ۲۴۱۱)

یعنی سوائے ذکر اللہ کے کلام کی کثرت نہ کرو کیونکہ اس سے قلب میں قساوت پیدا ہوتی ہے اور قلب قاسی کے برابر کوئی چیز بھی حق تعالیٰ سے دور نہیں زیادہ بولنے سے نور قلب جاتا رہتا ہے۔

مبتدی کو وعظ گوئی سے ممانعت میں حکمت

بالخصوص مبتدی کے لئے تو بہت ہی مضر ہے حتیٰ کہ اس کو وعظ گوئی سے بھی منع کیا جاتا ہے حالانکہ وعظ طاعت مگر اس کو وعظ سے منع کرنے کی وجہ یہی ہے کہ اس کے نور قلب میں بھی بہت کمی ہے اگر ابھی سے صرف کیا جائے گا اور قوت علمیہ اور عملیہ کی کمی سے وہ حدود کے اندر نہ رہے گا اس لئے اور کاموں کے لئے نور باقی نہ رہے گا ہاں جب اس کو نور قلب پورا پورا حاصل ہو جائے اور اس کو علمی اور عملی استحکام بھی ہو جائے تو اب اس کو وعظ گوئی کی اجازت ہے اس کی ایک بے ہودہ سی مثال یہ ہے کہ صغر سنی میں لڑکے کو جماع سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں وہ مادہ جو محرک جماع ہے بہت کم اور کمزور ہے اگر ابھی سے صرف ہونے لگے تو پھر اس کی نشوونما کاہے سے ہوگی ہاں تھوڑے دنوں کے بعد وہ وقت آنے والی ہے کہ اس کو اتنا جوش ہوگا کہ روکے نہ رکے گا اور اس وقت اطباء یہ کہیں گے کہ اس وقت اس کا استفراغ نہ ہونا مخل صحت ہے۔ مبتدی کو وعظ گوئی سے روکنے پر بعض ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ منع عن الخیر ہے مگر اس مثال سے اس کا کافی وشافی حل ہو جاتا ہے یہ تو مبتدی کی حالت ہے اور منتہی کو وعظ وغیرہ سے ممانعت نہ سہی لیکن فضول گوئی اور کثرت کلام اس کو بھی مضر ہوتی ہے کیونکہ یہ کم سے کم فعل لایعنی تو ہے جس کی نسبت حدیث میں ہے

ان من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه (کنزالعمال ۳: ۸۲۹۱)

(انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ فضول باتوں کو ترک کر دے)

بڑوں کی باتیں

ایک بزرگ کی حکایت ہے وہ کسی سے ملنے گئے مکان پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہاں گئے ہیں ظاہر میں یہ پوچھنا کچھ بھی نہیں تھا لیکن بعد میں ان کو خیال ہوا کہ اس سوال کی ضرورت کیا تھی یہ تو فعل لایعنی ہوا پھر عرصہ دراز تک اس فضول سوال کی وجہ سے روتے رہے زبان کی قدر ان ہی لوگوں نے سمجھی ہے خیر یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں جو ورع ہے۔

آپ تو اس کے متعلق ایک ضابطہ کا شرعی قانون سن لیجئے وہ بہت آسان ہے اس میں کچھ بھی وقت نہیں کم ازکم اس کی پابندی تو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ انسان جو باتیں کرتا ہے وہ تین قسم کی ہیں ایک طاعت جیسے حدیث وقرآن پڑھنا پڑھانا یا نماز پڑھنا امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے یہ تو موجب ثواب ہے کہیں مستحب اور کہیں سنت اور کہیں واجب اس کو سب لوگ جانتے ہیں دوسری قسم مباح ہے وہ وہ باتیں ہیں جو اپنی ضروریات مباح کے متعلق ہیں مباح کا حکم یہ ہے کہ نہ اس میں فی نفسہ ثواب ہے نہ ندامت اگر وہ ذریعہ بن جائے طاعت کا تو موجب ثواب ہے اور

اگر ذریعہ بن جائے گناہ کا تو موجب عذاب ہے۔ تیسری قسم وہ باتیں ہیں جو گناہ ہیں جیسے غیبت، جھوٹ، طعنہ، جھوٹی گواہی، وغیرہ وغیرہ ہم اس دوسری اور تیسری قسم میں یعنی مباح اور گناہ میں زیادہ مشغول ہیں اور پہلی قسم کی اگر کبھی توفیق ہوتی بھی ہے تو اس کو بھی خراب کر لیتے ہیں کیونکہ مدار نیت پر ہے ہم لوگ قرآن وحدیث پڑھتے پڑھاتے ہیں تو اس میں بھی صحیح نیت نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ اپنی بدنیتی سے ہم وہ کیا کرایا کام بھی غارت کر لیتے ہیں۔

ہماری صریح طاعت کا حال

جیسے میں وعظ کہہ رہا ہوں ظاہر میں تو یہ اچھا کام ہے مگر مجھے تو اس میں بھی خطرہ لگ گیا ہے ہمارے اعمال کا خدا ہی حافظ ہے اگر ہماری طاعت پر گرفت نہ ہو تب بھی ہم بڑی کامیابی سمجھیں ثواب تو بہت دور ہے یہ حالت ان اعمال کی ہے جن کو طاعت سمجھا جاتا ہے کہ ان کی بھی حقیقت دیکھی جائے تو گناہ ہی نکلتی ہے پھر ان کاموں کا کیا حال ہوگا جو گناہ ہی گناہ ہیں کہ صورت بھی ان کی گناہ ہے اور حقیقت میں تو گناہ ہیں ہی۔ جب ہماری زبان کے وہ اعمال بھی بعض اوقات گناہ ہوئے جن کو طاعت سمجھا جاتا ہے تو مباح کا حال معلوم جو خود طاعت بھی نہیں بلکہ نیت خیر سے طاعت ہو سکتا تھا۔ جب ہماری صریح طاعت ہی تباہ اور برباد ہیں تو افعال متحمل الطاعت کو طاعت کیسے سمجھا جائے اور گناہ تو گناہ ہے ہی تو ہماری زبان کے سارے اعمال گناہ ہی گناہ ہوئے دیکھئے ہم لوگ کس قدر گناہوں میں مبتلا ہیں دن رات میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں گناہ نہ ہوتا ہو کیونکہ زبان تو ہماری کسی وقت بھی نہیں رکتی نیت ہماری خراب رہتی ہے خیر میں طاعت اور متحمل الطاعت کے گناہ ہونے کے دعوے کو چھوڑ کر کہتا ہوں کہ یہی غور کر کے دیکھئے کہ آج کل ہماری زبانوں سے کثرت سے کیا نکلتا ہے بس غیبت یا جھوٹ کی ندامت میں وارد ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے تو رحمت کا فرشتہ اس سے ایک میل دور بھاگ جاتا ہے یہ کتنی سخت بات ہے آدمی کا جیسے وجود رحمت کا محتاج ہے ایسے ہی بقا بھی رحمت کی محتاج ہے آپ کے سارے کام جن کو آپ بنتا ہوا دیکھتے ہیں سب حق تعالیٰ کی رحمت سے بنتے ہیں ہر ہر کام پر فرشتے متعین ہیں اگر ذرا دیر کو وہ کام چھوڑ دے تو آپ کا سارا کام بند ہو جاوے اور انسان کی بقا نہ رہے دیکھئے آپ لقمہ نگلتے ہیں اس میں حق تعالیٰ کی کس قدر رحمت ہے لقمہ کا منہ میں سے حلق میں جانا کس قدر تعجب کی بات ہے کیونکہ وہ لقمہ پہلے مجری نفس کے منہ پر گزرتا ہے اور اس کے پیچھے مجری الطعام ہے جس میں وہ کس صفائی کے ساتھ چلا جاتا ہے کہ ایک ذرا برابر کھانا یا ایک قطرہ پانی مجری نفس میں جانے نہیں پاتا۔ یہ کام بہت ہی عجیب ہے مگر دیکھئے ساری عمر کھاتے پیتے گزر جاتی ہے کبھی یہ خبر نہیں ہوتی کہ مجری

نفس کدھر ہے اور مجری طعام کدھر ہے آخر یہ کام کون کرتا ہے صاحب وہی فرشتے رحمت کے یہ کام کرتے ہیں۔ جب تو اس صفائی سے ہوتا ہے کبھی خدا تعالیٰ کی قدرت دکھانے کے لئے وہ فرشتہ اپنا کام چھوڑ دیتا ہے تو پانی یا کھانا سانس کے راستے میں چلا جاتا ہے پھر دیکھئے کیا حالت ہوتی ہے اس کو پھندہ لگنا کہتے ہیں بعض لوگ اس میں فوراً مر گئے ہیں تو یہی رحمت کے فرشتے جو آپ کے کام بناتے ہیں جھوٹ بولنے والے سے ایک میل ہٹ جاتے ہیں یہ قدرت خدا ہے کہ جھوٹ بولنے والا اس وقت ہلاک نہیں ہو جاتا۔ حق تعالیٰ کو پردہ رکھنا ہے اس واسطے گناہ کا نتیجہ اسی وقت نہیں دکھلاتے ہاں کبھی دکھلا بھی دیتے ہیں۔ تاہم اس فرشتہ کا ہٹ جانا کس قدر خطرناک ہے اور جھوٹ بولنا کتنی بری چیز ہوئی کہ رحمت خداوندی اس سے ایک میل دور ہو جاتی ہے نیز اس میں ایسی گندگی ہے کہ فرشتہ اس سے بھاگتا ہے فرشتے حق تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں ان کو تکلیف پہنچانا خود ایک مستقل برائی ہے خصوصاً وہ جھوٹ جو حق العبد کے متعلق ہو۔

جھوٹی گواہی دینے کا حکم

وہ جھوٹ جو حق العبد کے متعلق ہو جیسے جھوٹی گواہی دے کر کسی کا حق مار دینا کہ یہ تو ایسا گناہ ہے کہ توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ صاحب حق ہی نہ معاف کرے آج کل یہ حالت ہے کہ بعض لوگوں نے گواہی دینے کا پیشہ کر لیا ہے چار آنہ پیسہ میں بھی جھوٹی گواہی دے دیتے ہیں کس قدر بے وقوفی ہے کہ چار آنہ کے پیچھے جہنم مول لیتے ہیں۔ بعض جگہ اس حرکت سے یہ نوبت ہوئی کہ حاکم کو معلوم ہو گیا کہ فلاں فلاں گواہی کا پیشہ کرتے ہیں ان کو مردود الشہادت کر دیا اور کچہری کے احاطہ میں آنے کی ممانعت کر دی خسر الدنیا والاخرۃ (دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھایا) دین میں تو مردود تھے ہی دنیا میں بھی پھٹکار پڑی کہ ہر شخص ان سے نفرت کرتا ہے اصل بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دین کی پرواہ ہی نہیں بعض دفعہ ایسی غلطی سے گناہ مول لیتے ہیں جس میں کچھ مجبوری بھی نہیں ہوتی مثلاً سودے کے دام گاہک کو غلط بتلا دیئے کہ میرا اتنے کا پڑتا ہے اس گناہ میں سوداگر بہت ہی مبتلا ہیں اور وجہ اس کی صرف ناواقفیت ہے سوداگروں کو چاہئے کہ خرید بتلا کر کبھی معاملہ نہ کریں کیونکہ اس میں کمی زیادتی بتلانا صریح جھوٹ ہے اور اس میں کوئی جھوٹ نہیں کہ سو کی چیز کے دو سو لے لو۔ اپنے مال کی جو چاہو قیمت لے لو اختیار ہے ہاں جب اتنی روپیہ ٹھہر جائے تو اس وقت واقعی بتلا دینا چاہئے اس میں اگر کم و بیش ہوگا تو جھوٹ ہوگا۔

بعض سوداگروں کی مکاری

اس مسئلہ میں بعض سوداگروں نے ایک چالاکی کی ہے وہ یہ کہ گھر کے گھر میں کئی دفعہ اس

مال کی بیع کر لی ایک دفعہ اپنی بیوی سے نفع بڑھا کر فرضی بیع کر لی پھر بیوی صاحبہ نے بہو صاحبہ سے معاملہ کر لیا پھر بہو صاحبہ نے اصل مالک سے بیع کر لی دونوں دفعہ میں اگر اکنی روپیہ بھی بڑھ گیا تو اصل پڑتے پر ۲ بڑھ گئے اور ان کے نزدیک خریدار سے یہ کہنے کی گنجائش ہوگئی کہ ہم کو یہ مال اتنے میں پڑا ہے مگر وہ یہ یاد رکھیں کہ اس ترکیب سے گناہ پھر بھی سر رہتا ہے کیونکہ خریدار تو دساور کی خرید ے تمہارے پڑتا پوچھنا چاہتا ہے اس کو گھر کی فرضی خرید وفروخت کا پڑتا بتلانا محض مکر وفریب اور دغا بازی ہے۔ یہ محض ظاہر میں ایک مصنوعی ترکیب ہوگئی مگر حق تعالیٰ پر تو سب روشن ہے۔اصل حقیقت لم اس کی خداع ہے وہ بجنسہ باقی ہے۔

کارہا باخلق آری جملہ راست   با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن   رایت اخلاص و صدق افراشتن

(ترجمہ۔مخلوق کے ساتھ تو سارے کام درست کرتے ہو تو خدا کے ساتھ مکر وحیلہ کیسے درست ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھنا اور اخلاص وصدق کا علم بلند رکھنا چاہیئے)

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس تدبیر سے اپنا تو دل خوش کر لیا لیکن یہی فعل دوسرا آپ کے ساتھ کرے تو آپ کو گوارا ہوگا یا ناگوار۔ضرور ناگوار ہوگا سیدھی بات یہ ہے کہ اس چکر میں کیوں پڑے پیسہ کی چیز روپیہ میں بیچو پڑتے کا نام کیوں لو بعضے جاہل اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ زیادہ نفع لینے کو حرام سمجھتے ہیں افسوس ہمارے بھائیوں نے جائز کو ناجائز کر رکھا ہے اور ناجائز کو نفع جتنا چاہو لے لو شرعاً جائز ہے یہ اور بات ہے کہ دنیا کا نقصان ہے کہ جب لوگوں پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہ نفع زیادہ لیتے ہیں تو وہ ان سے معاملہ کرنا بند کر دیتے ہیں تھوڑے نفع کی تجارت زیادہ چلتی ہے سو یہ دنیا کا نقصان ہے مگر شریعت نے اختیار دے دیا ہے کہ چاہے جتنے داموں بھی بیچو جائز ہیں لیکن جب پڑتے کا نام آ گیا یا کوئی مقدار نفع کی مقرر ہو گئی تو اس میں ایک پیسہ یا ایک کوڑی زیادہ ہونا بھی جھوٹ ہوگا اور جھوٹ کی وہ قسم ہوگی جس میں حق العبد کا بھی گناہ ہوگا۔اول تو جھوٹ خود ہی ایسا گناہ ہے جس سے رحمت کا فرشتہ ایک میل ہٹ جاتا ہے اور اس جھوٹ کو تو کیا کہا جائے جس میں حق العبد بھی مارا جاتا ہے۔

غیبت کی خرابیاں

یاد رکھئے یہ جھوٹ بدون صاحب حق کے معاف کئے معاف نہ ہوگا ایک گناہ تو زبان کا یہ ہوا۔اور ایک گناہ زبان کا غیبت ہے جس میں ہم لوگ اس قدر مبتلا ہیں کہ خدا کی پناہ خاص کر مستورات میں تو یہ مرض بہت ہی زیادہ ہے بیبیوں کے لئے تو یہ گناہ طبیعت ثانیہ ہو گیا ہے حتیٰ کہ

ان کو یہ بھی احساس نہیں رہا کہ غیبت کچھ بری چیز ہے یا غیبت کیا چیز ہے یہاں تک کہ اگر کسی بی بی کو غیبت پر ٹوکا جائے تو جواب دیتی ہے کہ اس میں غیبت کی کیا بات ہے میں تو اس کے منہ پر کہہ دوں گویا غیبت کی تعریف انہوں نے یہ سمجھ رکھی ہے کہ پیچھے وہ بات کہی جائے جو کہ منہ پر نہ کہہ سکیں اور کہہ سکنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے حالانکہ ایک معنی نہ کہہ سکنے کے یہ بھی ہیں کہ منہ پر کہنا اس کو ناگوار ہو صحیح معنی یہ ہیں مگر عورتوں نے یہ معنی پڑھے ہی نہیں بلکہ انہوں نے تو یہ معنی لے لئے ہیں کہ ہم کہہ سکیں اور وہ ہمارا مقابلہ نہ کر سکیں اور ہم سے جیت نہ سکے خواہ اس وجہ سے کہ یا اس قدر زبان دراز ہیں کہ ان سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا یا کسی دباؤ کی وجہ سے کہ دوسرا آدمی چھوٹا ہے اور یہ بڑے سمجھے جاتے ہیں پھر خواہ یہ چھوٹا بڑا ہونا واقعی ہو یا وہمی اور خیالی ہو اور اگر واقعی چھوٹا ہونے کا سبب تمہارا مقابلہ بھی نہ کر سکتا ہو تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر بڑا آدمی چھوٹے آدمی کو جو کچھ بھی کہہ لے جائز ہے اگر یہی ہے تو کل کو یہ کہا جائے گا کہ چھوٹے پر بڑا آدمی جو ظلم چاہے کر لے وہ بھی جائز ہے تو کل کو ظلم کو بھی جائز کر دینا اور ظاہر ہے کہ ظلم کا جائز ہونا یقیناً غلط ہے تو ایسے ہی یہ خیال بھی غلط ہے کہ زبان دراز آدمی جو کچھ زبان سے کہہ لے سب روا ہے۔ ایسے آدمی کو چاہئے کہ ذرا کلکٹر صاحب یا جج صاحب کو دو چار گالیاں سناوے جب ہم دیکھیں کہ زبان درازی کچھ جرم کو ہلکا کرتی ہے یا نہیں۔

صاحبو! خدا تعالیٰ کے یہاں حقوق کے اندر بڑا چھوٹا کوئی نہیں ہے ایک بادشاہ اور ایک فقیر اور ایک گدا اور ایک امیر اور جوان اور بوڑھا سب برابر ہیں ایک پیسہ اگر فقیر نے امیر کا مار لیا یا امیر نے فقیر کا مار لیا تو دونوں برابر ہیں۔ صاحبو! یہ تو بہت موٹی سی بات ہے کچھ شریعت کے ساتھ خاص نہیں۔ اہل دنیا کے قانون کو دیکھئے کہ کوئی قانون بھی ایسا نہیں جو حقوق میں سب کے برابری کا قائل نہ ہو۔ دیکھئے ریل میں دو پیسہ کا ٹکٹ لئے بغیر کوئی سفر کرے تو اس پر کیسا مواخذہ ہوتا ہے حالانکہ ریلوے کمپنی کے نزدیک دو پیسہ کیا چیز ہے بلکہ دو روپے اور دو سو روپیہ بھی کوئی چیز نہیں مگر عدالت میں کوئی عذر بھی نہیں چلتا خواہ امیر ہو یا غریب اس سے دو پیسے وصول کرائے جاتے ہیں بلکہ مع جرمانہ کے اور اس حرکت پر امیر کو زیادہ ملامت ہوتی ہے کہ یہاں دو پیسہ کے لئے منہ کالا کیا۔ ایسے ہی جس وقت عدالت خداوندی میں غیبت کرنے والا اور صاحب حق کھڑا کیا جاوے گا تو کیا آپ کو امید ہے کہ یہ عذر اس کا چل جائے گا کہ میں اس کے منہ پر بھی کہہ دیتا اس لفظ پر تو ایک اور جرم قائم ہو جائے گا جس کا نام غفلت عن العلم ہے کہ آپ نے دنیا میں کسی سے پوچھا بھی نہیں کہ غیبت کیا چیز ہے۔

صاحبو! خدا تعالیٰ کے یہاں حساب کے وقت جیتنا بڑا مشکل ہے بلکہ دنیا میں بھی کوئی جرم کر

کے بہت کم جیتتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس شخص کو دلائی جائیں گی اور یہ کورا رہ جائے گا اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ وقت کیسا ہوگا اس وقت روپیہ پیسہ رشتہ قرابت کچھ بھی نہ رہیں گے فقط نیکیوں کی پوچھ ہوگی اس وقت غیبت کرنے والے کی کس قدر افسوسناک حالت ہوگی کہ کتنی محبت اور مجاہدہ سے تو کچھ نیکیاں کمائیں تھیں اور ایک گناہ بے لذت کی بدولت چھین گئیں ذرا اس حالت کو پیش نظر کر کے دیکھئے پھر کسی کو غیبت کرنے کی ہمت ہوسکتی ہے اگر یہ حالت اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے تو غیبت کرنے والا زبان کاٹ کر بیٹھنے کو پسند کرے اور کبھی غیبت کی راہ نہ چلے مگر جس درجہ یہ گناہ برا ہے اسی درجہ مسلمانوں کو اس میں انہماک ہے خاص کر بیبیوں کی تو یہ غذا ہی ہے زبان کو گناہوں کے نمبر بہت سے ہیں۔ اس وقت ایک ایک تفصیل اور پھر ایک ایک کے جزئیات کی تفصیل کیسے ہوسکتی ہے لہٰذا بہت مختصر عرض کرتا ہوں غیبت کے متعلق تو کچھ کلام کو طول ہی ہوگیا وجہ یہ ہے کہ غیبت کے متعلق کبھی بات منہ پر آجاتی ہے تو کچھ نہ کچھ طول ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ بدترین گناہ ہے اور ایسا کثیر الوقوع ہے کہ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں (نہ اس کے حسن کی انتہا نہ سعدیؒ کے کلام کی)

حسنش کی جگہ قبحش کہنا چاہئے نہ قبحش غایتے دارد نہ سعدی سخن پایاں۔ (نہ اس کی برائی کی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی انتہا) مسلمانوں میں اس کی کوئی انتہا ہی نہیں رہی۔ عام و خاص عالم اور جاہل مرد و عورت چھوٹے بڑے سب اس میں مبتلا ہیں۔ الا ماشاء اللہ اس کے متعلق قرآن شریف میں تو یہ آیت ہے۔ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ. یعنی کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ یہ حکم بھی منع کے لئے کافی تھا مگر اس کو ایک گندی مثال سے موکد فرمادیا جو ناگوار طبعی ہے تاکہ غیبت سے ایسی نفرت ہوجائے جیسی اس مثال میں ہے مثال یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ پسند ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے۔ اول تو مردار ہی سے نفرت ہوتی ہے پھر اپنے بھائی کا گوشت یہ کیسی گندی مثال ہے اس کا تصور کرنے کے بعد تو غیبت سے ضرور ہی نفرت ہوجائے گی جس شخص کی غیبت کی جاتی ہے وہ چونکہ موجود نہیں ہوتا اور اس وجہ سے وہ اس غیبت کا جواب کچھ نہیں دے سکتا ہے۔ جیسے مردہ کہ وہ بھی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اور اس بناء پر اس کا گوشت کھانا عقلاً وطبعاً مکروہ ہے لہٰذا مثال میں غیبت کو مردہ کا گوشت کھانا بتلایا گیا کہ وہ بھی عقلاً وطبعاً مکروہ ہے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے شب معراج میں کچھ آدمی دیکھے کہ وہ اپنے مونہوں کو اپنے ہاتھوں سے نوچ رہے تھے اور ناخن ان کے تانبے کے

تھے اور وہ غیبت کرنے والے تھے دیکھئے غیبت کس قدر بری چیز ہے۔ آخر ہم جب ایمان رکھتے ہیں تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کا کچھ تو اثر ہونا چاہئے۔ کبھی تو یہ خیال آنا چاہئے کہ گناہ کا انجام یہ ہوگا دنیا کی ذراسی بھی تکلیف نہیں جھیلی جاتی تو یہ عذاب کیسے اٹھائیں گے۔

اور صاحبو! اگر سوچو اور غور کرو تو دنیا کا نفع بھی تو غیبت میں کچھ نہیں ہے بلکہ لطف معیشت جاتا رہتا ہے اس واسطے کہ جو باتیں بطور غیبت کے بیان کی جاتی ہیں وہ اکثر اوقات کل جھوٹی ہوتی ہیں یا زیادہ حصہ ان کا جھوٹ ہوتا ہے اور دراصل پیچھے کہنے کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس میں کچھ باتیں بے اصل ہوتی ہیں جو سامنے نہیں کہی جاسکتیں تجربہ کر لیجئے کہ دو آدمیوں کو سامنے بٹھلایئے اور غیبت کرنے والے کو اطمینان دلا دیجئے کہ اس وقت یہ شخص تیرا کچھ نہیں کر سکے گا تو نے جو باتیں کل کہی تھیں وہ اس کے سامنے دہرا دے ان شاء اللہ ہرگز بعینہ وہ باتیں نہ کہہ سکے گا جس کی وجہ یہی ہے کہ ان میں کچھ باتیں غلط بھی شامل تھیں جن کو غیبت کردہ کے سامنے زبان پر لانے کی ہمت نہیں ہوسکتی تو جب ہر غیبت میں کچھ باتیں غلط بھی شامل ہوتی ہیں اور بات چھپتی ہے نہیں اس کی خبر اس شخص کو بھی کسی راوی کے ذریعہ سے پہنچ جاتی ہے کہ فلاں شخص نے فلاں مجلس میں میری نسبت ایسی باتیں کہیں کچھ تو اس غیبت میں ہی بے اصل باتیں تھیں اور کچھ اس میں یہ راوی اضافہ کرتا ہے اور کچھ یہ قاعدہ ہے کہ اپنی غیبت کی باتیں اپنے آپ کو سچی بھی جھوٹی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے کی جھوٹی بھی سچی معلوم ہوتی ہے اس لئے غیبت کرنے والے نے تو مظنون باتوں کو بھی یقینی کر کے بیان کیا اور خود اس شخص نے جس کی غیبت کی گئی تھی اپنے متعلق تاویل کر کے یا اپنے ساتھ حسن ظن کر کے بالکل بے اصل اور لاشے اور غیر واقعی سمجھا اس واسطے یہ خیال کر لیا کہ گو مجھ میں کچھ عیب ہوں بھی مگر غیبت کرنے والے نے بہت زیادتی کی اتنی باتیں اسے کبھی نہیں کہنی چاہئیں تھیں۔ اور جب اس نے زیادتی کی تو مجھ کو بھی مکافات اس کی غیبت کرنا روا ہے اور اگر کچھ باتیں غیر واقعی بھی ملا دوں تو کیا حرج ہے جبکہ اس نے بھی ایسا ہی کیا ہے تو میں کیوں نہ کروں۔

اب اگر اس نے ایک غیبت کی تھی تو اس نے دو کیں (یہ حالت بھی ان دو شخصوں کی ہے جو سمجھدار ہوں اور غصہ میں بدحواس نہ ہو جاتے ہوں ورنہ آج کل اس کی پروا کہاں کہ راوی کی روایت صحیح ہے یا غلط اور اس نے غیبت کی بھی ہے یا نہیں اور کی ہے تو کوئی بات واقعی کہی یا غیر واقعی اور ہم کو کتنی باتوں سے مکافات کرنی چاہئے۔ اب تو اگر کان میں بھنک بھی پڑ جائے کہ کوئی شخص ہماری برائی کرتا تھا تو زبان کیا ہاتھ پیر بھی قابو میں نہیں رہتے اور سر پھوڑنے کی نوبت آ جاتی ہے یہ سب دن رات کی دیکھی ہوئی باتیں ہیں مستورات کی کچاچی آپ دیکھیں تو اسی قبیل سے نکلیں

گی) پھر یہ خبر بھی چھپی نہیں رہتی اور پہلے شخص کے پاس یہ روایت بھی پہنچی ہے کہ اس شخص نے تمہیں ایسا ایسا کہا اس کو اور جوش زیادہ ہوتا ہے اور پہلے اگر غیبت ایک کی تھی تو اب دس کرتا ہے۔ اور یہ خبر دوسرے کو پہنچتی ہے پھر کیا وہ پیچھے رہنے لگا ہے وہ بھی دس قدم آگے بڑھتا ہے غرض دونوں میں اچھی خاصی عداوت ہو جاتی ہے۔

غیبت سے عداوت پیدا ہوتی ہے

ایک عجیب لطف یہ ہے کہ بعض غیبت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو کیسے خبر پہنچے گی بلکہ بعضے مخاطب سے یہ کہتے ہیں کہ میاں کسی سے ذکر نہ کرنا خود تو دوسرے سے ذکر کر دیا اور دوسرے کو نصیحت ہے کہ ذکر نہ کرنا جو کام اپنے آپ سے نہ ہو سکے دوسرے سے اس کی ہو سکنے کی توقع عجیب بات ہے جب بات دوسرے کے منہ تک پہنچ گئی پھر چھپنا کیا معنی میں کہتا ہوں کہ کوئی غیبت بھی نہیں چھپ سکتی کیونکہ غیبت اکیلے تو ہوتی نہیں کم از کم دو آدمیوں میں ہوتی ہے جب بات ایک سے دوسرے تک پہنچ گئی تو اپنے قابو سے باہر ہو گئی۔ اب جہاں تک بھی پہنچے روک تھام نہیں ہو سکتی زبان سے بات نکالنے کے بعد یہ توقع کرنا کہ چھپ سکے گی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں تک عقل کے موافق ہے۔

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہار

(وہ راز کب مخفی رہ سکتا ہے جس کے لئے محفلیں منعقد کی جائیں) منہ نکلی بات تو ضرور شائع ہو جاتی ہے اور بغیر اثر لائے نہیں رہتی لہٰذا غیبت سے عداوت پیدا ہونا لازمی امر ہے پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دو شخصوں میں پیدا ہو جاتی ہے تو دونوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑتی دونوں کو سوائے نقصان پہنچانے کے کوئی مشغلہ نہیں رہتا سب سے پہلے تو یہ کہ عداوت ہوتے ہی نماز کا حظ اور لطف جاتا رہتا ہے کیونکہ قلب کو دوسرے کی مضرت رسانی میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ اس سے فرصت ہی نہیں ملتی اور لا یذکرون اللہ الا قلیلاً (نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑے سے) کا مصداق ہو جاتا ہے جو منافقین کی شان میں وارد ہے نماز تو اول ہی روز سے رخصت ہوئی اور یہ مشغلہ مزید براں شروع ہوئے کہ چوری کروادی جوتے اڑوا دیئے پولیس کو مخالف بنا دیا حکام کو بدظن کر دیا تجارت میں نقصان پہنچا دیا۔ بہت سی نظیریں ایسی ملیں گی کہ دو شخص اچھے اچھے مالدار ایک ذرا سی عداوت میں خاک میں مل گئے کسی بات میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی پھر ہائیکورٹ سے اوپر کس کا اطمینان ہوتا ہے دونوں کا کورٹ ہی ہو کر رہتا ہے غرض عداوت ہونے کی دیر ہے کہ دونوں خاک ہی ملے رکھے ہیں اور ان دو شخصوں پر ہی منحصر نہیں یہ عداوت ایسی بری بلا ہے کہ دو شخصوں سے دو خاندانوں تک پہنچتی ہے اور دو خاندانوں سے دو قوموں تک پہنچتی ہے اور دیرپا ایسی

ہے کہ قرنوں اور پشتوں تک ممتد رہتی ہے اور سب اس کے نتائج بد سے پامال ہو جاتے ہیں غرض عداوت میں جان کا بھی نقصان اور مال کا بھی نقصان دنیا کا بھی نقصان اور دین کا بھی نقصان ہے دین کا نقصان یہ ہے کہ بدلہ لینے میں ہوش نہیں رہتا کہ یہ فعل جو اس کی مکافات میں کیا جاتا ہے جائز ہے یا ناجائز وہ تدبیریں نقصان پہنچانے کی کی جاتی ہیں کہ انتقام میں بھی ان کا کرنا جائز نہیں۔

سفلی عملیات موجب شرک ہیں

عورتیں ٹوٹکے کرتی ہیں اور سفلیات سے عمل کراتی ہیں کہ اس کی اولاد مر جائے یا اسے کسی قسم کی بری بیماری لگ جائے اس میں قطع نظر تجاوز عن الحد کے اس فعل کا گناہ علیحدہ ہے محض ٹوٹکے اور سفلی عملیات ایسے ہیں جو موجب شرک ہیں لیجئے ایمان بھی گیا پھر نقصان رسانی کے لئے رشوتیں دیتے ہیں اور بے جا خوشامدیں کرتے ہیں یہ باتیں سب ناجائز ہیں اس سے کیا بدلہ لیا کہ اپنے اوپر گناہوں کی پوٹ باندھ لی بعض دفعہ ذرا ذرا سی عداوت سے ایک ملک کو اور قوم کی قوم کو ایک شخص نے تباہ کر دیا نہ حق نمک کا خیال رہا نہ حق اللہ کا نہ حق العبد کا ذرا سی جھوٹی مخبری کر دی اور بہت سوں کو قتل کرا دیا بچے ان کے یتیم ہو گئے عورتیں بیوہ ہو گئیں خاندان کے خاندان بے چراغ ہو گئے کیا اس کا کچھ وبال نہیں پڑے گا عذاب اخروی تو رہا در کنار دنیا میں بھی یہ ہو گا۔

نماند ستمگار بد روزگار بماند برو لعنت پائدار

(بد ذات ظالم زمانہ میں ہمیشہ نہیں رہتا مگر اس پر لعنت قائم رہتی ہے)

فساد کا انجام

ہمیشہ کے لئے ہر شخص کی زبان پر یہ رہے گا کہ بڑا نمک حرام تھا اور یہ نتیجہ کاہے کا ہے صرف عداوت کا حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فساد ذات البین مونڈنے والی چیز ہے میری مراد یہ نہیں کہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے کہ ایک کیل تک بھی نہیں چھوڑتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو آپس کی باتیں ہیں ان کو شریعت سے کیا تعلق۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت کو تعلق کاہے سے نہیں کیا خدا کی خدائی سے باہر یہ کام ہوتے ہیں ایک حاکم دنیا کے قانون کو بھی رعایا کے افعال میں دخل ہوتا ہے پھر خدائی قانون کو آپ کے افعال میں کیسے دخل نہیں خدا تعالیٰ کو ہمارے جملہ افعال میں دخل تام ہے اور ان کے لئے قانون مقرر کر دیا ہے جس میں کسی کو مجال دم زدنی نہیں ہے۔ اور وہ قانون ایسا ہے کہ ہمارے نفع کا بھی ہے۔ دیکھئے عداوت سے اگر منع کیا گیا ہے تو کیا ظلم ہے حیوان سے انسان بنایا گیا تو کیا برا ہو گیا۔ ہمارے ہی بھلے کے واسطے یہ باتیں بتائی گئی ہیں جس کی یہ قدر کی کہ بیبا کی کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ شریعت کو ہمارے افعال

میں کیا دخل ہے میں کہتا ہوں غنیمت ہے کہ دین میں بری باتوں کی برائی اور اصلاح موجود ہے اگر بالفرض یہ اصلاح نہ ہوتی تو حاملان شریعت کو کوئی بھی چین نہ لینے دیتا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی ہوتا ہے کہ شریعت کی عداوت جیسی بری چیز کی طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی یہ کیسا دین ہے لیکن جب ہر قسم کی اصلاح موجود ہے اور ایسی موجود ہے کہ باید وشاید کہ ایسی اصلاح کسی حکیم کے کلام میں بھی موجود نہیں تو اس کی یہ قدر کی گئی کہ مسلمان ہی یوں کہتے ہیں کہ دین کو ان کاموں سے کیا تعلق ہم لوگوں کو ذرا ہوش سنبھالنا چاہئے۔

صاحبو! ہمارے دین میں مرض کو اتنی دور سے پکڑا گیا ہے کہ کوئی مذہب اور کوئی عقلمند بھی اس طرح نہیں پکڑ سکا مذہب سے میری مراد غیر آسمانی مذاہب مراد ہیں ورنہ آسمانی تو سب ایک ہیں سب میں ان کی اصلاح ہے بشرطیکہ تحریف نہ کی گئی ہو بتلایئے یہ کس عقلمند کے قانون میں ہے کہ غیبت نہ کرو اور کیا غیبت کی ایسی تعریف کسی کے کلام میں ہے جیسی شریعت میں ہے اور شریعت نے اس پر بھی اس کی ایک اور اصل کو پکڑا ہے کہ کثرت کلام سے منع فرمایا۔ جب کثرت کلام ہی نہ ہوگی تو غیبت کی نوبت کیوں آئے گی بلکہ اس میں بھی دوسری نصوص میں ایک اور اصل الاصول کو پکڑا ہے یعنی ظن اور گمان سے منع فرمایا

ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث (الصحیح للبخاری ۴: ۵)

(ترجمہ) بدگمانی سے اپنے آپ کو بچاؤ اس لئے کہ بدگمانی بدترین جھوٹی بات ہے)

اور اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (بدگمانی سے بہت بچو اس لئے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے) کیونکہ اکثر باتیں محض گناہ پر ہوتی ہیں جب بدگمانی سے روک دیا گیا تو باتیں خود ہی کم ہوں گی اور غیبت تو کبھی بھی نہ ہوگی۔

خصوصیات شریعت

بتلایئے کس قانون میں اور کس رفارمر کے اور کس عقلمند کے وصایا میں یہ تدابیر ہیں یہ شریعت ہی کی خصوصیات میں سے ہے۔ ہاں نظر کرنے کی بے شک حاجت ہے بدون نظر کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور نہ معلوم یہ کہاں تک صحیح ہے کہ عداوت اور فساد ذات البین کو مفاسد دنیا ہی سے تعلق ہے اور اس سے دین میں خلل نہیں آتا ذرا ان لوگوں کی حالت دیکھئے جن میں عداوت ہو جاتی ہے کہ ان کو دین کی خبر ہی نہیں رہتی۔ کسی عارف سے ان کے حالات دکھا کر پوچھئے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے گا کہ یہ لوگ اس وقت خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے خدا کی پرستش میں پڑے ہوئے ہیں دونوں کا خدا اس وقت ضرر رسانی فریق ثانی ہوتا نہ نماز کی خبر رہتی ہے نہ روزہ کی بس بغل میں

بستہ ہے اور وکیل صاحب کے یہاں موجود ہیں یا کچہری میں ہیں اور روپیہ لٹا رہے ہیں اور دھکے کھا رہے ہیں اور آج ضلع میں ہیں اور کل کمشنری میں اور پرسوں ہائی کورٹ میں اور لطف یہ کہ اپنی اس گت کی بھی خبر نہیں بس اس میں مگن ہیں کہ اب کام مارا اور اسکو نیچا دکھایا۔

صاحبو! انصاف سیکھئے کہ یہ اس کو ہی نیچا دکھانا اور ذلیل کرنا یا اپنے آپ بھی نیچا دیکھنا اور ذلیل ہونا ہے۔ ہاں حس پلٹ جائے اور تلخی شیریں معلوم ہونے لگے تو کسی خطاب ہی کی ضرورت نہیں۔ قربان جایئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے وہ ایسی ہیں جن میں کوئی حظ بھی نہیں جس گناہ کو چاہے دیکھ لیجئے وہ ایسا ہی نکلے گا جس میں بہت سی خرابیاں ہوں گی اور صرف آخرت ہی کا گناہ نہ ہوگا بلکہ دنیا کو بھی غارت کرنے والا ہوگا۔ عداوت کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ کس درجہ بری چیز ہے اور کیسے نتائج بد کا سبب ہے پھر بتلایئے یہ قابل منع ہے نہیں۔ عداوت رکھنے والوں کی دنیا بھی کس قدر گندی رہتی ہے اور اس کے مقابلہ میں محبت والوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی دنیا نہایت پر لطف ہے جب دو دوست محبت خالص کے ساتھ ملتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں ہیں۔ اس کی قدر ہم لوگ کیا جان سکتے ہیں ہم میں تو محبت اور اخلاص کا وجود ہی نہیں مگر اس کا نمونہ دکھلاتا ہوں۔

آج کل کی تہذیب

دیکھئے دنیا ہی کے لئے جب کسی سے ملنے جایئے اور وہ آپ سے تہذیب سے ملے اور آپ کی خاطر داری اور عزت کرنے میں کوتاہی نہ کرے اور آپ بھی اس کی خاطر داری اور عزت میں کمی نہ کریں تو دیکھئے کیسا لطف آتا ہے حالانکہ آج کل اہل دنیا کی تہذیب صرف صورت تہذیب ہے حقیقت کا اس میں پتہ بھی نہیں بلکہ جہاں تہذیب زیادہ بڑھ جاتی ہے وہاں حقیقت میں محبت کی ضد پیدا ہو جاتی ہے ظاہر میں بات بات پر سلام کرتے ہیں کھڑے ہو جاتے ہیں فقرے فقرے پر بچھے جاتے ہیں مگر پیٹھ پیچھے مردود و ملعون کہتے ہیں یہ سب کچھ سہی مگر اس ظاہری تہذیب میں بھی لطف آتا ہے اور مل کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ پھر اگر ظاہری ملاطفت کے ساتھ حقیقی محبت و خلوص بھی ہو تو اس کا جو اثر طرفین پر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں سچ یہ ہے کہ دو محبوبوں کے ملنے سے جنت کا سا لطف دنیا ہی میں آجاتا ہے یہی وہ محبت ہے جس کی تعریف اور فضیلت حدیث میں آئی ہے کہ قیامت کے دن پکارا جائے گا

این المتحابون فی اللہ اظلھم فی ظلی یوم لاظل الاظلی (السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰:۲۳۳)

یعنی فرشتہ خدا کی طرف سے پکارے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں کہ جو لوگ آپس میں خالصاً

لوجہ اللہ محبت رکھتے تھے آج میں عرش کے نیچے ان کو سایہ دوں گا جب کہ کوئی سایہ نہیں سوا میرے عرش کے سایہ کے۔ لوگ آپس میں ملنے کو دنیا سمجھتے ہیں یہ دنیا نہیں دین ہے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ محبت وخلوص کتنوں کو حاصل ہے باہمی محبت عجیب چیز ہے۔

ہدیہ اور رشوت میں فرق

جب خلوص سے دو آدمی ملتے ہیں تو کس قدر مسرت ہوتی ہے اور دیکھئے اس خلوص میں اگر کچھ مال ایک دوسرے کو حاصل ہوتا ہے جس کا نام ہدیہ ہے اس سے طبیعت کس قدر خوش ہوتی ہے اور یہی مال رشوت میں لیا جاتا ہے کہ خوشی اور مسرت تو کہاں اس شخص کی وقعت بھی روپیہ لیتے ہی جاتی رہتی ہے اور دینے والا حیلہ حوالہ ڈھونڈتا ہے کہ کسی طرح بچ جائے یا کچھ کم دے کر چھوٹ جائے اور ہدیہ دینے والا دل وجان سے چاہتا ہے کہ کسی طرح دوسرا لے ہی لے۔ ایسے ہدیہ کی قدر صاحب دل ہی جانتے ہیں وہ اس کو نعمت غیر مترقبہ جانتے ہیں۔ اسی واسطے بظاہر کتنی ہی حقیر چیز ہو ان کے نزدیک بہت بڑی چیز ہوتی ہے ایک بزرگ دوسرے ایک بزرگ سے ملنے کو چلے راستے میں جی چاہا کہ کچھ ہدیہ لے چلیں اس وقت اور تو کچھ نہ ہو سکا تھوڑے ڈھیلے استنجے کے لے لئے اور ان کے سامنے جا کر رکھ دیئے اس کو انہوں نے نہایت خوشی سے قبول کیا۔ جو بات اہل دنیا کے بڑے بڑے قیمتی ہدایا سے حاصل نہیں ہو سکتی وہ ان استنجے کے ڈھیلوں سے طرفین کو حاصل ہوئی۔ اس ہدیہ کا قبول کرنا سنت ہے اور رد کرنا موجب دل شکنی ہے اور صاحب کس کی ایسی قسمت جو خلوص کے ساتھ اسے ہدیہ ملے۔ اس ہدیہ سے انوار پیدا ہوتے ہیں اس کے مقابلہ میں اہل دنیا کے ہدایا دیکھئے کہ دینے والا جس وقت ہدیہ کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے یہ سوچتا ہے کہ ایسا ہدیہ دوں جو میری شان کے خلاف نہ ہو اور دس آدمیوں کی نظریں اس کی طرف اٹھیں اور ایسی چیز ہو کہ مہدی الیہ کے یہاں نہ نکل سکے تاکہ میری بات اونچی رہے اس واسطے قیمتی اور نئی چیز تلاش کرتا ہے اس کی تلاش میں کلفت بھی پیش آتی ہے نیز قیمت کا بھی دل پر بار ہوتا ہے لیکن نفس وشیطان سب کچھ کراتا ہے۔ دل پر بار کر کے تکلیف اٹھا کر وہ چیز لے جاتے ہیں چونکہ اس میں خلوص نہیں ہے مہدی الیہ پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دیکھتے ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہ حضرت ہم کو نیچا دکھانے اور اپنی بات اونچی کرنے کے لئے ایسی قیمتی چیز لائے ہیں پھر یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ نیچا دیکھیں اور چپ ہو رہیں بلکہ اپنے گھروں میں کوئی چیز اس سے بھی بڑھ کر ہے تو کسی حیلہ بہانہ سے ہدیہ لانے والے کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھو بھائی ہم نے یہ چیز فلاں میلہ میں سے خریدی تھی اور اس میں یہ خوبیاں ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ چیز ان کے ہدیہ سے بڑھ گئی تو ان کو

ملال ہوا کہ ناحق میں نے اتنی قیمت بھی لگائی اور پھر بھی بات نیچی ہی رہی اور یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی طرف سے بجائے محبت کے کشیدگی بلکہ عداوت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ بھی عجیب بدتہذیب آدمی ہے اور اس کے مزاج میں کس قدر شیخی ہے کہ ہمارے ایسے قیمتی ہدیہ کی بھی قدر نہ کی تہذیب کی بات تو یہ تھی کہ چاہے اپنے گھر میں لاکھ روپیہ کی چیز موجود ہے تب بھی ہمارے تحفہ کو ذرا قدر کے ساتھ لے لیتا اس کی کیا ضرورت تھی کہ اس وقت اپنی شیخی جتائی۔

صاحبو! جیسا خود لے گئے تھے ویسی ہی قدر ہوئی آپ بھی تو شیخی ہی سے ہدیہ لے گئے تھے پھر یہ کیا کہ اپنے واسطے تو شیخی بری نہیں اور دوسرے کے لئے بری ہے یہ عجیب بات ہے۔ صاحبو ذرا انصاف سے کہ وہ استنجے کے ڈھیلے اچھے ہیں یا یہ روپیوں اور اشرفیوں کی چیز بات یہ ہے کہ دنیا کے پیچھے عقل بھی ماری جاتی ہے عقل کی بات یہ ہے کہ ہر کام میں نظر غایت اور غرض پر ہونی چاہئے اگر کوئی تلوار سونے اور چاندی کی بنادے تو کیا صاحب نظر اور سپاہی کے نزدیک بوجہ بہت قیمت لگ جانے کے یہ اچھی ہو جائے گی ہرگز نہیں تلوار لوہے کی اچھی ہے جس میں دس پانچ ہی خرچ ہوئے ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جس کام کے لئے تلوار موضوع ہے وہ کام لوہے کی تلوار دے گی سونے چاندی کی تلوار میں سوائے قیمت ضائع کرنے کے کچھ حاصل نہیں یہ استنجے کے ڈھیلے جو خلوص سے پیش کئے گئے ہیں یہ وہی اثر رکھتے ہیں جو ہدیہ کا موضوع اور غایت اور غرض ہے یعنی محبت اور روپیہ اشرفی کی چیز ہرگز یہ اثر نہیں رکھتی تو فرمایئے عقل کی بات کونسا ہدیہ پیش کرے ایک اور حکایت یہ ہے کہ ایک مفلس شخص کسی بزرگ سے ملنے چلے جی چاہا کہ کچھ ہدیہ لے چلیں راستہ میں کچھ لکڑیاں جو سوکھ کر درخت سے گر گئی تھیں لے لیں کہ ایک وقت کا ایندھن ہی ہو جاوے گا جا کر بے تکلف سامنے رکھ دیں کہ حضرت یہ ہدیہ ہے اگرچہ یہ کچھ چیز نہیں ہے مگر حضرت کے اخلاق رسید ہے کہ قبول فرمالیں دیکھئے کتنا ناچیز ہدیہ ہے مگر ع قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہے یا جوہری) ان بزرگ صاحب نے خادم کو حکم دیا کہ ان لکڑیوں کو حفاظت سے رکھو جب ہم مر جائیں تو ہمارے غسل کا پانی ان سے گرم کرنا۔ کیا عجب ہے کہ حق تعالیٰ ان ہی کی برکت سے مغفرت فرمادیں۔ صاحبو! کیا اس مٹھی بھر لکڑی کے سامنے لاکھ روپیہ کا ہدیہ بھی کچھ چیز ہے۔ حاشا وکلا۔ دیکھئے اہل اللہ کی زندگی بھی کیسی لطف کی زندگی ہے ان کی محبت اہل دنیا کی سی محبت نہیں ہوتی۔

اہل اللہ کی پرلطف زندگی

کہ ذرا سی بات میں اڑ جائے کیونکہ ان کی محبت دنیا کے واسطے نہیں ہوتی جس میں تغیر لازم ہے۔ ہاں اہل دنیا کی محبت بیشک دنیا کی وجہ سے ہوتی ہے جب تک وہ حاصل رہی محبت

رہی اور جب اس میں فرق آیا محبت میں بھی فرق آ گیا بلکہ اہل اللہ کی محبت دنیا کے ختم ہو جانے اور مر جانے سے بھی ختم نہیں ہوتی کیونکہ جس کی وجہ سے ان میں باہم محبت ہے جب تک وہ باقی ہے محبت بھی رہنی چاہئے اور آپ جانتے ہیں وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے تمہیں باہم محبت ہے وہ اللہ سبحانہ کی ذات ہے۔ جب ان کی محبت للہ ہے تو جیسے اللہ میاں کی ذات کو فنا نہیں ایسے ہی ان کی محبت کو بھی فنا نہیں۔ اہل محبت کی زندگی کیا اچھی زندگی ہے غریبی ہو یا امیری ہر حالت میں بادشاہوں سے بھی زیادہ عیش کے ساتھ گزرتی ہے۔ جہاں ایک دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے تو وہ کونسا عیش ہے جو ان کو نصیب نہ ہوگا۔ اس واسطے حدیث شریف میں ہے

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده (الصحیح للبخاری ۱: ۹)

یعنی مسلمان وہ ہے اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں اس کو لوگوں نے معمولی بات سمجھا ہے لیکن اگر یہ دیکھئے کہ الفاظ حدیث کیا کہتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کی صفت بیان فرمائی کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں تو اس کا خلاف اسلام کا خلاف ہوا اور اسلام کے خلاف کسی بات کا ہونا یہ کتنی بڑی بات ہے غرض باہمی محبت مطلوبات شرعی میں سے ہے اور شریعت نے اس کی خاص طور سے تعلیم فرمائی ہے اور اس کے لئے طریقے بتلائے ہیں جن سے خاص محبت پیدا ہو اس بیان کو کچھ طول دینے کی ضرورت نہیں ہے بات تمام دنیا کے نزدیک مسلم ہے اور آج کل تو اس کا بہت ہی غل مچا ہوا ہے ہر شخص کی زبان پر ہمدردی ہمدردی اور اتفاق اتفاق ہے گو آج کل زبانوں پر ہمدردی و اتفاق کے لفظ ہی لفظ ہیں حقیقت کا کہیں پتہ نہیں تاہم اس پر تو تمام دنیا کا اتفاق ہوا کہ اتفاق بڑی ضروری چیز ہے تمام کام دنیا اور دین کے اتفاق پر موقوف ہیں اور اس کی ضد یعنی عداوت اور نا اتفاقی بری چیز ہے اور دین سب ہی کو خراب کر دیتی ہے اور غیبت کو عداوت پیدا کرنے اور اتفاق کی جڑ کاٹ دینے میں خاص دخل ہے تو بہت آسانی سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ غیبت دنیا اور دین سب ہی کے مفاسد کی جڑ ہے دیکھ لیجئے کہ غیبت کس درجہ بری چیز ہوئی اور معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس چیز سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس میں کچھ بھی حظ نہیں نہ دنیا کا نہ دین کا یہ غیبت کا تھوڑا سا بیان ہوا۔ غیبت زبان کا ایک گناہ ہے زبان کے گناہ اس پر منحصر نہیں اور بھی گناہ ہیں جو اس سے کچھ کم نہیں بلکہ بعض خرابیوں میں بڑھے ہوئے ہیں۔ غیبت تو خیر کچھ لوگ جانتے بھی ہیں مگر زبان کے اور گناہ ایسے بھی ہیں جن کو جانتے بھی نہیں ہیں اور برابر ان میں مبتلا ہیں چونکہ ان کو گناہ ہی نہیں سمجھے اور اس واسطے متنبہ کیوں ہونے لگا۔

ریا اور سمعہ مہلک مرض ہے

زبان کی ذرا ذرا سی باتیں ایسی بہت ہیں کہ ہم ان کو معمولی اور ذرا سی کہتے ہیں اور درحقیقت وہ ایسی ذرا سی ہیں جیسے دیا سلائی کہ بارود کے پہاڑ کو اڑا دینے کو ایک ہی کافی ہے مثلاً عورتیں اپنے مال پر اتراتی ہیں اپنے زیور اپنے کپڑوں کو جتلائے بغیر ان کو چین ہی نہیں آتا جہاں بیٹھیں گی کسی نہ کسی حیلہ سے زیور دکھلا دیں گی اور کہیں گی کہ فلاں وقت بنوایا تھا۔ یہ میرے میکے سے جہیز میں ملا تھا اور فلانی چیز میں نے اپنے سلیقہ شعاری کی بدولت خرچ میں سے کاٹ کاٹ کر بنوائی تھی کوئی پوچھے کہ کس پر احسان کیا اور جن کو دکھلا رہی ہو ان کو اس میں سے کچھ بانٹ دو گی یا اس جتلانے کا کیا فائدہ ہے یہ ہے ذرا سی بات جو بظاہر میں بہت معمولی ہے مگر یہ خبر دیتی ہے کہ اس کے قلب میں ریا اور سمعہ کا مرض ہے یعنی نام ونمود کا جو سخت مہلک مرض ہے ایک درویش نے ایک مہمان کے سامنے خادم سے کہا کہ اس صراحی میں پانی لاؤ جو ہم دوسرے حج میں لائے تھے۔ ان مہمان بزرگ نے کہا کہ بھلے مانس تو نے ایک لفظ میں اپنے دونوں حجوں کو باطل کر دیا آخر یہ تو سمجھ کہ تو نے حج للہ کیا تھا یا للناس۔ اگر اللہ کے لئے کیا تھا تو لوگوں کو سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ دیکھئے کتنا ذرا سا لفظ ہے جس نے اتنی مشقتوں اور دور دراز کے سفروں کو اور اس میں جو کچھ مال وزر خرچ ہوا تھا سب کو ضائع کر دیا دیکھئے دیا سلائی اور بارود کی مثال ہے یا نہیں۔ لوگ تہجد پڑھتے ہیں رات کو نیند کھوتے ہیں سردی گرمی کی تکلیف اٹھاتے ہیں اور صبح کو لوگوں کے سامنے آنے بہانے اس کو جتلاتے ہیں کرے کرائے کام کو غارت کر لیتے ہیں۔

نفس کا مکر

عورتوں میں یہ مرض بہت ہے اول تو تہجد گزار عورتیں ہیں ہی کم اور اگر کوئی ہے بھی تو رات کو تہجد پڑھیں گی اور صبح کو دو چار دفعہ اس کو منہ پر لا دیں گی کسی سے کہیں گی آج میرا سر بھاری ہو رہا ہے رات کو نیند نہیں آئی۔ آنکھ کھل گئی تھی میں نے کہا لاؤ تہجد ہی پڑھ لوں جب پڑھنے کھڑی ہوئی تو بارہ رکعتیں پوری ہی کر کے چھوڑیں ایسا لطف آیا کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا کسی سے کہیں گی بہن تم بھی تہجد پڑھا کرو میری آنکھ رات کو کھل گئی تھی کیا نور ظہور کا وقت تھا جس نے تہجد نہ پڑھا اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ کسی سے بطور مسئلہ کے پوچھیں گی کیوں جی اگر وقت زیادہ ہو تو تہجد میں بارہ رکعت سے بھی زیادہ پڑھ لیں تو کچھ حرج ہے۔ اس سے یہ جتلانا مقصود ہوتا ہے۔ کہ ایسی شوقین ہیں کہ نفلوں سے ان کا جی ہی نہیں بھرتا۔ خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ کے سامنے فریب نہیں چلتا یہ سب نفس کے مکر ہیں اپنی طاعت کو جتلانا درحقیقت غیر اللہ کو مقصود بنانا ہے یہ کیا حماقت ہے کہ طاعت

میں نام تو لگایا جائے خدا تعالیٰ کا اور مقصود ہو غیر وہ طاعت منہ پر مار دینے کے قابل ہے حق تعالیٰ کی غیرت سے ڈرنا چاہئے۔ کسی ادنیٰ سے آدمی کے ساتھ بھی وہی معاملہ کر کے دیکھئے اس کو کتنا غیظ آتا ہے۔ کسی کے واسطے پان لگا کر لائے اور جب اس کے سامنے آؤ تو بجائے اس کے ہاتھ میں دینے کے ایک بھنگی کے ہاتھ میں رکھ دو تو دیکھئے اسے کتنا غصہ آتا ہے اور اس حرکت کو اپنی توہین سمجھ کر وہ پان کو الٹا آپ ہی کے منہ پر مارے گا۔ لوگ خدائے احکم الحاکمین کے ساتھ یہی برتاؤ کرتے ہیں کہ طاعت کا نام ان کے لئے ہوتا ہے۔ اور مقصود دوسرا ہوتا ہے مگر افسوس ہم کو اس کا کچھ بھی خیال نہیں آیا بلکہ پھر بھی اس کی امید رکھتے ہیں کہ ثواب ملے گا۔ صاحبو! اگر حق تعالیٰ محض اپنے فضل سے مواخذہ سے چھوڑ دیں تو زہے قسمت ہم لوگ اول تو اطاعت ہی نہیں کرتے اور جو کرتے ہیں تو اس کو ایک دیا سلائی سے اڑا دیتے ہیں یہ کیسی غلطی ہے اس خیال میں نہ رہئے کہ کسی سے یہ کہہ دینا کہ سر بھاری ہو رہا ہے تہجد کا جتلانا نہیں بلکہ محض اتفاقاً سلسلہ کلام میں بات منہ پر آ گئی یا دوسرے کو تہجد کی تعلیم کرنا امر بالمعروف ہے یا کسی سے اس طرح مسئلہ پوچھنا کہ بارہ رکعت سے زیادہ بھی جائز ہے یا نہیں طاعت ہے یہ سب دھوکہ ہے عنوان مختلف ہیں مگر معنی ایک ہی ہیں یعنی اپنی بزرگی جتلانا اس کی میں ایک شناخت بہت ہی موٹی بتلاتا ہوں وہ یہ کہ اگر کوئی دوسری بی بی اپنی تہجد کو تمہارے سامنے انہی عنوان سے ظاہر کرے تو تمہارے دل میں کیا خیال ہوگا کیا یہی سمجھو گی کہ وہ جتلاتی نہیں بلکہ دوسرے کو تہجد کی تعلیم کرتی ہے اور درحقیقت رکعتوں کا مسئلہ ہی پوچھتی ہے ہرگز یہ خیال نہ ہوگا بلکہ سنتے ہی کہو گی مٹ گئی کس قدر اوچھی ہے ایک دن دو رکعت کیا پڑھ لیں کہ پیٹ پھولا جاتا ہے اور بغیر کہے نہ چوکی اصل یہ ہے کہ جس بات میں نفسانیت کا شمول ہوتا ہے اس میں خاصیت یہی ہے کہ دوسرے کو اس سے نفرت ہوتی ہے لیکن چونکہ آدمی کی طبیعت میں اپنے ساتھ حسن ظن رکھا ہوا ہے اس واسطے خود اس کام کو کرتے ہوئے برائی نہیں معلوم ہوتی اسی واسطے محققین نے بھلے برے کی یہ بھی ایک شناخت مقرر کی ہے کہ جس کام کی نسبت یہ معلوم کرنا ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا اور اس میں نفسانیت شامل ہے یا نہیں اس میں اس طرح غور کر لو کہ یہ کام اگر دوسرا آدمی کرے تو ہم کو برا معلوم ہوگا یا نہیں اس سے اکثر باتوں کا حسن و قبح معلوم ہو جاتا ہے اور خوب یاد رکھئے کہ حق تعالیٰ کی نظر حقیقت پر ہے طاعت کو زبان پر لانا بلا ریاء کے نہیں ہوتا گو نفس بعض تاویلوں کا پردہ ڈال کر آپ نظر سے چھپا دیتا ہے مگر حق تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتا بلکہ جو کوئی ذرا بھی غور سے کام لے اس سے بھی نہیں چھپ سکتا اس کی بہت احتیاط رکھئے اور کبھی اس کو خفیف نہ سمجھئے اپنے عمل کو بھی ظاہر نہ کیجئے۔ اور جہاں کہیں اہل اللہ اور علماء سے ایسی بات منقول ہو کہ انہوں نے اپنے عمل کو ظاہر کیا ہے تو خوب سمجھ لو کہ ان کی ریس ہم نہیں کر سکتے۔

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر
(بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں جیسے لکھنے میں شیر شیر یکساں لیکن معنی میں زمین آسمان کا فرق ہے)

ان کو خدا تعالیٰ نے وہ بصیرت دی ہے کہ ہر چیز میں سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر لیتے ہیں وہ جس موقع پر اپنے کسی عمل کو ظاہر کرتے ہیں تو واقع میں وہ موقع اسی کا ہوتا ہے اور اس کے وہ مامور ہوتے ہیں اور اس میں وہ ماجور بھی ہوتے ہیں اور اس موقع پر ظاہر نہ کرنے سے وہ عاجز ہوتے ہیں وہ بصیرت ہم لوگوں کو کہاں حاصل ہے وہ بصیرت تو بڑے مجاہدوں اور مشقتوں سے اور بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے پڑھنے لکھنے اور فارغ التحصیل مولوی ہو جانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی آج کل کی مستورات تو کس شمار میں ہیں کیونکہ نہ ان کو علم ہے ورنہ علم کا شوق یہ کیا ریاء اور تحدیث بالنعمت میں فرق کر سکتی ہے اس لئے اسلم طریق یہی ہے کہ اپنے محاسن اور طاعات کو زبان پر کبھی لاوے ہی نہیں بس اس شعر پر عمل چاہئے کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ آدمی یہ سوچ کر جس کے واسطے میں نے طاعت کی ہے اس کو تو علم ہے اور وہ کبھی بھولے گا بھی نہیں پھر کسی کو جتلانے کی کیا ضرورت ہے اور نہ جتلانے میں کیا ضرر ہے یہ بھی زبان کے گناہ ہیں اور ظاہر میں کس قدر معمولی ہیں لیکن یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ یہ دیا سلائی ہیں اور اعمال بارود ہیں۔ ایک دیا سلائی منوں بارود کو کافی ہے۔

زیادہ بولنے کا انجام

میں ایک ایک گناہ کو کہاں تک بتاؤں قربان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا گر بتلا دیا جس کی تفصیل کی ضرورت ہی نہیں وہ گر یہ ہے

ان اللہ کرہ لکم قیل وقال (مسند احمد ۲: ۳۲۹)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیادہ بولنے کو منع فرما دیا نہ آدمی زیادہ بولے گا نہ زبان کے گناہوں میں پڑے گا۔ اس گر کو جان لینے کے بعد اس تفصیل کی ضرورت ہی نہیں رہی کہ کون سی بات غیبت ہے اور کون سی بات ریا اور سمعہ ہے بس ضرورت کے موافق بولو اور گناہ سے بے خطر رہو زیادہ بولنا ہر شخص کو کم و بیش مضر ہے زیادہ بولنے سے نورانیت کب کی جاتی رہتی ہے۔

دل زپر گفتن بمیرد در بدن گرچہ گفتارش بود در عدن
(بہت گفتگو کرنے سے دل بدن میں مر جاتا ہے اگرچہ اس کی گفتگو نہایت شستہ عمدہ ہے)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصیحت ہے

لا تکثروا الکلام بغیر ذکر اللہ فان کثرۃ کلام بغیر ذکر اللہ یقسی القلب وابعد بشیء من اللہ القلب القاسی (سنن الترمذی: ۲۴۱۱)

یعنی سوائے ذکر اللہ کے اور کلام میں زیادتی نہ کرو کیونکہ کثرت کلام قساوت قلب پیدا کرتی ہے اور جس قلب میں قساوت ہو اس سے زیادہ کوئی چیز حق تعالیٰ سے دور نہیں دیکھئے کس قدر کام کی بات اور قلت کلام کس قدر ضروری چیز ہے۔ جس کی طرف ہم لوگ ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔

بلا تحقیق بات کرنا گناہ ہے

ایک گناہ زبان کا بے ثبوت و بلا تحقیق کسی بات کو بیان کر دینا ہے لوگ اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے اسی لئے آج کل اتنی جھوٹی باتیں مشہور ہوتی ہیں۔ جن کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ کانپور میں ایک دفعہ مشہور ہوا کہ کانپور کے ایک محلہ میں ایک بکری کے بچہ پیدا ہوا ہے جس کا اوپر کا دھڑ انسان کا ہے اور نیچے کا دھڑ بکری کا اور اس کی اتنی شہرت ہوئی کہ ہر شخص کی زبان پر تھا لیکن جھوٹی بات کی یہ علامت ہے کہ جس کسی سے پوچھا جاوے کہ تم نے بھی دیکھا تھا تو جواب ملے گا کہ میں نے خود نہیں دیکھا فلانے سے سنا ہے اسی طرح وہاں بھی دیکھنے والا کوئی نہیں تھا آخر ایک شخص نے اس محلہ میں جا کر اس کی تحقیق کی وہاں جس سے پوچھا اس نے کہا میاں باولے ہوئے ہو کچھ بھی نہیں۔ غرض یہ خبر بالکل بے اصل نکلی۔ ایک مرتبہ ہولی کے دنوں میں ایک روایت مشہور ہوئی کہ کوئی منہیار گاؤں سے شہر میں آیا تھا راستہ میں ایک درخت سے آواز آئی کہ چوڑی پہناتا جا۔ وہ اس درخت کے پاس گیا تو سات ہاتھ یکے بعد دیگرے نکلے اس نے سب کو چوڑیاں پہنائیں اخیر میں آواز آئی کہ میں ہولی ہوں اور ہندوؤں سے کہہ دینا کہ ہولی مقبول نہیں ہوئی دوبارہ کریں۔ یہ خبر ایسی مشہور ہوئی کہ بہت سے لوگ دوبارہ ہولی پھونکنے پر تیار ہوگئے۔ غرض ایسے بہت سے قصے آپ نے سنے ہوں گے کہ ایسی بے اصل باتیں مشہور ہوگئیں جن سے بعض وقت بڑے نقصان پہنچ گئے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ماسمع (الصحیح المسلم، المقدمہ باب: ۳ رقم: ۵)

یعنی آدمی کے لئے جھوٹ بولنے کے لئے یہی بہت ہے کہ جو کچھ سنے اسے فوراً نقل کر دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھوٹ فرمایا ہے حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنی سنائی باتوں میں بعضی باتیں سچی بھی ہوتی ہیں سب کو جھوٹ فرمانے کی کیا وجہ تو سنو وجہ یہ ہے کہ جو شخص اس کا عادی ہوگا وہ ضرور بالضرور جھوٹ میں مبتلا ہوگا تو حدیث کے یہ معنی ہوئے کہ ہر مسموع کو روایت کر دینا اور اس کا عادی ہونا جھوٹا بننے کے لئے کافی ہے دو شخص حضرت سلطان الاولیاء

رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بغرض بیعت حاضر ہوئے نماز کے وقت دونوں حوض پر وضو کرنے بیٹھے۔ ایک بولا ہماری مسجد کا حوض اس حوض سے بہت بڑا ہے حضرت سلطان الاولیاء نے سن پایا پوچھا کہ کتنا بڑا ہے کہا حضرت یہ تو ٹھیک طور پر نہیں بتلا سکتے مگر اس سے بہت بڑا ہے فرمایا جاؤ اس کو ماپ کر آؤ کہ کتنا بڑا ہے جب انہوں نے ناپا تو صرف ایک بالشت کا فرق نکلا آ کر خوش خوش حضرت سلطان جی سے عرض کیا کہ حضرت ایک بالشت بڑا ہے فرمایا ایک بالشت کو بہت بڑا نہیں کہہ سکتے تم بہت بے احتیاط آدمی ہو کہ بدون تحقیق کے تم نے اسے بہت بڑا کہہ دیا میں تم کو بیعت نہیں کرتا اور اول اپنی زبان کی اصلاح کرو اس کے بعد بیعت کا نام لو اور دیکھئے ظاہر میں کتنی ذرا سی بات ہے حتیٰ کہ اس قصہ کو سن کر آج کل کے لوگ تو تعجب کریں گے کہ اس میں کیا ایسا قصور ہو گیا جو بیعت سے انکار کر دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ قصور کیا چاہئے کہ یہ بات حدیث کے خلاف ہے اور حدیث میں ایسی بات کو جھوٹ فرمایا گیا ہے اور جھوٹ کچھ کم قصور ہے مگر افسوس ہے کہ ہم تو صریح جھوٹ کو بھی عیب نہیں سمجھتے اس کو تو کیا عیب سمجھیں گے۔

سنی سنائی بات کو نقل کرنے کی ممانعت

غرض سن لیجئے بلا تحقیق روایت کرنا ممنوع ہے اس کی ایک خرابی رویت ہلال کے وقت معلوم ہوتی ہے چنانچہ بعض دفعہ تمام شہر میں سن لیجئے کہ چاند ہو گیا اور فلاں جگہ دس آدمیوں نے دیکھا اور فلاں جگہ پچاس نے دیکھا اور جب تحقیق کیجئے تو ایک دو گواہ بھی رویت کے نہیں ملتے اس کی ساعت ہی ساعت ہوتی ہے کہ ہم نے فلاں محلہ میں سنا اور انہوں نے فلاں محلہ میں دیکھا اس وقت تحقیق کرنے والے کو کس قدر پریشانی ہوتی ہے اور تحقیق کرنے والے پر لوگ یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ کسی کو معتبر ہی نہیں سمجھتے۔ بھلا معتبر کیا خاک سمجھیں جس وقت ہم دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ تم نے خود دیکھا تو کوئی اقرار نہیں کرتا آپ ہی فرمایئے کہ ایسی حالت میں تحقیق کرنے والے کا قصور ہے یا شاہدوں کا اگر لوگ اس مسئلہ کو جانتے کہ شریعت میں اصل بات کی روایت کرنا منع ہے اور اس پر عمل کرتے تو یہ پریشانی ہرگز نہ ہوتی۔ دیکھئے شریعت کے احکام کتنے اچھے ہیں جن سے پریشانی کا استیصال ہو جاتا ہے۔ اس بات پر ایک آیت میں بھی ممانعت آئی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو روایت کر دے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ حق تعالیٰ نے منافقین کے بارہ میں بطور انکار کے فرمایا ہے کہ جب ان کو کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملتی ہے تو اسے فوراً شائع کر دیتے ہیں آخر کوئی بات تو ہے جو اس پر حق تعالیٰ نے اعتراض کیا ہے خود سمجھ لیجئے کہ یہ گناہ ہے کہ جو خبر سنی وہ روایت کر دی اور

بیوقوفی بھی ہے ایسا آدمی دنیا میں بھی ذلیل اور بے اعتبار ہو جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ میاں فلانے کا کیا اعتبار وہ تو یوں جومنہ میں آوے ہانک دیا کرتا ہے۔ اس عادت کو چھوڑ دیجئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب عادت زیادہ بولنے کی نہ ہو اور جس کو قیل وقال کی عادت ہوگی وہ اس میں ضرور مبتلا ہوگا۔

خاموشی کے منافع

کسی نے خوب کہا ہے خاموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی (خاموشی ایسے معنی رکھتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتے) اسی طرح زبان کے اور بھی گناہ ہیں جن کو لوگ جانتے بھی نہیں بلکہ بعضے گناہ ایسے بھی ہیں جن کو عام لوگ طاعت سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ذکر اللہ ہے اور ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر حقیقت میں وہ ذکر موضوع روایات ہیں اس میں پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں (پڑھے لکھوں سے مراد معمولی پڑھے لکھے ہیں ورنہ کامل اہل ایسی غلطیوں میں کیوں مبتلا ہوتے) اس کی یہ مثالیں ہیں کہ معراج نامہ پڑھنا۔ ساپن نامہ پڑھنا وفات نامہ پڑھنا کہ یہ سب قصے موضوع ہیں کسی معمولی آدمی کی طرف بھی غلط بات کی نسبت برا ہے دنیا میں بھی اس پر گرفت ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط باتیں منسوب کی جائیں۔ یہ خرابی آج کل کے جاہل واعظوں کی ہے جن کو علم تو ہے نہیں معتبر کتابوں سے صحیح صحیح روایتیں نکال سکیں اس واسطے اردو کی کتابوں میں سے جو اور رنگین مضامین یاد کر لیتے ہیں تاکہ وعظ میں خوب دلچسپی ہو۔ جھوٹی بات کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ اس میں رنگینی خوب ہوتی ہے اور سامعین کو نفسانی لطف خوب آتا ہے اور بات میں رنگینی نہیں ہوتی۔ ایک ناول اٹھا کر پڑھئے جس میں کسی جنگ کے حالات ہوں اس میں دلچسپی ہوگی اور ایک کسی مورخ کے لکھے ہوئے جنگ کے حالات یا سرکاری بات پڑھے تو اس میں دلچسپی ایسی کبھی نہ ہوگی۔ یہ معراج نامہ وغیرہ اسی واسطے پڑھے جاتے ہیں کہ وعظ میں رنگ آوے۔ جاہلوں کے نزدیک تو ان سے وعظ میں رنگ آتا ہے اور وہ برستے ہیں اور علماء و عارفین کے نزدیک انوار نہیں بلکہ نار برستی ہے دلیل اس کی حدیث ہے

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار (الصحیح للبخاری ۱:۳۸)

یعنی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو کوئی میری نسبت کوئی جھوٹی بات قصداً بیان کرے تو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ دیکھئے کس قدر سخت وعید ہے اور یہ حدیث کیا بتلاتی ہے۔

فضائل میں بھی موضوعات کا بیان کرنا جائز نہیں

یہ حدیث ایسی مجلسوں میں جہاں موضوعات پڑھی جائیں نار کا برسنا ثابت کرتی ہے۔ یا

انوار کا بعض جاہلوں نے یہاں تک غضب کیا کہ یہ سمجھ رکھا ہے کہ موضوع باتیں شریعت کے کسی فائدہ کے لئے یہ بیان کر دینا درست ہے جیسے نماز کے متعلق ایسے فضائل بیان کر دیئے جائیں جن کی قرآن حدیث میں کچھ بھی اصل نہ ہو مگر ان سے نماز پر تحریص ہوتی ہو تو جرح نہیں سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل غلط ہے اور اس میں دو خرابیاں ہیں ایک تو اس وعید کو سر لینا جو بھی بیان ہوئی یعنی

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار (الصحیح للبخاری ۱:۳۸)

(جس شخص نے قصداً مجھ پر جھوٹ بولا پس چاہیئے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے)

دوسرے شریعت کی طرف ایک نیا مسئلہ منسوب کرنا ہے کہ ایسا اس سے جائز ہے نیز اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ شریعت کامل نہیں ہے کیونکہ یہ مسئلہ شریعت میں کہیں منقول نہیں حالانکہ شریعت اسلامی کامل و مکمل ہے۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (آج ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو مکمل کر دیا) دین کو حق تعالیٰ نے کامل فرمایا ہے اور کوئی نعمت ایسی نہیں چھوڑی جس کو پورا نہ کر دیا ہو نعمت سے مراد دینی نعمت ہے تو کوئی بات دین کی ایسی نہیں رہی جس کی شریعت میں کمی ہو غلط روایتوں کو بیان کرنا درحقیقت یہ ظاہر کرنا ہے کہ دین میں اس فضیلت کے ان کی کمی رہ گئی۔ یہ ایجاد فی الدین ہے اور تجربہ سے ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ صرف ان لوگوں کے علم اور نظر کا قصور ہے کہ ان کو واقعی فضائل نماز کے معلوم نہیں۔ حدیث کی کتابوں میں واقعی فضائل اتنے موجود ہیں کہ ساری عمر بیان کئے جاؤ ختم نہ ہوں پھر کیا ضرورت ہے کہ جھوٹ بولا جائے کیا صحابہؓ نے جب فتوحات کئے تھے تو نو مسلموں کو موضوع فضائل سے نماز کی ترغیب دی تھی حاشاو کلا وہ لوگ کامل سچے تھے اور ان کے بیچ ہی کا یہ اثر تھا کہ ان کی ذرا سی بیان کی ہوئی فضیلت جس کے اندر گھس جاتی اور نو مسلموں کو ایسا پکا نمازی بنا لیتی تھی کہ خود نماز پڑھنے والا بھی چاہے کہ نماز قصداً چھوڑ دے تو نماز نہ چھوڑ سکتا تھا۔

واقعی باتوں کا اثر

جھوٹے فضائل میں یہ اثر کہاں جھوٹی روایتوں سے اس وقت تو جوش ہوتا ہے۔ لیکن ان میں فطری ظلمت ہوتا ہے کہ قلوب ان کو قبول نہیں کرتے تو اور مجلس سے اٹھتے ہی ان کا ذرا بھی اثر باقی نہیں رہتا چنانچہ دیکھ لیجئے کہ مصنوعی وعظوں میں کیا اثر ہے اور اہل اللہ محققین کے وعظوں میں کیا اثر ہے بعض اہل قلب کے وعظوں کی مجلس میں سے جنازے اٹھ گئے ہیں یہ اصلی اور واقعی باتوں کا اثر ہے مصنوعی مصنوعی ہے اور اصلی اصلی ہے خوب سمجھ لیجئے کہ موضوع روایتیں اور کتابیں پڑھنا جائز نہیں اور یہ بھی زبان کے بدترین گناہوں میں سے ہے زبان کا ایک اور گناہ بھی میں آپ کو بتلاتا ہوں۔ جس کی نسبت اچھوں اچھوں کو بھی خیال نہیں ہوتا کہ یہ گناہ ہیں۔

شاعر مرفوع القلم نہیں

وہ گناہ یہ ہے کہ نظم لکھتے وقت جو کچھ زبان پر آ جائے لکھ ڈالتے ہیں اور یہ سمجھ رکھا ہے کہ شاعر جو کچھ کہہ دے جائز ہے یہ بالکل غلط ہے شاعر مرفوع القلم نہیں ہوتا بلکہ شعر کا حکم وہی ہے جو نثر کا ہے اور تحریر کا حکم بھی وہی ہے جو تقریر کا حکم ہے بھلا کوئی شاعر نظم میں گورنمنٹ کی توہین تو کر دے۔ دیکھئے دست بدست سزا تیار ہے یا نہیں اس وقت یہ عذر کافی نہ ہوگا کہ میں شاعر ہوں نہ معلوم کون سے قانون یا عرف یا مذہب کا حکم ہے کہ شاعر زبان کے الزامات سے بری ہوتا ہے اس مرض میں اچھے اچھے پڑھے لکھے مبتلا ہیں۔ ایک آزاد شاعر کا شعر ہے۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ناحق کے لفظ کو خیال کیجئے کس قدر گستاخی ہے یہ تو ایک آزاد شاعر کے قلم سے نکلا ہوا ہے بہت سے دینداروں کے کلام میں بھی ایسی غلطیاں ہیں ان میں سے ایک غلطی یہ بھی ہے کہ شعراء اپنے کلام میں اکثر مدینہ طیبہ کا نام یثرب باندھتے ہیں حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ یثرب جاہلیت کا نام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام بدل کر طیبہ کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ یثرب اور طیبہ کا وزن ایک ہی ہے شعر میں جہاں یثرب بندھ سکتا ہے وہاں طیبہ بھی بندھ سکتا ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسند کئے ہوئے نام کو چھوڑ کر ناپسندیدہ نام کو باندھا جائے۔ اسی طرح جو اشعار خلاف شریعت ہیں ان کا لکھنا بھی گناہ ہے اور پڑھنا بھی گناہ ہے اس میں بھی عورتیں بہت مبتلا ہیں۔ کوئی قصہ ماہ رمضان پڑھتی ہے کوئی معجزہ آل نبی پڑھتی ہے بلکہ آج کل عورتوں کی انتہائی تعلیم یہی کتابیں رہ گئی ہیں۔ ایک شخص سے کسی نے پوچھا کہ تم نے کہاں تک پڑھا ہے۔ تو کہا میں نے سب کچھ پڑھا ہے۔ معراج نامہ میں نے پڑھا معجزہ آل نبی میں نے پڑھا نور نامہ میں نے پڑھا سانپ نامہ میں نے پڑھا۔ اس کا نام سب کچھ رکھا ہے۔ صاحبو! یہ کتابیں سب موضوعات ہیں۔ لکھنے والا تو گنہگار ہوا ہی پڑھنے والا بھی گنہگار ہوتا ہے اور ان کا شائع کرنا اور چھاپنا بھی گناہ ہے مطبع والوں نے آج کل یہ حیلہ تراش لیا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کے دام لیتے ہیں راست و دروغ برگردن راوی۔ مصنف اپنی تصنیف کا خود ذمہ دار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک دفعہ کسی باغی کی کوئی تصنیف کردہ کتاب یا اشتہار بھی چھاپئے اور اگر عدالت میں یہ جواب طلب ہو تو کہہ دیجئے کہ ہم نے تو اپنی محنت کی اجرت لی ہے راست و دروغ برگردن راوی۔ مصنف سے جواب طلب کیا جائے ذرا میں دیکھوں کہ یہ جواب دیکھ کر مطبع والے چھوٹ جائیں گے یا نہیں۔ جب ایک دنیا کے حاکم سے نہیں چھوٹ سکتے تو حاکم حقیقی سے تو چھوٹنا معلوم۔ بیبیو!

کیا دنیا میں یہ موضوعات ہی کی کتابیں رہ گئی ہیں کتابیں اچھی اور صحیح بھی تو بہت ہیں اور اتنی موجود ہیں کہ تمام عمر بھی پڑھو تو ختم نہ ہوں دین کی خدمت بحمداللہ علماء نے اتنی کر دی ہے کہ کافی سے بھی زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ بہشتی زیور پڑھیے۔ بزرگوں کی حکایتیں پڑھیے۔

دین اور دنیا کی مفید باتیں

میں کہتا ہوں اگر دین کی کتابیں بھی نہ پڑھ سکو تو دنیا کی بھی ایسی کتابیں ہیں جو بیکار اور مضر نہیں۔ مثلاً صنعت و حرفت کی کتابیں کھانے پکانے کی ترکیبیں خوان نعمت الوان نعمت پڑھو اور ان کی ترکیبوں سے کھانے پکاؤ۔ اپنا ہاتھ صاف کرو اس میں کچھ گناہ نہ ہوگا اور موضوعات میں تو سخت گناہ ہوتا ہے نہ دنیا کا کچھ فائدہ نہ دین کا بلکہ دین تو غارت ہوتا ہے۔ صاحبو! کام میں لگئے اول تو کام دین کا ہے اگر اس سے فرصت ہو تو دنیا کے کام میں لگئے۔ کیا خوب فقرہ ہے اگر مردم بہ امور آخرت نتوانند پرداخت کارہائے دنیا چہ بد است۔ آج کل لوگ گھڑی گھنٹہ بہت رکھتے ہیں مگر وقت کی قدر خاک بھی نہیں۔ وقت کی قدر میں یہ بات بھی داخل ہے کہ سوچ کر کام کیا جائے یہ کام کرنے کا ہے۔ اور یہ کام کرنے کا نہیں اگر ہم لوگ اپنے وقت کی قدر کریں اور اپنے کاموں میں غور کر لیا کریں کہ کونسا کرنے کا ہے اور کونسا نہیں کونسا ضروری ہے اور کونسا غیر ضروری تو بہت کچھ اصلاح ہو جاوے موضوعات اور فضولیات سب چھوٹ جائیں۔ غرض خدارا کام کو سوچ کر کرنے کی عادت ڈالئے اور ہر کام کو کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ یہ دین اور دنیا میں مضر تو نہیں دیکھئے کتنی جلد اصلاح ہوتی ہے۔ لیکن ایک بلا عام ہو گئی ہے کہ اس کا کسی کو بھی خیال نہیں دین کا تو کیا ہوتا دنیا کے نفع و نقصان کو کام کرنے سے پہلے نہیں سوچ لیتے اور دین کی تو یہ حالت ہے کہ ذرا سی آمدنی کے سامنے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی۔

ایک قصہ باغیانہ

ایک قصہ موضوع میں نے چھپا ہوا دیکھا۔ جس کو کسی مطبع والے نے چھاپا تھا لیکن کچھ خیال دین کا بھی آ گیا تو گناہ سے بچنے کے لئے آپ نے اخیر میں یہ لکھ دیا الحمدللہ والمنۃ کہ ایں قصہ موضوع طبع شدہ سبحان اللہ بھلا آپ ایک اشتہار باغیانہ تو چھاپیے اور اسی طرح اس کے اخیر میں بھی لکھ دیجئے کہ یہ اشتہار باغیانہ ہے اور بے فکر ہو جائیے کہ اب اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا بلکہ یوں لکھئے کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ باغیانہ اشتہار چھپ گیا جیسا وہاں الحمدللہ والمنۃ لکھا تھا۔ بھلا موضوع قصہ کے طبع پر الحمدللہ والمنۃ (اللہ کا شکر و احسان ہے) کے لفظ کو تو خیال کیجئے۔ چوری اور سینہ زوری اسی کو تو کہتے ہیں سوچے تو سہی کہ یہ لفظ کسی قلبی حالت کی خبر دیتا ہے۔ خدا تعالیٰ سے

اگر ذرا بھی تعلق ہوتا ایسا لفظ کبھی نہ لکھا جا سکتا تھا۔ بعض لفظ ایسے ہوتے ہیں کہ ظاہر میں تو بہت ہی چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان پر بڑا وبال مبنی ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی کلمات کی نسبت حدیث میں ہے بہا سبعین خریفا فی النار یعنی بعض وقت آدمی زبان سے ایسا کلمہ نکال بیٹھتا ہے جس کی وجہ سے ستر برس کی مسافت پر دوزخ میں گر جاتا ہے۔ بعض پڑھے لکھوں نے یہ عار اختیار کر لی ہے کہ ایسے واہی تباہی کلمات زبان سے بک لئے پھر کہہ دیا توبہ توبہ خدا معاف کرے خوب یاد رکھئے کہ ان اہلہفر بیوں سے حق تعالیٰ دھوکہ میں نہیں آتے۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق رابسجودے ونبی رابہ درودے

(تم ان لوگوں سے ہرگز نہ ہو جو اللہ کو ایک سجدہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں)

غرض زبان کی حفاظت بہت ہی ضروری چیز ہے جس کو لوگوں نے بہت ہی خفیف سمجھ رکھا ہے۔

زبان کا مواخذہ

اور صاحبو! کچھ شریعت ہی نے زبان کی آزادی سلب نہیں کی بلکہ ہر قانون اور رواج زبان کی آزادی کے خلاف ہی کونسا قانون یہ کہہ سکتا ہے کہ زبان پر مواخذہ نہیں ابھی کچہری میں جا کر آپ زبان سے اقرار کر لیجئے کہ میں نے قتل کیا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ یا اقرار کر لیجئے کہ میرے ذمہ فلاں شخص کے سو روپیہ ہیں ابھی یہ رقم دینا پڑے گی اور اس کو کوئی نہ سنے گا کہ یہ بات واقع میں غلط یا صحیح ہے اقرار کے بعد اس کے واپس لینے اور مٹانے کی بھی کوئی ترکیب نہیں یا راستہ میں کھڑے ہو کر کسی کو گالی دیجئے تو وہ شخص ضرور آمادہ فساد ہو جائے گا پھر نہیں کہا جا سکے گا کہ میں نے تو جھوٹ موٹ ایک لفظ زبان سے کہہ دیا تھا۔ غرض قانوناً دیکھئے یا عرفاً جس طرح بھی نظر ڈالئے زبان کو آزاد کبھی نہ پایئے گا پھر شریعت ہی پر الزام ہے اگر وہ زبان کو روکتی ہے بلکہ آپ غور سے دیکھیں تو کالشمس فی نصف النہار واضح ہو جائے گا کہ جن باتوں سے شریعت نے زبان کو روکا ہے۔ وہ واقعی اس قابل ہے کہ زبان کو ان سے خراب نہ کیا جائے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ غیبت ایسی چیز نہیں جس سے زبان کو روکنا چاہئے یا جھوٹ ایسی چیز نہیں یا بہتان ایسی چیز نہیں یا کثرت کلام اور فضول بک بک کرنا کوئی اچھی چیز ہے اگر بری باتوں سے شریعت روکتی ہے تو آپ کے بھلے کی بات ہے یا برے کی اس پر تو ہم کو شریعت کی قدر کرنا چاہئے کہ چھانٹ چھانٹ کر بری باتوں سے ہم کو بچا لیا۔ اگر آپ لاکھ برس تک سر مارتے تو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکتیں پھر ان بری باتوں میں بعض وہ ہیں جن کو جہلاء اچھی سمجھتے ہیں وہ سب میں زیادہ رد کئے کے قابل ہیں۔

ایجاد بندہ

ازاں جملہ ایک کتاب نور نامہ ہے جو مجموعہ موضوعات ہے مگر ایسا رائج ہوا ہے کہ سب لوگ خصوصاً عورتیں اس کو بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور لکھنے والوں نے بھی غضب ہی کیا ہے کہ بجائے منع کرنے کے اس کے فضائل لکھ دیئے ہیں کہ جو کوئی اس کو جمعرات کو پڑھے تو اس پر آتش دوزخ حرام ہو جاوے۔ اہل علم جمعرات کی قید ہی سے پرکھ جاتے ہیں کہ یہ فضیلت ایجاد شدہ ہے۔ بنائی ہوئی بات کہیں چھپتی ہے کسی بات میں اتنا مبالغہ اس کے بے اصل ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ ایسی ہی کتابوں نے اسلام کو بدنام کر دیا ہرگز اس کا پڑھنا جائز نہیں اور اسی قسم سے دعائے گنج العرش ہے اس کے بھی اس قدر معتقد ہیں محتاج بیان نہیں۔ میں اس دعا کی نسبت کلام نہیں کرتا دعا کا مفہوم اچھا سہی لیکن اسناد غلط ہے قرآن وحدیث میں کہیں نہ یہ دعا آئی اور نہ کہیں اسکی یہ فضیلتیں آئیں اس کا نام ہی بتلا رہا ہے کہ موضوع ہے بنانے والے کو یہ بھی نہ سوجھی کہ لفظ گنج العرش کی ترکیب کیا ہے یہ لفظ عربی ہے یا فارسی گنج لفظ فارسی اور عرش عربی اور الف لام بھی عربی کا لگا ہوا یہ ترکیب ایسی ہوگی جیسے کوئی دکان کا ترجمہ کرے خلۃ التجارت۔ بھلے مانس کو عربی نام رکھنا تھا تو کنز العرش لفظ موجود تھا مگر کیا کیجئے اس کے موضوع ہونے کا ثبوت نام ہی میں رہنا تھا اور اسناد تو اس کی ایسی غلط ہے کہ اگر ذرا بھی کسی کو تجربہ ہو اور سچی جھوٹی باتیں سنی ہوں تو پہچان سکتا ہے کیونکہ اتنا مبالغہ جتنا دعائے گنج العرش کی اسناد میں ہے سچی بات میں کبھی نہیں ہوتا۔ ایک چور کا قصہ اس میں لکھا ہے کہ اس کو حاکم نے سزا دینی چاہی مگر قدرت نہ ہوئی ہاتھ کاٹنا چاہا نہ کٹا تلوار سے قتل کرنا چاہا نہ مرا۔ آگ میں جلانا چاہا نہ جلا۔ اس کی اس سے وجہ پوچھی گئی تو بیان کیا کہ میرے پاس دعائے گنج العرش ہے اس میں گویا چوروں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ دعائے گنج العرش پاس رکھو اور خوب چوری کرو۔ خدا نہ کرے کہ اللہ میاں کا نام اس واسطے بنایا گیا ہو کہ اس سے گناہ میں مدد ملے استغفر اللہ اچھی طرح سن لیجئے کہ یہ دعا موضوع ہے یعنی کسی کی تصنیف کردہ ہے۔ حدیث قرآن سے ثابت نہیں۔

شریعت پر افتراء

اور یہ اعتقاد رکھنا کہ یہ قرآن وحدیث میں آئی افتراء علی الشرع ہے اور محض جہالت اور بدعت ہے ہاں وہ دعا فی نفسہ ٹھیک ہے لیکن جو دعائیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ اس سے بدرجہا افضل ہیں اور عجیب بات ہے کہ قرآن وحدیث کی تو کسی دعا کی یہ فضیلت نہیں آئی کہ اس کے پاس رکھنے سے نہ تلوار اثر کرے گی نہ آگ تو اس دعا کی یہ فضیلت کہاں سے آگئی یہ اسناد اور فضائل اس دعا کے تاجروں نے تراشے ہیں تا کہ ان کو دیکھ کر ہر شخص کو

رغبت ہو اور تجارت خوب چلے تو اسناد اور فضائل کا تو بالکل جھوٹ اور ان اسناد کا پڑھنا اور عقیدہ رکھنا سب ناجائز اور نفس دعائے گنج العرش بلحاظ مضمون کے جائز ہے لیکن چونکہ اس کے پڑھنے والوں کے خیالات اس کی نسبت بہت بڑھے ہوئے ہیں اور وہی فضائل ذہن میں جمے ہوئے ہیں جو اس کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں اس واسطے سد اللباب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ نفس دعا کا پڑھنا بھی چھوڑ دیں۔ اس کی جگہ قرآن وحدیث کی دعائیں اس قدر موجود ہیں کہ تمام دن پڑھے جائیے اور ایسی دعائیں ہیں کہ ان کی فضیلت کو کوئی دعا بھی نہیں پہنچ سکتی الفاظ کی بندش ہی کی نسبت میں کہتا ہوں کہ پڑھنے سے خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کی تصنیف ہے اور یہ کس کی تصنیف ہے گنج العرش کسی معمولی عربی دان کی تصنیف ہے ان کی شان یہ ہے

انا افصح العرب والعجم (کتاب الشفاء للقاضی عیاض ۱ . ۱۷۸ بلفظ آخر)

(میں عرب اور عجم والوں سے زیادہ فصیح ہوں) اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف کہنا بھی مجازاً ہے ورنہ درحقیقت وہ الہامی اور من عند اللہ ہیں وما ینطق عن الھوٰی (اپنی خواہش نفسانی سے آپ گویا نہیں ہوتے) کا مصداق ہیں پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ کوئی دعا بھی ان دعاؤں کے برابر ہو سکتی ہے علمائے متقین نے قرآن وحدیث کی دعاؤں کو جمع کر کے کتابیں بنادی ہیں اور ان کے حصے مقرر کر دیئے ہیں تاکہ روزمرہ پڑھنے میں سہولت ہو دو چار دفعہ ان کو پڑھئے آپ کی طبیعت خود دوسری دعاؤں کی طرف ہٹ جائے گی مگر آج کل مذاق پلٹ گئے ہیں کہ موضوعات ہی کو پسند کرتے ہیں۔ قصے بھی پڑھتے ہیں تو وہ جو بالکل فرضی اور جھوٹ ہیں اور سچے قصے پسند ہی نہیں آتے یہ عجیب غلطی ہے حالانکہ آج کل تحقیق وتعلیم کا بہت چرچا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جھوٹے قصے پڑھنے سے کونسی تحقیق ہوتی ہے اور عقلاء اور تعلیم یافتوں سے تعجب ہے کہ ایسے قصوں کو جھوٹا معلوم ہونے کے بعد پڑھتے ہیں۔ آج کل اسی قسم کی کتابیں کثرت سے بکتی ہیں اور لوگ بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ شریعت تو شریعت لوگوں نے عقل کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ بعض کتابیں علاوہ جھوٹ ہونے کے مخرب اخلاق بھی ہیں۔ جیسے گل بکاولی، بدر منیر کو پڑھ کر کس قدر اثر اخلاق پر پڑتا ہے۔

ناول تخریب الاخلاق ہیں

مگر افسوس ہی ہے کہ آج کل کے رفارمروں کو اس کا مطلق خیال نہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بری ایک چیز ہے جو آج کل کثرت سے شائع ہے اور اس کو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اور رفارمران قوم سب ہی پسند کرتے ہیں وہ ناول ہیں پرانے قصوں میں ان کے پاسنگ بھی وہ اثر نہیں جو ان ناولوں میں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ کے جھوٹے قصوں میں تو صرف یہی تھا کہ داستان گونے

زمین آسمان کے قلابے ملا کر ایسا دلچسپ قصہ بنا دیا کہ سننے والوں کو اچھا معلوم ہوتا ہے بس اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک دلچسپ بات سنی طبیعت خوش ہو گئی مگر ان سے بدمعاشی کی ترکیبوں پر عمل کرنے کا کسی کو وسوسہ بھی نہیں آتا کیونکہ ان میں جو ترکیبیں ہیں امکان سے باہر ہیں ان میں تو محالات اور مستبعد باتوں سے قصہ کو رنگین کیا گیا ہے بخلاف ان ناولوں کے کہ ان میں واقعہ کو اس طرح بیان کیا جاتا ہے جس میں زیادہ مبالغہ اور زمین آسمان کے قلابے نہیں ہوتے۔ ایسا فوٹو کھینچا جاتا ہے کہ گویا یہ واقعہ ہو رہا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سننے والے کو بدمعاشی کی ترکیبیں آسان اور سہل معلوم ہو جاتی ہیں اور اسی قسم کے حرکات کرنے میں اسی سے پوری مدد ملتی ہے کہنے کو تو ناول تہذیب و اخلاق کیلئے لکھے جاتے ہیں مگر ہوتی ہے ان سے تخریب اخلاق یہ عجیب بات ہے آج کل کے ناول اس اثر خاص میں ان پرانی کتابوں سے بھی بدتر ہیں جو مخرب اخلاق اور داخل فحش کہی جاتی ہیں۔ جیسے بہار دانش وغیرہ وغیرہ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ ان کتابوں کے دیکھنے والے ایسے بداخلاق اور بے حیاء نہیں ہو جاتے جیسے ناولوں کے دیکھنے والے۔

مصنف کی قلبی ظلمت کا تصنیف پر اثر

اس کی وجہ ایک باریک بات ہے وہ یہ کہ کسی کا کلام یا کتاب سننے یا دیکھنے سے اس کے مصنف کا خفی اثر قلب پر پڑتا ہے گو وہ کتاب ظاہراً کیسی ہی ہو حتیٰ کہ ایک بزرگ کسی کے مکان پر گئے تھے پوچھا کہ یہاں بڑی ظلمت محسوس ہوتی ہے کیا بات ہے۔ صاحب خانہ نے کہا کہ یہاں ظلمت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہاں قرآن شریف کی تفسیر رکھی ہے۔ پوچھا کونسی تفسیر ہے کہا کہ تفسیر کشاف ہے کہا کہ یہ اسی تفسیر کی ظلمت ہے کیونکہ یہ ایک معتزلی کی تصنیف ہے۔ دیکھئے مصنف کی قلبی ظلمات اس کتاب میں موجود تھیں۔ اسی طرح مصنف کے قلبی انوار بھی اس کی تصنیف میں موجود ہوتے ہیں۔ پرانے عام لوگوں کے قلوب میں اتنی ظلمات نہ تھیں جتنی آج کل کے قلوب میں ہیں اس واسطے ان کی نامناسب تصنیف میں بھی اتنی برائی نہیں جتنی آج کل کی تصانیف میں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کی تصانیف جو اہل دل تھے مطلق ظلمت نہیں رکھتیں گو ان میں کیسا ہی نامناسب مضمون ہو دیکھئے یوسف زلیخا جامی کی کیسی کتاب ہے بعض جگہ اس میں ظاہراً حسن و عشق کے مضامین ہیں خصوصاً زلیخا کا سراپا لکھنے میں تو ذرا بھی کوتاہی نہیں کی گئی مگر آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ اس کو پڑھ کر کسی پر برا اثر پڑا ہو۔ یوسف زلیخا پرانے مکتبوں میں داخل درس تھی اور اب تک بھی ہے مگر اس کے پڑھنے والوں میں سے کسی پر بھی بے حیائی کا اثر نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ تصنیف ایک اہل دل کی ہے جن کا قلب نہایت سلیم تھا ان کی سلامت قلب ان کے کلام کے اندر

موجود ہے خوب یاد رکھئے کہ جب کوئی کتاب دیکھنا ہو تو اول اس کے مصنف کے حالات معلوم کر لیجئے جس مذاق کا وہ ہوگا وہ مذاق اس کتاب سے دیکھنے والے میں ضرور متعدی ہوگا یہ بڑے کام کی بات ہے۔ آج کل کے ناول نویس خود اخلاق ذمیمہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی کتابیں خواہ کسی پیرایہ میں ہوں ان کے اخلاق کو کتاب کے دیکھنے والوں میں ضرور پہنچا دیتی ہیں۔ یہ راز ہے اس کا کہ ناول لکھے جاتے ہیں تہذیب اور اخلاق کے لئے اور ہوتی ہے تخریب اخلاق۔

اپنی اولاد کو غیر مستند کتب کے مطالعہ سے روکئے

میرا اعتراض صرف ناولوں پر ہی نہیں ہے جو کتابیں بھی اس قسم کی ہوں سب کو الگ کر دینا چاہئے جیسے گل بکاولی بدر منیر، قصہ حاتم طائی وغیرہ وغیرہ یہ سب جلا دینے کے قابل ہیں۔ تعجب ہے کہ اچھے اچھے عقلمند ان کتابوں سے اپنی اولاد کو نہیں روکتے بلکہ خود بھی دیکھتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں۔ بوڑھے بوڑھے آدمی اس خبط میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح جو کتابیں بے اصل ہیں گو دین کی صورت میں ہوں ان کو مت پڑھو ان کے پڑھنے سے سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کیا حاصل ہے اسی جنس سے معراج نامہ ہے۔ عورتیں معراج نامہ بہت پڑھتی ہیں اور معراج نامہ بکتے بھی بہت ہیں۔ علیٰ ہذا آج کل مولد شریف کے رسالے بہت تصنیف ہو رہے ہیں۔ ظاہراً یہ کتابیں خیر ہی خیر ہیں اسی وجہ سے لوگ ان پر بہت گرویدہ ہیں اور منع کرنا بھی ظاہراً سوء ادب معلوم ہوتا ہے اور ظاہر بین اور ناواقف اور جاہل لوگ منع کرنے والوں کے مخالف بھی ہو جاتے ہیں اور ان کو بے ادب اور گستاخ سمجھتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ مانعین گستاخ نہیں۔ ان کے اس ممانعت کا سبب گستاخی اور بے ادبی نہیں بلکہ اس کا اصلی سبب شان تحقیق اور ادب ہے وہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ غیر واقعی مضامین اللہ اور رسول کی طرف سے منسوب کئے جائیں۔ کیونکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اس کو منع فرمایا ہے۔

امتثال امر

آپ ہی انصاف کیجئے کہ امتثال حکم ادب ہے یا یہ ادب ہے کہ حکم کو چھوڑ کر اپنے دل میں جو کچھ آئے اس کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جائے معراج نامہ اور مولد شریف کے رسالوں میں دیکھ لیجئے کہ کس قدر موضوعات ہیں صرف اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لگا دینے سے ان کا پڑھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ تو عین گستاخی اور معصیت ہے کہ جھوٹ بھی لگایا تو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ لگایا۔ اول تو ان میں مضامین خلاف شرع ہیں اور دوسرے اور مفاسد بھی ایسے موجود ہیں جن کی وجہ سے منع ہی کو ترجیح ہو سکتی ہے۔

مستورات کی آواز کا پردہ

مثلاً عورتیں ان کتابوں کو مجمع میں بیٹھ کر بلند آواز کے ساتھ اور خوش الحانی کے ساتھ پڑھتی ہیں جو دروازہ میں یا سڑک پر مردوں تک بھی پہنچ جاتی ہے کیا یہ جائز ہو سکتا ہے۔ دیکھو نماز میں عورت کے لئے قرآن شریف کی قرأت جہراً ناجائز ہے پھر مناجاتیں اور غزلیں اس طرح پڑھنا کہ غیر مردوں تک آواز پہنچے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ حج میں لبیک حاجی کو پکار پکار کر کہنا مسنون ہے حدیث میں تصریح موجود ہے کہ اچھا حج وہی ہے جس میں بہت چیخ پکار ہو یعنی لبیک کے نعرے لگائے جائیں لیکن عورت کے لئے لبیک بھی جہراً ناجائز ہے جب ایسے موقعوں پر عورت کو آواز نکالنے کی ممانعت ہے تو ان موقعوں پر بھی جہاں مردوں کو بھی جہر کا اذن نہیں ہے کیسے اجازت ہوگی خصوصاً اس وقت میں جبکہ فتنہ کا خوف بھی ہو عورت کو تو بلا ضرورت پکار کر بولنے کی بھی ممانعت ہے اور جس موقع پر ضرورت بھی نہ ہو اس موقع پر زور سے بولنا اور آواز بنا بنا کر پڑھنا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کل طبائع میں کیسا انقلاب ہو گیا ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کے پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ غیرت اس کو کیونکر جائز رکھتی ہے کہ عورتیں بلند آواز سے گائیں۔ جیسے باہر نکلنا ویسے ہی مردوں کو گانا سنانا۔ پردہ صرف صورت ہی کا نہیں ہوتا آواز کا بھی پردہ ہے سنگار کا بھی پردہ ہے صورت کا بھی پردہ ہے۔ حیاء خود جزو ایمان ہے۔ جو افعال حیاء کے خلاف ہیں ان کو فحشاء کہتے ہیں جن کی نسبت وارد ہے ینھی عن الفحشاء والمنکر یعنی حق تعالیٰ منع فرماتے ہیں۔ بے حیائی کی باتوں سے اور بری باتوں سے وارد ہے اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ یعنی حق تعالیٰ نے بے حیائیوں ہی کو حرام کیا ہے خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی دیکھئے کلمہ حصر سے کس قدر شدت اس کی حرمت میں بڑھ گئی ہے۔ اسلامی شریعت بھی کیا چیز ہے حیوان سے آدمی بناتی ہے جو باتیں شریعت میں منع ہیں وہ فطرت کی رو سے بھی بری ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ کوئی آدمی ہی بننا نہ چاہے۔

عورتوں کے لئے دینی کتب کا دستور العمل

ایسی ہی ایک کتاب وفات نامہ ہے وہ بھی عورتیں بہت پڑھتی ہیں اس میں بھی بعض روایتیں بالکل غلط ہیں کہاں تک تفصیل کروں بس ایک گر بتائے دیتا ہوں یہ دستور العمل رکھو کہ جو کتاب دیکھنی ہو اول اس کو علماء کے پاس بھیجو اور دریافت کرو کہ یہ ہمارے دیکھنے کی ہے یا نہیں اگر وہ اجازت دیں تو دیکھو ورنہ نہ دیکھو۔ اس عموم میں اچھی بری سب کتابیں آ گئیں۔ میں کسی کتاب

کی اجازت عام آدمیوں کو خصوصاً عورتوں کو نہیں دیتا تاوقتیکہ کسی معتبر عالم سے بالتخصیص اجازت نہ لے لیں۔ اس سے آپ تعجب نہ کریں کہ اچھی کتابوں سے بھی میں منع کرتا ہوں میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ اچھی کتابوں کا دیکھنا بھی ہر شخص کے لئے جائز نہیں اس سے ان کتابوں کو عیب نہیں لگتا بلکہ ممانعت کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ دیکھنے والے کو اس کے سمجھنے کی استعداد نہیں ہوتی۔ کبھی وقت کا اقتضاء اس کے خلاف ہوتا ہے ایسے موقعوں پر ان ہی اچھی کتابوں سے بجائے ہدایت کے گمراہی پیدا ہو جاتی ہے۔ آج کل بہت سے لوگ گمراہ ایسے موجود ہیں جن کے ہاتھوں میں تصوف کی کتابیں موجود ہیں اور اپنے ہر ہر قول پر ان سے احتجاج کرتے ہیں۔ عوام کو وہ کتابیں دکھلا کر اپنا مدعا بزعم خود حق الیقین کے درجہ تک ثابت کر دیتے ہیں خود بھی گمراہ ہیں اور خلق خدا کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ واقع میں ان کی ایک بات بھی کتاب کے موافق نہیں ہوتی ایسے ایسے نازک مسئلے ان کے نوک زبان ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ وہ وحدۃ الوجود سے ادھر کوئی مسئلہ ہی نہ چھیڑتے اور ہمہ اوست کا تو ہر وقت مشغلہ ہی ہے مگر سراسر گمراہ ہو گئے اور گمراہی کی وجہ یہ ہوئی کہ استعداد ان کو ہے نہیں کیونکہ اس فن کو کسی سے باقاعدہ حاصل نہیں کیا بس تصوف کی کتابوں کو اس خیال سے خود دیکھنا شروع کر دیا کہ یہ کتابیں تو بڑی اچھی ہیں اور خلق اللہ کی ہدایت ہی کے لئے لکھی گئی ہیں ان کے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ بس نتیجہ اس کا یہ ہوا جو عرض کیا گیا یہ غلطی ہے یا نہیں دیکھئے اب میرا کہنا درست ہے یا نہیں کہ اچھی کتابیں بھی مضر ہوتی ہیں یہ ضرر تو قلت استعداد کی وجہ سے ہوا اور بعض اچھی کتابوں سے اقتضاء حال کے خلاف ہونے سے مضرت ہو جاتی ہے کسی خائف کو جو غلبہ خوف سے پریشان ہو کتاب الخوف سنائی جاوے تو وہ کتاب تو بری نہیں اور سننے والا غلط فہمی بھی نہ کرے گا لیکن بے موقع ضرور ہے کیونکہ اس وقت اس کو ضرورت ہے کتاب الرجاء سنانے کی۔ یہ بات اہل علم کے یاد رکھنے کی ہے کہ مریض اور ضعیف القلب اور بوڑھے آدمی کو یا مرتے وقت کسی کو خوف کی باتیں نہ سناویں الا باشد ضرورت۔ بعض وقت اس سے ایسا نقصان پہنچتا ہے کہ ایمان تک جاتا رہتا ہے۔ خصوصاً مشائخ کو ان باتوں کا خاص طور سے خیال کرنا چاہئے اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اچھی کتابیں کس طرح مضر ہو جاتی ہیں اگر اب بھی سمجھ میں نہ آیا ہو تو میں ایک نظیر دیتا ہوں جس سے مضمون بہت واضح ہو جاوے گا وہ یہ ہے کہ شیخ بو علی سینا اور بقراط اور سقراط یہ کس درجہ کے لوگ تھے گویا طب کے موجد تھے ان کی طبی کتابیں سب کے نزدیک مسلم ہیں اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کسی کو نقصان پہنچانے کے واسطے نہیں لکھیں ان کی کتابیں سراسر نفع ہی نفع ہیں میں پوچھتا ہوں کہ ان کی کتابیں کیا سب ہی کو مفید ہو سکتی

ہیں کیا ایسا شخص جس کو معمولی اردو کی لیاقت یا فارغ التحصیل عربی داں ہی سہی مگر اس نے طب نہ پڑھی ہو ان سے نفع اٹھا سکتا ہے ہرگز نہیں۔ یہاں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ ان کتابوں کو یہ سمجھ کر کہ یہ بڑے لوگوں کی تصنیف ہیں اور نفع ہی کے واسطے لکھی گئی ہیں۔ مطالعہ کر کے بے کھٹکے کسی علاج کی ہمت کریں۔ علاج کے بارہ میں تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے طبیب بھی دوسروں سے مشورہ کر لیتے ہیں اور بہت غور اور فکر کے بعد کسی نسخہ کے استعمال کی جرأت کرتے ہیں۔

قرآن وحدیث کے ترجمہ کی مثال

صاحبو! کس قدر افسوسناک بات ہے کہ جان کے معاملہ میں تو اس قدر احتیاط اور ایمان کے معاملہ میں اس قدر بیباکی ع بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ (دیکھو راہ کا تفاوت کہاں سے کہاں تک ہے) اس مثال سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ کتاب خواہ کیسی ہی معتبر اور مسلم ہو وہ بھی ہر شخص کے کارآمد نہیں ہو سکتی اور اس سے اس کتاب پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ خود اہل تصوف نے لکھا ہے کہ ہماری کتابوں کا مطالعہ نااہل کو حرام ہے چنانچہ میری تقریر سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو گئی اب میں ترقی کر کے کہہ سکتا ہوں کہ حدیث اور قرآن سے بھی ہر شخص کو نفع نہیں ہو سکتا اور ہر شخص کو مناسب نہیں کہ حدیث وقرآن کو بطور خود پڑھے۔ یہ لفظ گو ظاہر میں موحش ہیں مگر اس کی شرح سن لیجئے حدیث وقرآن کا پڑھنا بھی دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو تبرکاو استلذاذاً اور ایک معنی اور مفہوم سے اول طریق سے تو ہر شخص کے لئے جائز ہے۔ بلکہ مامور بہ اور مستحب ہے اور صدہا برکات کا موجب ہے قرآن کا ایک حرف پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں ایسے ہی حدیث کو کوئی شخص تبرکاً پڑھے تو زہے قسمت اور دوسرے طریق سے ہر شخص کو جائز نہیں۔ یعنی جو شخص صحیح معنی سمجھنے کی لیاقت نہ رکھتا ہو اس کو قرآن کا ترجمہ یا حدیث کا ترجمہ پڑھنا جائز نہیں اگرچہ اردو ہی کا کیوں نہ ہو۔ اردو ترجمہ کی ایسی مثال ہے جیسے طب یا ڈاکٹری کی اردو کتابیں سو بتلایئے کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ بدون طب یا ڈاکٹری باقاعدہ پڑھے اردو کی کتاب کچھ کام دے سکتی ہے۔ میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ اگر قرآن کا ترجمہ دیکھنے کا شوق ہو تو کسی معتبر استاد سے سبقاً سبقاً پڑھا کرو اپنی قابلیت کے بھروسہ نہ ہو۔ بی اے اور ایف اے پاس کرنا اور بات ہے اور قرآن وحدیث کا سمجھنا اور بات ہے۔ کیا ایف اے اور بی اے پاس کر کے آپ ڈاکٹری کی کتاب سے نسخہ نکال سکتے ہیں ہرگز نہیں بلکہ میں اس سے کم درجہ کا کام بتلاتا ہوں کہ بدون سیکھے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیا ایف اے اور بی اے پاس کر کے آپ جوتی گانٹھ سکتے ہیں اور اگر آپ اپنی قابلیت کے بھروسہ اس کی ہمت کریں گے تو ایک چمار کا لونڈا بھی آپ کی غلطی پکڑ

لے گا۔ بڑے حیف کی بات ہے کہ ایف اے اور بی اے پاس کر کے چمار کا کام تو نہ آوے اور قرآن وحدیث کی فہم کی قابلیت آجاوے مثل مشہور ہے لکل فن رجال (ہر فن کے کچھ مرد ہوتے ہیں) یعنی ہر کارے و ہر مردے (ہر کام کا ایک مرد ہوتا ہے) جو کام جس کا ہے اس کے سپرد کرنا چاہئے۔ ہاں اس سے نفع اٹھانے کی تدبیر یہ ہے کہ اس سے مشورہ کرو اور اس کی رائے کو اپنی رائے پر ترجیح دو۔ غرض کارآمد طریقہ یہی ہے کہ جس کتاب کو دیکھنا چاہو اول علماء سے پوچھ لو خصوصاً عورتوں کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ یہ خود خلقۃً ناقص العقل ہیں اور تحصیل علم کے ذرائع ان کے واسطے کم ہیں اس لئے اپنی رائے سے کتابوں کا مطالعہ کرنے میں بہ نسبت اصلاح کے ان کا فساد زیادہ قریب ہے میں تو مشورہ دیتا ہوں کہ عورتیں کوئی غیر ضروری کتاب بھی نہ دیکھیں بلکہ سوائے کام کی کتابوں کے گھر میں بھی نہ رکھیں۔ خصوصاً نظم کی کتابیں کیونکہ نظم کی اکثر کتابوں میں مسئلہ مسائل یا کوئی دنیاوی کارآمد صنعت وحرفت تو ہے ہی نہیں صرف شاعرانہ مضامین ہوتے ہیں ان کی عورتوں کو کیا ضرورت ہے۔

عورتوں کی خوش اعتقادی

نظم کی کتاب گھر میں رکھو ہی مت غیر معتبر کتابوں کے پاس مت پھٹکو ان سے نفع نہیں ہوتا اور نقصان ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ عورتوں میں خوش اعتقادی کا مادہ بہت ہوتا ہے خصوصاً کتابوں پر تو بہت ہی جلد ایمان لے آتی ہیں تو اگر کوئی غیر معتبر کتاب گھر میں ہوگی تو گھر کی بی بی کو یا اور آنے جانے والی کسی بی بی کو یا آئندہ آنے والی نسلوں کو نقصان پہنچے گا۔ عورتوں کی خوش اعتقادی کی یہ حالت ہے کہ بعض بیبیاں جب کوئی بات بیان کرتی ہیں اور ان سے کہا جائے کہ یہ بات غلط ہے تو کہتی ہیں غلط کیوں ہوتی میں نے کتاب میں پڑھی ہے کیا کتابیں بھی جھوٹی ہیں گویا ان کے نزدیک ہر کتاب کا سچا ہونا لازم ہے۔ میں بتائے دیتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ دیکھو کافروں کے پاس کتنی کتابیں ہیں جن میں شرک اور تثلیث تک کی باتیں لکھی ہوئی ہیں کہ وہ بھی چھپی ہیں اور آج کل کا مذاق تو یہ ہوگیا ہے کہ جو بات کسی کو معلوم ہوا سی کی ایک کتاب بنالی۔ بکری پالنے کی کتاب بھینس پالنے کی کتاب۔ ایسی ایسی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں جن سے چھاپنے والے روپیہ کماتے ہیں۔ آج کل جب مال داخل سرشت ہوگیا ہے جس طرح ہو سکے سچ سے جھوٹ سے عیب سے ہنر سے روپیہ کماتے ہیں۔ زبانی جھوٹ میں تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ کوئی غلطی نہ پکڑ لے اور کتاب لکھنے میں اس سے امن ہے۔ کتاب میں جو چاہو لکھ دیا اور اچھی ضخامت کی کتاب جلد تیار کر دی اور اشتہار خوب نمکین چھاپ دیا بس کچھ نہ کچھ رقم کھڑی ہو ہی

گئی۔ اس میں اگر جھوٹ اور فریب بھی ہوا تو بعد خرید لینے کے کوئی کیا کرلے گا بہت سے بہت دو چار گالیاں دے کر خاموش ہو جائے گا۔ یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ جب لوگوں نے دنیا میں بے حیائی اختیار کر لی ہے کہ جھوٹی سچی کتابیں بے دھڑک چھاپتے ہیں جس میں بعض وقت یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ اس کا بد نتیجہ ظاہر ہو جائے گا اور رسوائی اور فضیحت ہوگی اور قانون اور حکام کی طرف سے اس پر گرفت کی جاوے گی تو دین میں تو یہ کچھ بھی کر گزریں بعید نہیں کیونکہ وہاں یہ بھی اندیشہ نہیں کہ اس کی پاداش دست بدست مل جائے گی کیونکہ حق تعالیٰ نے دین کا معاملہ آخرت پر رکھا ہے اور دنیا کے لوگوں میں رسوائی نہیں ہوتی بلکہ اس کا عکس ہوتا ہے کہ جتنی کوئی جھوٹی جھوٹی اور رنگ آمیز باتیں کرے مجلس آرائی خوب ہوتی ہے اور خوب جاہ حاصل ہوتا ہے۔

پھر کتاب لکھنے والے کیوں احتیاط کرنے لگے اس میں تو ان کے بہت سے فائدے ہیں اس واسطے ہر کتاب کا اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے بلکہ غالب یہ ہے کہ آج کل دین کے نام سے جو کتابیں جدید تصنیف ہوتی ہیں وہ اکثر غلط ہوتی ہیں ان سے مقصود صرف کمائی ہوتی ہے اس واسطے میں کہتا ہوں کہ کتاب کے دیکھنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے عورتیں تو عورتیں مرد بھی اور ان میں سے جاہل ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ بھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں بس اسلم طریقہ یہی ہے کہ جب کوئی کتاب دیکھنی ہو کسی معتبر عالم کو وہ کتاب دکھلا کر پوچھ لے کہ میرے حسب حال اس کتاب کا دیکھنا مناسب ہے یا نہیں۔ یہ خطاب میں عام لوگوں سے ہی نہیں کرتا بلکہ بعض خواص اور لیاقت رکھنے والوں کو بھی کرتا ہوں کیونکہ آج کل بعضے پڑھے لکھوں کا یہ مشغلہ دیکھا ہی جاتا ہے کہ وہ غیر مذہب کی کتاب بہت دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ دوسرے مذہب میں کیا ہے محض آبائی تقلید سے اپنے مذہب کو سب سے بڑھ کر سمجھتے رہنا ٹھیک نہیں بلکہ تحقیق کے ساتھ اپنے مذہب کا معتقد ہونا چاہئے اور مذاہب باطلہ کی تردید کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہ کس قدر معتبر خیال ہے گو یہ بات ان کی فی نفسہ ٹھیک ہو لیکن وہ تحقیق اور تردید کے اہل نہیں۔ اس کے اہل حق تعالیٰ نے اس امت میں حفاظت دین کے لئے بہتیرے پیدا کئے ہیں جو ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں اور اس فن کے کاملین اتنی مبسوط اور مدلل ومفصل کتابیں لکھ گئے ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹا شبہ تک ان کے بیان سے نہیں بچا ان کے اصول ایسے ہیں کہ قیامت تک بھی جو شبہ پیدا ہو سکے گا اس کا جواب ان اصول سے مل سکے گا تو وہ لوگ اس کام کو کریں گے اور کرتے ہیں لیکن ہر شخص تو اس کا اہل نہیں کہ باطل کا مطالعہ کیا کرے اور اس کے مزخرفات سے دھوکہ میں نہ پڑے میں عوام کو مشورہ دیتا ہوں کہ دوسرے مذاہب کی کتابیں ہرگز نہ دیکھیں اور اس کام کو اس کے اہل یعنی علماء کے سپرد رکھیں۔

اہل باطل کی کتب کا مطالعہ مضر ہے

آخراور بھی تو بہت سے کام ہیں جو ہر شخص نہیں کر سکتا اوران کو دوسروں پر چھوڑ رکھا ہے دنیا میں وہ کون شخص ہے جو اپنی تمام ضروریات کو خود اپنے ہاتھ سے انجام دے سکتا ہو کہ کھیتی بھی خود ہی کر لے آٹا بھی خود ہی پیس لے روٹی بھی خود ہی پکا لے کھانے پکانے کے آلات ہانڈی، برتن، چمٹا توا وغیرہ بھی خود بنا لے جوتا بھی خود ہی سی لے۔کوئی ایک ہی شخص ایسا بتا دیجئے۔انسان کے مدنی الطبع ہونے کے یہی تو معنی ہیں کہ یہ اپنے کاموں میں محتاج ہے۔اور آج کل تو تقسیم عمل کا مسئلہ بہت ہی مسلم اور زبان زد ہے پھر دین ہی نے کیا قصور کیا کہ اس میں ہر شخص دخل دینے لگے اور دوسرے افراد کی احتیاج نہ سمجھے مجھے سخت تعجب ہے ان لوگوں سے جو تمدن کے مدعی ہیں اور رفارمر کہلاتے ہیں اور وہ دین کے لئے اپنی رائے کو کافی سمجھتے ہیں اور اس جماعت کی ضرورت نہیں سمجھتے جو اس کام کی متکفل ہے اسی طوفان بے تمیزی کو دیکھ کر میں نے خطاب عام کیا ہے کہ کوئی شخص اپنی رائے کو کافی نہ سمجھے اور اپنی رائے سے کسی کتاب کو نہ دیکھے بلکہ اس جماعت سے رائے لے لے جو اس کام کے لئے مخصوص ہے یعنی علماء سے عقل کی بات یہی ہے اور یہ ضروری بات ہے اس کو سرسری نہ سمجھا جاوے۔

نامشروع تحریر کا حکم

غرض نامشروع تحریر کا وہی حکم ہے جو نامشروع تقریر کا ہوگا اور کسی بات کا لکھنا زبان سے ادا کرنے ہی کے حکم میں ہے تو کتاب میں لکھنا اسی بات کا درست ہے اور اسی مضمون کو دیکھنا بھی درست ہے جس کا زبان سے کہنا درست ہے تو بری کتابوں کا لکھنا اور دیکھنا سب زبان ہی سے بری باتیں کہنے کے حکم میں ہے جس کا ناجائز ہونا میں نے عقلاً نقلاً ثابت کر دیا لہٰذا یہ مشغلہ چھوڑ دیا جاوے۔صاحبو! جو بات زبان سے کہی جاوے کتاب میں لکھی جاوے یا سنی جاوے یا پڑھی جاوے اس کو سوچ سمجھ کر اور خیال کر کے سن کر یا پڑھا یا دیکھا جائے بہت اہتمام کے ساتھ اس کی عادت کر لینی چاہئے۔جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے چھوٹے سے لفظ میں ان سب کو جمع کر دیا

ان الله كره لكم قيل وقال (مسند احمد ۴: ۲۴۹)

یعنی بک بک کرنا ناپسند فرمایا۔دعویٰ کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ جو کوئی قیل قال زیادہ کرے گا وہ ان سب مفاسد میں جن کو میں نے کسی قدر شرح وبسط کیساتھ بیان کیا ہے ضرور مبتلا ہوگا اور جو زبان کی حفاظت کرے گا وہ ان تمام مفاسد سے ضرور بچے گا۔

صاحبو! بتلایئے کہ یہ سب مفاسد قابل احتراز ہیں یا نہیں۔جب قابل احتراز ہیں تو ان کے انسداد کی تدبیر بھی ضروری ہوئی۔

دین و دنیا کی عافیت

اس حدیث میں تدبیر یہ ارشاد ہوئی ہے کہ قیل و قال کم کرو اس جملہ کی قدر وہ شخص جان سکتا ہے جس کو ان مفاسد سے از خود نفرت ہو لیکن اس نے یہ حدیث نہ سنی ہو اور اپنی عقل سے ان کے انسداد کی تدبیر سوچتا ہو اور ایک مدت اس میں صرف کر چکا ہو وہ اس حدیث کو سن کر حیران رہ جائے گا کہ اتنے عیوب کی دوا کیسی سہل اور مختصر بتلائی گئی ہے جب وہ اپنی کوشش پوری طرح صرف کر چکا ہو اور پریشان ہو گیا ہو کہ ان مفاسد کی تدبیر کیا کروں اس وقت اس کے سامنے یہ جملہ پڑھ دیا جائے تو واللہ اس کو وجد آ جائے گا کہ ایک جملہ میں سب کا علاج موجود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ زبان کو روکو جب زبان سے کم بولو گے اور زبان کے باب میں احتیاط کا خیال تمہارے دل میں جم جاوے گا تو نہ فضول بولو گے اور نہ فضول کتابیں دیکھو گے اور نہ کسی سے لڑائی جھگڑا ہو گا اس سے دنیا کی کتنی عافیت نصیب ہو گی اور جو مضرتیں فضول کتابوں یا باتوں پر مبنی تھیں ان سب سے حفاظت ہو جاوے گی یہ دین کی عافیت ہو گی تو کم بولنا کیا ہے حقیقت میں کنجی ہے دین و دنیا کی عافیت کی اور زیادہ بولنا کنجی ہے ہر قسم کے مفاسد کی ہم لوگوں کو یہ نعمتیں مفت ہاتھ آ گئی ہیں اس واسطے قدر نہیں ہوتی مگر عقل کی بات یہ ہے کہ ان جواہرات کی قدر کرو اور اس پر پورا پورا عمل کرو میرا مطلب یہ نہیں کہ بالکل بولنا چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کم بولو اور جب بات کرو تو پہلے سوچ لو کہ اس بات کی آیا ضرورت ہے یا نہیں اور یہ بات مفید ہو یا مضر دنیا کا یا دین کا کسی کا نفع تو دیکھ لو اگر کسی کا بھی نفع نہیں ہے تو مت بولو خاموش بیٹھے رہو۔ بے ضرورت بات کرنے سے قلب کی نورانیت جاتی رہتی ہے گو وہ بات جواز ہی کے مرتبہ میں ہو اور کوئی فتویٰ اس پر نہ لگ سکے۔ غرض زبان کی حفاظت بہت ضروری ہے اور کسی قدر مشکل بھی ہے مشکل ہونے کی دلیل ایک تو یہی ہے کہ عام و خاص عالم و جاہل اور اچھے اچھے سمجھدار اور زبان کے گناہ جاننے والے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ الا ماشاء اللہ کوئی بات تو ہے کہ اس سے بچاؤ نہیں ہوتا مگر چونکہ یہ فعل اختیاری ہے اس لئے قدرت سے خارج ہرگز نہیں اس کا اصل علاج تو ہمت ہے اور آدمی مکلف ہی اس لئے بنایا گیا ہے کہ نفس پر جبر کر کے احکام الٰہیہ کی تعمیل کرے گو وہ قدرے دشوار ہوں گے مگر قدرت میں ضرور داخل ہیں پس ہمت کر کے زبان کی حفاظت کرے جیسا کہ تمام افعال اختیاریہ کا یہی حال ہے اور علماء نے آسانی کے لئے اس کی کچھ تدبیریں بھی لکھی ہیں اور وہ علماء کی ایجاد نہیں بلکہ حدیث و قرآن ہی سے مستنبط ہیں۔ سب سے اول تو یہ تدبیر ہے کہ بے ضرورت بولو ہی مت جائز ناجائز کی گفتگو چھوڑ دو اس تفصیل میں نہ رہو کہ ناجائز بات نہ بولیں گے بلکہ جائز بات میں بھی احتیاط کرو کہ بے ضرورت شدیدہ نہ بولو کیونکہ جب زبان کو ذرا بھی وسعت دی جاتی ہے تو گناہ میں ضرور مبتلا ہو جاتی ہے۔

کفارہ مجلس

اور ایک تدبیر جو تدبیر ہونے کے ساتھ تدارک بھی ہے یہ ہے کہ جب دو چار آدمی جمع ہو کر باتیں کریں تو باتیں ختم کرنے سے پہلے کچھ ذکر اللہ اور ذکر الرسول بھی کر لیا کرو اس کی ضرورت حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث میں ہے

وما جلس قوم مجلسا لم یذکروا اللہ فیہ ولم یصلوا علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم الا کانت علیھم ترۃ (مسند احمد۲:۵۱۵)

یعنی مجلس میں لوگ باتیں کرتے ہیں اور اس مجلس میں حق تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہیں بھیجتے وہ مجلس ان کے لئے قیامت کے دن حسرت کا باعث ہوگی اور بھی کچھ نہ ہو تو ختم کرتے وقت یہی کہہ لیا کریں سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے) یہ لفظ جامع ہے ذکر اللہ اور ذکر الرسول دونوں کو علماء نے لکھا بھی ہے کہ یہ کفارہ مجلس ہے اس میں دو فائدے ہیں ایک تو یہ کہ جو لا یعنی باتیں زبان سے نکل جاتی ہیں ان کا اس سے کفارہ ہو جاتا ہے (کفارہ مجلس حدیث میں اور بھی آیا ہے جو کتاب الادعیہ میں مذکور ہے۔

سبحانک اللھم وبحمدک اشھدان لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک (سنن الترمذی : ۳۴۳۳)

(اے اللہ آپ پاک ہیں مع اپنی حمد کے گواہی دیتا ہوں سوائے آپ کے کوئی معبود نہیں مغفرت چاہتا ہوں آپ سے اور آپ کی طرف رجوع ہوتا ہوں) اور ایک فائدہ یہ ہے کہ جب آدمی اس کا التزام کرلے کہ ہر مجلس میں کفارہ مجلس ضرور پڑھ لیا کرے گا یا کوئی ذکر ضرور کیا کرے گا تو نفس کے اوپر اس پابندی کا بار ہوگا پھر گناہ کی بات تو کرے ہی گا نہیں بلکہ بولنا ہی کم کر دے گا کیونکہ جس کام پر کچھ تدارک کرنا پڑتا ہے اس کے انسداد میں اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہی ہے لیکن یہ اثر جب ہوگا کہ جب پورے پابند بنجائیے اور ہر وقت زبان کی نگرانی رکھیے اور ہر مجلس میں کچھ ذکر یا کفارہ مجلس ضرور کر لیا کیجئے اور میں صرف گناہ ہی کی باتوں کو نہیں کہتا ہوں جائز باتیں بھی کرو تو اس میں بھی اسے ملا لو۔

عطیہ الٰہی

افسوس ہے کہ لوگ زبان کو کچھ سمجھتے ہی نہیں اس کی قدر اس واسطے نہیں ہے کہ یہ ایسا عطیہ الٰہی ہے کہ کم ہوتا ہی نہیں اس کی قدر اس شخص سے پوچھیے جو اس نعمت سے محروم ہے ایک گونگے

سے یوں کہا جائے کہ ہم ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ تیری زبان گویا ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ تو سوائے اللہ اللہ کے کچھ نہ بولنا واللہ باللہ وہ اس کو خوشی سے منظور کر لے گا۔ یہ زبان نعمت بے انتہا ہے حق تعالیٰ نے اس کو بہت وسعت دی ہے لیکن یہ خود سمجھ لیجئے کہ یہ اصل میں عطا ہوئی ہے ذکر اللہ کے لئے ہاں ضرورت کے وقت اور کام میں لانے کی بھی اجازت دی گئی ہے اور اسکو آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اس کی نگرانی بھی ایسی ہی بے انتہا ہے جیسی یہ نعمت غیر محدود تھی۔ نص قرآنی موجود ہے مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ یعنی انسان کوئی کلمہ بھی منہ سے نہیں نکالتا مگر اس پر سخت نگراں تعینات ہے غرض جو بات منہ سے نکلتی ہے اچھی ہو یا بری ہو ذکر ہو یا غیر ذکر لکھ لی جاتی ہے۔ پھر سب باتیں محفوظ رہتی ہیں قیامت کے دن ایک ایک لفظ پر باز پرس ہوگی۔

دیکھئے کس قدر فکر کی چیز ہے ایک دن کی باتوں کا حساب بھی اگر کوئی دینا چاہے تو مصیبت میں آ جاوے پھر ساری عمر کی باتوں کا حساب تو جیسی مصیبت ہے معلوم ہے حق تعالیٰ درگذر ہی کریں تو خیر ہے ورنہ کہیں ٹھکانہ نہیں ہم لوگ درگزر کے بھروسہ بیٹھے ہیں لیکن یہ سخت غلطی ہے اگر درگزر نہ ہوئی تو کیا ہوگا۔ یہ ایسی بات ہے جیسے پرانے زمانہ میں اس زمانہ کی رسم کے موافق بعض دفعہ پھانسی کے مجرموں کو یہ بات پیش آئی ہے کہ پھانسی گلے میں ڈالی گئی اور لٹکائے گئے تو رسی ٹوٹ گئی اور موت سے بچ گئے اس کو دیکھ کر کیا کوئی یہ ہمت کر سکتا تھا کہ اپنے گلے میں پھانسی ڈال کر لٹکا کرے اور یوں کہے کہ ممکن ہے رسی ٹوٹ جائے اور میں نہ مروں تو کیا کوئی اس کی ہمت کر سکتا ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ عقل کی بات ہے۔ صاحبو! یہی حالت گناہ کی ہے کہ گناہ کرنا گلے میں پھانسی ڈالنا ہے اس کا ذاتی اثر تو یہی ہے کہ عذاب میں ڈال دے اور کیسا عذاب جو پھانسی سے بدرجہا بدتر ہے یہ اور بات ہے کہ کبھی عفو الٰہی سے اس پر عتاب کا نتیجہ متفرع نہ ہو۔ جیسے کبھی پھانسی کی رسی ٹوٹ جاتی ہے جو شخص گناہ کی ہمت کرتا ہے اس کو چاہئے کہ پھانسی میں بھی لٹکنے کی ہمت کرے ہر گناہ کی یہی حالت ہے خصوصاً زبان کے گناہ تو بدترین گناہ ہیں ان سے تو بہت خوف کرنا چاہئے۔ کثرت کلام میں یہ تو زبان کے گناہ کے متعلق بیان ہوا۔

کثرت کلام کا منشاء

اب ایک قاعدہ اور سمجھنا چاہئے کہ ہر فعل کا کوئی نہ کوئی منشاء ہوتا ہے یعنی اگر کوئی گالیاں بکتا ہے تو گالیاں بکنا تو زبان کا فعل ہے مگر اس کا منشاء اندر ہے یعنی قلب میں غضب ہونا جب قلب میں غصہ آتا ہے تب زبان سے گالیاں نکلتی ہیں ہر فعل کی یہی حالت ہے کہ اس میں جوارح قلب کے تابع ہوتے ہیں جب قلب کو حرکت ہوتی ہے تب ہی جوارح کو ہوتی ہے اور قلب کی حرکت کا

بھی کوئی سبب ہوتا ہے جس سے اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اس سبب ہی کو منشاء کہتے ہیں اب سمجھ لیجئے کہ کثرت کلام کا منشاء کیا ہے جس سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے سوچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز ترفع ہے یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی ایسے موقع پر زیادہ نہیں بول سکتا جہاں اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے دیکھو اپنے کسی بزرگ کے سامنے اور استاد کے سامنے کوئی زیادہ نہیں بولتا اس واسطے کہ اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہے اور اس کو بڑا اپنے ہم جولیوں میں یا اپنے چھوٹوں کے سامنے بے محابا بولتا ہے ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ کثرت کلام جب ہی ہوسکتی ہے جبکہ اپنا بڑا ہونا اپنے ذہن میں ہو اور جب آدمی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھے تو ممکن نہیں کہ اس سے کثرت کلام ہوسکے اب میں پوچھتا ہوں کہ ہمارے لئے کوئی موقع اپنے کو بڑا سمجھنے کا ہے یا نہیں میں کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں کیونکہ ہم لوگ جو اپنے لئے بڑے بننے کا کوئی موقع تجویز کرتے ہیں۔ یہ اسی وقت تک ہے جب تک ہماری نظر کوتاہ ہے اور اگر ذرا بھی اس میں وسعت ہوتی تو کوئی موقع بھی بڑے بننے کا نظر میں نہ آتا اس واسطے کہ اگر کوئی آدمی کسی سے بڑا ہے تو اس کے اوپر بھی ایک بڑا ضرور موجود ہے اور حالت یہ ہے کہ جس سے یہ بڑا ہے بعض اوقات اس کے سامنے بھی نہیں ہوتا اور جو اس سے بڑا ہے وہ ہر وقت اس کے سامنے ہے وہ کون یعنی حق تعالیٰ شانہ صاحبو! کوئی آدمی لاکھ بڑوں کا بڑا ہو مگر حق تعالیٰ کے سامنے تو چھوٹا ہی ہے اور حق تعالیٰ ہر وقت حاضر ناظر ہیں۔ تو اس کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جب ہی ہوسکتا ہے جب حق تعالیٰ کی طرف سے نظر ہٹ جائے اور یہ کس قدر غفلت اور حرمان کی بات ہے۔

ہر آں کہ غافل از دے یک زمان ست درآں دم کافرست اما نہاں ست

(جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھر میں کافر ہے لیکن نہاں ہے)

مجموعۃ الامراض

پس اپنی بڑائی نظر آنے کا وہی وقت ہے جب حق تعالیٰ سے غفلت ہو اور کثرت کلام اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ اپنی بڑائی ذہن میں ہو نتیجہ یہ نکلا کہ کثرت کلام اسی وقت ہوسکتی ہے جب حق تعالیٰ سے غفلت ہو اور خدا سے غفلت ایک مرض نہیں بلکہ مجموعۃ الامراض ہے تو جس شخص کو کثرت کلام میں مبتلا دیکھو سمجھ لو کہ ایک مرض میں مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے امراض میں مبتلا ہے یہی باتیں ہیں جن سے عارفین کو ذرا سی بات میں آدمی کی پوری حالت معلوم ہوجاتی ہے اور یہی فرق ہے ظاہری تعلیم اور باطنی تعلیم کرنے والوں میں کہ وہ جڑ کو دیکھتے ہیں۔ وہ کثرت کلام کو دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ اس شخص میں وہ تمام امراض موجود ہیں جو ترفع اور تکبر کی فرع ہیں۔

اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے مقاصد

صاحبو! اپنے آپ کو بڑا سمجھنا ایسا فعل ہے جس میں مفاسد ہی مفاسد ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو کبھی بڑا نہ سمجھے اگر یوں ذہن میں نہ آوے تو چاہئے بہ تکلف اس کی مشق اہل اللہ نے اس کی تدابیر لکھی ہیں اور یہ ہیں کہ اگر اپنے سے چھوٹے کو دیکھے تو اس وقت یہ خیال کرے کہ یہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے اس نے گناہ کم کئے ہیں میری عمر زیادہ ہے گناہ بھی میرے زیادہ ہوں گے اور اپنے سے بڑے کو دیکھے تو یوں خیال کرے کہ اس کی عمر زیادہ ہے اس نے نیکیاں مجھ سے زیادہ کی ہوں گی۔ لوگ ان باتوں کو توہمات سمجھتے ہیں لیکن یہ توہمات ہی کام دینے والے ہیں آخر اپنے کو بڑا سمجھ کر کونسی بات حاصل ہو گی اور کیا نفع ہو جائے گا شیطان ایک یہ بھی وسوسہ ڈالتا ہے کہ ان خیالات کے یعنی دوسروں کے گناہ کم ہونے اور دوسروں کی طاعات کے زیادہ ہونے کا تو کوئی ثبوت نہیں پھر خواہ مخواہ ان میں پڑنا سوائے خبط الحواسی کے اور کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ اس کا جواب الزامی دیجئے اور نفس و شیطان سے پوچھئے کہ جو باتیں اور خیالات تو القاء کرتا ہے مثلاً اپنے بڑا ہونے کا کیا وہ سب واقعی ہوتی ہیں اگر غور سے دیکھیں تو شیطان کے القاء کردہ خیالات یعنی ترفع اور تکبر کی باتیں سب بے اصل اور محض وہمی اور خیالی ہوتی ہیں چنانچہ ایک ذرا سے بچے کو دیکھئے کہ جب وہ کسی سے لڑتا ہے تو وہ بھی دوسرے سے کہتا ہے کہ میں تجھے مار ڈالوں گا اور زمین میں گاڑ دوں گا اور تیرے بڑوں تک کو سمجھ لوں گا اس وقت اس کے ذہن میں یہ سب باتیں سچ سچ ہوتی ہیں مگر کوئی صاحب بتا دیں کہ یہ باتیں کیا واقعی ہیں کیا وہ سچ مچ اس کو دفن کر سکتا ہے اور اس کے حمایتوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے کچھ بھی نہیں۔ ایک ہوا ہے جو سر میں بھر جاتی ہے اور اپنے آپ کو بڑا دکھاتی ہے تو جب شیطان خود اپنا کام بنانے کے لئے خیالی باتوں سے کام لیتا ہے تو ہم بھی اس کے جواب میں خیالی باتوں سے کام لیں تو کیا حرج ہے یہ ایسا جواب ہے کہ اس کے آگے نفس اور شیطان کو کچھ جواب نہیں آ سکتا اور یہ جواب الزامی بھی ہے اور تحقیقی بھی ہے الزامی ہونا تو ظاہر ہے اور تحقیقی ہونا اس طرح ہے کہ یہ بات اپنے موقع پر ثابت ہو چکی ہے کہ خیالی بات بھی موثر ہوتی ہے۔ چنانچہ شیطان خیالی بات ہی سے گناہ کرا دیتا ہے پھر خیالی بات کو اگر ہم اچھے مقصود میں موثر بنائیں تو کیا استبعاد ہے غرض اپنا کبر مٹانے کے لئے خیال ہی سے کام لیجئے اور اس کو فضول بات نہ سمجھئے۔ دنیا کے ہزاروں کام ہیں جو خیال ہی پر مبنی ہیں بڑے بڑے مکانات اور اعلیٰ پیمانہ کی تجارتیں محض اسی خیال پر مبنی ہیں کہ شاید ہماری عمر دراز ہو جائے تو اس سے راحت ملے گی حالانکہ یہ محض ایک خیالی ڈھکوسلہ ہے پھر ازالہ کبر ہی کے لئے خیالی باتوں سے اب کیوں پرہیز ہے۔

بزرگوں کے ازالہ تکبر کے چند واقعات

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ آپ چلے جاتے تھے راستہ میں ایک کتا ملا وہ سامنے سے آتا تھا راستہ تنگ تھا اور آس پاس کیچڑ تھی دونوں ایک دم سے نہیں جا سکتے تھے۔ بس یہی صورت تھی کہ یا تو یہ کیچڑ میں اترتے یا وہ اترتا۔ یہ بھی کھڑے ہو گئے وہ بھی کھڑا ہو گیا انہوں نے کتے سے کہا کہ راستہ چھوڑ کر کیچڑ میں اتر جا اس نے کہا تم کیوں نہیں اترتے انہوں نے کہا کہ میں مکلف ہوں میرے کپڑے یا بدن ناپاک ہو جائیں گے تو نماز نہ ہوگی۔ اس نے کہا اگر کپڑے نجس ہو گئے تو پانی سے ذراسی دیر میں پاک ہو سکتے ہیں لیکن میرے اترنے سے جو آپ کے باطن میں نجاست پیدا ہو گی کہ مجھ سے اپنے کو بڑا سمجھا اور کیچڑ میں نہ اترے تو یہ ناپاکی ہزار سمندروں سے بھی پاک نہ ہو گی۔ میں تو اتر ہی جاؤں گا میرا کیا بگڑے گا اور تمہارا قلب بگڑ جائے گا اور وہ سمندر میں بھی دھونے سے پاک نہ ہوگا۔ یہ سن کر ان پر ایک حالت طاری ہوئی اور بہت روئے اور کیچڑ میں اتر پڑے۔ حضرت بایزید کی حکایت ہے کہ ایک بار راستہ میں ایک کتے سے دامن بچا کر نکلے کتے نے کہا میری ظاہری نجاست کو دیکھا اور اپنی باطنی نجاست کو نہ دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تجھ سے دوستی کر لوں اس نے جواب دیا کہ تمہارا میرا کیا ساتھ تمہاری تعظیم وتکریم ہوتی ہے اور مجھ کو ہر شخص دھتکارتا ہے اس پر یہ بہت روئے اور کہا کہ جب ایک کتا مجھے دوستی میں قبول نہیں کرتا تو حق تعالیٰ کے مقبول بننے کا کیسے خیال کیا جائے۔ انہیں بزرگ کی ایک اور حکایت ہے جس کو شیخ نے بوستاں میں لکھا ہے۔

شنیدم کہ روزے سحر گاہ عید ز گرما برآمد بروں بایزید

(میں نے سنا کہ ایک روز عید کی صبح کے وقت بایزید حمام سے باہر نکلے)

قصہ یہ ہے کہ حضرت بایزید ایک دفعہ عید کے روز حمام میں سے غسل کر کے کپڑے بدل کر نکلے راستہ میں جا رہے تھے کہ کسی نے کوٹھے پر سے کوڑے کا ٹوکرا سر پر پھینک دیا یہ ایسی بات تھی کہ اس پر اتنے بڑے شخص کو غصہ آنا کم تھا مگر ان بزرگ نے کچھ بھی نہیں کہا اور سیدھے گھر کو چلے آئے اور نہا دھو کر دوسرے کپڑے پہن لئے پیشانی پر بل بھی نہیں پڑے ایک تو یہ ان حضرات کے حالات ہیں اور ایک ہمارے حالات ہیں کہ ٹوکرا تو کہاں اگر کوئی بات بھی خلاف مزاج کہہ دے تو آپے میں نہ رہیں رگیں پھول جائیں آنکھیں سرخ ہو جائیں منہ میں جھاگ آ جائے اور بلا انتقام لئے ہرگز نہ مانیں اور سزا میں بھی یہ نہ ہو کہ جرم کے برابر ہی سزا دیں اور بدلہ پر اکتفا کریں بلکہ جہاں تک بھی قابو چلے اس کی عقوبت میں کمی نہ کریں ترفع کا مادہ انسان میں طبعاً رکھا ہوا ہے بڑے بڑے مجاہدوں سے اصلاح ہوتی ہے۔

آج کل کا خبط

آج کل بجائے اس کے کم کرنے کے نئی چال یہ نکلی ہے کہ اس کو بالقصد حاصل کیا جاتا ہے اور ہر ہر بات میں دوسرے سے بڑھنا چاہتے ہیں وضع میں بھی چال ڈھال میں بھی بات چیت میں بھی غرض ہر کام میں آج کل یہ خبط ہے کہ وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جس سے دوسرے کی نظر میں اپنا رفیع ہونا ثابت ہو اور نظریں اٹھیں حالانکہ جب دیکھنے والے کو یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ صرف بناوٹ ہے تو بجائے نظر میں وقعت ہونے کے اور ذلت ہو جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ معمولی حجام اور خدمت گار بلکہ بھنگی تک کوٹ پتلون اور بوٹ پہن کر گھڑی لگا کر نکلتے ہیں اپنے نزدیک تو وہ ترفع کی ترکیب کرتے ہیں مگر مخلوق کیا ایسی بے وقوف ہے کہ شریف اور کمین کو نہیں پہچانتی۔ بعض دیکھنے والے تو ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں اور اکثر یہی ہے کہ شریف اور رذیل تعلیم یافتہ کی صورت چھپتی نہیں جب لوگ اس کو پہچان لیتے ہیں تو حد سے زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں میں تو کہتا ہوں اگر نظریں اٹھنے کی خواہش ہے تو ایک ہڈ ویعنی چہرہ خرید لو جو دو پیسے میں آ جائے گا اور منہ پر باندھ لو پھر دیکھو جہاں کو نکلو گے نظریں تمہارے ہی اوپر اٹھیں گی بلکہ لونڈے تالیاں بجاتے ہوئے تمہارے ساتھ ساتھ ہوں گے پھر دیکھنا کیسی شہرت ہوتی ہے۔ آج کل لوگوں نے ایسی صورت بنائی ہے جن سے ڈر معلوم ہو اور خود بھی بیان کرتے ہیں کہ ایسی وضع رکھنی چاہئے کہ جس سے دوسرے پر اثر پڑے یعنی ڈر جائے گویا بھیڑیا بنتے ہیں کہ جہاں کو نکل جائیں لوگ ڈرتے چلے جائیں میں پوچھتا ہوں ڈرانا کس کو مقصود ہے اول تو اس وضع سے یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا کیونکہ لوگ جان گئے ہیں کہ یہ وضع محض بناوٹ ہے اور واقع میں کوئی چیز نہیں اور اگر حاصل ہو بھی تو کس کو ڈرانا مقصود ہے اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو کہ جن کی نسبت قرآن مجید نے تو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (تمام مومن آپس میں بھائی ہیں) صاف فرمایا ہے اور حدیث میں ہے

من اخاف مسلما اخافه الله او کما قال (مجمع الزوائد ۳: ۲۸۳ بلفظ آخر)

(جو شخص کسی مسلمان کو ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ڈرائیں گے) اور آج کل تو عقلاء زمانہ بھی اپنے آپ کو اصول مساوات کا بڑا شیدائی بتلاتے ہیں تو بتلایئے کہ مساوات ڈرانے میں ہے یا نہ ڈرانے میں۔ آج کل کے اقوال و افعال بھی عجیب متعارض ہیں زبان سے اصول مساوات کی تعریف کرتے ہیں اور عملاً اپنے بھائیوں کو ڈرانا چاہتے ہیں اور ڈرانا مستلزم ہے بڑا بننے کو اور ظاہر ہے کہ بڑا بننا اور مساوات ضدین ہیں۔

باہمی محبت عجیب چیز ہے

صاحبو! کیا مسلمان ایسی چیز ہیں کہ ان کو ڈرایا جاوے مسلمان حق تعالیٰ کے محبوب ہیں ان کو

ڈرانا چاہئے یا ان سے محبت رکھنی چاہئے مسلمان تو ایسی چیز ہے کہ فرشتے تک اس کا ادب کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ حق تعالیٰ کی نظر بھی اس پر رحمت کے ساتھ پڑتی ہے۔ پھر جس پر احکم الحاکمین اور مقربین کی نظر رحمت ہو اس کے متعلق یہ کون عقلمند تجویز کر سکتا ہے کہ اس کو ڈرایا جاوے ایک ادنیٰ کلکٹر کا چپراسی جو کلکٹر صاحب کا کسی قدر منہ لگا ہو اس کو تو کوئی ڈرا ہی نہیں سکتا بلکہ سب اس کے نخرے اٹھاتے ہیں بلکہ اس کی جا بیجا حرکتوں کو سہتے ہیں پھر جو شخص احکم الحاکمین کا مقرب ہو اس کے ساتھ کیا برتاؤ رکھنا چاہئے لطف یہ ہے کہ آج کل ہمدردی کا سبق بھی ہر شخص کی زبان پر ہے۔ کیوں صاحب کسی سے ہمدردی ڈرانے میں ہوسکتی ہے یا اس سے محبت کرنے میں اگر ہمدردی کرنا چاہتے ہو تو باہم تعلقات ایسے رکھنے چاہئیں جس سے محبت پیدا ہو اور یہ دعویٰ سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے کو دبانے اور ڈرانے سے محبت نہیں ہوتی بلکہ خود دب جانے اور ڈر جانے سے محبت پیدا ہوتی ہے باہمی محبت اگر واقعی ہو تو عجیب چیز ہے شریعت نے اس کی بڑی قدر کی ہے اور اس کو ضروریات میں سمجھا ہے اور ہر ہر بات میں اس کا خیال رکھا ہے کہ محبت کی تاسیس ہو جس حکم شرعی کو اٹھا کر دیکھئے اس میں اس کا پورا التزام ہوگا کہ مخالفت نہ پیدا ہو چنانچہ معاملات میں عام اصول کر دیا ہے جو شرط مفضی الی النزاع (جھگڑے کی طرف پہنچانے والی) ہو وہ جائز نہیں اور مفسد عقد ہے بتایئے کسی قانون نے الفت و محبت کا اس قدر خیال رکھا ہے اور دیکھئے اصول شرعی ہے

لا خیر فیمن لا یالف و لا یولف (مسند احمد ۲: ۴۰۰)

یہ حدیث ہے یعنی اس شخص میں کچھ بھی بھلائی نہیں جو نہ خود دوسروں سے محبت رکھے نہ دوسرے اس پر محبت رکھیں۔ بعض لوگ ایسے اکھڑ مزاج کے ہوتے ہیں کہ ان کو ملنا جلنا پسند نہیں آتا اس حدیث میں ان کی مذمت وارد ہے۔

شریعت کا بے نظیر تمدن

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے تعلقات بڑھانا پسندیدہ ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ضروری تعلقات کو قطع نہ کرنا چاہئے اور ان تعلقات کو شریعت نے ایسی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی بے نظیری کے وہ لوگ بھی قائل ہو گئے ہیں جو تمدن کے مدعی تھے یعنی فلاسفر اور انہوں نے صاف لکھ دیا ہے کہ تمدن کو شریعت مصطفویہ نے ایسا مکمل بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم اپنی کتابوں میں اس کو بیان نہ کریں گے یہ حکماء کا قول ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جہاں شریعت نے میل جول کی تعلیم دی ہے اس موقع پر میل نہ کرنا مذموم ہے۔ بلکہ وہاں محبت رکھنی چاہئے شریعت نے محبت کو منع نہیں کیا ہے بلکہ اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے ہاں

بناوٹ اور محض ظاہری محبت سے منع کیا ہے اور اس محبت کی تعلیم دی ہے جو ظاہر و باطن اور حاضر و غائب ہر حالت میں یکساں ہو جس میں سوائے للہیت کے کچھ نہ ہو ایسی محبت کی بے انتہا فضیلت حدیث میں وارد ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ندا دی جائے گی

این المتحابون فی اللہ اظلھم فی ظلی یوم لا ظل الا ظلی (السنن الکبری للبیھقی ۱۰ : ۲۳۳ بلفظ آخر)

یعنی وہ لوگ کہاں ہیں جو آپس میں حب فی اللہ رکھتے تھے آج میں ان کو اپنے سایہ میں جگہ دوں گا جبکہ کوئی سایہ سوائے میرے سایہ کے نہیں ہے ایسی محبت کیسی اچھی چیز ہے اور واقعی محبت یہی ہے۔ ہم لوگوں کی محبت بلکہ وہ محبت بھی جس کو آج کل عشق کہتے ہیں کوئی چیز نہیں۔

حقیقی محبت

یہ دیکھا گیا ہے کہ دو شخصوں میں بہت گہری محبت تھی کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب یکجا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ ان میں بڑی محبت ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا لیکن ذراسی بات پر بگاڑ ہو گیا تو مقدمہ بازی اور فوجداری تک نوبت آ گئی اور ساری محبت، مبدل بہ عداوت ہو گئی یہ کیا محبت ہے جو محض چندروز کا جوش ہے۔ لوگوں نے حقیقی محبت دیکھی ہی نہیں۔ حقیقی محبت وہ ہے جو کسی وجہ سے بھی زائل نہ ہو سکے وہ محبت دنیا کے فنا ہونے سے بھی فنا نہیں ہوتی۔ امام شافعی صاحب کا مقولہ ہے کہ ہمیں تو جنت کی آرزو اس لئے ہے کہ وہاں دوستوں سے ملاقات رہے گی یہ نہ ہوگا جو دنیا میں ہوتا ہے کہ ہمارا ایک دوست ہے اور اس سے گہری دوستی ہے اور کوئی وجہ پیدا ہو گئی تو وہ مغرب سے مشرق کو چل دیئے یا موت آ گئی مر گئے بس احباب تڑپتے رہ گئے۔ وہاں نہ جدائی کا خوف نہ موت کا اندیشہ خدا تعالیٰ نصیب فرمادیں۔ اللہ اکبر آپس کی محبت کیا چیز ہے جس کو اہل اللہ نے مقصود بنایا اور اس کے لئے جنت کو مقوع ٹھہرایا۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے آج کل بناوٹ اور رسوم کا نام محبت رکھا ہے چنانچہ علماء نے جوریا اور نمود کے لین دین کو روک دیا تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو طریقے میل جول کے اور جو ذرائع محبت کے رہ گئے تھے ان کو مولوی لوگ اڑا دیتے ہیں ؏ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ (جب حقیقت کا پتہ نہ چلا ڈھکوسلوں کا راستہ اختیار کیا) میں کہتا ہوں ان رسوم کو محبت سے مس ہی نہیں بلکہ ان میں اثر یہ ہے کہ ان سے محبت جاتی رہتی ہے۔ یاد رکھیے محبت کے لئے سادہ ہی زندگی مناسب ہے اور جہاں تکلفات آئے بس محبت کی جڑ کٹی۔ صاحبو! یہ تو بہت ہی موٹی بات ہے کہ محبت کا نباہ متعاودین ہی میں ہو سکتا ہے یہ کہیں نہیں ہوتا کہ ایک بادشاہ اور ایک بھنگی میں محبت ہوئی اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں تساوی نہیں

یہ تو ہوتا ہے کہ بھنگی کو بادشاہ کے ساتھ محبت ہو مگر ادھر سے محبت نہیں ہوتی (برابری) ادنیٰ کو اعلیٰ کے ساتھ محبت ہو سکتی ہے مگر اعلیٰ کو ادنیٰ کے ساتھ نہیں ہوتی۔ دونوں طرف سے محبت جب ہی ہوتی ہے کہ تساوی ہو اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں تساوی یا اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب امیر ہو جائیں اور یا اس طرح ہو سکتی ہے کہ سب غریب ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ سب کا امیر بننا تو اختیاری نہیں ہاں غریب بننا اختیاری ہے۔ پس محبت کی صورت یہی ہے کہ سب غریب بن کر رہیں اس سے مراد یہ نہیں کہ اپنے اپنے اموال کو پھینک کر محتاج بن جائیں بلکہ غریب بننے سے مراد عادات اور معاشرات میں غریب بن جانا ہے۔ اسی کو دوسرے لفظ میں کہا جاتا ہے کہ سادہ زندگی ہی میں محبت ہو سکتی ہے۔ کہاں ہیں آج کل کے فلسفی جو ہمدردی ہمدردی پکارتے پھرتے ہیں اور تنعم اور تکلف میں کھپے ہوئے ہیں کیا تنعم کے ساتھ ہمدردی جمع ہو سکتی ہے ہمدردی کا ہم معنی لفظ محبت ہے اور میں ابھی ثابت کر چکا ہوں کہ محبت کے ساتھ مساوات شرط ہے اور تنعم مساوات کے خلاف ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تنعم کے ساتھ ہمدردی جمع نہیں ہو سکتی مگر آج کل مصلحان قوم تنعم کی صورت میں ہمدردی کے طالب ہیں۔ یہ عجیب غلطی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ شریعت کی تعلیم کیسی گہری تعلیم ہے اور جس معاشرت کو حضرت سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے پسند کیا وہ کیسی اچھی معاشرت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے رہتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تکیہ میں کھجور کی چھال بھری تھی۔ حدیث میں رث البیت رث الاھیئت کا لفظ آیا ہے یعنی آپ کی وضع بھی سادی تھی اور بود و باش بھی سادی تھی ممتاز جگہ پر بھی آپ نہ بیٹھتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں باہر کے لوگ آتے تھے تو پہچان نہیں سکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں اور پوچھنا پڑتا تھا کہ من محمد فیکم (تم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں) جب صحابہ بتلاتے تھے ھذا الابیض المتکی (یہ گورے چٹے تکیہ کا سہارا لگانے والے) تب پہچان ہوتی تھی (صلی اللہ علیہ وسلم) متکی کے معنی تکیہ پر بیٹھنے والے کے نہیں بلکہ ہاتھ کا یا دیوار وغیرہ کا سہارا لگانے والے ہجرت کے واقعہ میں آتا ہے کہ مسجد قبا میں انصار حضرت ابوبکرؓ سے بہت دیر تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دھوکہ میں مصافحہ کرتے رہے کچھ ٹھکانا ہے جانبین سے سادگی اور بے تکلفی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع میں کسی بات کا امتیاز نہ تھا ورنہ لوگ پہچان ہی نہ لیتے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ کہ آپ نے اس کو خلاف ادب نہیں سمجھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف

سے بچانے کے لئے بجائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خود مصافحہ کرتے رہے یہ ہے مساوات اب کوئی آج کل کے لوگوں سے پوچھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو ایسا برتاؤ کیا کیا ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں تھی۔ دیکھئے کس قدر سادگی ہے اس برتاؤ میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت کو سب جانتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد دو برس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ زندہ رہے مگر روایات میں آیا ہے کہ کبھی ہنسی نہیں آئی کیا اس کی کوئی نظیر دکھلا سکتا ہے۔

معاشرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

صاحبو! محبت سادہ ہی زندگی میں ہو سکتی ہے میرے ذوق سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ برتاؤ رفع تکلیف کے لئے کیا تھا تاکہ اول وقت سے ہی لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت سے واقف ہو جائیں اور آج کل یہ خیال ہے کہ جب تک بناوٹ نہ کی جائے ہیبت اور رعب نہیں ہوتا اسی واسطے ڈراؤنی شکلیں بناتے ہیں کپڑے اس طرح کے پہنتے ہیں جن سے پتلا دبلا آدمی بھی بہت بڑا معلوم ہو چلتے اس طرح ہیں کہ دور تک کھٹ کھٹ آواز جاوے بولنے میں لہجہ ایسا اختیار کرتے ہیں کہ سننے والا ہیبت میں آجاوے مگر کیا ہے ہیبت تو خداداد ہوتی ہے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت یہ تھی جس میں ہر طرح سے عبودیت اور تواضع کا خیال رکھا جاتا تھا۔ اٹھنے میں بیٹھنے میں کھانے میں چلنے میں بولنے میں چالنے میں کوشش کی جاتی تھی کہ ذرا بھی بڑے بننے کا اور امتیاز کا شائبہ نہ آنے پائے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین (سنن الترمذی: ۲۳۵۲)

یعنی اے اللہ مجھ کو زندگی میں بھی مسکین رکھنا اور موت بھی مسکینوں میں دینا اور قیامت میں بھی مسکینوں میں اٹھانا جس شخص کی یہ حالت ہو اس کا تو رعب بالکل ہی نہ ہونا چاہئے لیکن دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب کی حالت کیا تھی۔ کسی بادشاہ کے دو قاصد مدینہ آئے تھے کہ بادشاہوں کے قاصد بادشاہوں کی معاشرت دیکھے ہوئے اور بڑے بڑے لشکر اور فوجوں کے دیکھنے والے تھے۔ بڑے بڑے سلاطین کے یہاں جاتے تھے۔ یہاں نہ دربار تھا نہ فوج تھی نہ کوئی سامان رعب کا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وضع قطع بالکل غریبوں کی سی تھی لوگوں میں بیٹھے ہوتے تو پہچانے بھی نہ جاتے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو راوی کا بیان ہے کہ مارے ہیبت کے ان کے بازو کانپتے تھے **فرعدت فرائصھما** کا لفظ آیا ہے یعنی ان کے بازوؤں کی رگیں ایسی کانپتی تھیں جیسے کسی کو جاڑا چڑھا اور بات نہ کر سکتے تھے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر سے رعب کم کرنے کے لئے فرمایا میں تو ایک ایسی غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی آج کل کا کوئی فلسفی بتلائے کہ رعب کاہے کا

تھا اور جب اپنی آنکھوں نے دیکھ لیا کہ ایسا رعب تھا پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ بلا بناوٹ کے رعب نہیں ہو سکتا ع۔ ہیبت حق است ایں از خلق نیست (یہ ہیبت حق ہے مخلوق کی ہیبت نہیں)

ہر کہ ترسید از حق و تقوے گزید ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ اختیار کرتا ہے اس سے جن وانسان اور جو شخص دیکھتا ہے ڈرتا ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت اعلیٰ وارفع ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے لئے بھی یہی ہیبت تھی۔

فتح بیت المقدس کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عالم

دیکھئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ جب شام کی طرف تشریف لے گئے تو نہ ٹھاٹ کا سامان تھا نہ رعب داب کی کوئی تدبیر کی گئی تھی بلکہ اور یہ ہوا کہ امیر المومنین کے پاس ایک ہی اونٹ تھا اور سوار ہونے والے ایک آپ تھے اور ایک غلام تھا قرارداد یہ ہوئی کہ اس پر ایک میل مثلاً خود سوار ہوں اور ایک میل غلام سوار ہو۔ یہاں سے ہم لوگوں کو یہ بھی سبق لینا چاہئے کہ سفر رفیق کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے آج کل لوگوں کی عجیب حالت ہے کہ جس کو ذرا سا بھی امتیاز حاصل ہو وہ اور رفیقوں سے بڑا بننا چاہتا ہے خواہ وہ امتیاز فرضی اور وہمی اور اپنے ہی خیال کے موافق ہو اور دوسروں پر ان کو بڑا بننے کا کوئی حق حاصل نہ ہو مثلاً کوئی مولوی صاحب ہیں یا کوئی حکیم صاحب ہیں یا کسی محکمہ کے افسر ہیں تو وہ جب راستہ کو نکلتے ہیں ان کے دل میں خواہش ہوتی ہے بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ راہگیر بھی جو نہ ان کے شناسا ہیں اور نہ ان پر کوئی حکومت ہے وہ بھی ان سے آگے نہ چلیں اور ان کو سلام کریں اور جو ان کے کچھ شناسا یا شاگرد ہیں یا ان کے محکمہ کے ملازم ہیں ان کی تو کیا مجال ہے کہ سامنے بول بھی سکیں۔ صاحبو! یہ نخوت اور تکبر ہے آپ کو یہ کیا استحقاق حاصل ہے کہ راہگیروں سے آپ کو امتیاز ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک محکوم اور زرخرید غلام کے ساتھ جس پر ان کو ملک رقبہ حاصل ہے یہ برتاؤ کرتے ہیں کہ ایک میل یہ پیدل چلیں اور ایک میل وہ۔ یہ ہے مساوات۔ کہاں ہیں مدعیان مساوات اس کی نظیر دکھائیں اور یہ ہے طریقہ اسلامی، غرض بیت المقدس پہنچے وہاں شہر کے دروازہ پر علماء اہل کتاب انتظار میں تھے جنہوں نے خلیفۃ المسلمین کو دیکھنے کے لئے بلایا تھا اور یہ بات طے ہوئی تھی کہ اگر خلیفہ وہی ہیں جن کی خبر اگلی کتابوں میں ہے تو ہم ان سے نہیں لڑیں گے یہ ثابت ہے کہ ان سے کوئی جیتے گا نہیں اور اگر وہ نہیں ہیں تو ہم لڑیں گے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو لوگوں نے عرض کیا کہ اس وقت مناسب یہ ہے کہ گھوڑے پر سوار ہو جائیے آپ نے ان کے اصرار سے منظور کر لیا اور گھوڑے پر

چڑھے مگر فوراً ہی اتر پڑے اور فرمایا کہ اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے اور فرمایا نحن اقوام اعزنا اللہ بالاسلام یعنی ہم کو حق تعالیٰ نے اسلام سے عزت دی ہے بس یہی کافی ہے اس کے سوا کسی طریقہ عزت کی ہم کو ضرورت نہیں اور اسی طرح آپ پیوند زدہ لباس میں اونٹنی پر سوار ہو کر چل دیئے اور یاد نہیں کہیں دیکھا ہے کہ لطف یہ ہوا کہ اس وقت باری غلام کی سواری کی تھی اس نے عرض کیا کہ حضرت اب موقعہ آپ کے پیدل چلنے کا نہیں ہے شہر آ گیا ہے آپ سوار ہولیں۔ فرمایا کہ میں ظلم کروں یہ تو حق تلفی ہے اس نے عرض کیا کہ میں اپنا حق معاف کرتا ہوں مگر آپ نے منظور نہیں کیا اور اسی طرح سے چلے کہ غلام اونٹ پر اور خلیفہ اس کی مہار پکڑے ہوئے تھے جب دروازہ کے پاس پہنچے تو علمائے اہل کتاب نے سوار کو خلیفہ سمجھا اور اس کا حلیہ کتاب سے ملایا جب حلیہ نہ ملا تو پوچھا کیا خلیفہ پیچھے آتے ہیں لوگوں نے کہا نہیں خلیفہ یہ ہیں جو مہار پکڑے ہوئے ہیں ان سے حلیہ ملایا تو مل گیا پھر معلوم ہوا کہ کتاب میں یہ بھی تھا خلیفہ جس وقت بیت المقدس پر آئیں گے تو ہیئت یہ ہوگی کہ غلام سوار ہوگا اور خلیفہ اونٹ کی مہار پکڑے ہوں گے بس لوگوں نے شہر کے دروازے کھول دیئے اور بدون لڑائی کے مسلمانوں کی فتح ہوگئی سادہ زندگی نے وہ کام کر دیا جو بڑے بڑے لشکر بھی نہ دیتے بتلایئے یہ ہیبت کاہے کی تھی نہ وہاں کپڑے تھے نہ مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں نہ جوتے کھٹ کھٹ بولنے والے تھے غرض کوئی سامان بھی ہیبت پیدا کرنے کا نہ تھا مگر ہیبت موجود تھی اور ایسی ہیبت تھی کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ صاحبو! کپڑوں سے ہیبت اور وقعت نہیں ہوا کرتی مگر آج کل لوگوں کا یہ خیال ہو گیا ہے کہ عزت اور وقعت کپڑوں ہی سے ہے اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ عزت اور وقعت ایسی چیز ہے کہ جب کوئی چاہے اتار لے اور جب چاہے پہن لے واقعی خیالی عزت تو ایسی ہی ہونی چاہیئے اول تو یہی غلطی ہے کہ عزت پر مرتے ہیں بھلا دنیا کی عزت کیا چیز ہے پھر اس کا بھی طریقہ وہ اختیار کیا ہے جس سے دن میں دس دفعہ عزت حاصل ہو اور دس دفعہ اتر جائے یہ کس قدر کوتاہ نظری ہے عورتوں میں تو یہ خبط بہت ہی ہے یہ تو کہیں ایک منٹ کے لئے بھی سادی وضع سے جانا پسند نہیں کرتیں اور یوں کہتی ہیں کہ اور بھی کچھ نہ ہو تو ناک کان میں تو کچھ ہو یونہی خالی خولی کسی کے سامنے جانا تو ذلیل ہونا ہے ہم دوسرے سے کس بات میں کم ہیں یہ کس قدر بڑا لفظ ہے کہ ہم دوسرے سے کس بات میں کم ہیں شرعاً تو اس کی مذمت سب جانتے ہیں۔

فضیلت جزئی تو ہر شخص کو حاصل ہے

مگر میں یہاں عقلاً بھی گفتگو کرتا ہوں کہ اس سے مراد فضیلت کلی ہے یا جزئی فضیلت کلی کا تو کوئی دعویٰ کر نہیں سکتا کیونکہ عام بشر میں کوئی متنفس ایسا نہیں نکل سکتا جو دوسرے پر فضیلت کلی رکھتا

ہولا محالہ فضیلت جزئی مراد ہوگی تو حاصل یہ ہوا کہ ہم فضیلت جزئی کی وجہ سے دوسرے سے اعلیٰ یا اس کے برابر ہیں سو اگر فضیلت جزئی کی وجہ سے کوئی کسی سے اعلیٰ ہو سکتا ہے یا دوسرے کے برابر ہو سکتا ہے تو یہ بات تو ہر شخص کو حاصل ہے کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کو دوسرے پر فضیلت جزئی حاصل نہ ہو حتیٰ کہ بھنگی چمار کو بھی فضیلت جزئی حاصل ہے کیونکہ جو کام بھنگی چمار کرتا ہے اس میں وہ ضرور ہم لوگوں سے بڑھا ہوا ہے اگر ہم چاہیں بھی تو اس کام کو ایسا نہیں کر سکتے جیسا کہ وہ کر سکتا ہے اور ان کا کام فضول و بیکار بھی نہیں بلکہ ایسا کام ہے جس پر انسانی زندگی موقوف ہے اگر بھنگی پاخانہ کمانا چھوڑ دے تو سارا شہر تعفن سے سڑ کر وہ اور بیماری کا شکار ہو جائے۔ چمار جوتے نہ بنائے تو چلنا پھرنا دوبھر ہو جائے تو ایک فضیلت جزئی اس کو بھی ہم پر حاصل ہے کہ وہ ہماری زندگی کی بقاء میں ایسا احسان کرتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے تو حسب قاعدہ مسلمہ وہ بھی ہم سے اعلیٰ یا کم از کم برابر تو ہو پھر اپنے ہی مسلمہ قاعدہ سے یہ بات لازم آ گئی کہ تم کسی سے بڑھ نہیں سکتے پھر کپڑے اور زیور پہننے سے جو غرض تھی وہ حاصل نہ ہوئی کیونکہ فضیلت کلیہ تو کسی طرح بھی حاصل نہیں ہو سکتی اور کپڑے یا زیور پہن کر فضیلت جزئیہ بھی ایسی حاصل نہیں ہوتی جس سے دوسروں کی فضیلت جزئیہ کا سد باب ہو جاوے ذرا عقل سے کام لینا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگوں نے شریعت کو تو چھوڑا ہی ہے عقل سے بھی کوسوں دور ہو گئے ہیں۔ کپڑوں اور زیور کو وقعت کا سبب سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں اور کچھ کمال نہیں ورنہ صاحب کمال کی عزت تو کمال سے ہوتی ہے اگر وہ ننگا بھی ہو تو کپڑوں کے ساتھ اس کی عزت نہیں اتر جاتی۔ عورتوں میں اور کچھ کمال تو ہے نہیں بس ان کے پاس کپڑے اور زیور ہی ہیں اسی سے بڑا بننا چاہتی ہیں حالانکہ شرعاً وعقلاً اس سے بڑا بننا ممکن نہیں جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ہم لوگوں کی یہ عادت ہو گئی ہے کہ کسی بات میں غور نہیں کرتے بس جو دل میں آ گیا کر ڈالا اگر کام کرنے سے پہلے غور کر لیا کریں تو شریعت کے علاوہ عقل کی بھی بہت سی اصلاحیں ہو جاویں مجھے کوئی بتا دے کہ اس میں کیا منافع ہیں کہ زیور بہت ہو اور کپڑے بہت سے ہوں اور ان کو دکھلانے کے لئے استعمال کیا جاوے زیور کا یہ نفع بیان کیا جاتا ہے کہ مال محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ نقد روپیہ خرچ ہو جاتا ہے اور زیور بنوا لینے سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے میں اس کو کسی درجہ میں تسلیم کرتا ہوں مگر سوال یہ ہے کہ زیور میں یہ منفعت تو ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کوئی مضرت بھی ہے یا نہیں یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کوئی بھی مضرت نہیں ہے۔ بلکہ میں اس میں قومی، ملکی، ذاتی سب قسم کی مضرتیں بتلاتا ہوں۔ قومی ضرر تو بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ جب زیور دکھلاوے اور بڑا بننے کے لئے پہنا جاتا ہے تو اس سے دوسرے کی تحقیر مقصود ہوتی ہے۔

قومی ترقی کا اصل الاصول

اور جب اس سے کسی کی تحقیر کی گئی تو مساوات نہیں رہی اور قومی ترقی کا اصل الاصول مساوات ہے اور ملکی مضرت یہ ہے کہ زیور کی محبت حب مال ہے اور جس قوم میں حب مال ہے وہ کوئی کام ملکی ترقی کا نہیں کرسکتی۔ مال اس کے پیر میں ایک بیڑی ہے جو اس کو کہیں نقل وحرکت کرنے نہیں دیتی واقعات بخوبی اس کے شاہد ہیں کہ جس فوج کے دل میں حب مال داخل ہوگئی اس سے کچھ بھی نہ ہوسکا سوائے اس کے کہ لوٹ مار اور ظلم کیا۔ جب کبھی دشمن نے ان کو اپنی طرف ملانا چاہا ذرا سا لالچ دلا کر ملا لیا اور ان کے بادشاہ سے ان کو تڑا کر بہت اسے مغلوب کرلیا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے مقابلہ میں گئے تھے ترقی ملک کے واسطے اور ذرا سے لالچ میں اپنے ملک کو تباہ وبرباد کردیا۔ غرض ہزاروں تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ جب مال ترقی ملکی کو مانع ہے۔ اور ذاتی مضرت سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے جس کے پاس زیور زیادہ ہے وہ ہر وقت خطرہ میں ہے کہ کوئی لوٹ نہ لے کوئی چرا نہ لے کہیں کھو یا نہ جائے کہیں گر نہ جاوے۔ دوسرا ضرر یہ ہے کہ زیور پہن کر عورتیں کچھ کام نہیں کرسکتیں اس کا تجربہ یوں ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کو جملہ اقسام کے زیور دیجئے اور اس سے کہئے کہ سر سے پیر تک زیور میں لد جائے۔ دیکھ لیجئے گا کہ زیور پہننے کے بعد وہ اس کام کی بھی نہ رہے گی کہ اٹھ کر پانی بھی پی لے ذرا ہلے جلے گی تو کوئی زیور اپنی جگہ سے ہل جائے گا کوئی گر جائے گا کوئی ٹوٹ جائے گا جھومر بے موقع ہوگیا۔ چھلا نکل گیا۔ بلاق گر گیا نتھ اپنی جگہ پر نہ رہی۔ غرض پورا زیور ہو تو عورت اچھی خاصی اپاہج بن جائے گی۔ جب وہ ہلنے جلنے کے کام کی بھی نہ رہی تو صحت کی جو گت ہوگی وہ معلوم ہے اور آج کل اس کا مشاہدہ بھی ہے۔ عورتوں کی صحت خراب ہونے کی وجہ یہی ہے کہ ریاضت نہیں کرتیں اور ریاضت نقل وحرکت کو کہتے ہیں۔

زیور کے مفاسد

اور زیور اس کے لئے مانع ہے تو زیور مانع صحت ہے اور صحت ہر کام کا موقوف علیہ ہے تو زیور کی زیادتی ہر مفید کام کے مانع ہوئی یہ تو صحت کا نقصان ہوا اور اس کے بعد یہ نقصان الگ ہے کہ بعض دفعہ زیور ٹوٹ جاتے ہیں یا کھوئے جاتے ہیں اور بناتے وقت سنار ان میں کھوٹ ملاتے ہیں یہ سب مالی نقصان ہوا۔ تجربہ کاروں کا قول ہے کہ زیور میں آدھے دام رہتے ہیں۔ زیور میں جہاں ایک نفع ہے وہاں بیسیوں مفاسد بھی ہیں لوگوں نے منفعت کو تو دیکھ لیا کہ زیور بنوا لینے سے مال محفوظ ہو جاتا ہے اور مضرت کو نہیں دیکھا حالانکہ غور سے دیکھئے تو اس میں منفعت پر مضرت

غالب ہے تو حسب قاعدہ مسلمۃ العبرۃ للاکثر یہ حکم صحیح ہوا کہ زیور مضر ہے۔ یہ نقصانات دنیوی ہیں اور دینی نقصانات تو اس قدر ہیں کہ کوئی منفعت اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔ اضاعت وقت اور اسراف، اور حب مال اور ریا اور سمعہ اور کبر اور تفاخر یہ اس کے نتائج ہیں جن کو ہم لوگوں نے بہت ہی معمولی سمجھ رکھا ہے ان کے متعلق جو وعیدیں قرآن وحدیث میں وارد ہیں ان کو کوئی دیکھے تو کبھی زیور کا نام بھی نہ لے گا طبائع میں ایسا انقلاب ہوا ہے کہ باوجود دینی اور دنیوی نقصانات کے عورتوں کو دن رات اس سے فرصت ہی نہیں نماز جائے روزہ جائے مگر بناؤ سنگار نہ جائے ذرا دیر کو دس منٹ کے لئے کہیں جائیں گی تو پچاس منٹ تیاری کے لئے چاہئیں اتنا وقت خراب کرنا اور لاگت لگانا اور خطرہ میں پڑنا سب منظور ہے چاہے پیٹ کو نہ ہو مگر تن اور ناک کان کو ضرور ہو تا کہ دکھلانے کا موقع ہو جائے کہ ہم کسی سے کم نہیں ہیں اگر اپنے پاس نہ ہو تو مانگے تانگے ہی کا ہو اور وہ بھی اپنی حیثیت سے زیادہ۔ صاحبو! یہ کیا خبط ہے پھر افسوس یہ ہے کہ زیور کپڑا پہننے میں اس کو بھی نہیں دیکھا جاتا کہ جس کے یہاں جاتی ہیں وہ کس حیثیت کی ہے بعض وقت وہ غریب ہوتی ہے ایسی جگہ ٹھاٹ سے جانا اس کو تنگ کرنا ہے اور ذلیل ورسوا کرنا ہے اس کے یہاں ان کے ٹھاٹ شان کے موافق بٹھانے کی جگہ بھی نہیں ہوتی نیز اس کو بھی اپنی حیثیت بنانے کی ضرورت پڑتی ہے اس کو کون گوارا کرسکتا ہے کہ ایک آراستہ پیراستہ آدمی کے سامنے میلے کچیلے لباس میں آجاوے جس سے دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کی کوئی نوکر چاکر ہے پھر اس کو اپنی ہیئت درست کرنے کے لئے پاس پڑوس میں سے زیور یا کپڑا مانگنے پڑتے ہیں اول تو مانگنا ہی خود ذلت کی بات ہے پھر مانگ کر بھی وہ غرض پوری نہیں ہوتی جس کے واسطے یہ ذلت گوارا کی گئی تھی کیونکہ غریب آدمی پر شاندار زیور اور کپڑا پھبتا ہی نہیں بلکہ ٹاٹ میں تزیب کا سا پیوند ہو جاتا ہے دیکھنے والے کہہ اٹھتے ہیں کہ پرائے زیور پر اترا رہی ہے۔ یہ سب بکھیڑے کاہے کی بدولت ہوئے صرف بناؤ سنگار کر کے جانے کی بدولت خدا کے واسطے یہ بننا چھوڑ دو اور اس مقصود کے لئے کپڑے بدل کر جانے کی رسم چھوڑ دو اگر یہ رسم عورتیں چھوڑ دیں تو سینکڑوں بکھیڑوں سے نجات مل جائے اور بہت سی تشویشوں سے بچی رہیں خرچ بھی آدھا ہو جائے وقت بھی بچ جائے وہ دنیا کا بھی فائدہ پہنچے اور دین کا بھی مگر کیا کیجئے عورتوں میں تنعم اور تکلف حد سے بڑھ گیا ہے مرد تو پھر بھی آزاد ہیں جب کہیں جانا چاہا اٹھے اور چلے گئے مگر عورتوں کو کہیں جانے کے لئے چوبیس گھنٹے پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جو کوئی بی بی بلانا چاہے تو چوبیس گھنٹے پہلے اطلاع کرے ان کا یہ قانون ایسا ہے جیسے ریل کا پورا درجہ کرایہ کرنے کا کہ چوبیس گھنٹہ پہلے اطلاع دینے سے پورا درجہ مل سکتا ہے میری رائے ہے کہ اگر بیبیاں یہ طریقہ اختیار کرلیں کہ کپڑے میلے پہنے ہوں تو بدل لیا

کریں ورنہ ہرگز نہ بدلیں بلکہ جہاں جانا ہو ویسے ہی ہو آیا کریں تو بہت فتنوں سے نجات ہو جائے اس پر عمل کر کے دیکھئے کہ اس میں کتنے فائدے ہیں اس کو معمولی بات نہ سمجھیں یہ صرف ظاہری بات نہیں بلکہ منجملہ ضروریات دین کے ہے کیونکہ اس کے خلاف طریقہ اختیار کرنے کا یعنی بناؤ سنگار کر کے جانے کا منشاء محض کبر ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں بڑا بنوں اس کے علاوہ ان تکلفات کی اور کیا وجہ ہے اس عادت کو بدلئے کیونکہ بڑا بننے کی عادت بہت بری ہے حدیث میں ہے

لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر (الصحیح المسلم کتاب الایمان ب : ۳۹)

یعنی جس شخص کے دل میں ذرہ برابر کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ دیکھئے کتنی سخت بات ہے اور کبر کتنی بری چیز ہے جس میں ہم دن رات مبتلا ہیں ہم کو ذرا ہوش میں آنا چاہئے۔ ترفع کی برائی آپ نے سن لی اور ظاہر ہے کہ سب رسم ورواج یعنی زیادہ بناؤ سنگار وضع بنانا خودداری کیا وغیرہ ترفع کے شعبے ہیں اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ کس قدر مفاسد کو مستلزم ہیں تو ترفع کس قدر بری چیز ہوئی اور اسی ترفع کو میں نے منشاء ثابت کیا تھا کثرت کلام کا تو کثرت کلام کس قدر شدید چیز ہوئی۔ میری تقریر سے یہ بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کثرت کلام صرف ایک مرض نہیں بلکہ یہ خود ایک بڑا مرض ہونے کے ساتھ علامت ہے اس بات کی کہ جو شخص اس مرض میں مبتلا ہے اس کی زبان میں تو مرض ہے ہی ایک ام الامراض موجود یعنی ترفع اور تکبر بلفظ دیگر کثرت کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے باطن میں صدہا مرض موجود ہیں اور قلب بالکل مجروح ہے۔

بلاغت حدیث

صاحبو! کثرت کلام ایسی چیز ہے اس واسطے اس سے حدیث میں

ان الله کره لکم قیل وقال (مسند احمد ۴: ۲۴۹)

(یقیناً اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا تمہارے لئے کثرت کلام کو) کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ ظاہراً تو اس میں کثرت کلام سے روکا ہے لیکن جب ثابت ہو گیا کہ کثرت کلام اس قدر مفاسد کو ضمن میں لئے ہوئے ہے تو اس سے روکنا ان سب سے روکنا ہوگا۔ یہ حدیث کی بلاغت ہے کہ ذرا سے لفظ سے کس قدر اصلاحیں کی ہیں۔ یہ بیان ہوا حدیث کے ایک جملہ کا اس کے بعد حدیث میں یہ لفظ ہے و کثرة السوال (اور کثرت سوال کو) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ سوال کے معنی دو ہیں ایک تو سب جانتے ہیں جس کا ترجمہ مانگنا اور ایک معنی اور ہیں جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ہے پوچھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی کثرت سے منع فرمایا ہے یعنی نہ کثرت سے مانگو اور نہ کثرت سے پوچھو۔ لفظ کثرت سے معلوم ہوا کہ قلت کے ساتھ دونوں جائز ہے مگر یہ سمجھ لیجئے کہ تھوڑے سے مراد یہ نہیں کہ پیسہ دو پیسہ مانگ لینا جائز

ہے۔اور زیادہ نہ مانگے یا ایک آدھ مسئلہ پوچھ لینے میں کچھ حرج نہیں زیادہ نہ پوچھے بلکہ دونوں صورتوں میں قلیل کا معیار یہ ہے کہ محتاج الیہ کا سوال جائز ہے یعنی ضرورت کے وقت سوال جائز ہے اور بلا ضرورت جائز نہیں خواہ سوال کے معنی مانگنے کے لئے جاویں یا پوچھنے کے بہر تقدیر معنی یہ ہوئے کہ ضرورت کے وقت مانگنا بھی جائز ہے اور پوچھنا بھی اور بلا ضرورت مانگنا بھی جائز نہیں اور پوچھنا بھی جائز نہیں پھر ضرورت کے وقت جو سوال کیا جاوے وہ چاہے قلیل ہو یا کثیر وہ سب قلت میں داخل ہے اور جو سوال بے ضرورت کیا جاوے وہ کثرت میں داخل ہے چاہے وہ ایک پیسہ ہی یا ایک بات ہی ہو۔اب میں اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل لوگوں نے دونوں میں کیا کیا غلطیاں کر رکھی ہیں اور دونوں میں کس قدر افراط اور تفریط ہے خاص کر عورتوں میں۔انہوں نے بعض مواقع سوال پورا کرنے کے ایسے سمجھ رکھے ہیں کہ وہاں خرچ کرنا بہت ضروری سمجھتی ہیں مثلاً بھیک مانگنے والے فقیر ان کو اس طرح ٹھگتے ہیں کہ یہ ڈر جاتی ہیں اور خواہ اپنے آپ فاقہ ہی کرنا پڑے مگر اس کا سوال ضرور پورا کرتی ہیں۔کوئی شاہ صاحب بن کر آتے ہیں اور اپنا یہ کمال دکھلاتے ہیں کہ الگنی پر فلانی رضائی پڑی ہے میں تو وہ لوں گا کوٹھے میں صندوق کے اندر فلاں کپڑا رکھا ہے میں تو وہ لوں گا بس عورتیں سمجھتی ہیں کہ کوئی بڑے کامل آگئے اگر وہی چیز ان کو نہ دی گئی تو خدا جانے کیا آفت آجاوے گی مال پر وبال پڑے یا اولاد پر پڑے پس وہ چیز ان کو دے ہی دیتی ہیں نہ یہ دیکھتی ہیں کہ ہم کو تکلیف ہوگی نہ یہ کہ شوہر کی اجازت بھی ہے یا نہیں عورتوں کو اس سے بھی بحث نہیں ہوتی کہ کون چیز کس کی ملک ہے یاد رکھو خاوند کی ملک میں تصرف کرنا درست نہیں بلکہ عورت کو تو اپنے مال میں بھی خاوند سے مشورہ کر کے تصرف کرنا چاہئے کیونکہ وہ ناقص العقل ہوتی ہے مگر یہاں یہ حالت ہے کہ دوسرے کی ملک میں بھی بے دھڑک تصرف کر ڈالتی ہیں خوب سمجھ لو کہ یہ دینا بالکل جائز نہیں اور کسی شاہ صاحب اور فقیر صاحب کی دھمکی میں نہ آنا چاہئے سمجھنے کی بات ہے کہ جو شخص اس طرح سے ڈرا دھمکا کر پرایا مال چھینے وہ کامل کہاں سے ہوا وہ تو غاصب اور ڈاکو ہے۔

عمل کا مقصد

اس میں بعض پڑھے لکھے بھی دھوکہ میں مبتلا ہیں اور یہ سمجھتے ہیں سائل کو کبھی خالی لوٹانا جائز نہیں اور اس کے ثبوت میں آیات اور احادیث پیش کرتے ہیں

مثلاً واما السائل فلا تنہر (لیکن سائل کو نہ جھڑکو)

اور ان للسائل حقا ولو جاء علی فرس (الاسرار المرفوعۃ:۲۸۶)

(سائل کا حق ہے اگر گھوڑے پر سوار ہو کر آئے) اور وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ

(دے تو قرابت داروں کو ان کا حق اور مسکین کو) اور وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (دیتے ہیں وہ مال باوجود اس کی محبت کے قرابت دار اور یتیموں اور مساکین کو) ان سب میں سائل اور مسکین کو دینے کی کس قدر تاکید یں ہیں اور یہ لفظ لو جاء علی فرس (اگرچہ گھوڑے پر آئے) تو بالکل صریح ہے کہ سائل خواہ بری حیثیت میں نہ ہو تب بھی اس کو دینا ضرور چاہئے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں وہ سائل مراد ہے جس کو ضرورت ہو بعض سائل ایسے ہوتے ہیں کہ جو ظاہر وضع قطع سے غریب نہیں معلوم ہوتے مگر ان کے گھر فاقہ کی نوبت ہوتی ہے اور بوجہ شرافت کے اپنی وضع ایسی بنائے رہتے ہیں جس سے انکا پردہ ڈھکا رہے ایسے لوگوں کی خدمت کرنا بہت زیادہ موجب اجر ہے اور لو جاء علی فرس (اگرچہ گھوڑے پر آئے) سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں ورنہ دوسرے ادلہ موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سائل کو دینا ضروری نہیں بلکہ بعض موقع پر دینا گناہ بھی ہے جیسا فقہاء نے لکھا ہے کہ جس شخص کو مانگنا حرام ہے اس کو مانگنے پر دینا بھی حرام ہے البتہ دینے والے کو اگر معلوم نہ ہو تو معذور ہے جیسے آج کل بہت سے سائل ایسے ہیں جو واقع میں غنی ہیں لوگ ان کو ٹوٹے حال سے دیکھ کر زکوۃ کا اہل سمجھتے ہیں اور زکوۃ دے دیتے ہیں حالانکہ ان کو زکوۃ لینا جائز نہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ ایک موذن تھا جو بہت ٹوٹے حال سے رہتا تھا لوگ اس پر بہت رحم کھاتے اور خدمت کرتے مگر اس کے پاس پانچ سو روپے جمع تھے بات چھپی نہیں رہتی کچھ لوگوں کو خبر ہو گئی انہوں نے وہ روپے چرا لئے اور اسی رقم سے خوب کھانے پکوائے اور ان ملا صاحب کی دعوت کی ملا جی بہت خوش ہوئے اور بہت تعریف کی۔ وہ جب تعریف کرتے تو لڑکے یوں کہتے حضرت سب آپ ہی کا طفیل ہے جب بار بار یہی سنا کھٹک گئے حجرہ میں آ کر دیکھا تو روپیہ ندارد اس کا ایسا صدمہ ہوا کہ فوراً دم نکل گیا۔ (ایسا مال بھی کس کام کا جس سے دم نکل جائے)

اعانت علی المعصیت بھی معصیت

تو آج کل مانگنے والے اکثر جمع کرنے والے ہوتے ہیں ایسے لوگوں کو مانگنا جائز ہی نہیں اور ان کو دینا گویا مانگنے کا عادی بنانا اور اعانت علی المعصیت ہے اور اعانت علی المعصیت بھی معصیت ہے۔ یہ اس دینے کی حقیقت ہے جس کو لوگ سخاوت سمجھتے ہیں آج کل لوگ سوال سے بالکل نہیں ڈرتے میں نے دیکھا کہ بعض لوگ حج کرتے ہیں اور کچھ توشہ وغیرہ اپنے ساتھ نہیں لیتے اور اس کو توکل سمجھتے ہیں ان کا تمام سفر اس طرح قطع ہوتا ہے کہ جس کو کھاتے دیکھا اسی کے سامنے جا کھڑے ہوئے یا شیخ لقمہ لوگ اس کو اس قدر رذلیل سمجھتے ہیں کہ اکثر تو انکار کر دیتے ہیں کہ جاؤ نہیں

دیتے اور جو لوگ ذرا رحم دل اور مہذب ہوتے ہیں وہ انکار تو نہیں کرتے مگر ان سے چھپ کر کھاتے ہیں اور مانگنے والوں سے سخت تنگ ہوتے ہیں دیکھئے یہ توکل ہے یہ وہ توکل ہے جس پر دوسری قومیں ہنستی ہیں اور جس کی وجہ سے انہوں نے توکل کا ترجمہ اپاہج بن جانا کیا ہے کہ توکل اپنے واسطے بھی اس قدر برا ہے کہ اس سے ذلت ہوتی ہے اور دوسروں کے واسطے بھی کس قدر برا ہے کہ ہر شخص ان کی صورت دیکھ کر چونکتا ہے کہ مانگنے کو آئے ہوں گے بلکہ اسلام کیلئے کس قدر مضر ہے کہ غلطی تو یہ نالائق کریں اور دھبہ آتا ہے اسلام پر دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں توکل اسی طرح کا سکھلایا گیا ہوگا دیکھئے سوال کیسا برا کام ہے جس سے مخلوق کو بے حد تکلیف پہنچتی ہے اور اسلام پر بھی دھبہ آتا ہے تو ایسا سوال کہاں جائز ہے جس سے دوسروں کو تکلیف ہو اور دین پر بات آئے۔ ایسے لوگوں پر حج فرض ہی کہاں ہے۔ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ان پر حج فرض نہیں کیا۔ قرآن شریف میں صراحۃً موجود ہے مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا (جو شخص استطاعت رکھتا ہو طرف اس کے راستہ کے) ادھر سوال کی ممانعت مصرح ہے پھر حج کون سی مد میں داخل ہے فرض و واجب تو کیا جائز بھی نہیں ہاں کوئی صاحب ہمت ہو اور بلا زاد راہ محض خدا کے بھروسہ پر چل دے اور اس بات میں پکا ہو کہ کسی حال میں کسی سے سوال نہ کرے تو یہ البتہ بڑے مرتبہ کی بات ہے۔

سوال کی دو صورتیں

بعض لوگوں نے ایسا کیا بھی ہے مگر کوئی شاذ و نادر ہی ایسا کر سکتا ہے یہ تو سوال کی دو صورتیں بیان ہوئیں جو متعارف ہیں اور ان کو ہر شخص سوال ہی کہتا ہے اور ایک صورت سوال کی اور بھی ہے جس کو آج کل بہت سے لوگ سوال نہیں سمجھتے حالانکہ وہ درحقیقت سوال ہی ہے ہاں تہذیب کے ساتھ اور تہذیب ہی نے اس کی حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی مدرسہ کے لئے یا کسی قومی کام کے لئے (اس طرح چندہ کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک لمبی فہرست بنا کر لے گئے جس میں کسی کے نام دو روپے لکھ دیئے اور کسی کے نام چار روپے لکھ دیئے اور معزز معزز آدمی ساتھ لے کر کسی کسی کے پاس جاتے ہیں وہ بیچارہ شرما شرمی کے مارے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ اپنے نام پر "ص" بنا دے وہ فہرست لے جانے والے تو بہت خوش ہیں کہ ہم دین کے بڑے حامی ہیں کہ چندہ مانگتے پھرتے ہیں گویا بڑا مجاہدہ کرتے ہیں کیونکہ وہ کام اختیار کیا ہے جو اپنی وضع کے بالکل خلاف ہے یعنی اتنے بڑے آدمی ہو کر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا میں کہتا ہوں اگر خلاف وضع کام کرنا ہی مجاہدہ اور مجاہدہ کے لئے اس کے سوا اور کسی شرط کی ضرورت نہیں تو میں ایک اس سے بھی پورا مجاہدہ بتلاتا ہوں جو اس اصول کے موافق اس سے بھی زیادہ دینداری میں

داخل ہونا چاہئے اور بڑا مجاہدہ ہونے کی وجہ سے موجب اجر بھی زیادہ ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ کسی ساہوکار کے یہاں نقب لگائیے یا ایک مجمع اکٹھا کر کے کسی کے یہاں ڈاکہ ڈالئے جس سے بہت سارا روپیہ ایک دم ہاتھ لگ جائے اور خوب دل کھول کر مدرسہ کا کام چلے یہ مجاہدہ بہت سخت ہے کیونکہ اپنی وضع سے بہت ہی بعید ہے ہاتھ پھیلانا تو اتنا بعید نہ تھا جتنا یہ بعید ہے اور یہ خطرناک بھی ہے کہ اگر پکڑے گئے تو گھر سے بھی گئے یہ ہے سخت مجاہدہ اور جب یہ مجاہدہ سخت ہے تو اجر بھی بڑا ہونا چاہئے کیا کوئی صاحب اس کو پسند کریں گے اب میں پوچھتا ہوں کہ اس میں اور اس سوال میں کیا فرق ہے جو علت حرمت کی اس میں ہے وہی اس سوال میں بھی موجود ہے یعنی اخذ مال غیر بلا رضاء یہ علت جہاں کہیں بھی پائی جاوے گی وہاں حرمت موجود ہوگی خواہ وہ چوری ہو خواہ ڈاکہ ہو خواہ غفلت ہو خواہ دھوکہ دہی ہو اور خواہ سوال بصورت جبر ہو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دباؤ ڈال کر روپیہ لیا گیا تو رضا کہاں ہوئی اور جب رضا نہ ہو تو اس میں اور چوری اور غصب میں کیا فرق رہا اگر غلیظ کو یوں ہی کھایا گیا تو کیا ہوا اور چاندی کا ورق لپیٹ کر کھایا گیا تو کیا ہوا اگر تہذیب کے ساتھ دباؤ ڈالنے سے حلت ہو جاتی ہے بہت سے ٹھگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس طرح روپیہ وصول کر لیتے ہیں کہ آدمی ان کی خوشامد کرتا ہے اور ہاتھ جوڑتا ہے اور دیتا ہے تو چاہئے کہ ان کو بھی یہ روپیہ حلال ہو جائے جو وہ مخلوق کو دھوکہ دے کر وصول کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی تہذیب سے وصول کرتے ہیں بلکہ لوگ خود ہی خوشامد کر کے ان کو دیتے ہیں یاد رکھو جب یہ جائز نہیں تو مسلمان کا وہ روپیہ جو اس سے بجز بدون بشاشت قلب کے لیا جاوے وہ کیسے جائز ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پھر کام کیسے چلے کوئی کام بے روپے کے تو ہوتا نہیں اور روپیہ مانگنے کو منع کیا جاتا ہے اور بے مانگے کوئی دیتا نہیں تو کوئی کار خیر کیسے ہو۔ ہمارے بزرگ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ کیا ضرور ہے کہ کام بڑے ہی پیمانہ پر ہو جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا کرو ترغیب دو اور سوال مت کرو ترغیب اگر خلوص سے ہے تو اسکا اثر ہوتا ہے کیونکہ دین کی محبت ہر مسلمان کو ہے ترغیب دینے سے ہی کچھ نہ کچھ شرکت ہر شخص کر لے گا۔

عالیشان مسجد بنانا ضروری نہیں

ہاں یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ جتنا روپیہ آپ چاہتے ہیں اتنا چندہ نہ ہوگا تو یہ کیا ضرور ہے کہ آپ کی خواہش کے موافق کام ہو جتنا آسانی اور خوشی سے ہو جائے اتنے ہی میں کام کر لو مثلاً مسجد بنانی ہے تو جتنا چندہ آسانی سے ہو جائے اتنے ہی میں بنا لو پکی نہ بن سکے کچی بنا لو۔ کیا مسجد کے لئے پکا ہونا بھی ضروری ہے دیکھو سب سے پہلی مسجد مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا تھا وہ کچی ہی تھی کھجور کے تنے کھڑے کر کے چھپر ڈال لیا گیا جس

کی حالت یہ تھی کہ جب پانی برستا تھا تو خوب ٹپکتی تھی یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت میں نماز پڑھی ہے۔ حدیث کے یہ الفاظ ہیں یسجد بین الماء و الطین یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کر رہے تھے کیچڑ میں کیا اس وقت تمام مسلمانوں سے وہ مسجد پکی نہیں بن سکتی تھی اور کم از کم ایسا انتظام ہونا تو کچھ بھی دشوار نہ تھا کہ پانی نہ ٹپکتا مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف زیادہ توجہ تعلیم امت ہی کے لئے نہیں فرمائی امت کو آپ نے یہ بتلا دیا کہ اصل کام سے غرض رکھو زوائد میں نہ پڑو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ گو آج کل مسجدیں عالیشان بہت ہیں مگر نمازیوں کی کمی ہے اس کے بجائے اگر مسجدیں کچی ہی ہوں اور نمازی زیادہ ہوں تو یہ بہت اچھا ہے غرض اصل کام کیلئے تو روپیہ تھوڑا ہی کافی ہے۔ جو ترغیب سے بھی مل سکتا ہے یہ کیا ضرورت ہے کہ عالیشان مسجد بنانے کی ٹھان لو اور اس کے لئے لوگوں کے گلے گھونٹ گھونٹ کر سوال کی ذلت اٹھا کر چندہ لو۔ علی ھذا کوئی مدرسہ کھولنا ہو تو آج کل عادت یہ ہوگئی ہے کہ جو مدرسہ کی اصلی غرض ہے اس کی طرف تو لوگ نظر کرتے نہیں زوائد کو شروع کر دیتے ہیں سب سے پہلے عمارت بنتی ہے اور وہ بھی ایسی ہوتی ہے کہ لوگ تماشہ کے لئے آیا کریں۔ روپیہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو اس میں خرچ ہو جاتا ہے۔

اہل کمال مدرسین کی ضرورت

اور جو اصل غرض تھی اس میں تخفیف کی جاتی ہے۔ اصل غرض تعلیم ہے اس میں تخفیف یوں کی جاتی ہے کہ مدرسین بہت کم تنخواہ کے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ مدرس جتنا کم تنخواہ پر مل جائے اسی کو مہتمم اپنی کارگزاری سمجھتے ہیں مقصود یہ ہوتا ہے کہ مدرسین کی تعداد بڑھا لیں چاہے وہ فارغ التحصیل بھی نہ ہوں بس تماشائیوں کو دکھلا دیا کریں کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے مدرسین ہیں۔ صاحبو! اہل کمال تو کسی فن کے بھی سستے نہیں آتے۔ اچھا معمار مزدوروں کی اجرت پر نہیں آ سکتا ہے۔ اچھا دھوبی معمولی دھوبیوں سے دام زیادہ ہی لیتا ہے۔ پھر مدرس وہ کیسے اچھا کم تنخواہ پر آ جاوے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز آج کل ترقی پر ہے اور دین میں پست ہمتی ہے دنیا کی ہر چیز میں تو وہی چیز پسند کی جاتی ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور دین میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کو بھی کافی سمجھ لیتے ہیں افسوس آج کل حقیقت شناسی سے کس قدر بعد ہو گیا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ کریں گے کہ طالب علموں کے وظیفہ میں کمی کر دیں گے۔ اتنا وظیفہ مقرر کرتے ہیں جس میں بیچارہ روکھی روٹی سے بھی پیٹ نہیں بھر سکتا۔

طلباء کو معقول وظیفہ دینے کی ضرورت

صاحبو! ذرا تو انصاف کیجئے علم کے لئے محنت کی ضرورت ہے یا نہیں اور علم بھی کونسا علم

دین جو ادق علوم ہے۔ روکھی روٹی کھا کر کیا اس کا دماغ کام دے گا اور وہ کیا علوم میں ترقی کر سکے گا۔ وظیفہ کم کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ طالب علموں کی تعداد بڑھ جائے اور لوگوں کے سامنے یہ کہہ سکیں کہ ہمارے مدرسہ میں اتنے طالب علم ہیں مقصود یہ ہے کہ تعداد زیادہ ہو چاہے کام کچھ بھی نہ ہو۔ غرض ہر چیز میں شہرت اور نمود اصل بڑھ گئی اس نے حقیقت پر پردہ ڈال دیا اسی لئے اصل کام کی طرف توجہ نہیں اور زوائد کی تفصیل کی جاتی ہے۔

مدرسہ کی اصل غرض

مدرسہ سے اصل غرض تعلیم ہے اس پر تو مٹی ڈال دی اور مدرسین اور طلباء کی پڑھائی اور عالیشان عمارت بنا کر کھڑی کر دی چاہے مدرسین نا قابل ہی ہوں اور چاہے طلبہ بھوکے ہی مرتے میں صرف کرتے ہوا تنا روپیہ مدرسین کی تنخواہوں اور طلبہ کے وظیفوں میں خرچ کر و اس طرح تھوڑے سے روپیہ میں زیادہ کام ہوگا اور جو غرض ہے مدرسہ سے وہ بوجہ احسن پوری ہوگی اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ دیکھنے والوں پر بھی اثر ہوگا دنیا میں سب لوگ ظاہر میں ہی نہیں ہیں سمجھدار لوگ بھی ہیں سب لوگ اس خیال کے نہیں ہیں کہ بڑا مدرسہ اس کو سمجھیں جس کی عمارت بڑی ہو بلکہ اس خیال کے لوگ بھی جو اصل مقصود کو دیکھتے ہیں تعلیم اچھی ہوگی تو اس پر نظریں اچھی ہی پڑیں گی اور اس میں امداد کرنے کے لئے خواہ مخواہ دلوں میں حرکت پیدا ہوگی اور لوگ بلا مانگے خود دیں گے آپ کو سوال کم کرنا پڑے گا اور مال زیادہ ملے گا۔ صاحبو اگر آمدنی بڑھانے کی کوئی تدبیر ہے تو یہی ہے کہ اس کے زیادہ پیچھے نہ پڑا جائے بلکہ کام کے پیچھے پڑا جائے اس سے خود آمدنی بڑھ جاتی ہے مگر آج کل لوگ الٹی چال چلتے ہیں مانگنے کی وہ وہ صورتیں نکالتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ صاحبو! صورت کچھ بھی ہو مگر حقیقت اس کی سوال ہی ہے جس کے لئے ذلت لازم ہے اور اس سے صرف انہی کی ذلت نہیں ہوتی بلکہ ان کے ساتھ علم اور دین کی بھی ذلت ہوتی ہے۔ غرض یہ بھی اس کثرت سوال میں داخل ہے۔ جس کو حدیث میں منع فرمایا ہے اور کثرت سوال کے ایک معنی وہ بھی ہیں جس کا ترجمہ ہے بہت پوچھنا یعنی وہ باتیں پوچھنا جو ضرورت اور اپنے حوصلہ سے باہر ہوں جیسے لوگوں نے آج کل مشغلے کر لئے ہیں کہ جب پوچھتے ہیں تو تقدیر کا مسئلہ اور وحدۃ الوجود کا مسئلہ پوچھتے ہیں جو ایسے باریک مسئلے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء نے ان میں سر مارا اور کچھ نہ پا سکے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ مسئلے صحیح نہیں مسئلے بالکل صحیح ہیں اور عقل سے خارج بھی نہیں لیکن مشکل اور دقیق بہت ہیں ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتے بلکہ عقل محض سے حل ہو ہی نہیں سکتے ہاں اگر کوئی باقاعدہ علم حاصل کرلے اور عقل کی امداد نقل سے لے تو وہ ان کی تہہ کو بخوبی پہنچ سکتا

ہے بالکل کھلے ہوئے مسئلے ہیں پھر غضب یہ ہے کہ پوچھنے والوں میں لیاقت تو گلستاں اور بوستاں کی بھی نہیں ہوتی اور بحث کرتے ہیں ان مسئلوں میں پھر اس کے نتیجے دو ہوتے ہیں اگر مزاج میں آزادی ہوئی تب تو آگے چل نکلتے ہیں اور کوئی ہمہ اوست کہتا پھرتا ہے اور کوئی جبر کا قائل ہو جاتا ہے حالانکہ سمجھتے کچھ بھی نہیں کہ ہمہ اوست کیا بلا ہے اور جبر و اختیار کس کو کہتے ہیں اور اگر آزادی نہ ہوئی تو ان دونوں مسئلوں میں قسم قسم کے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں پھر معاذ اللہ یہ نوبت آتی ہے کہ نفس کہتا ہے یہ کیسا دین ہے جس میں ایسے مشتبہ مسائل ہیں۔ قصور تو اپنا اور بدظنی دین سے۔ صاحبو! ان مشغلوں کو چھوڑ دو اور کام میں لگو اور مجیب صاحبوں کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ جب ایسے مسئلے پوچھے جائیں اور سائل ان کے سمجھنے کا اہل نہ ہو تو ہرگز جواب نہ دیں۔ عالم ہونے کی شان بھی نہیں کہ ہر بات کے جواب کے لئے تیار ہو جائیں آج کل دونوں طرف سے بے احتیاطی ہے سائل تو ایسے ہی مسئلوں کی چھیڑ چھاڑ کو دین سمجھے ہوئے ہیں اور علماء اپنا کمال اس کو سمجھتے ہیں کہ سارے مسائل کو سمجھا ہی کر چھوڑیں۔ قرآن شریف میں تو ان احکام کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جن کی ضرورت نہ ہو فرماتے ہیں لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ یعنی وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ ظاہر کر دی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو چنانچہ اس آیت کا شان نزول بعض مفسرین نے یہ فرمایا ہے کہ جب حج کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے آپ نے تین بار سکوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور پھر کسی سے ادا نہ ہو سکتا تو جب احکام کے متعلق ایسی باتوں کے پوچھنے سے بھی منع کیا گیا ہے جو غیر ضروری ہیں تو ان باتوں کا کیا پوچھنا جو مضر بھی ہیں۔ تجربہ کر کے دیکھئے کہ غیر ضروری سوالات وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو کچھ کام کرنا نہیں چاہتے اور جن کے ذہن میں دین کی کچھ وقعت نہیں ہوتی جن کے دلوں میں علماء کا اور دین کا کچھ ادب نہیں ورنہ دیکھئے کہ ایک کلکٹر سے ملنے جاتے ہیں تو وہاں گنی چنی ہی باتیں کرتے ہیں اور باہر نکل کر کہتے ہیں کہ میں نے قصداً زیادہ باتیں نہیں چھیڑیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بلا پیچھے لگ جائے۔ دیکھئے وہاں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی قانونی مسئلہ کو چھیڑ دیں کہ اس کا حکم قانون میں ایسا کیوں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہاں ہیبت اور ادب ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا ادب

صحابہ ایسے مودب تھے کہ جو ضروری باتیں پوچھنا بھی چاہتے تھے تو کئی کئی دن تک نہ پوچھتے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے بعض دفعہ فرشتہ کو بصورت انسان بھیجا اور اس نے وہ سوالات کئے جو صحابہؓ

کے دل میں رہتے تھے تا کہ لوگوں کو علم ہو یہ ان کے ادب کی برکت تھی کہ حق تعالیٰ نے خود ان سوالات کو حل فرمادیا چنانچہ حدیث جبریل ایک مشہور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ جبرئیل بصورت انسان آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کئے اور اس سے غرض یہی تھی کہ لوگوں کو ان باتوں کا علم ہو جائے۔ ادب کی یہ برکت ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی طرف سے ضرورت پوری کی گئی۔

بنی اسرائیل کی بے ادبی کا انجام

اور بے ادبی کا یہ نتیجہ ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا کہ ایک گائے کی قربانی کرو انہوں نے اس حکم میں حجتیں نکالنا شروع کیں کہ بتلایئے گائے کیسی ہو بتلایا گیا کہ جوان گائے ہو کہا یہ بھی بتلایئے کہ اس کا رنگ کیسا ہو حکم ہوا کہ رنگ زرد ہونا چاہیے پھر کہا کہ ٹھیک ٹھیک اور مشرح بتلایئے کہ کیسی گائے ہو اب تک ہماری سمجھ میں پوری حالت اس کی آئی نہیں حکم ہوا کہ ایسی گائے ہو کہ جس سے نہ جوتنے کا کام لیا گیا ہو اور نہ سینچائی کا کام لیا گیا ہو اور بالکل یک رنگ ہو کہیں اس میں داغ دھبہ نہ ہو چنانچہ ایسی گائے ان کو تلاش کرنا پڑی اور یہ ہزار دقت رقم کثیر خرچ کر کے بہم پہنچی۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اتنی حجت نہ کرتے اور جیسے ہی حکم ہوا تھا فوراً کوئی سی گائے ذبح کر ڈالتے تو کافی ہو جاتی یہ تنگی کثرت سوال کی وجہ سے ہوئی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس امت کو حق تعالیٰ نے خود ہی اس فعل سے منع فرمادیا چنانچہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ (اے ایمان والو وہ باتیں مت پوچھو کہ اگر ظاہر کر دی جاویں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو) اور آگے یہ بھی فرمادیا قَدْ سَاَلَھَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِکُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِھَا کٰفِرِیْنَ یعنی تم سے پہلی امت نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ احکام میں اس طرح حجتیں کرتے تھے گویا تحقیق کر رہے ہیں لیکن جب حکم ہوتا اور اس کی پوری شرح کر دی جاتی تو اس کی امتثال سے انکار کر دیتے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ حجتیں کرنا اسی بات کی علامت ہے کہ اس شخص کو کام کرنا منظور نہیں کام کرنے والا ہمیشہ ڈرا کرتا ہے کہ خدا جانے مجھ سے تعمیل ہو سکے گی یا نہیں اسی واسطے وہ اپنے اوپر تنگی کو اختیار کرتا ہے بنی اسرائیل بڑے سرکش تھے انہوں نے حجتیں چھانٹیں اور تقریریں کر کر کے اپنے اوپر مصیبت لا دی اس امت پر خدا کا فضل رہا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم حکم کو سن کر اس میں شقوق اور احتمالات نہ نکالتے تھے۔

برکت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

یہ برکت حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کہ اس امت نے سہولت پسندی کو اپنا شعار بنایا اور جب کبھی اس کے خلاف کوئی چھوٹا واقعہ بھی ہوا جب ہی حق تعالیٰ نے آیت اتار دی

اور بالتصریح اس کی ممانعت فرمادی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شفقت کہ جب کبھی ایسا موقع ہوا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو سنبھالے رہے اور قولاً وفعلاً دونوں طرح اس سے باز رکھا جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ جب حج کی فرضیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تو ایک شخص نے عرض کیا کہ حج ایک ہی دفعہ فرض ہے یا ہر سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور جواب نہیں دیا اس نے پھر پوچھا پھر جواب نہیں دیا پھر سہ بارہ پوچھا جواب نہیں دیا اور یہ فرمایا کہ اگر میں ہر سال کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا پھر تم سے ہو نہ سکتا واقعی حق تعالیٰ کا شکر نہ ادا ہو سکتا کہ ہم کو ایسا رہبر دیا جو ہمارے اوپر ماں باپ سے بھی زیادہ بلکہ ہماری جانوں سے بھی زیادہ شفیق ہے۔ دیکھئے ہم خود اپنے اوپر تنگی کر رہے ہیں اور آپ ہم کو بچاتے ہیں بس اصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اس امت پر فضل ہی کرنا تھا یہ بیان ہوا کثرت سوال کا جبکہ سوال کے معنی پوچھنا ہو۔ غرض سوال مانگنے کے معنی میں ہو یا پوچھنے کے معنی میں دونوں

حب الدنیا رأس کل خطیئة۔ (مشکوٰۃ المصابیح : ۵۲۱۳)

(دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے) جب کوئی گناہ یا کوئی نقصان ہوگا حب دنیا ہی سے ہوگا۔

عورتوں سے خطاب

مسلمانو حرص کو چھوڑ دخاص کر میں عورتوں کو خطاب کرتا ہوں کیونکہ انہوں نے اس میں ایسا حصہ لیا ہے کہ ایک دنیا کو پریشان کر ڈالا ہے شادی بیاہ میں جو کچھ ہوتا ہے ان کی خرابیاں اس حد کو پہنچ گئی ہیں کہ وہ لوگ بھی جو دین سے کچھ تعلق نہیں رکھتے چلا اٹھے کہ ان کا انسداد ہونا چاہئے کیونکہ جہاں ایک شادی عورتوں کے قانون کے موافق ہوگئی وہیں دیو نکل گیا اور کئی کئی پشتیں قرض میں بندھ گئیں۔ دین تو غارت ہوا ہی تھا دنیا بھی برباد ہوگئی شادی بیاہ سے قطع نظر ان کی ذرا سی نقل وحرکت ہو تو اس کے لئے وہ سامان ہونا چاہئے جس کے لئے ایک معقول رقم چاہئے جوڑا بھی نیا ہونا چاہئے زیور بھی اسی وقت بتایا جائے جوتا بھی عمدہ ہی ہو یہ تو مال کا خرچ ہوا پھر اس میں وقت بھی اتنا صرف ہوتا ہے کہ اس میں بہت سے کام ہو سکتے تھے ان سب مفاسد کی وجہ وہی حرص ہے کہ جس کو ذرا اپنے سے اونچا دیکھا اسی کی ریس کرنے لگیں کہ ہم بھی اسی کے سے کپڑے پہنیں اسی کا سا زیور ہو اسی کا سا مکان ہو اسی کی سی معاشرت ہو۔

کام کی بات

دیکھو کام کی بات بتلاتا ہوں حدیث میں آیا ہے کہ دنیا کے معاملہ میں تو اپنے سے کمتر کو دیکھو اور دین میں اپنے سے برتر کو دیکھو یہ کیسا اچھا گر ہے معاشرت کی درستی کا کیونکہ یہ بات سب کو

مانی پڑتی ہے کہ دنیا ہر شخص کو اپنی خواہش کے موافق نہیں مل سکتی اور کسی کی ریس کرنے سے کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا پھر یہ کونسی عقل کی بات ہے کہ آدمی اس بات کے پیچھے پڑے جس کو پا نہیں سکتا یہ ایسا ہے جیسے کوئی آسمان پر چڑھ جانے کی کوشش کرے کہ ساری عمر بھی صرف کر دے گا تب بھی کامیابی نہ ہوگی ایسے شخص کو سب پاگل ہی کہیں گے تو جب کسی کی برابری اختیاری نہ ہو تو عقل کی بات یہی ہے کہ اس کی فکر میں نہ پڑے اور اس کی عمدہ تدبیر یہی ہے کہ اپنے سے اونچے کو نہ دیکھئے حدیث کی تعلیم کس قدر فطرت کے موافق ہے اور دینی ترقی اختیاری ہے کیونکہ وہ افعال اختیاریہ پر مبنی ہے اور کوشش پر ترتب اثر کا وعدہ ہے۔ لہٰذا یہاں مقتضائے عقل یہی ہوا کہ اس میں نظر کو نیچا نہ کرلے بلکہ ہمیشہ اپنے سے اونچے کو دیکھے مگر اب بالعکس معاملہ ہے دین میں تو یہ حالت ہے کہ کوئی نماز پڑھتا ہے اور وہ ایسے شخص کو دیکھے گا جو نماز بھی نہ پڑھتا ہو اور اپنے دل میں خوش ہو گا کہ میری حالت اس سے تو اچھی ہے اور دنیا میں اگر ایک شخص کو دیکھیں گے کہ بیس روپیہ کی آمدنی رکھتا ہے اور دوسرا پانچ روپے کی رکھتا ہے تو پانچ روپے والے پر کبھی نظر نہ ڈالیں گے اسی کو دیکھیں گے جو زیادہ مالدار ہے زمانہ حال کے اہل ترقی کی یہی تعلیم ہے اور اسی کا نام اولوالعزمی اور فراخ وحوصلگی رکھا گیا ہے کسی کو ہم نے یہ کہتے نہیں سنا کہ دین میں بھی فراخ حوصلگی یا اولوالعزمی اختیار کرو وہاں البتہ یہ سنا ہے کہ نماز میں فرائض ہی کافی ہیں سنن اور نوافل کی چنداں ضرورت نہیں افسوس کیا قلب ماہیت ہو گیا ہونا تو اس کے برعکس چاہیے تھا اگر برعکس بھی نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ جتنا خدا تعالیٰ نے دیا ہے اسی میں خوش رہیں اور عافیت بھی اسی میں ہے کیونکہ اپنی کوشش سے آدمی زیادہ پا نہیں سکتا دیکھ لیجئے کسی خوشحال کی ریس ایک غریب آدمی کرے تو ممکن نہیں کہ ریس کر کے یہ اس کے برابر ہو جائے بس سوائے اس کے کچھ نہ ہوگا کہ یہ اپنے دل کو بے چین کرے گا تو پھر دنیا میں اپنے سے بڑھے ہوئے کو دیکھنے سے کیا حاصل ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ کچھ نہ کرے رزق کا حیلہ تو مناسب ہے کیونکہ دنیا عالم اسباب ہے اور ہم لوگوں کے قلوب ضعیف ہیں مگر اجمال فی الطلب (طلب میں میانہ روی) رکھے اور اسباب ہی میں نہ کھپ جائے جتنا آسانی سے یعنی بلا دین کو بگاڑے ہوئے مل جائے اسی میں خوش رہے اگر آسانی سے اس سے زیادہ بھی مل جائے اور اس میں شریعت سے مزاحمت نہ ہو اور اسکی تحصیل کا کوئی ذریعہ ناجائز نہ ہو تو زیادہ میں کوئی حرج نہیں مگر یہ اعتدال جب رہ سکتا ہے جب قلب میں دنیا کی محبت نہ ہو۔ صاحبو! خصوصاً مستورات کو مخاطب کرتا ہوں کہ دنیا سے دل نہ لگاؤ نہ زیور کی حرص کرو نہ برتن کی نہ کپڑے کی جتنا خدا تعالیٰ نے دیا ہو اس پر صابر و شاکر رہو۔ دین میں تو اس کے

فائدے ہیں ہی دنیا میں بھی فائدہ یہ ہے کہ آرام سے رہو گی پریشانی نہ ہوگی اور اگر اس کے خلاف کرو گی تو حاصل تو اتنا ہی ہوگا جتنا قسمت میں ہے اور پریشانی مفت میں ہوگی۔ یہ تقریر منشاء کی اس تقدیر پر ہوئی جبکہ سوال سے مراد کسی چیز کا مانگنا ہو جس کا منشاء حرص بیان کیا گیا ہے اور اگر سوال سے مراد مسائل پوچھنا ہو تو اس کی بھی کثرت سے حدیث میں منع کیا گیا ہے جس پر ظاہراً شبہ ہو سکتا ہے کہ مسائل پوچھنا تو موجب ترقی دین ہے اس کی ممانعت کیسی تو میں عرض کرتا ہوں کہ

کثرت سوال کا منشاء

اس منع سے تعجب نہ کیجئے کیونکہ کثرت سوال کا منشاء عمل نہ کرنا ہے (باریک بات ہے) جس کو کام کرنا ہوتا ہے وہ تو ذرا سا حکم پا کر اس کی تعمیل میں لگ جاتا ہے۔ بلکہ وہ ڈرا کرتا ہے کہ اگر کچھ پوچھوں گا تو کوئی دشواری کام میں نہ پیدا ہو جائے اور پھر مجھ سے ہو نہ سکے اور جس کو کام کرنا نہیں ہوتا وہ بھی تقریریں چھانٹا کرتا ہے۔ غرض مسائل میں خواہ مخواہ خوض کرنا اچھا نہیں یہ عمل سے لاپروائی کی دلیل ہے اور اس میں تقصیر صرف سائلین ہی کی نہیں بلکہ گروہ علماء کی بھی ہے جو ان سوالوں کا جواب دیتے ہیں وہ کوتاہی یہ ہے کہ یہ حضرات ہر سوال کے جواب کے لئے تیار ہو جاتے ہیں پوچھنے والوں کو تو دل لگی ہوتی ہے اور ان کا وقت ضائع ہوتا ہے یہ تو وقتی مفاسد ہیں اور جو خراب نتائج بعد میں پیدا ہوتے ہیں ان کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے اول تو سننے والے اکثر صحیح نہیں سمجھتے نیز روایت کرنے میں احتیاط بالکل نہیں اس میں عوام اور جہلاء کی تو کیا شکایت کی جاوے پڑھے لکھے بھی احتیاط نہیں کرتے کہا جائے کچھ اور دوسری جگہ بات ہو جائے کچھ سے کچھ۔ کچھ تو سمجھنے میں غلطی کی اور کچھ روایت میں بے احتیاطی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مفتی تک وہ مضمون کچھ کا کچھ ہو کر پہنچ گیا پھر وہ دوسرے سننے والے جن کو یہ مضمون پہنچایا گیا وہ بھی محتاط نہیں انہوں نے سوء ظن سے مفتی اول پر کوئی فتویٰ لگا دیا اور دل میں عداوت بٹھالی پھر وہ فتویٰ لوٹ کر وہاں بھی نقل کیا گیا جہاں سے بات چلی تھی اور درمیان میں وہ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اب چونکہ ان کے فتوے کی مخالفت کی گئی تھی اس واسطے انہوں نے ان کے فتوے سے بھی تیز کوئی فتویٰ لگا دیا یہ ہے اصل اکثر علماء کے باہم مخالفت کی اس میں قصور عوام کا تو ہے۔

علماء کی کوتاہی

یہ ہے اصل اکثر علماء کے باہم مخالفت کی اس میں قصور عوام کا تو ہے ہی مگر علماء کی بھی یہ کوتاہی ضرور ہے کہ کیوں فضول باتوں کے جواب کے لئے تیار ہو جاتے ہیں جس کے یہ نتائج

ہوتے ہیں یہ کونسا کمال ہے کہ جواب میں سائل کے مذاق کا اتباع کیا جائے جب ہم کو معلوم ہو جائے کہ یہ سوال بے ضرورت کیا جاتا ہے اور اس کے یہ نتائج ہونے والے ہیں تو ہم سکوت کیوں نہ اختیار کرلیں میں تو اس سوال کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا جس میں گو کچھ بھی مفاسد نہ ہوں لیکن بے ضرورت ہو کیونکہ کم سے کم تضیع وقت تو ہے ہی یہ فضول ایسا ہے جیسا کوئی سائل آ کر پوچھے کہ تم نے مکان کتنے گز زمین میں بنوایا ہے تو کون عقلمند ہے کہ اس کا تحقیقی جواب دینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ بس اس کا جواب یہی دے گا کہ اس سوال سے غرض بتلاؤ جب کوئی غرض صحیح نہیں ہے تو ہم جواب بھی نہیں دیتے پھر بھی برتاؤ ان سائلوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا جو دین کے متعلق بیکار سوال کرتے ہیں۔ اس کثرت سوال کو بھی منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد تیسری چیز کا حدیث میں بیان ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اضاعة المال (اور مال کے ضائع کرنے کو) یعنی حق تعالیٰ نے اس کو بھی ناپسند کیا ہے کہ مال کو ضائع کرو۔ اس میں بھی آج کل خبط ہوا ہے کہ ہزاروں آدمی اس گناہ میں مبتلا ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہم گناہ کر رہے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ لوگ اضاعۃ مال صرف مال کے پھینک دینے کو سمجھتے ہیں اور مال کو پھینک دینا ایسا فعل ہے کہ دنیا میں کوئی بے وقوف سے بے وقوف بھی اس کو اختیار نہیں کرتا باؤلوں کو بھی دیکھئے تو چاہے اور کہیں کی ان میں عقل نہ ہو مگر ایک پیسہ بھی کہیں مل جائے تو ضرور اٹھالیں گے پیسہ کو پھینکتے ہوئے کسی پاگل کو بھی نہیں دیکھا گویا مال کی حفاظت امر طبعی ہے۔

اضاعت مال کا شرعی مفہوم

اب سوال ہوتا ہے کہ پھر اس کی اضاعۃ سے منع فرمانے کی ضرورت کیا تھی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حدیث میں اضاعۃ مال کے معنی مال پھینکنے کے نہیں بلکہ مراد گناہ میں خرچ کرنا ہے اور اس سے رکنا طبعی امر نہیں تھا۔ اس لئے اضاعۃ مال سے منع کیا گیا۔ آج کل جو خرچ لوگوں نے مقرر کر رکھے ہیں انہیں کا اکثر حصہ گناہ ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف ناچ ہی میں خرچ کرنا منع ہے اور اس میں روپیہ خرچ کرنا اضاعۃ مال ہے میں کہتا ہوں کہ ناچ میں خرچ کرنا گناہ کیوں اور یہاں اضاعۃ مال کیوں ہے اس کا جواب آپ کو یہی دینا پڑے گا کہ اس واسطے گناہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے منع کیا ہے یا بلفظ دیگر شریعت میں منع ہے۔ بس معلوم ہوا کہ جو بات شریعت میں منع ہو وہی گناہ ہے اور اسی میں روپیہ خرچ کرنا اضاعۃ مال ہے پھر یہ خیال کہاں تک صحیح رہا کہ صرف ناچ میں روپیہ خرچ کرنا اضاعۃ مال ہے بلکہ جو بھی گناہ کا کام ہو اس میں خرچ کرنا اضاعۃ مال ہوگا اب میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ شریعت میں صرف ناچ ہی منع نہیں ہے بلکہ اکثر رسوم تقریبات بھی

ممنوع ہیں اور ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں ممنوع ہیں جن کی تفصیل کی اس وقت چنداں حاجت نہیں۔ میں بطور اصول کے ایک بات بیان کرتا ہوں جس سے بہت سے فروع کا حکم نکل آوے گا اور اختصار کے ساتھ تمام رسوم کا حال معلوم ہو جاوے گا وہ یہ ہے کہ شریعت میں جیسے ناچ منع ہے ایسے ہی تکبر اور تفاخر بھی منع ہے بلکہ ان کی ممانعت ناچ سے زیادہ ہے کیونکہ ناچ تو ایک ہی گناہ ہے اور یہ اصل الاصول ہیں۔ بہت سے گناہوں کے۔ اب دیکھ لیجئے کہ آج کل کی رسموں میں خرچ کرنے سے مقصود کیا ہوتا ہے اگر غور و انصاف سے کام لیجئے گا تو یہی کہنا پڑے گا کہ رسوم سے غرض بڑا بننا اور ناموری ہے ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میرا نام بڑا رہے اسی واسطے رسوم میں جو ایجادیں ہوتی ہیں وہ ہی ہوتی ہیں کہ جن سے بڑائی ثابت ہو۔ کسی نے پلاؤ کی دعوت دی تو دوسرا بریانی کی دیتا ہے صرف اس واسطے کہ یہ کہا جائے کہ اس سے بڑھ گیا علیٰ ہذا تمام رسوم میں یہی حالت ہے اور گو بہت لوگوں کو ان رسوم کی خرابیاں بھی محسوس ہوگئی ہیں لیکن اس واسطے نہیں چھوڑ سکتے کہ برادری یہ کہے گی کہ خرچ سے منہ موڑا اس شیخی اور ترفع نے تباہ کر رکھا ہے۔

جملہ رسوم کا مبنیٰ

پس یہ بڑا بننا ہی مبنیٰ ہے تمام رسم کا اور حدیث میں ابھی گزرا

لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر (الصحیح المسلم الایمان ب: ۹۳)

(جس کے دل میں ذرہ بھر تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ داخل ہوگا) اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تکبر شریعت میں منع ہے جب یہ بات ہے کہ رسوم کا مبنیٰ یہی ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ رسوم شرعاً منع نہیں ہیں اور جب رسوم ممنوع اور گناہ ہوئیں تو ان میں خرچ کرنا اضاعۃ مال ہوا یا نہیں پس معلوم ہو گیا ہوگا کہ صرف ناچ میں خرچ کرنے کو ہی اضاعۃ مال نہ کہیں گے بلکہ اضاعۃ مال کی حقیقت یہ ٹھہری کہ جہاں شریعت نے منع کیا۔ وہاں خرچ کرنا اضاعۃ مال ہے۔ آج کل دو باتوں میں بہت خرچ ہوتا ہے شادی میں اور غمی میں حتیٰ کہ ایک شادی یا غمی جس نے باقاعدہ کر دی پشتہا پشت تک کے لئے بربادی یادگار میں لے لی کیا برکات ہیں ان رسوم کے اصل یہ ہے کہ دین چھوڑ کر دنیا بھی نہیں بنتی۔ دیکھئے کیسی کیسی ریاستیں ان رسوم کی بدولت غارت ہوگئی ہیں مگر ابھی تک آنکھیں نہیں کھلیں بلکہ لوگ ان میں تاویلیں کرتے ہیں اور معمولی اشخاص نہیں اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ اس خبط میں مبتلا ہیں اور ان کو کھینچ تان کر جائز بلکہ مستحسن ثابت کرتے ہیں ایسا زوال حس ہوا ہے کہ شرعی خرابی تو کیا محسوس ہوتی دنیا کی بربادی بھی محسوس نہیں ہوتی بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس چیز کے اجزاء فرداً فرداً مباح ہوں تو ان کو مرکب کرنے سے حرمت کہاں سے آجاوے گی ظاہر ہے کہ پانی اور شکر کو ملانے سے کوئی

بری چیز نہیں ہو جاوے گی۔ بیٹا بیٹی کو اور رشتہ داروں کو دینا لینا اور ان کیساتھ سلوک کرنا برا نہیں اور آپس میں ملنا جلنا بھی برا نہیں ان سب کو ترکیب دے کر ایک تقریب بنالی تو کیا جرم ہو گیا اور حرمت کہاں سے پیدا ہو گئی۔ یہ لوگ اس مرکب کے ایک جزو چھوڑ گئے جس کا نام شیخی بگھارنا ہے یہ بھی تو اس میں داخل ہے اس کو کیوں بھول گئے اب اس کی مثال پانی اور شکر کی نہیں رہی بلکہ شکر اور پیشاب کی ہو گئی یا زہر اور شربت کی ہو گئی اگر یہ مرکبات آپ کے نزدیک قابل استعمال ہیں تو رسوم کو بھی ہم کچھ نہیں کہتے بات یہ ہے کہ گناہوں کی طرف لوگوں کو خیال ہی نہیں رہا اور اس طرف نظر ہی نہیں پہنچی بس تقریبات میں تو یہ دیکھ لیا کہ دینا لینا ملنا جلنا ہوتا ہے دو جزو تو نظر پڑے اور تیسرا جزو نظر سے غائب رہا اور حکم لگا دیا کہ یہ ایک مرکب ہے جس کے سب اجزاء طیب ہیں تو مرکب بھی طیب ہوا یہ نہیں دیکھا کہ اگر کوئی مرکب سو جزوں سے بھی بنایا گیا ہو جس کا ہر جزو اکسیر ہو اور بہت قیمتی ہو مگر ایک خرابی جزو مل جانے سے سب خراب ہو جاتا ہے ایک من بھر دواء المسک جس میں نرا عنبر اور مشک ہی پڑا ہو چند قطرے پیشاب کے ملانے سے یا تھوڑا سا زہر ملانے سے بیکار محض ہو جاتی ہے۔ غرض یہ محض من سمجھوتہ ہے کہ چند اجزاء کو غیر مضر دیکھ کر تقریبات پر جواز اور استحسان کا حکم لگا دیا جاوے۔

تقریبات کا زیادہ تر مدار مستورات ہیں

اس میں عورتوں کو میں زیادہ خطاب کرتا ہوں کیونکہ تقریبات میں زیادہ تر مدار کار یہی ہیں بلکہ ان خرافات کی موجد بھی یہی ہیں یہ مردوں کو ایسا گھڑ بڑا لیتی ہیں کہ ان کو کچھ نہ کچھ رسوم کرنی پڑ ہی جاتی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد ان کے گڑ بڑانے سے معذور سمجھے جا سکتے ہیں اور وہ یہ کہہ کر چھوٹ سکتے ہیں کہ عورتوں نے ہم کو مجبور کیا تھا کیونکہ مرد عورتوں پر شرعاً اور عقلاً اور عرفاً حاکم ہیں اور عورتیں محکوم ہیں یہ کیا شان حکومت ہے کہ حاکم کو محکوم گڑ بڑا لے لیکن پھر بھی اگر عورتیں رسوم چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو بہت سہولت سے اصلاح ہو سکتی ہے اس واسطے میں بیبیوں کو زیادہ تر مخاطب بناتا ہوں کہ ذرا ہوش میں آؤ اور ہر کام کو اس کا انجام سوچ کر کرو۔ ذرا سی خیالی نمود کے لئے دنیا اور آخرت سب کو غارت مت کرو عقل سے کام لو تمہاری مصلحتوں کو تم سے زیادہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں ان کے حکم کے موافق چلو دیکھو تمہارا دین بھی سدھرے گا۔ اور دنیا بھی سدھرے گی۔ اگر پچاس لڑکیوں کی شادی کراؤ گی تو تباہی کی کبھی نوبت نہ آئے گی اور تمہاری تجویزیں تو ایسی ہیں کہ اگر ایک شادی بھی ان کے موافق کسی نے کر دی تو بیخ و بنیاد سے ندارد۔

حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی شادی کا حال

ہر کام میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق چلو ایسی معیشت رکھو جیسی اللہ اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند کی ہے شادی ایسی کرو۔ جیسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ہوئی تھی نہ وہاں منگنی تھی نہ بری تھی نہ بارات تھی۔ نہ رخصتی متعارف تھی۔ بس منگنی یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی اور بارات اور شادی یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نکاح کر دیا۔ بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود بھی نہ تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اس پر معلق کیا کہ اگر علی قبول کر لیں تو نکاح ہے۔ بعد میں حاضر ہو کر منظوری ظاہر کر دی۔ دیکھئے یہ بارات کیسی تھی کہ دولہا بھی موجود نہیں ہے۔ ایک جزو تو نکاح کا ایک جلسہ میں ہوا اور دوسرا جزو یعنی قبول نکاح دوسرے وقت میں ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خبر بازار میں پہنچی وہاں انہوں نے قبول کیا اور رخصتی یہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ان کو علی رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچا آؤ وہ ان کو پیادہ ہاتھ پکڑ کر پہنچا آئیں نہ ڈولا نہ پالکی تھی نہ گھوڑا نہ جوڑا کچھ بھی نہ تھا۔ جہیز یہ تھا دو چادر یمانی جو سوسی کے طور پر بنی ہوئی تھیں اور دو نہالے جن میں السی کی چھال بھری ہوئی تھی اور چادر گدے دو بازو بند چاندی کے اور ایک کملی اور ایک تکیہ اور ایک پیالہ اور ایک چکی اور ایک مشکیزہ اور پانی رکھنے کا برتن یعنی گھڑا اور بعض روایتوں میں ایک پلنگ بھی آیا ہے یہ دونوں جہان کی شہزادی کا نکاح ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عزت دار ہے اس شادی میں جو کچھ بھی ہو جاتا کم تھا۔ بارات میں فرشتے ہوتے ہیں اور جہیز میں سونے چاندی کے پہاڑ ہوتے غرض جو کچھ بھی ہو جاتا بعید نہ تھا کیونکہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں سب کچھ تھا جتنا آپ چاہتے فوراً موجود ہو جاتا اور اگر اس سے کسی کے دل کو اطمینان نہ ہو تو وہ اسی بات میں غور کر لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلطان دین ہونے کے ساتھ سلطان دنیا بھی تو تھے اتنے اموال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے کہ دونوں ہاتھ بھر بھر کر سونا تقسیم کیا کرتے تھے تو کیا صاحبزادی کے واسطے بڑی سے بڑی مقدار چاہتے تو فراہم نہ ہو جاتی۔ بات یہی ہے کہ جس کی نظر اللہ اور ما عند اللہ (جو اللہ کے پاس ہے) پر ہے اس کی نظر میں سونا چاندی تو کیا دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لئے دنیا کو پسند ہی نہیں کیا اور ایک دینار بھی رکھنا کبھی گوارا نہیں کیا جیسا کہ کتب حدیث میں صاف صاف مذکور ہے۔

سادگی سے شادی کی ضرورت

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر مجبوری اور ناداری اور محتاجی کا نہ تھا بلکہ اختیاری تھا پھر بھی حضرت سیدہ کی شادی میں کسی قسم کا تکلف نہیں کیا صرف یہی سامان تھا جو بیان ہوا اس لئے اس سے یہ بات

بخوبی نکلتی ہے کہ کسی کو لاکھ روپے کا بھی مقدور ہو اور والی ملک ہی کیوں نہ ہو تب بھی ان خرافات اور تکلفات کی گنجائش نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلطان جہاں بھی تھے پھر بھی اتنی سادگی کے ساتھ شادی کی ماوشما (ہم اورتم) تو کس شمار میں ہیں مگر ہم لوگوں نے اپنی دولت خراب کی ہے کہ مریں گے اور تباہ ہوں گے اور قرضوں کی نالشوں میں کچھے کچھے پھریں گے مگر شادی اسی طرح کریں گے جس میں ذرا دیر کے لئے نام کی صورت ہو چاہے ساری عمر کی بربادی ہو مستورات اس میں اس طرح کھبی ہوئی ہیں کہ خود تو ڈوبتی ہی ہیں اپنے ساتھ مردوں کو بھی ڈبوتی ہیں اور ایک مرد کو نہیں بلکہ سارے خاندان کو بلکہ پشتہا پشت تک کو بس ایک شادی میں اندھے بہرے بن کر جتنا مال تھا سب لٹا دیا اور محتاج ہو گئیں۔ جب یہ محتاج ہو گئیں تو اولاد کے واسطے کیا رہا۔ کئی کئی پشت تک سنبھلنے کی نوبت نہیں آتی۔

قدر مال کی ضرورت

صاحبو! مال کی قدر کرو یہ کون عقلمند کہہ سکتا ہے کہ مال کو اس طرح ضائع کرنا چاہئے۔ اس حدیث میں اسی کے متعلق ارشاد ہے واضاعۃ المال یعنی حق تعالیٰ نے مال ضائع کرنے کو برا سمجھا ہے۔ صاحبو! مال کی قدر کرو مال دنیا کی زندگی کا سہارا ہے اس کو ہوش اور عقل کے ساتھ خرچ کرو اور اگر خرچ کرنے ہی کا جوش ہے تو اللہ کی راہ میں دو دیکھو کتنا حوصلہ ہے اس میں حوصلہ آزمائی کرو۔ لیکن افسوس کیا حالت ہے مسلمانوں کی کہ جب کسی مدرسہ کا یا کار خیر کا نام آوے تو کہتے ہیں یہاں تو کوئی ایسا نہیں جو اس کام کو کرلے سب معمولی حیثیت کے لوگ ہیں چار پیسے کمائے اور کھالئے کوئی کہتا ہے کہ یہاں تو روز کنواں کھودنا اور پانی پینا مدرسہ کے چندے کے لئے رئیسوں کو تلاش کرو ہماری تو حالت یہ ہے گھر میں ایک کمانے والا اور دس کھانے والے ہیں۔ غرض جب کار خیر کا نام آوے تو اس طرح سب نادار اور غریب بن جاتے ہیں شہر میں ایک مدرسہ ہے جس میں طالب علموں کی تعداد اتنی بھی نہیں کہ اگر مردم شماری کی جاوے تو بیس آدمیوں کے مقابلہ میں بھی ایک طالب علم کا اوسط ہو مگر طالب علم بھولے ہیں اور ان کے نام کا ٹکڑا بھی گھر سے نہیں نکلتا اور ان ہی گھروں میں سے شادی کے وقت چار ہزار نکل آئیں گے۔ اس وقت معلوم نہیں کہ یہ رقمیں کہاں سے آجاتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جس بات کی پرواہ ہوتی ہے اس کے واسطے آدمی کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا ہے اور جس بات کی پرواہ نہیں ہوتی اس کے واسطے حیلے حوالے کر کے من سمجھوتہ کر لیتا ہے رسمیں دلوں کے اندر گھسی ہوئی ہیں تفاخر اور نمود کے لئے قرض اور ادھار کر کے بھی سامان ہو ہی جاتا ہے اور خاطر خواہ جوش دکھلایا جاتا ہے اور کار خیر اور مدرسوں اور طالب علموں کے واسطے ذرا سا حیلہ بھی کافی ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ کیا خدا تعالیٰ نے یہ تھوڑا ہی کہہ دیا ہے کہ وسعت ہو یا نہ ہو طالب علموں کو ہر

حال میں دیئے جاؤ (اور شاید یہ کہہ دیا ہے کہ وسعت ہو یا نہ ہو شادی میں چار ہزار ضرور لگا دیا کرو)

صاحبو! یہ سب حیلے ہیں شیطان ان کے ذریعہ سے دین کی طرف سے ہٹا کر اپنی راہ پر لگاتا ہے اور ذرا سی مصلحت سمجھا کر شادی وغیرہ میں اسراف اور تفاخر اور سمعہ اور ریاء جیسے امراض میں مبتلا کرتا ہے عقل کی بات یہ ہے کہ تم یہ سب واہیات رسمیں چھوڑ دو اور اس فریب میں نہ آؤ کہ ان میں یہ مصلحت ہے اور وہ مصلحت ہی ایک بڑا مانع جو رسموں کو چھوٹنے نہیں دیتا یہ خیال ہے کہ اگر رسمیں نہ کریں گے تو لوگ برا بھلا کہیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر رسمیں کرو گے تب بھی کچھ لوگ برا بھلا کہیں گے اور نہ کرو گے تب بھی کہیں گے۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ ایک طرف برا بھلا کہنے والے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اور صلحاء اور عقلاء ہیں اور ایک طرف بے وقوف اور نفس و شیطان ہیں پھر دیکھ لو کونسی طرف جاتا ہے۔ عورتیں برادری سے بہت ڈرتی ہیں کہتی ہیں کہ رسمیں نہ کریں گے تو برادری میں ناک کٹ جائے گی (کیسی برادری اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے برادری کیا چیز ہے) بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب مل کر چھوڑیں تو رسمیں چھوٹ سکتی ہیں یہ بھی ایک شیطانی دعویٰ ہے تم تنہا ہی سب رسمیں ایک دم چھوڑ دو برادری کا انتظار مت کرو کیونکہ اس طرح تو قیامت تک بھی رسمیں نہ چھوٹیں گی کیونکہ برادری میں مختلف مزاج اور مختلف خیال کے لوگ ہوتے ہیں سب کا اجتماع ایک بات پر نہیں ہوسکتا خصوصاً امر خیر پر۔ شر کی بات پر تو اجتماع ہو جاتا ہے جیسا کہ آج کل موجود ہے کہ ہر عاقل وغیر عاقل ادنیٰ واعلیٰ ان رسموں میں متفق ہیں جن کے بری ہونے کے خود بھی قائل ہیں۔ تھانہ بھون کا قصہ ہے کہ ایک جگہ رسموں کی خرابیاں بیان کی گئیں تو ایک شخص بہت الجھے کسی بات کا جواب صحیح اور عقل کے موافق تو ان سے آتا نہ تھا آخر میں کہہ دیا کہ یہ سب باتیں بزرگوں سے چلی آتی ہیں۔ کیا ہمارے بزرگ بے وقوف تھے میں کہتا ہوں اگر یہ بات رسموں کے جواز کی دلیل ہوسکتی ہے تو کفر وشرک کے جواز کی بھی دلیل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ کفار بھی تو یہی کہتے تھے وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (یعنی پایا ہم نے اس پر اپنے باپ دادوں کو) کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو بت پرستی کرتے ہی دیکھا ہم بھی ان کے طریقہ پر چلتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے اس کا یہ جواب دیا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ یعنی اگرچہ تمہارے آباء واجداد عقل اور ہدایت کے خلاف طریقہ رکھتے ہوں جب بھی ان کی تقلید کرو گے۔ ہدایت سے مراد نقل ہے حاصل یہ ہوا کہ کسی بات کے جواز وحسن پر دلیل عقلی نقلی پیش کرنا چاہئے یہ کافی نہیں کہ باپ دادا ایسے ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ یہ بات کفار نے کہی تھی جس کے جواب میں آج مسلمان بھی کہتے ہیں کہ عقل سے کام لینا چاہئے اگر دوسرے نے غلطی کی تو ہم کیوں غلطی میں

پڑیں تو جو جواب تم کفار کو دیتے ہو وہی اپنے نفس کو بھی دو لہٰذا رسموں کے چھوڑنے میں بھی کسی کی تقلید اور انتظار کی کیا ضرورت ہے آدمی کو جو کام کرنا ہے ہمت کر کے کر ڈالے بعض لوگ اس سے ڈرتے ہیں کہ لوگ کنجوس کہیں گے کہ تقریبات اس واسطے چھوڑ دیں کہ پیسہ خرچ نہ ہو میں کہتا ہوں اگر کوئی کنجوس ہی کہہ لے تو کیا بگڑے گا آپ ان کو مسرف کہہ لیجئے جن کا لقب قرآن شریف میں اخوان الشیاطین ہے اور عقلمند کے نزدیک تو بے موقع خرچ کرنے سے ایسی کنجوسی ہی اچھی۔ اس صورت میں کوئی عقلمند تو آپ کو برا کہے گا نہیں رہے کم عقل لوگ تو ان کی زبان سے کہاں تک بچے گا جب ان کو عقل ہی نہیں تو وہ جس بات کو چاہیں برا کہہ دیں گے ان کے برا بھلا کہنے کا کوئی ضابطہ ہی نہیں اگر ان کے ٹوکنے کا خیال کیا جائے گا تو زندگی محال ہو جاوے گی آپ کس کس بات میں ان کی زبان سے بچنے کا اہتمام کریں گے بس عقل سے کام لیجئے اور شریعت کو عقل کا رہبر بنائیے۔ نہ برادری کا خیال کیجئے نہ بیوقوف جاہلوں کے برا کہنے کا خدا جانے یہ رسمیں کس نے ایجاد کی ہیں کہ شادی ہو تب گھر کی بربادی اور غمی ہو تب گھر کی بربادی اور ان کے نتائج آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر چھوڑ نہیں سکتے۔

رئیس ضلع بلند شہر کے رسم چہلم ختم کرانے کا واقعہ

ضلع بلند شہر کے ایک رئیس کا انتقال ہوا ان کے صاحبزادے نے چالیسویں کی رسم کو توڑنا چاہا لیکن اس کی یہ صورت اختیار نہ کی کہ کچھ سامان نہ کریں بلکہ یہ کیا کہ رسم کے موافق تمام برادری کو دعوت دی اور بہت سے عمدہ عمدہ مرغن کھانے پکوائے۔ بڑے لوگوں پر ایک یہ بھی آفت ہے کہ جب تک وہ غمی کی نہریں نہ بہادیں اس وقت تک ان کا کرنا کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ غرباء الحمد للہ اس سے بری ہیں۔ غرض جب سب لوگ جمع ہو گئے تو کھانا چنوایا اور ہاتھ دھلوا کر سب کو بٹھلایا گیا اور کھانا شروع کرنے کی اجازت دینے سے پہلے پکار کر کہا صاحبو آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد ماجد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اور والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ جانا جس عظیم الشان صدمہ کا سبب ہوتا ہے ظاہر ہے تو صاحبو کیا یہی انصاف ہے کہ ایک تو میرا باپ مرے اور اوپر سے تم لوگ لوٹنے کے لئے جمع ہو تم کو کچھ شرم بھی آتی ہے اس کے بعد کہا کہ اب بسم اللہ کر کے کھائیے لیکن سب لوگ اسی وقت اٹھ گئے اور یہ رائے ہوئی کہ ان رسوم کے متعلق علیحدہ بیٹھ کر غور کرنا چاہئے چنانچہ بہت سے آدمی جمع ہوئے اور باتفاق رائے ان کو موقوف کر دیا اور وہ کھانا فقراء کو تقسیم کر دیا گیا۔ ہمارے قصبہ میں رواج ہو گیا ہے کہ جو لوگ بستی ہی میں میت کے یہاں تعزیت میں جاتے ہیں عورتیں ہوں یا مرد اس کے یہاں کھانا بھی نہیں کھاتے خدا کا شکر ہے کچھ تو رسمیں ٹوٹیں اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ بہتر یہ ہے کہ ایسا اجتماع آج کل میت کے یہاں ہوتا ہے یہ بھی نہ ہو خاص کر میت کا

اجتماع کیونکہ اس اجتماع سے بھی کچھ نہ کچھ بار گھر والوں پر ہوتا ہی ہے خصوصاً عورتوں کے اجتماع میں کہ ان کے پان اور ڈولی ہی کا جرمانہ بہت ہے۔ (گو ہمارے یہاں یہ بھی رواج ہو گیا ہے کہ غمی میں جا کر میت کے یہاں پان بھی نہ کھاتے نہ ڈولی کے پیسے ان سے دلواتے ہیں بلکہ جانے والی عورتیں اپنے گھر سے پان بنا کر لے جاتی ہیں اور ڈولی کے پیسے خود دیتی ہیں مگر پھر بھی گھر والے کچھ نہ کچھ سامان ضرور کرتے ہیں) علاوہ اس کے یہ بات بھی دیکھنا چاہئے کہ اجتماع کی غایت اور غرض کیا ہے اسکی غایت دو امر ہیں ایک اظہار محبت دوسرے غمزدوں کی امداد تو سمجھ لیجئے کہ محبت اگر واقعی ہے تو اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ باپ کو بیٹے سے محبت ہوتی ہے تو وہ گاتا نہیں پھرتا کہ مجھے محبت ہے اور نہ تصنع سے ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جس سے دیکھنے والوں پر اس کی محبت ظاہر ہو۔ اب اس اجتماع کی غایت صرف دوسری بات رہ گئی یعنی غمزدوں کی امداد سو آج کل کے اجتماع میں وہ بھی بالکل ندارد ہے۔ اول تو آنے والیوں کا قصد یہ ہوتا ہی نہیں کہ وہاں جا کر کچھ کام بتا دیں گے بلکہ صرف پہلی غایت کسی قدر ملحوظ ہوتی ہے یعنی اظہار محبت اور اس میں بھی صرف اظہار ہی اظہار ہوتا ہے واقع میں محبت کا نام بھی نہیں ہوتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ ان کو وہاں جا کر ذرا سی تکلیف پہنچے اور خاطر داری میں ذرا سی کمی ہو جائے تو شکایت کرتی ہیں۔ بھلا محبت میں شکایت کیسی دوسرے اگر قصد ہو بھی کہ غمزدوں کی امداد کریں تو اس اجتماع میں وہ قصد پورا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آنے والیوں کا کچھ نہ کچھ تو کام ہوتا ہی ہے الٹا گھر والوں کو کچھ نہ کچھ ان کی طرف بھی مصروفیت ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اگر اجتماع کسی بیمار کی عیادت کے لئے ہوا ہے گھر والے بیمار کی خدمت پوری نہیں کر سکتے۔ لہٰذا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ دو چار مرد یا عورتیں جو مستعد اور ہوشیار ہوں وہ تو بیمار کے گھر رہیں اور گھر والوں کا کام بتا دیں باقی اور لوگ وقتاً فوقتاً خبر گیری کے لئے آتے جاتے رہیں وہاں جمع نہ ہوں بلکہ دیر تک بیٹھیں بھی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ لوگوں کو رسموں نے چرا لیا ہے نہ کسی فعل کی غایت پر نظر ہے نہ کسی فعل کے مفسدہ کی طرف خیال جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمع ہوتے ہیں محبت کے لئے اور ہو جاتی ہے عداوت اور امداد خاک نہیں پہنچتی بلکہ مریض اور میت دونوں کی گت خراب ہو جاتی ہے۔ گھر والے مریض اور میت کو سنبھالیں یا ان کے حقے پانی اور لیٹنے بیٹھنے کا انتظام کریں غرض رسم ہی رسم رہ گئی ہے اور ان رسوم میں علاوہ اصل غرض حاصل نہ ہونے کے یہ بھی خرابی ہے کہ اس پر بھی نظر نہیں ہوتی کہ ان رسوم میں کس قدر بے جا اسراف ہوتا ہے ایک جگہ دیکھا گیا کہ ایک میت کے بعد بھنگیوں میں بھی کھانا تقسیم ہوا جس کی لاگت فی حصہ تخمیناً دو روپیہ تھی۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس اسراف کا پھر شکایت ہے کہ مسلمانوں کی قوم پنپتی نہیں۔ کسی کے گلے پر چھری پھیرے جاؤ اور یہ رونا روئے جاؤ کہ ہائے یہ مرا جاتا ہے تو یہ

حماقت ہے یا کچھ اور۔ شادی سنت کے موافق کر دو دینے لینے کو کوئی منع نہیں کرتا ہاں دکھلانے اور سنانے کو منع کیا جاتا ہے اپنے گھر میں چپکے چپکے سب کام کرلو جتنی اپنی حیثیت ہو اس سے باہر قدم نہ رکھو پھر دیکھو مسلمان پنپتے ہیں یا نہیں۔ اپنی حیثیت سے زیادہ کام کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ایسا نہ کریں تو برادری کیا کہے گی۔ مثلاً لڑکی کو زیور دیتے ہیں تو اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ چار آدمی زیور کو دیکھیں گے اس لئے گنتی کے چار پانچ عدد تو ہو جاویں اور حیثیت اتنی ہے نہیں تو محض دکھانے کے لئے اتنے ہلکے ہلکے عدد بنوائے جاتے ہیں کہ ان میں سونا برائے نام ہوتا ہے اور وہ ہرگز اس قابل نہیں ہوتے کہ چار دن بھی پہنے جا سکیں چنانچہ پھر بعد میں سب توڑ توڑ کر دوبارہ بنوائے جاتے ہیں جس میں بہت خسارہ ہوتا ہے بس محض بناء فاسد علی الفاسد ہے وہی قصہ ہوا کہ کسی نے شعر لکھا تھا جس میں کوئی لفظ مشدد آ گیا تھا۔ ایک استاد کو سنایا انہوں نے کہا کہ اس میں یہ تشدید غلط ہے یہ لفظ مشدد استعمال میں نہیں آیا ہے کہا بضرورت شعر تشدید لائی گئی کیونکہ مصرعہ ٹوٹتا تھا کہا شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے) اسی طرح جب لڑکی والوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ زیور ایسا خراب کیوں بنوایا تھا جس کو دوبارہ بنوانا پڑا اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ برادری کے ڈر سے اس کا جواب وہی ہے کہ شعر گفتن چہ ضرور (شعر کہنا کیا ضرور ہے) برادری کا ایسا لحاظ کیوں کیا جو بے عقلی کی نوبت آئی اور میں تو کہتا ہوں کہ بدنامی سے بچنے کا کتنا ہی اہتمام کیا جاوے۔ مگر بچنا ممکن نہیں بدنامی ضرور ہوتی ہے جہاں مجمع ہوتا ہے وہاں ضرور طبائع مختلف ہوتے ہیں سب طبائع کے موافق کام کرنا ناممکن ہے ذرا سی بات کسی کے خلاف مزاج ہوئی تو وہ مطعون کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ قولاً یا فعلاً مجمع والوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ یہاں اس بات کا بیڑا اٹھایا گیا ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش پوری کی جاوے گی کہ اس صورت میں تو ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ کوئی موقع گرفت کا ملے چنانچہ مشاہد ہے اب شادی بیاہ کیا ہیں لام بندی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو برباد کرنے اور نیچا دکھلانے پر تلے ہوئے ہیں۔ ذرا صحیح نظر سے دیکھئے تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جو کوئی شریعت کو چھوڑتا ہے اس سے عقل بھی رخصت ہو جاتی ہے۔

شادی بیاہ کی بناء

دیکھئے شادی بیاہ کی بناء تو تعلق و محبت بڑھانے اور دو اجنبی خاندانوں کو ملانے پر ہے اور ان رسوم کی بدولت وہ ملے ہوئے خاندانوں میں بھی تفریق ہو جاتی ہے۔ جس کام میں اصل غرض ہی محفوظ نہ رہے وہ عقل سے خارج ہوا یا نہیں یہ ایسا ہوا جیسے کوئی بازار گیا تھا تجارت کرنے اور روپیہ کمانے کیلئے اور وہاں جا کر اپنا اصلی اثاثہ بھی کھو آیا بلکہ کچھ قرض بھی کر آیا تو اس کو عقلمند کہا جاوے گا یا بیوقوف اور اس کو بازار جانے سے منع کرنا درست ہے یا اجازت دینا۔ ایک بنئے

کے یہاں شادی ہوئی بنئے اکثر مالدار ہوتے ہیں اس نے بہت کچھ لیا دیا اور علاوہ عمدہ عمدہ کھانے کھلانے کے رخصت کے وقت بارات کے ہر ہر شخص کو ایک ایک اشرفی بھی دی مگر اس پر بھی ایک شخص نے یہی کہا کہ سسرے نے کیا دیا اتنا بڑا آدمی تھا فی کس اگر دو دو اشرفی دیتا تو کیا مر جاتا، بس سارا لینا دینا مٹی ہو گیا جس غرض سے خرچ کیا تھا وہ بھی حاصل نہ ہوئی تعریف تو کیا ہوتی بلکہ کسی نہ کسی نے اعتراض ہی کر دیا مثل مشہور ہے کہ زبان نہیں پکڑی جاتی۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اس کا بیڑا ہی نہ اٹھایا جاوے کہ ہم سب کی خواہش پوری کریں گے اور کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملے گا بلکہ سیدھی سادی شادی کرو جس کو نکاح کہتے ہیں۔

شادی کے متعلق جاہلوں کی اصطلاح

آج کل یہ بھی جاہلوں کی اصطلاح ہے کہ شادی اسی کو کہتے ہیں جس میں خوب دھوم دھام اور جہاں یہ نہ ہو اس کو شادی نہیں کہتے بلکہ نکاح کہتے ہیں چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو غریب آدمی ہیں۔ شادی تو ہمارے یہاں کہاں ہو سکتی ہے بس ہم تو نکاح کر دیں گے۔ واقعی ٹھیک کہا نکاح تو وہی ہے جس میں خرافات نہ ہوں اور شادی تو کفار کی رسم ہے۔ جس میں ریا و نمود ہوتی ہے نکاح طریقہ سنت ہے اس کو ریا و نمود سے کیا مطلب اس محاورہ میں اس کا اقرار ہے کہ نکاح وہی ہے جس میں رسمیں نہ ہوں اور جس میں رسمیں ہوں وہ نکاح نہیں بلکہ شادی ہے پس تم طریقہ سنت ہی اختیار کرو کفار کی سی شادی نہ کرو۔ جہاں تک ہو سکے مختصر کام کرو اور غمی میں بھی نہ خود جمع ہو نہ کسی کو جمع کرو۔ غمی میں مجمع ہونا تو شادی سے بھی زیادہ برا ہے اس کا انجام سوا اس کے کچھ بھی نہیں کہ میت کے گھر والوں کو پریشان کرنا اور زیر بار کرنا اور مرتے کو مارنا ہے۔

غمی میں ایصال ثواب کے لئے اجتماع کی ضرورت نہیں

غمی میں مجمع بالکل ہی نہ چاہئے ہاں جس کے جانے سے تسلی ہو وہ جائے وہ اگر کہیں دور بھی ہو تو اس کا پہنچ جانا مناسب ہے۔ لوگ کہتے ہیں مجمع ایصال ثواب کے واسطے کیا جاتا ہے کہ سب کچھ کچھ پڑھ کر بخشیں گے مجمع کو کچھ کھانا کھلایا جائے گا تو سمجھ لیجئے کہ ثواب بلا مجمع کے بھی پہنچ سکتا ہے۔ خلوص کے ساتھ عزیز و اقارب اور اہل محبت خفیہ کچھ کچھ خیرات کر دیں یا کچھ پڑھ کر بخش دیں یا کچھ نہ ہو تو اس کے لئے دعا کریں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ اس کے لئے زیادہ کارآمد ہو گا آپ کے ہزاروں روپیہ خرچ کرنے اور دھوم دھام مچانے سے میت کو کچھ نفع نہیں ہوتا۔ غرض ان گھڑی ہوئی رسوم کو چھوڑ دو اور یہ مت سمجھو کہ مال کا خرچ کرنا ناچ اور گانے میں ہی

منع ہے بلکہ جہاں ضرورت نہ ہو اور جہاں شیخی اور دکھلاوا مقصود ہو اور التزام مالایلزم (جو چیز لازم نہیں اس کا لازم کر لینا) ہو وہاں خرچ کرنا بھی اضاعت مال ہے جس کی نسبت خصوصاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ ہے واضاعۃ المال (مال کا ضائع کرنا) اور غور کیا جاوے تو اس کا سبب ناشکری ہے یعنی حق تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہ پہچاننا کیونکہ جس کے دل میں کسی چیز کی وقعت ہوتی ہے اس کو ہاتھ سے دیتے ہوئے دل دکھا کرتا ہے اگر کسی کو ایک تمغہ کسی انعام میں مل جائے تو گو وہ کوئی چیز نہیں مگر اس کو حفاظت سے رکھتا ہے کیونکہ ایک ذی وجاہت شخص کا عطیہ ہے اگر ہم مال کو عطیہ الٰہی سمجھیں تو اس کی قدر تمغوں وغیرہ سے بھی زیادہ کریں۔ یاد رکھو کہ مال بڑی نعمت ہے اگر مال نہ ہو تو کوئی کام بھی دنیا کا نہ ہو۔ اس بات سے کچھ تعجب نہ کیجئے کہ میں مال کو اچھا کہہ رہا ہوں آپ نے عام طور سے واعظوں کو مال کی مذمت ہی کرتے سنا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ مال برا نہیں ہاں حب مال بری چیز ہے بلکہ مال تو کسی درجہ میں ضروری چیز ہے۔ جو شخص مال کو درجہ ضرورت میں رکھتا ہے وہ محب مال نہیں ہے آدمی محب مال جب کہلاتا ہے کہ اکتساب مال میں حرام وحلال کی تمیز نہ کرے یا خرچ کرنے میں وجوب ومروت کے مواقع میں تنگی کرے بس یہی علامت ہے حب مال ہونے اور نہ ہونے کی باقی مال کتنا ہی زیادہ ہو جاوے اگر اس کا اکتساب ناجائز طریق سے نہیں ہوا ہے اور اس کے حقوق ادا کئے جاتے ہیں تو وہ برا نہیں ہے اور اہل اللہ کے کلام میں جو مال کی برائیاں ملتی ہیں۔ نیز ان کو جو خود مال کے اکتساب سے اجتناب رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کلیہ تو صحیح ہے کہ مال بشرائط مذکور بری چیز نہیں ہے۔ لیکن ان شرائط کا پایا جانا ذرا کم ہے فی صدی ایک دو آدمی بھی ان کے پابند مشکل سے نکلتے ہیں اس واسطے سد اللباب اہل اللہ نے مال سے اجتناب رکھا ہے اور اس کے خلاف پر تحریض کی ہے تاہم یہ کہنا صحیح ہے کہ مال میں عیب ہی عیب نہیں ہیں کچھ فوائد بھی ہیں عیب ہائے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ (تمام عیب بیان کرتا ہے اس کا ہنر بھی بیان کر) مال کے فوائد یہ ہیں کہ جب مال بقدر کفایت پاس ہوتا ہے تو قلب کو اطمینان رہتا ہے دنیا کے کام بھی ٹھیک ہو سکتے ہیں اور دین کے کام بھی۔ فراغ عجیب چیز ہے جب یہ فراغ قلب جاتا رہتا ہے تو آدمی سے کچھ کام بھی نہیں ہو سکتا جس کو پورا توکل حاصل نہ ہو اس کے لئے مال ہی فراغ کا ذریعہ ہے اس کو خصوصیت کے ساتھ ہرگز مال ضائع نہ کرنا چاہئے یعنی بے موقع خرچ نہ کریں۔ ضعیف القلب لوگوں کے لئے مال سب سے عمدہ ذریعہ اطمینان کا ہے آج کل قوی القلب لوگ کم ہیں۔ اور یہ حالت ہے کہ ذرا سی تنگی پیش آئے تو بھٹکے پھرتے ہیں حتیٰ کہ نعوذ باللہ بعضے مرتد ہو جاتے ہیں مال کا نہ رکھنا اور فقر وزہد اختیار کرنا تو استحباب

کا درجہ ہے اس کیلئے ایمان کھونا کیسی سخت بات ہے اس واسطے آج کل عام مجمع میں زہد کی تعلیم دینا ٹھیک نہیں ہے۔ہاں اس تعلیم کی ضرورت ہے کہ مال حرام ذرائع سے نہ کماؤ یہ درجہ زہد کا ہر حالت میں ضروری ہے مگر دنیا کامل زاہدوں سے خالی نہیں ہے بعضے ایسے لوگ بھی ہیں جو فقیر و نادار اور بالکل محتاج ہیں مگر غنائے باطنی رکھتے ہیں اس درجہ کے لوگ جس درجہ کا زہد اختیار کریں درست ہے اور ان کے لئے زہد بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر نہایت شکستہ حال ہیں۔مگر ان کی نظروں میں سلاطین کی بھی کچھ حقیقت نہیں انہیں کے حق میں کہا گیا ہے۔

مبیں حقیر گدایان عشق را کیں قوم شہاں بے کمرو خسرواں بے کلہ اند

(گدایان عشق کو حقارت سے نہ دیکھو۔اس لئے یہ لوگ بے تخت تاج کے بادشاہ ہیں)

مگر چونکہ یہ لوگ آج کل کم ہیں اس واسطے اس وقت ان سے خطاب بھی نہیں بلکہ عام خطاب یہی ہے کہ مال کے پیچھے تو نہ پڑو لیکن اگر حلال طریق سے حاصل ہو تو اس کو ضائع بھی نہ کرو اور اس کو برا مت سمجھو خصوصا جبکہ وہ دین کے لئے معین بھی ہو۔

مال را گر بہر دین باشی حمول نعم مال صالح گفت آں رسول

مال حلال طریقہ سے حاصل کیا جائے اور اچھی نیت سے رکھا جائے تو عجیب چیز ہے ہاں ناجائز طریق سے نہ کمایا جائے۔نہ ناجائز طریق سے خرچ کیا جائے اچھا کھانا اچھا پہننا یہ بھی ناجائز نہیں ہے بلکہ بعض کیلئے بڑی منفعت کی چیز ہے ایک اہل دل کا قول ہے کہ اچھا کھاوے اس نیت سے کہ عبادت زیادہ کروں گا اور اچھا کپڑا پہنے اس نیت سے کہ حق تعالیٰ کا عطیہ ہے اور حق تعالیٰ کو میں اچھا معلوم ہوں گا۔

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار رحمہ اللہ اور مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت

حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کتنے بڑے امیر تھے اور اسی کے ساتھ شیخ وقت بھی تھے مولانا جامی ان کے پاس گئے دیکھا کہ بڑے ٹھاٹھ ہیں۔مولانا جامی کو یہ بات پسند نہ آئی اور یہ مصرعہ سنا کر چل دیے اور ایک مسجد میں جا پڑے۔نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد۔(وہ مرد خدا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے) دوپہر کو خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور حساب و کتاب ہو رہا ہے ان کو ایک شخص نے آکر پکڑ لیا کہ میرے تین پیسے جو تمہارے ذمہ ہیں وہ دیتے جاؤ وہاں ان کے پاس پیسے کہاں تھے بہت حیران ہوئے کہ کیا کروں۔دیکھا کہ خواجہ عبیداللہ احرار ایک سواری میں سوار سامنے سے گزرے اور یہ واقعہ دیکھ کر اپنے کسی خادم سے کہا کہ جو خزانے ہم نے یہاں بھیجے

ہیں ان میں سے یہ دام دے کر ان کو چھڑا دو یہ ہمارے مہمان ہیں بس مولانا کی آنکھ کھل گئی اور سمجھے کہ میں غلطی پر تھا اٹھ کر شاہ صاحب سے معافی چاہی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ صاحبزادہ وہ مصرعہ کیا پڑھا تھا انہوں نے عذر کیا کہ اب کیا مجال جو ایسا حرف زبان پر لاؤں فرمایا پہلے اپنی خوشی سے پڑھا تھا اب ہماری خوشی کے لئے پڑھ دو۔ غرض مجبور ہو کر پڑھا مصرعہ نہ مردست آنکہ دنیا دوست دارد (وہ مرد خدا نہیں جو دنیا کو دوست رکھے) شاہ صاحب نے بیساختہ فرمایا۔ گر دارد برائے دوست دارد (اگر رکھے دوست کی وجہ سے رکھے) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں بڑے امیر تھے مگر ہم میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ وہ حلال سے کماتے تھے اور حلال میں خرچ کرتے تھے نہ آمد میں ان پر کوئی اعتراض ہو سکتا تھا نہ خرچ میں اور ہماری یہ حالت ہے کہ نہ کمانے میں حلال وحرام کا خیال نہ اٹھانے میں۔ آمد بھی قابل الزام خرچ بھی قابل الزام۔

مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب

مسلمانو کیا حالت ہے تمہاری اپنے ہاتھوں اس قدر تباہی مول لی ہے کہ دن بدن گرتے جاتے ہو یہ واویلا تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ مسلمان تباہ حال ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس مال کی اتنی کمی نہیں ہے جتنا شور وغل ہے ہاں خرچ زیادہ ہے اس کی کمی کرنی چاہئے اور اس کے لئے معیار شریعت سے اچھا کوئی بھی نہیں ہے شریعت کے موافق چلئے دیکھئے پھر کتنی شکایت کم ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ مال کو غنیمت سمجھو اور اسکو عطیہ الٰہی خیال کرو جس کے خرچ کا حساب دینا ہوگا۔ بے دھڑک اور بے سوچے سمجھے خرچ مت کرو۔ میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مال کو عطیہ الٰہی نہ سمجھنا یہی سبب ہے اس کے مفاسد کا اسی طرف قرآن کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا. (اور زیادہ فضول خرچی مت کرو یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) مبذرین کو اخوان الشیاطین فرمایا اور شیطان کی صفت کفور فرمائی تو مبذرین کے لئے بھی یہ صفت کفور ثابت ہو گئی اور کفور کفران سے مشتق ہے جس کے معنی ناشکری کے ہیں اس کا مقابل شکر ہے۔ جب ناشکری سبب ہوئی اسراف واضاعت مال کی تو شکر سبب ہوگا حفظ مال کا اور ناشکری کی مذمت ہے اور اس سے نہی ہوئی ہے تو شکر کی مدح ہوئی اور اس پر تحریض ہو گئی دیکھئے آیت میں میرے قول کی تائید موجود ہے کہ قلت شکر سبب ہے اسراف کا اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ وعظ

خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث میں چار چیزوں سے ممانعت ہوئی گو ظاہر میں تین ہی باتوں کا ذکر ہے مگر سوال کے دو معنی اوپر بیان ہوئے ہیں اس لئے چار چیزوں سے ممانعت ہوگئی ایک قیل وقال سے اس میں زبان کے تمام گناہ آگئے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے حتیٰ کہ خوش آوازی سے بے موقع اشعار پڑھنا بھی اس میں داخل ہے اور بڑے گناہ جیسے غیبت وغیرہ یہ بھی اس میں داخل ہیں (میں ساتھ ساتھ ہر فعل کی اصل اور اس کا علاج بھی بتلانا چاہتا ہوں) قیل وقال کی جڑ ترفع ہے۔ دوسری چیز کثرت سوال ہے اس کی دو تفسیریں تھیں ایک سوال بمعنی مانگنا اس کی جڑ بے حیائی ہے اور دوسری تفسیر سوال کا زیادہ پوچھنا ہے یعنی علماء کو لایعنی سوالات سے دق کرنا اس کی اصل عمل کا ارادہ نہ ہونا زیادہ چوں وچرا وہی کیا کرتا ہے جس کو کام کرنا نہیں ہوتا چوتھی چیز مال کا ضائع کرنا ہے اس کی اصل قلت شکر ہے تو یہ چار چیزیں تو عمل ظاہری کے مرتبہ میں ہوئیں اور چار چیزیں ان کی اصل ہوئیں باطن میں مجموعی معالجہ کا یہ ہے کہ اعمال ظاہری کے لئے تو ترک کی ہمت علاج ہے بے ہمت کے کچھ نہیں ہوسکتا آدمی اسی معنی کا مکلف ہے اور باطنی چار چیزوں کے لئے جو ان ظاہری اعمال کی اصل تھیں وہ چیزیں علاج ہیں ایک ذکر اللہ، ذکر سے میری مراد زبانی علاج نہیں بلکہ ذکر قلبی جو مرکز ہے ذکر لسانی کا مطلب یہ ہے کہ ذکر کی اتنی کثرت کی جاوے کہ وہ قلب میں رچ جائے۔ جب ذکر قلب میں رچ جاتا ہے تو معاصی دور ہٹ جاتے ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ ہر کام کا انجام سوچا کرو۔ قلب کی اصلاح اس سے بہت ہوتی ہے۔ اگر اس کا پورا التزام کرلیا جائے تو نہ قیل وقال رہے کیونکہ خیال ہوگا کہ اس کا نتیجہ کیا ہے کم سے لایعنی تو ضرور ہے اور نہ کثرت سوال رہے گی بہر دو معنی کیونکہ مانگنے کا انجام خیال میں آئے گا کہ ذلت ہے جو طبعاً وشرعاً دونوں طرح مذموم ہے اور بیجا سوالات کا انجام یہ خیال میں آئے گا کہ اہل اللہ کو تکلیف دینا اور عمل کا قصد نہ کرنا بیہودہ بات ہے یا کم سے کم فعل لایعنی تو ضرور ہے اور انجام سوچنے سے اضاعت مال بھی نہ ہوگی کیونکہ اس میں دنیا و دین دونوں کی خرابیاں پیش نظر ہوجائیں گی۔

خلاصہ کا خلاصہ یہ ہوا کہ فکر کی ضرورت ہے اور اس کے عمل و ذکر دائم لازم ہے سو صاحبو ہمت کرو اور بڑی ہمت یہ ہے کہ ملامت کا خوف نہ کرو کوئی کچھ کہے کہنے دو کرو وہی جو اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں اور آسائش وآرام طلبی کو کسی قدر ترک کرو کیونکہ اسکے بغیر کوئی کام

نہیں ہوسکتا پابندی کسی چیز کی بھی کی جاوے آسائش میں غلو کرنے سے کام میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور پڑتا ہے۔ دوسری ضرورت ہے ذکر اللہ کی۔ زبان سے ذکر کرو اور دل میں بھی ذکر کرو دل کا ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو سوچا کرو کہ وہ علیم ہیں ہمارے ظاہری و باطنی سب گناہوں کو جانتے ہیں اور قدیر ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں اس کے سوچنے سے گناہ بالکل ندارد ہو جائیں گے اور صرف اس کا سوچنا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان باتوں کو معلوم کیا جاوے جو خدا تعالیٰ کو ناپسند ہیں کیونکہ اس سوچنے سے مقصود معاصی سے بچنا ہے اور معاصی سے بچنا جب ہی ہوسکتا ہے جب علم ہو تو تیسری ضرورت ہوئی علم دین کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب مولوی ہی بن جائیں بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ علماء سے ملتے رہیں اور جو بات پیش آوے اس کا حکم پوچھ لیا کریں اور عورتوں کے لئے آسان صورت یہ ہے کہ جو پڑھی ہوئی ہیں وہ چھوٹے چھوٹے رسالے اردو کے لے کر دیکھ لیا کریں لیکن اپنی رائے سے نہیں بلکہ مستند عالم سے پوچھ کر جس کو وہ منتخب کریں ان کو دیکھیں ان کے سوا اور کتابوں کو نہ دیکھیں اور جو بیبیاں خود پڑھی لکھی نہیں ہیں وہ پڑھی لکھی بیبیوں کے پاس آمد و شد رکھیں بلکہ کوئی وقت مقرر کر کے ان رسالوں کو سنا کریں اور جو کوئی واقعہ پیش آوے اس کا حکم اپنے مردوں کی معرفت علماء سے دریافت کر لیں اس طرح سے ہر مسلمان عالم بن سکتا ہے۔ مولوی کا نام نہ آیا نہ سہی مگر جتنے علم کی ضرورت ہے وہ حاصل ہوسکتا ہے اور یہ طریقہ کس قدر سہل ہے مگر کسی قدر اہتمام کی ضرورت ہے اور بلا مقصد تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔

غرض اللہ کے ہو جاؤ اطاعت کرو اور نافرمانی سے بچو بس خدا ہی کے ہو جاؤ
اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرماوے۔ فقط

اصلاح النفس

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۵ صفر ۱۳۳۰ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں سوا دو گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ۱۵۰ تھی۔

مولوی سعید احمد صاحب نے قلم بند فرمایا۔

اپنی اصلاح کی فکر اہم ہے۔ آخرت کا فکر کتنا ضروری ہے آخرت سے ہم کو بہت غفلت ہے۔ اصلاح کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے اول علم، دوم اہل اللہ سے تعلق۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔
فقد قال اللّٰہ تعالٰی۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ ط اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (المائدہ آیت ۱۰۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! لازم پکڑو اپنے اوپر اپنے نفسوں کو نہ نقصان پہنچا سکے گا تمہارا وہ شخص جو گمراہ ہے جبکہ تم نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے پس اللہ تعالیٰ تم کو آگاہ کرے گا جو تم لوگ عمل کرتے ہو۔ یہ وہی آیت ہے کہ جس کے متعلق اس کے قبل بھی بیان ہوا ہے اس روز خیال تھا کہ آیت کے متعلق جتنا کچھ ضروری مضمون ہے وہ بیان ہو گیا لیکن بعد کو تامل سے معلوم ہوا کہ ابھی آیت کے ایک جزو کے متعلق بیان کرنا باقی ہے کیونکہ آیت میں ایک جملہ انشائیہ ہے اور دوسرا جملہ خبریہ جو کہ معنی انشائیہ ہے کیونکہ ہر جگہ نفس خبر مقصود بالذات نہیں ہوتی۔

علوم کی دو قسمیں

حاصل یہ ہے کہ علوم دو قسم کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ خود وہ علوم ہی مقصود بالذات ہیں جیسے عقائد مثلاً قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اور وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے اللہ تعالیٰ ایک ہے اور وزن اعمال کا تولا جانا اس دن حق ہے) اس میں تو خود خبر ہی مقصود ہوتی ہے

کیونکہ ان کے متعلق کوئی عمل نہیں ہوتا دوسرے وہ علوم ہیں کہ خود وہ علم مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس علم سے عمل مقصود ہوتا ہے خواہ وہ امر ہو یا نہی ایسے مقام پر اگر خبریہ ہو تو وہ معنی انشاء ہوگا جس کی تعیین قرائن سے ہو جائے گی مثلاً اس مقام پر خدا تعالیٰ نے اول ایک امر فرمایا ہے اس کے بعد جملہ خبر یہ ذکر فرمایا ہے جس سے مقصود اس امر کی تاکید ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ اس امر کی مخالفت نہ کرو پس معلوم ہوا کہ اعمال میں خبر مقصود نہیں ہوتی لہٰذا میں اس خبر سے تعرض نہیں کرتا بلکہ صرف دو مضمونوں کو لیتا ہوں ایک امر کو دوسرے نہی کو جو کہ جملہ خبریہ سے مقصود ہے۔ یعنی لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ سے کیونکہ مقصود یہ ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں نہ پڑو۔ گزشتہ جمعہ کو بیان کا زیادہ رخ اسی نہی کی طرف رہا اور آیت میں مقصود بھی زیادہ تر یہی ہے کہ دوسروں کی فکر میں نہ پڑو اور اس وجہ سے امر کے متعلق کچھ بیان نہیں ہو سکا تھا اور صرف نہی کے متعلق بہت کافی مضمون بیان ہو گیا تھا کیونکہ اس وقت تک ذہن میں یہ تھا کہ محیط فائدہ صرف لَا یَضُرُّکُمْ ہے۔

اپنی فکر اصلاح کی ضرورت

لیکن غور کرنے سے معلوم ہوا کہ علیکم انفسکم کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور اگرچہ مسوق لہ الکلام صرف لا یضرکم ہے لیکن جملہ اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا کا زیادہ تعلق عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ سے ہے کیونکہ دوسروں کی فکر کرنا کچھ ایسا گناہ نہیں جس پر اس جملہ الی اللہ مرجعکم کو مرتب فرمایا جائے پس وہ علیکم انفسکم کے ساتھ مرتبط ہے اور اس پر مرتب ہے اور اس ترتب سے معلوم ہوتا ہے کہ علیکم بھی مقصود ہے۔ کیونکہ حاصل اس کا یہ ہے کہ چونکہ تم کو خدا کے پاس جانا ہے اس لئے تم اپنی فکر کرو اور غفلت میں نہ پڑو اور اپنی اصلاح کرو بہر حال یہ ایک ضروری مضمون ہے اس مقام پر بھی اور فی نفسہ بھی۔ اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت یہ ہوئی کہ اگر ہم اپنی حالت میں غور کریں تو ہم کو معلوم ہو کہ ہم کن کن خرابیوں میں مبتلا ہیں ہاں اگر غفلت ہی میں رہیں جیسا کہ اس وقت تک رہے ہیں تو اور بات ہے لیکن باوجود شدید غفلت کے اتنا ہر مسلمان کو علم ہے اور اگر غور کرے تو اس کو معلوم بھی ہو جائے کہ آخرت کی فکر کتنی ضروری ہے نیز اپنی حالت موجودہ میں غور کرنا اس ضرورت کو اور بھی موکد کر دیتا ہے کیونکہ ہر شخص اپنی روزمرہ کو دیکھ لے اور سوچ لے کہ اس کے تمام وقت میں سے آخرت کی فکر میں کتنا وقت خرچ ہوتا ہے حالانکہ ہر شخص کے نزدیک موت کا آنا یقینی ہے بلکہ ایسا یقینی ہے کہ دوسرے تمام خطرات اتنے یقینی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سخت مقدمہ میں ماخوذ ہو اور مسل پوری اس کے خلاف ہو تو اگرچہ اس کو غالب گمان اپنے سزا پانے کا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی رہائی کا احتمال بھی باقی

رہتا ہے اسی طرح اگر ایک شخص کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو جائے تو جس طرح اس کو ہلاک ہونے کا گمان ہوتا ہے اسی طرح صحت کا بھی گمان ہوتا ہے غرض ہر امر میں دونوں پہلو ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کس تندہی اور توجہ سے اس کی فکر میں مشغول ہوتے ہیں اور ہمہ تن اسی میں کھپ جاتے ہیں لیکن موت میں کسی شخص کو بھی یہ احتمال نہیں کہ میں اس سے محفوظ رہوں گا نہ کافر اس سے بچے گا نہ مسلمان حتیٰ کہ شیطان جو سب سے بڑا کافر اور شریر ہے اس کو بھی ایک دن موت آئے گی کیونکہ اس کو جو مہلت دی گئی ہے تو قیامت تک مہلت دی گئی ہے جیسا کہ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (مہلت دیجئے مجھ کو قیامت تک کے لئے) سے ظاہر ہے غرض موت میں کسی کو شبہ نہیں بلکہ توحید جیسی یقینی چیز سے لوگوں نے انکار کیا مگر موت سے انکار نہیں کر سکے معاد کے متعلق مختلف رائیں ہوئیں کوئی حق پر ہے کوئی باطل پر ہے لیکن موت میں سب متفق رہے۔

موت سے فراموشی

مگر باوجود اس قدر یقینی اور متفق علیہ مسئلہ ہونے کے اس کو ہم نے ایسا بھلا دیا ہے کہ یاد دلانے سے بھی ہم کو یاد نہیں آتی نہ تذکیر قولی سے نہ تذکیر فعلی سے مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی شخص مرتا ہے تو ہم اس کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں قبرستان تک جاتے ہیں لیکن ہنستے کھیلتے چلے آتے ہیں ہمارے قلب پر تفکر یا تدبر کے آثار ذرا بھی نہیں ہوتے غرض کوئی مصیبت ایسی نہیں کہ ہم کو اس سے موت کی طرف توجہ ہو جائے تو صاحبو کیا یہ حالت مہمل چھوڑنے کے قابل ہے کیا یہ ضروری العلاج نہیں اگر ہے تو فرمایئے آج تک اس کا کیا علاج کیا، اگر نہیں کیا تو اب کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ علاج میں جس قدر دیر اور غفلت کی جاتی ہے مرض بڑھتا جاتا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے ہر شخص غور کر لے کہ جس قدر خوف بچپن میں تھا جوانی میں نہیں ہے اور جس قدر جوانی میں ہے۔ بڑھاپے میں نہیں ہے حتیٰ کہ بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ سالہا سال تک ان کو ذرا بھی اثر نہیں ہوتا اور بعض کو اگرچہ موت یاد ہے لیکن خوف اور دہل نہیں ہے۔ دیکھو اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ میرے گرفتار کرنے کے لئے گارڈ پھرتی ہے تو اس کے قلب کی کیا حالت ہوگی کہ عیش تلخ ہو جاتا ہے چین آرام برباد ہو جاتا ہے ہر وقت یہ ذہن میں ہوتی ہے کہ کسی طرح میں اس مصیبت سے نجات پاؤں۔

گناہوں سے ہماری دلیری

غرض موت سے ہر وقت ڈرنا چاہئے خصوصاً جبکہ گناہوں کا انبار بھی سر پر لدا ہوا ہو جس سے آپ کو بھی سخت اندیشہ ہے آخرت میں بھی اور دنیا میں بھی مگر ہم لوگ اس سے ایسے دلیر ہیں

کہ کسی مصیبت میں گناہوں کو کبھی یاد نہیں کرتے بلکہ مصیبت میں اکثر مقولہ زبان پر لے آتے ہیں کہ کرتو ڈر نہ کرتو ڈر مطلب یہ کہ ہم نے تو کوئی جرم نہیں کیا مگر اڑنگے میں آ گئے سو خوب سمجھ لو کہ یہ ایک جاہلانہ مقولہ ہے کیونکہ نہ کرکے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ اگر کچھ نہ کرکے بھی ڈرنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ گویا ظالم ہیں خوب یاد رکھو کہ ایسا کہنا سخت توہین کرنا ہے خدا تعالیٰ کی۔ صاحبو! خدا تعالیٰ تو کیے پر بھی بہت کم گرفت کرتے ہیں اور بے کیے تو پکڑتے ہی نہیں چنانچہ قرآن شریف میں منصوص ہے ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر (جو تم کو پہنچتی ہے مصیبت اور تکلیف تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے) اور بہت سی تو درگزر ہی کر دیتا ہے) یعنی ہمارے کرتوتوں میں بھی بہت سے معاف ہو جاتے ہیں اور ان پر گرفت نہیں ہوتی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چور کو گرفتار کیا اور قطع ید کا حکم دیا اس چور نے کہا کہ اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ یہ میرا پہلا قصور ہے مجھے معاف کر دیجئے پھر کبھی نہ کروں گا۔

اللہ تعالیٰ کا حلم

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تو غلط کہتا ہے خدا تعالیٰ پہلے جرم میں کسی کو رسوا نہیں کرتے چنانچہ تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے قبل بھی دو تین مرتبہ چوری کر چکا ہے۔

حلم حق باتو موا ساہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(خدا تعالیٰ کا حلم تیری رحمت و ہمدردی کرتا ہے اگر جب تو حد سے گزر جاتا ہے تو ذلیل کرتا ہے)

خدا تعالیٰ کا حلم بہت کچھ مواسات کرتا ہے لیکن جب ہم حد سے بالکل ہی نکل جائیں تو آخر غیرت خداوندی ہم کو رسوا کر دیتی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ گناہوں پر بھی ہم کو بہت کم پکڑتا ہے لیکن چونکہ ہم لوگ اپنے بہت معتقد ہیں اپنے معاصی کی خبر ہم کو نہیں ہے اور بعض اوقات تجاہل بھی ہوتا ہے کہ غفلت کی وجہ سے ہم کو کوئی پتہ نہیں چلتا چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ خدا جانے ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ مصیبت ہم پر نازل ہوئی اللہ اکبر گویا ہم کو کسی وقت اپنے گناہ سے خالی ہونے کا بھی گمان ہے۔

اپنے گناہوں سے غفلت کی عجیب مثال

صاحبو! اپنے گناہوں سے غفلت کرنا بہت بڑا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کے معتقد ہیں ایسے لوگ اور بھی زیادہ تباہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے تقدس کی گویا دلیل بھی موجود ہوتی ہے کہ جب اتنے لوگ ہم کو

اچھا کہتے ہیں تو یقیناً ہم اچھے ہوں گے ہماری بالکل وہ حالت ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک مکتب کے لڑکوں نے اتفاق کیا کہ آج استاد صاحب سے چھٹی لینی چاہئے اور تو کوئی سبیل نہ نکل سکی آخر اس پر رائے ٹھہری کہ جب استاد صاحب آئیں تو سب مل کر ان کی مزاج پرسی کرو اور ان کو بیمار بتلاؤ چنانچہ سب نے ایسا ہی کیا دو چار لڑکوں کو تو استاد صاحب نے جھڑک دیا لیکن جب متواتر سب نے یہ ہی کہا تو استاد صاحب کو بھی خیال ہوا آخر سب کو لے کر گھر چلے گئے اور حکم کیا کہ تم دہلیز میں بیٹھ کر پڑھو میں گھر میں آرام کرتا ہوں لڑکوں نے دیکھا کہ مقصود اب بھی حاصل نہ ہوا تو آخر نہایت زور سے چلا کر پڑھنا شروع کیا استاد صاحب کو مصنوعی درد وغیرہ تو پیدا ہو ہی گیا تھا چلا کے پڑھنے سے اس میں واقعی ترقی ہونے لگی مجبور ہو کر سب کو چھوڑ دیا جیسا وہ معلم لڑکوں کے کہنے سے مبتلائے وہم مرض جسمانی ہو گیا تھا۔

مبتلائے وہم مرض نفسانی

سب معتقدین کے کہنے سے مبتلائے وہم مرض نفسانی یعنی گمان تقدس ہو گئے ہیں لیکن بطور لطیفہ یہ بھی کہا جائے گا کہ ایسے لوگوں میں جہاں اپنے کو مقدس سمجھنے کا مرض ہے اس کے ساتھ ہی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی مقدس سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال کو باوقعت جانتے ہیں تو خیر ان میں جہل کے ساتھ تواضع بھی ہے مگر یہ اعتقاد دوسروں کو اس باب میں سچا سمجھنے کا ایسا ہے کہ جیسے کسی نائن نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ نتھ اتار کر منہ دھو رہی ہے نتھ اتری دیکھ کر فوراً اپنے شوہر کے پاس دوڑ گئی اور کہا کہ بیوی صاحبہ تو بیوہ ہو گئیں جلدی جا کر اس کے شوہر کو خبر کر نائی صاحب فوراً اس بیوی کے شوہر کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضور آپ کیا بے فکر بیٹھے ہیں آپ کی بیوی صاحبہ بیوہ ہو گئیں ججمان صاحب نے رونا شروع کر دیا گریہ و بکاء کی آواز سن کر دوست احباب جمع ہو گئے سبب پوچھا تو یہ لغو حرکت معلوم ہوئی دوستوں نے کہا کہ بھائی جب تم زندہ ہو تو تمہاری بیوی کیونکر رانڈ ہو گئیں آپ فرماتے ہیں کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن یہ نائی نہایت معتبر شخص ہے یہ جھوٹ نہ بولے گا یہ ہی ہماری حالت ہے کہ اپنے گناہوں کا ہم کو علم ہے اپنی حالت خوب جانتے ہیں لیکن محض اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ ہم کو اچھا کہتے ہیں ہم بھی اپنے معتقد ہو گئے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کا کوئی معتقد نہیں لیکن وہ پھر بھی اپنے معتقد ہیں تو چونکہ تقدس کا یقین اپنے اوپر ہے اس لئے اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیوں ہم پکڑے گئے صاحبو! ہم کو تو نہ پکڑے جانے پر تعجب ہونا چاہئے جو شخص روزانہ ڈکیتی ڈالتا ہو اگر چھ ماہ تک بچا رہے تو تعجب ہے اور گرفتار ہو جائے

تو کچھ بھی تعجب نہیں۔ ہم لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جن گناہوں پر مواخذہ نہیں ہوا ان سے خدا تعالیٰ ناراض نہیں ہوئے چنانچہ جب مصیبت کے التفات کرتے ہیں تو نئے گناہوں کو دیکھتے ہیں۔

حالانکہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ اگر گناہ آج کیا ہو تو آج ہی مواخذہ بھی ہو دیکھئے اگر کوئی شخص کچی مٹھائی کھالے تو عادۃ پھوڑے پھنسیاں نکلتی ہیں لیکن یہ کچھ ضروری نہیں کہ جس روز کھایا ہے اسی روز نکلنے لگیں۔ فرعون نے چار سو برس تک خدائی کا دعویٰ کیا لیکن سر میں درد بھی نہیں ہوا اور پکڑا گیا تو اس طرح کہ ہلاک ہی کر دیا گیا خدا تعالیٰ کے ہاں ہر کام حکمت سے ہوتا ہے کبھی ہاتھ در ہاتھ سزا مل جاتی ہے اور کبھی مدت کے بعد گرفتاری ہوتی ہے علیٰ ہذا نیکیوں میں بھی کبھی ہاتھ در ہاتھ جزا دیدی جاتی ہے کبھی توقف ہوتا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا فرمائی اور قبول بھی ہوگئی چنانچہ ارشاد قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (بیشک تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی) لیکن جو دعا کے قبول ہو جانے کے اسی وقت اس پر اثر مرتب نہیں بلکہ ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (پس تم دونوں موسیٰ و ہارون علیہما السلام، ثابت قدم رہنا اور نادانوں کا طریقہ اختیار نہ کرنا) کہ تم دونوں ترتب اثر میں جلدی نہ کرنا کہ یہ نادانوں کا طریقہ ہے بلکہ استقامت استقلال سے کام لینا حتیٰ کہ چالیس برس تک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انتظار کیا اور ۹ادن کے بعد فرعون اور اس کی قوم ہلاک ہوئی ان دونوں واقعوں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ نہ کسی جرم پر فوراً اثر مرتب ہونا ضروری ہے نہ نیکی پر چنانچہ فرعون کو چار سو برس کی مہلت دی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس سال تک رکھا گیا اور جب یہ ہے تو اگر کبھی جرم کی فوراً سزا نہ ملی تو اس کی نسبت یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اس جرم سے خدا تعالیٰ ناخوش نہیں ہوئے یا یہ جرم قابل سزا سخت نہ تھا یا ہم کو معاف کر دیا گیا لوگ اس غلطی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمیشہ نئے گناہ کو دیکھا کرتے ہیں اور جب نیا گناہ نظر میں نہیں آتا تو اپنی مصیبت پر تعجب کرتے ہیں اور گویا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت کر کے یہ کہتے ہیں کہ کرتو ڈرنہ کرتو ڈر۔ صاحبو! مسلمان کے منہ سے اس جملہ کا نکلنا سخت حیرت ہے کیا کسی کے نزدیک خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کے نوابوں کی سلطنت ہے کہ جس کا کوئی ضابطہ ہی نہیں کہ جس طرح جی چاہا کر لیا خیر یہ جملہ معترضہ تھا مقصود یہ ہے کہ دنیا کے خطرات کو ان تک مہتم بالشان بنایا کہ کچھ نہ کر کے بھی ڈرتے ہیں۔

آخرت سے ہماری غفلت

اور آخرت کے بارے میں قدر غفلت ایسی بے پروائی کہ آئے دن سینکڑوں خرافات میں مبتلا ہیں ان گناہوں کے بارے میں دبے جاتے ہیں لیکن ذرا بھی پروا نہیں کیا یہ مرض نہیں اور اگر

ہے تو کیا اس کی تدبیر ضروری نہیں ہے۔ صاحبو! یہ یاد رہے کہ جس قدر اس کی جانب سے غفلت ہوگی تدبیر دشوار ہوتی جائے گی اور صاحبو ہماری وہ حالت ہے کہ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔ یعنی ایک تو یہ مرض تھا جو ابھی بیان ہوا۔ دوسرا مرض جو دینداروں میں زیادہ ہے یہ ہے کہ جب کبھی ان کی حالت زار ان کو یاد دلائی جاتی ہے تو متنبہ ہوتا ہے لیکن صرف اس قدر کہ تھوڑی دیر رو دیئے بڑی ہمت کی ایک دو وقت کا کھانا ترک کر دیا صورت غمگین بنا کر بیٹھ گئے لیکن تدبیر کی جانب ذرا توجہ نہیں بلکہ اس غمگینی میں بھی اگر کوئی دنیا کا قصہ یاد آ گیا تو فوراً اس میں مصروف ہو گئے خوب کہا ہے۔

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بسجودے و نبی را بدرودے

(تم اس قوم میں سے مت ہو جو کہ حق تعالیٰ کو فریب میں ڈالتی ہے اپنے سجدے سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درود سے)

بعض لوگ ان سے بھی چند قدم آگے ہیں کہ تاسف سے پریشان بھی ہوتے ہیں لیکن باوجود اس کے بھی کبھی تدبیر کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور تدارک کا خیال نہیں ہوتا حالانکہ نری پریشانی سے کیا ہو سکتا ہے اگر کسی شخص کو اول درجہ دق کا شروع ہو جائے اور اس کو اطلاع بھی ہو جائے اور پریشانی بھی ہونے لگے لیکن وہ صرف یہ ہی کرے کہ جب کوئی اس سے ملنے کو آئے تو اس کے سامنے رونا شروع کر دے اور دن رات کڑھا کرے مگر علاج کی طرف توجہ نہ کرے تو نتیجہ اس کا کیا ہوگا صرف یہ ہی کہ دس پانچ روز میں دوسرا تیسرا درجہ بھی شروع ہو جائے گا اور آخر کار ایک روز خاتمہ ہو جائے گا تو غلطی اس کی یہ ہے کہ پریشانی کو علاج سمجھتا ہے حالانکہ تدبیر اس کی یہ تھی کہ روپیہ خرچ کرتا طبیب سے رجوع کرتا تلخ دواؤں پر صبر کرتا اور پرہیز پر مستعد ہو جاتا اگرچہ کسی ایک کے آگے بھی پریشانی کا اظہار نہ کرتا۔

امراض باطنی اور معاصی میں اصل تدبیر

اسی طرح امراض باطنی اور معاصی میں بھی اصل تدبیر یہ ہی ہے کہ کسی کامل کی طرف رجوع کرے گناہوں سے پرہیز پر مستعد ہو جائے تلخ تجاویز پر صبر کرے۔ اس تدبیر سے ان شاء اللہ تعالیٰ چند روز میں امراض دور ہو جائیں گے اور اخلاق حسنہ پیدا ہوں گے۔

خوب کہا ہے۔

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(وہ عاشق ہی کیسا جس کی طرف محبوب کبھی التفات ہی نہ کرے اے دوست تجھے کوئی مرض ہی نہیں ورنہ طبیب تو موجود ہے وہ کیوں برائے علاج نہیں آتا)

شیطان کی رہزنی

یہ شیطان کی راہزنی ہے کہ دین کے رنگ میں دین سے ہٹا رہا ہے یعنی یہ خیال دل میں جما دیا ہے کہ صرف گریہ و بکا ہی کافی ہو جائے گا۔ عرفی کہتا ہے۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

(اگر رونے گڑگڑانے سے وصال میسر آجاتا ہے تو سو سال اسی طرح تمناؤں میں گزار دیتے)

مشہور ہے کہ ایک شخص نے ایک بدوی کو دیکھا کہ وہ بیٹھا رو رہا ہے اور سامنے ایک کتا پڑا سسک رہا ہے بدو سے رونے کا سبب پوچھا تو کہا یہ کتا میرا رفیق تھا چونکہ مر رہا ہے اس کے غم میں رو رہا ہوں اس شخص نے کتے کے مرنے کا سبب پوچھا تو بدوی نے کہا کہ صرف بھوک سے مر رہا ہے یہ سن کر اس شخص کو بہت صدمہ ہوا نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا تو ایک بوری پر نظر پڑی بدوی سے پوچھا کہ اس بوری میں کیا چیز ہے بدو نے جواب دیا کہ اس میں روٹی ہے اس شخص نے کہا کہ جب تیرے پاس روٹی موجود ہے اور کتا بھوک مر رہا ہے اور اس کے مرنے کا تجھے غم ہے تو اس میں سے روٹی نکال کر کیوں نہیں کھلا دیتا تو آپ کہتے ہیں کہ صاحب اتنی محبت نہیں کہ اس کو روٹی بھی دے دوں کیونکہ اس کے دام لگتے ہیں ہاں اتنی محبت ہے کہ اسکے غم میں رو رہا ہوں کیونکہ آنسو میں تو دام نہیں خرچ ہوتے۔

گر جاں طلبی مضائقہ نیست ور زر طلبی سخن درین ست

(اگر جان طلب کرو تو کوئی حرج نہیں ہے اگر پیسہ طلب کرو تو کلام اس میں ہے)

ہماری وہی حالت ہے کہ گھر بار سب تمہارا لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا کہ گناہوں میں مبتلا ہونے سے رنج بھی ہے اور ان کے مٹ جانے کی تمنا بھی ہے لیکن تدبیر نام کو نہیں ہاں ہے تو صرف اس قدر کہ دو آنسو بہا لیے۔ اور بعض لوگوں کو توجہ بھی ہوتی ہے تدبیر بھی کرتے ہیں لیکن یہ کہ کسی بزرگ کے پاس گئے اور اپنی حالت بیان کر کے فرمائش کی کہ آپ کچھ توجہ کیجئے اس کی بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک شخص طبیب کے پاس جائے اور اپنے امراض کو بیان کرے اور جب طبیب نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے یہ نسخہ آپ ہی پی لیں۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی اور سب لوگ قہقہہ لگائیں گے۔

بس یہی حال طالبین توجہ کا بھی ہے کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ اور یہ توجہ نہ کریں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا وہ یہ کہ جس دن جہاز چلے اس دن مجھے پورا اختیار اپنے نفس پر دیدو کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ

کر جہاز میں تم کو بٹھلا دوں اور وہ جہاز تم کو لے کر روانہ ہو جائے اور جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعاء سے کیا کام چل سکتا ہے کیونکہ جب تم قصد نہ کرو گے دنیا کے کاروبار کو نہ چھوڑو گے نہ وہ خود کم ہوں گے تو صرف میری دعا تو تم کو حج کیونکر کرا دے گی۔ کیونکہ خود کعبہ تو تم تک آنے سے رہا اس کو کیا غرض پڑی ہے اور جن کو یہ شرف نصیب ہو بھی گیا ہے تو ان کو بھی اس صورت سے حج نصیب نہیں ہوا اور یہ مضمون کہ بعضوں کو یہ شرف کعبہ کے از خود آنے کا نصیب ہوا ہے قابل ذکر کے نہ تھا کہ نازک مضمون ہے لیکن ضرورت اس کے ظاہر کرنے کی یہ ہوئی کہ آج کل تمام علوم اردو میں ہوتے جاتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کی نظر سے یہ حکایت گزرے کیونکہ بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ مکہ معظمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آ رہے تھے کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی اور کہنے والوں کو ہنسنا اور وہم پرست کہنا شروع کیا دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہہ کر اڑایا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے انہوں نے اس کو خلاف عقل بتلایا اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

غرض اس ضرورت سے اس مضمون کا ذکر ضروری ہوا تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے پس جن بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعضے ایسے بزرگ ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی لیکن حج کرنے کے لئے ان کو بھی خود کعبے ہی میں آنا پڑا اور جب ایسوں کو بھی خود کعبہ کی طرف جانے کی احتیاج تھی تو اس سوداگر کو تو کیوں ضرورت نہ ہوگی اور یہ تجارت چھوڑ کر جائیں نہیں تو محض حاجی صاحب کی دعا سے ان کو کیا نفع ہو سکتا ہے تو جو لوگ کچھ تدبیر کرتے بھی ہیں صرف اس قدر کرتے ہیں صاحبو! خیال کیجئے ابو طالب جو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں اور بہت بڑے محب کہ جس موقعہ پر تمام قریش نے مخالفت کی اور آپ کے دشمن ہو گئے اس موقعہ پر بھی ابو طالب

نے ساتھ دیا اور اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے نہیں ارادہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش اور محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی اور آخرکار اپنی قدیم ملت پر ان کا خاتمہ ہو گیا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ. (بیشک آپ ہدایت نہیں دیتے جس شخص کو آپ چاہیں لیکن بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں)

تمنا اور ارادہ میں فرق

اس موقعہ پر ایک بات طالب علم ہونے کے کام کی ذہن میں آئی وہ یہ کہ یشـــاء کی ضمیر جس طرح خدا تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے کہ جس کو خدا تعالیٰ چاہیں ہدایت دیں اسی طرح من کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص خود اپنی ہدایت چاہے اس کو خدا تعالیٰ ہدایت فرماتے ہیں اور دلیل اس معنی کے صحت کی یہ آیت ہے وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا (اور جو شخص آخرت (کے ثواب) کی نیت رکھے گا اور اس کیلئے جیسی سعی کرنا چاہئے ویسی سعی بھی کرے گا بشرطیکہ وہ شخص مومن بھی ہو سو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی) کیونکہ اراد اور یشاء ایک ہی بات ہے تو معلوم ہوا کہ اصلاح کا مدار خود اپنے چاہنے پر ہے دوسرے کے چاہنے اور کوشش کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کا ارادہ اسی وقت بارآور ہوگا کہ جب خدا تعالیٰ بھی چاہیں لیکن اس کا چاہنا بھی ضرور ہے تو من کی طرف اگر ضمیر راجع ہو تو معنی بہت لطیف ہوں گے کہ ہدایت اس کو ہوتی ہے جو خود اپنی ہدایت چاہے اور ابو طالب نے چاہا نہیں اس لئے ہدایت نصیب نہیں ہوئی اور جب ابو طالب کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاہنے سے کچھ نفع نہ ہوا تو آج کون شخص ہے جو ابو طالب سے زیادہ حقدار ہو اور کون بزرگ ہے جس کی تمنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا سے زیادہ مقبول ہو پس معلوم ہوا اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب تک خود ارادہ نہ کرے دوسرے کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے کیونکہ تمنا دوسری چیز ہے ارادہ دوسری چیز ہے مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں دو شخص حج کو جانے کی بابت تذکرہ کر رہے تھے ان میں سے ایک نے کہا بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے میں نے کہا کہ صاحب یہ بالکل غلط ہے اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا تو ضرور سب کے سب حج کر آتے۔

نری تمنا سے کام نہیں چلتا

ہاں یوں کہیے تمنا ہر مسلمان کی ہے سو نری تمنا سے کام نہیں چلتا ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو مثلاً ایک شخص تو زراعت کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا کوئی سامان مہیا نہیں کرتا اور ایک شخص اس کا سامان بھی کر رہا ہے تو پہلے شخص کو متمنی اور دوسرے کو مرید کہیں گے اسی طرح اگر دو شخص جامع مسجد پہنچنا چاہیں مگر ایک تو اپنی جگہ بیٹھا ہوا تمنا ظاہر کیے جائے اور ایک شخص چلنا شروع کر دے تو دوسرے کو مرید کہیں گے اور پہلے کو متمنی تو جب ارادہ ہوتا ہے کام بھی ضرور پورا ہو جاتا ہے اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی تو کوئی رہبر مل جاتا ہے جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے اسی کو کہتے ہیں السعی منی والاتمام من اللہ (کوشش کرنا میری طرف سے ہے اور اس کو پورا کرنا اللہ کی طرف سے ہے) پس کام شروع کر دینا چاہئے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے اور کام پورا ہو جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عالی ہمتی کی حکایت

میں ایک عالی ہمتی کی حکایت آپ کو سناتا ہوں۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا نے بلایا ہے تو جس مکان میں ان کو لے کر گئی ہے تو یکے بعد دیگرے سات حصے اس مکان کے تھے اور ہر حصہ مقفل تھا اور قفل بھی ہر حصے کے نہایت مضبوط تھے غرض پورا سامان کیا گیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام باہر نکل کر نہ جاسکیں آخر زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام سے اپنی خواہش کا اظہار کیا دھمکی بھی دی لجاجت بھی کی لیکن عصمت نبوت کے سامنے ایک بھی نہ چلی۔ واقعی حضرت یوسف علیہ السلام ہی کا کام تھا کہ اس مصیبت میں بھی ان کو اتنا قوی توکل رہا جو آگے معلوم ہوگا آپ نے دیکھا کہ مکان سب مقفل ہیں نکلنے کی کوئی صورت بظاہر نہیں مگر ساتھ ہی قوت توکل نے ہمت دلائی کہ مجھ کو اپنا کام تو کرنا چاہئے خدا تعالیٰ ضرور مدد کریں گے چنانچہ آپ نے وہاں سے بھاگنا شروع کیا اور زلیخا آپ کے پیچھے ہوئی لکھا ہے جس دروازے پر آپ پہنچتے تھے قفل ٹوٹ کر گر جاتا تھا اور دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ اسی طرح ساتوں دروازے کھل گئے اور آپ صحیح وسالم عفت کے ساتھ باہر نکل آئے اسی کی طرف اشارہ کر کے مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید خیرہ یوسف وار مے باید دوید

کہ اگر چہ قصر عالم میں کوئی دروازہ نظر نہیں آتا کہ اس سے نکل کر تم نفس وشیطان کے پھندے سے بچ سکو لیکن مایوس پھر بھی نہ ہونا چاہئے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا تو چاہئے پھر دیکھئے دروازہ پیدا ہوتا ہے کہ نہیں۔ بہت لوگ اس انتظار میں ہیں کہ فلاں کام سے فراغت کر لیں تو پھر توبہ کر کے اپنی اصلاح کی تدابیر میں لگیں کسی کو لڑکے کے نکاح کی فکر ہے کسی کو

مکان بنانے کی فکر ہے کسی کو جائیداد کا شغل ہے صاحبو! ذرا غور کرو کتنے برس یہ کہتے ہوئے گزر گئے کہ اب کے برس کچھ ضرور کر لیں گے مگر آج تک ضروریات اور حاجات کا سلسلہ ختم ہونے نہیں آتا

لاینتھی ارب الا الی ارب

دنیا کی ہر ضرورت کا خاتمہ ایک نئی ضرورت پر ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ دوسری ضرورت پر وھکذا الی غیر النھایۃ آخر یہ عمر دنیا یوں ہی تمام ہو جاتی ہے پس امروز فردا پر ٹالنے سے کیا فائدہ ہمت کر کے کام شروع کر دینا چاہئے خدا تعالیٰ خود مدد کریں گے کامل نہ ہو گے تو خالی بھی نہ رہو گے اگر تم کو صدیقیت کا درجہ بھی نصیب نہ ہوا تو کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہو رہو گے کم از کم خدا تعالیٰ کے ساتھ ایک محبت اور لگاؤ دنیا سے بے تعلقی اور طبیعت کا اچاٹ ضرور ہی ہو جائے گا مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ حالت ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سوداکنم باز چوں فردا شود امروز فردا کنم

(ہر رات وعدہ کرتا ہوں کہ کل اس پاگل پن کو چھوڑ دوں گا اور جب کل ہو جاتی ہے تو اگلے دن پر ٹال دیتا ہوں)

کہ روز یہ ہی وعدہ رہا کہ کل ضرور کر لیں گے مگر ساری عمر اسی کل کل میں گزر گئی اور کل نصیب نہ ہوئی حتیٰ کہ موت کا وقت سر پر آ جاتا ہے اور اس وقت بجز حسرت کے اور کچھ نہیں بن پڑتا اور یہ تمنا کرتا ہے کہ رَبِّ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (اے میرے پروردگار کیوں نہیں مؤخر کر دیا مجھ کو تھوڑی سی مدت کے لئے تاکہ میں تصدیق کرتا اور صالحین میں سے ہو جاتا۔) مگر یہ تمنا رد کر دی جاتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا. (اور ہرگز نہ مہلت دے گا اللہ تعالیٰ کسی نفس کو جبکہ آ جائے اس کا وقت) کہ اب ایک ساعت کی مہلت بھی نہیں مل سکتی۔

موت سے ایک ساعت بھی مہلت نہیں مل سکتی

اور صاحبو ہم تو کیا چیز ہیں کہ ہم کو کچھ مہلت مل سکے حضرت سلیمان علیہ السلام جو کہ نبی معصوم و مقبول ہیں انہوں نے جب بیت المقدس کی تعمیر شروع فرمائی اور اختتام تعمیر سے قبل آپ کی وفات کا وقت آ گیا تو آپ نے یہ تمنا کی کہ بیت المقدس کی تعمیر تیار ہو جانے تک مہلت دی جائے لیکن قبول نہ ہوئی غور کیجئے نبی کی درخواست اور بیت المقدس کی تعمیر کے لئے مگر نا منظور۔ آخر آپ نے یہ درخواست کی کہ مجھے اس طرح موت دی جائے کہ جنات کو میری موت کی اطلاع اس وقت تک نہ ہو جب تک کہ یہ تعمیر پوری نہ ہو جائے چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی اور آپ

حسب عادت اپنے عصاء پر سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور اسی حالت میں روح قبض ہو گئی اور سال بھر تک آپ کی لاش اسی طرح کھڑی رہی۔ جنات نے آپ کو زندہ سمجھ کر کام جاری رکھا حتیٰ کہ جب تعمیر پوری ہو گئی اس وقت آپ کی لاش زمین پر گر گئی اور جنات کو اس وقت آثار سے معلوم ہوا کہ آپ کے انتقال کو اس قدر زمانہ گزر گیا ہے اسی کو خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (اور نہیں خبردار کیا ان (جنات) کو ان (حضرت سلیمان علیہ السلام) کی موت کے واقع ہونے پر لیکن زمین پر رینگنے والے جانوروں نے جو کھا رہے تھے اس ڈنڈے کو پس جب وہ گرے تب جنات پر دلیل ظاہر ہوئی کہ اگر غیب کی باتوں کو جانتے ہوتے تو اس رسوائی کے عذاب میں نہ ٹھہرے رہتے) اور اس طریقہ پر موت دینے سے لوگوں کو یہ بھی ہدایت ہو گئی کہ جنوں کو علم غیب نہیں تو جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو بیت المقدس تیار کرنے کے لئے مہلت نہیں دی گئی تو ہم کو بیت المقدس تیار کرنے کے لئے مہلت کب مل سکتی ہے۔

غرض اس جملہ تقریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم لوگ ارادہ تو کرتے ہیں لیکن ارادۃ الفعل نہیں کرتے کیونکہ ارادۃ الفعل وہ ہے جو کہ مقارن ہو فعل کے ساتھ کہ اس کے بعد فعل متخلف ہی نہ ہو اور جس کو ہم ارادہ کہتے ہیں وہ نری ہوس ہے دیکھئے اگر ایک شخص کھانا کھانے کا ارادہ کرے لیکن نہ ہاتھ ہلائے نہ منہ چلائے نہ منہ کھولے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کھانے کا ارادہ کیا ہاں یہ کہیں گے کہ اس نے کھانے کی ہوس اور تمنا کی اور جو لوگ بزرگوں کی توجہ کے امیدوار بیٹھے ہیں ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کیا ان بزرگ کو بھی نری توجہ سے سب کچھ حاصل ہو گیا تھا یا ان کو کچھ کرنا پڑا تھا اگر ان کو کچھ خود بھی کرنا پڑا ہے تو کیا وجہ کہ تم کو نری توجہ سے حاصل ہو جائے۔ اور بزرگوں کی توجہ سے انکار نہیں بیشک بزرگوں کی توجہ سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن اس توجہ کے اثر کے لئے محل قابل کی بھی ضرورت ہے دیکھو اگر کھیتی کرنا چاہو تو زمین میں تخم ریزی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ تخم ریزی اس وقت کارآمد ہوتی ہے جبکہ زمین بنجر نہ ہو ورنہ تخم بھی ضائع ہوتا ہے اور محنت اور جانکاہی بھی رائیگاں جاتی ہے پس اول قابلیت پیدا کرو۔

ارادہ کے ساتھ بزرگوں کی توجہ کی ضرورت ہے

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول ارادہ کرو۔ ہاں نرا ارادہ بھی کافی نہیں جب تک کہ توجہ بزرگان نہ ہو کیونکہ۔

بے عنایات حق و خاصان حق   گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بغیر خدائے تعالیٰ اور ان کے مخصوص بندوں کی عنایت اور مہربانیوں کے اگر بادشاہ ہو تو اس کی ہستی کا ورق بھی سیاہ ہو جاتا ہے)

اصل میں ارادہ کے پورا ہونے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ عنایت خداوندی متوجہ ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ بزرگان خود متوجہ ہوں اکیلے کوئی کسی کا کام نہیں ہوا۔

یار باید راہ راتنہا مرو   بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

کہ اس جنگل میں تنہا نہ چلو کسی رہبر کو ضرور ساتھ لے لو کہ وہ تم کو رستے کے خطرات سے محفوظ رکھے آگے کہتے ہیں۔

ہر کہ تنہا نادر ایں رہ رابرید   ہم بہ عون ہمت مرداں رسید

(اول تو یہ سفر بہت ہی کم لوگ طے کر پاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی کسی واسطہ سے بزرگوں کی توجہ سے ہی کامیاب ہو گئے)

کہ اگر تم نے کسی کی حکایت سن لی ہو کہ وہ بغیر کسی رہبر کے اس راستے کو طے کر گئے تو اول تو یہ نادر ہے دوسرے واقع میں وہ بھی کسی کی ہمت کی بدولت منزل تک پہنچے ہیں اگر چہ ظاہر نظر میں معلوم نہ ہو۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی بہت سی مخلوق بلا کسی تعلق کے ہمارے لئے دعا کرتی ہے گو ہم کو خبر بھی نہ ہو تو کوئی شخص اپنے کو مستغنی نہ سمجھے اسی لئے فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

بے رفیقی ہر کہ باشد در راہ عشق   عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

گر ہوائے ایں سفر داری دلا   دامن رہبر بگیر و پس بیا

در ارادت باش صادق ای فرید   تا بیابی گنج عرفاں را کلید

(بغیر ساتھی کے جو بھی عشق کے راستے میں چلا تو اس کی عمر تمام ہو گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہو سکا اے دل اگر اس سفر کی خواہش رکھتا ہے تو کسی راستہ بتانے والے کا دامن پکڑ پھر چل اپنے ارادے میں مخلص ہو جا اے فرید تا کہ معرفت کے خزانہ کی کنجی تیرے ہاتھ آئے)

غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بے رفیق سیدھا رستہ ملتا ہے۔ دیکھو اگر ایک نابینا شخص کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اول اس کو چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے ہی نہیں تو ہزار رفیق ملنے پر بھی رستہ قطع نہیں ہوگا اور چلنے کے بعد رفیق اور رہبر کی ضرورت ہے کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ناآشنا رستہ میں کسی جگہ ضرور ٹکر کھا کر گرے گا۔ بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہ ہی ہے کہ اپنے پیروں چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑ لے بالکل ایسی ہی حالت اس رستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑنا ہے۔

راہ طریقت پر چلنے کی ضرورت

اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ لوگ جو آج کل نری پیری مریدی کو اصل کام سمجھتے ہیں یہ غلطی ہے نری پیری مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا اگر چہ مرید کسی سے بھی نہ ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سلسلہ میں داخل ہونے کے برکات کچھ بھی نہیں ہیں اس کے برکات ضرور ہیں لیکن اسی کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ آج اس پیری مریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہے کہ الامان الحفیظ۔ میرے ایک دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک مکار پیر صاحب کسی گاؤں میں پہنچے اتفاق سے بہت ہی نحیف ہو رہے تھے مریدوں نے پوچھا کہ پیر تم اس قدر ضعیف کیوں ہو پیر صاحب نے جواب دیا کہ ظالمو تمہیں میرے ضعف کی خبر نہیں دیکھو میں اپنا بھی کام کرتا ہوں اور تمہارا بھی۔ تم نماز نہیں پڑھتے میں تمہاری طرف سے نماز پڑھتا ہوں تم روزہ نہیں رکھتے میں تمہاری طرف سے روزے رکھتا ہوں اور سب سے بڑی مشقت یہ ہے کہ سب کی طرف سے پل صراط پر چلتا ہوں جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے بس ان فکروں نے لاغر کر دیا۔ مرید یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور ایک گوجر نے خوش ہو کر کہا کہ پیر میں نے تجھے اپنا مونجی کا کھیت بخش دیا پیر کو خیال ہوا کہ دیہاتی لوگوں کا کچھ اعتبار نہیں ہے اسی وقت چل کر قبضہ کر لینا چاہئے۔ کہا بھائی ابھی چل کر دیدو چنانچہ وہ گوجر ساتھ ہو لیا راستے میں اتفاق سے کسی ڈول سے پیر صاحب کا پیر پھسل گیا۔ اور گر گئے گرنے کے ساتھ ہی اس گوجر نے ایک لات رسید کی اور کہا کہ تو جب اتنی چوڑی مینڈ پر نہیں چل سکا تو پل صراط پر کس طرح چلتا ہوگا تو جھوٹا ہے جا ہم تجھے اپنا کھیت نہیں دیتے تو صاحبو! سچ بات یہ ہی ہے کہ کام اپنے ہی کئے سے ہوتا ہے کسی دوسرے کے کیے کوئی کام نہیں ہوتا اور میں کہتا ہوں کہ اگر دوسرے کے کرنے سے کام ہو جاتا ہے اور اپنے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تو اس کی کیا وجہ کہ یہ قاعدہ دین ہی کے کاموں میں برتا جاتا ہے دنیا کے کاموں سے بھی کیوں ہاتھ نہیں اٹھا لیا جاتا اور ان کو بھی کیوں پیر صاحب کے بھروسے پر نہیں چھوڑ دیا جاتا بس نہ کھاؤ نہ پیو نہ کھیتی کرو سب کام تمہاری طرف سے پیر ہی کر لیا کریں گے ان ہی کے کھانے سے تمہارا پیٹ بھر جائے گا ان ہی کے پانی پینے سے تمہیں تسکین ہو جائے گی۔ افسوس ان کاموں میں تو اس قاعدے پر عمل نہ کیا گیا بلکہ اپنے کرنے کو ضروری سمجھا گیا اور دین کے کام کو ایسا قدر رستا اور بے وقعت سمجھا گیا کہ اس میں اس قسم کے قاعدے برتے گئے۔

شیخ کا کام راہ بتلانا ہے

اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ اودھ میں ایک پیر تھے کہ وہ نماز نہیں پڑھا کرتے تھے ان کے

مرید کہا کرتے تھے کہ مکہ میں جا کر نماز پڑھتے ہیں میرے ایک دوست نے سن کر کہا کہ صاحب اس کی کیا وجہ کہ نماز کے لیئے تو مکہ کو اختیار کیا جائے اور کھانے ہگنے کے لئے ہندوستان کو اگر نماز وہاں پڑھی جاتی ہے تو کھانا ہگنا بھی وہیں ہونا چاہئے اور اگر یہ ہندوستان میں ہوتا ہے تو نماز بھی ہندوستان میں ہونی چاہئے کیونکہ ہندوستان بم پولیس نہیں ہے اور اپنے اس قاعدے میں کہ سب پیر ہی کرلیں گے غور کر کے دیکھو اس کا حاصل تو یہ ہے کہ گویا پیر تمہارے کمین ہیں کہ گناہ تم کرو اور پیر اس کو اٹھائیں یاد رکھو کہ پیر صرف رستہ بتلانے کے لئے ہیں کام کرنے کے لئے نہیں کام تم کو خود کرنا چاہئے۔ اس تقریر پر شاید اہل فن کا یہ شبہ ہو کہ بعض مرتبہ مرشد کی توجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو کہ خود محنت کرنے سے پیدا نہیں ہوتی سو اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے تو یہ کیفیت باقی بھی نہیں رہتی۔ اس کیفیت کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن کا گرم ہو جانا لیکن یہ گرمی باقی نہیں رہتی آگ کے سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوئی۔ اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔

مفت چیز کی قدر نہیں ہوتی

ایک بزرگ نے اپنے ایک ہم عصر بزرگ سے کہا کہ تم اپنے مریدوں سے محنت لیتے ہو اور ہم نہیں لیتے انہوں نے یہ سن کر اپنے ایک مرید سے کہا کہ تم ذرا ان کے مرید سے مصافحہ تو کرو مصافحہ کرنا تھا کہ وہ کم محنت مرید خالی رہ گئے پیر نے ان سے کہا کہ دیکھا نتیجہ محنت نہ کرنے کا اب تم ہمارے کسی مرید کو تو اس طرح کورا کر دو بات یہ ہے کہ اپنی کمائی کی قدر بھی خود ہوتی ہے اور مفت کی چیز کی کچھ قدر نہیں ہوتی۔

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

(جو شخص سستا کماتا ہے وہ سستا دیتا ہے۔ بچہ روٹی کی ٹکیہ کے بدلے موتی دے دیتا ہے)

مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتہ دوشالے سے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے اس سے سبب پوچھا تو کہا کہ دوشالہ تو میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتہ میری کمائی کا ہے۔ تو جو لوگ اپنے بوتہ پر کرتے ہیں ان کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے البتہ ان میں شور و غل اچھل کود نہیں ہوتی اور نہ یہ مطلوب ہے دیکھو اگر کوئی بچے کی تربیت کرنا چاہے تو طریقہ اس کا یہ ہے کہ اس کو تھوڑا تھوڑا کھلائے کہ جزو بدن ہو اور اس سے نشو و نما پیدا ہو۔

شیخ کامل کا انداز تربیت

اسی طرح شیخ کامل بھی ایک ہی دن سب کچھ نہیں بھر دیتا کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں

کہ طالب کو حالات کا ہیضہ ہو اور ایک ہی دن میں خاتمہ ہو جائے بلکہ وہ بتدریج اس کو آگے کو بڑھاتا ہے اور جو لوگ اناڑی ہیں اور طریق تربیت سے ناواقف و ناآشنا ہیں وہ ایک دم میں بڑھا دینا چاہتے ہیں ایسے لوگوں کو عوام الناس بہت بزرگ سمجھتے ہیں حالانکہ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے تعلقات اس سے چھوٹ جاتے ہیں نہ بیوی کے کام کا رہتا ہے نہ بچوں کے اور یہ کمال نہیں بلکہ نقص ہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی　　　نے برائے فصل کردن آمدی

(تو ملانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جدائی پیدا کرنے کے لئے)

خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک عام عنوان سے فرماتے ہیں ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل (اور وہ لوگ قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے)

بزرگی کا معیار

افسوس آج اسی کو کمال سمجھا جاتا ہے اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں دیکھئے اولاد کو منہ بھی نہیں لگاتے بیوی تک کو نہیں پوچھتے ہر وقت قرب خداوندی میں غرق رہتے ہیں صاحبو! کیا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی قرب میں زیادہ ہو سکتا ہے کبھی نہیں پھر دیکھ لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت کیا تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے اولاد کے حقوق بھی ادا فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے ایک کو پیار کر رہے تھے اور ایک نجد کے رئیس پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے دیکھا کہ عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے دس بیٹے ہیں میں نے تو آج تک کسی ایک کو بھی کبھی پیار نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیرے دل ہی میں سے رحم نکال لیا تو اس کو میں کیا کروں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا (جس شخص نے نہیں رحم کیا ہمارے چھوٹوں پر اور جس نے نہ احترام کیا ہمارے بڑوں کا پس وہ ہم میں سے نہیں ہے) اس واقعہ سے پورا اندازہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت اور مرضی کا ہو گیا ہوگا پس نرا جوش اور مستی یا ترک تعلق واجبۃ الابقاء بزرگی نہیں ہو سکتا اور اگر کسی کا نام بزرگی ہے تو تشنہ شراب اور حالت جنون بھی بزرگی ہے کیونکہ ان دونوں میں یہ بات خوب حاصل ہو جاتی ہے۔ صاحبو بزرگی کا معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہوتی جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشابہت بڑھتی جائے کیونکہ ولایت مستفاد عن النبوۃ ہے افسوس یہ ہے کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نظر اور توجہ کا اثر

چنانچہ بزرگی کا ایک معیار یہ بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کردے اٹھا کر زمین پر ٹپک دے وہ بڑا بزرگ ہے حالانکہ یہ بالکل ہی لغو ہے اگر یہ بزرگی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ضرور اس کو برتنا چاہئے تھا پھر کیا وجہ کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں تو میں نکل کر جاؤں کیوں آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش نہیں کر دیا۔ جب مدینہ طیبہ تشریف لے چلے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چاروں طرف دیکھتے چلتے تھے سراقہ جو کہ آپ کی تلاش کے لئے بھیجا گیا تھا جب سامنے آ گیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سراقہ چلا آ رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت بھی خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی کہ اللھم اکفنا شرہ (اے اللہ روک دے ہم سے اس کے شر کو) چنانچہ پیٹ تک اس کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا سراقہ نے کہا کہ غالباً آپ نے میرے لئے بددعا کی ہے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں قریش کو آپ کا پتہ نہ دوں گا چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا اور پھر کسی سے اطلاع نہیں کی اس واقعہ سے آج کل کے لوگوں کو سبق لینا چاہئے کہ اس زمانہ کے کفار میں بھی صدق و ایفائے عہد تھا آج کل کی طرح پولٹیکل چالیں نہ تھیں بلکہ آج سے چند روز پیشتر تک بھی یہ اوصاف اکثروں میں موجود تھے مگر صد حیف کہ آج بالکل مفقود ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو اس وقت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے دن میں سینکڑوں جھوٹے وعدے کرتے ہیں بیسیوں مکر کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ رنج کی بات یہ ہے کہ مقدسین بھی اس حالت سے پاک نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

بقمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم   چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

کہ میں قمار خانہ میں گیا تو دیکھا کہ سب پاکباز جمع ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قمار خانہ کے جو مقرر کردہ اصول تھے سب کے سب ان پر چل رہے تھے اس میں کسی قسم کا دخل نہ تھا اور بعنوان محاورہ کسی قسم کی بے ایمانی نہ تھی کیونکہ وفائے عہد کو لوگ ایمانداری کہتے ہیں خلاصہ یہ کہ جب اصول پر قمار ٹھہرا تھا ان میں خلاف عہد نہ ہوتا تھا اور جب صومعہ میں گیا تو دیکھا کہ جب اصول پر یہاں حق تعالیٰ سے عہد کیا تھا اس میں وفا نہیں اور ان کو پورا نہیں کیا جاتا مثلاً عہد کیا تھا کہ ایاک نعبدو ایاک نستعین (ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت

کی کرتے ہیں) حالانکہ اس عہد کو وفا نہیں کیا جاتا کیونکہ دل میں ہزاروں غیر اللہ من وجہ درجہ معبودیۃ اور مستعانیۃ لئے ہوئے بھرے ہیں۔ صاحبو پہلے لوگ اس قدر سیدھے سادے بھولے ہوتے تھے کہ ان کو کسی قسم کی چالاکی آتی ہی نہ تھی میرے ایک رشتہ دار بزرگ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد زمیندار تھے ایک مرتبہ کاشتکار اناج لایا ہے ان زمیندار نے پوچھا کہ یہ کس قدر ہے کاشتکار نے نوے من بتلایا انہوں نے کہا کہ ہم سے تو اسی من ٹھہرا تھا کاشتکار نے کہا نہیں جناب نوے من ٹھہرا تھا بہت دیر تک اس میں جھگڑا رہا آخران کے صاحبزادے نے بہت سی کنکریاں جمع کر کے ایک ڈھیر نوے کنکریوں کا اور دوسرا اسی کنکریوں کا لگا دیا اور ان زمیندار سے گنگوا کر پوچھا کہ یہ اسی زائد ہیں یا نوے انہوں نے نوے کو زائد بتلایا تو انہوں نے کہا کہ کاشتکار اس قدر من دینا چاہتا ہے جس قدر یہ نوے کنکریاں ہیں تب ان دونوں کا جھگڑا ختم ہوا سبحان اللہ کیسے اچھے وقت تھے کہ کفار میں بھی چالیں نہ تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ سراقہ نے جو عہد آپ سے کیا تھا اس کو پورا کیا اور جو شخص اس کو رستے میں ملتا گیا اس سے کہتا گیا کہ میں بہت دور تک دیکھ آیا ہوں ادھر کہیں نہیں ملے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہایت امن وامان سے مدینے پہنچ گئے تو دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ کے ساتھ یہ نہیں کیا کہ اس کو ایک نظر میں اڑا دیتے یا گرا دیتے بلکہ خدا تعالیٰ سے دعا فرمائی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تشویش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا یعنی نظر بے ہوش کرنے کا کبھی احتمال ہی نہ تھا ورنہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پریشان نہ ہوتے بلکہ مطمئن رہتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک نظر بھی کریں گے تو یہ فوراً لوٹ پوٹ ہو جائے گا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی کمال نہیں ہے ہاں نظر و توجہ سے صرف اس قدر ہوتا ہے کہ راہ پر لگایا جائے آگے جو کچھ ہوتا ہے اپنے کرنے سے ہوتا ہے۔

حکایت حضرت حافظ شیرازیؒ

چنانچہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سنا ہے کہ بڑے امیر زادہ ہیں اور نظر کردہ ہیں ان کی حالت یہ تھی کہ متوحشانہ جنگلوں میں پھرا کرتے تھے ان کے والد ان کو نکما بے کار سمجھا کرتے تھے حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کو مکشوف ہوا کہ فلاں مقام پر فلاں رئیس کا ایک لڑکا ہے اس کی تربیت کرو حضرت نجم الدین تشریف لائے حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے والد نے نہایت تعظیم وتکریم سے مہمان کیا اور عرض کیا کہ کیسے تکلیف کی انہوں نے فرمایا کہ اپنے بیٹوں کو جمع کرو چنانچہ انہوں نے حافظ رحمہ اللہ کے سوائے سب بیٹوں کو بلا کر پیش کیا آپ نے سب کو دیکھا اور فرمایا کہ ان کے سوا کوئی اور لڑکا نہیں حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے والد حافظ رحمۃ اللہ علیہ کو کالعدم کہتے

تھے اس لئے جواب دیا کہ اور کوئی نہیں انہوں نے فرمایا کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے اور وہ ان میں معلوم نہیں ہوتا تب انہوں نے کہا کہ ایک اور ہے مگر نہایت آوارہ دار جنگلوں میں پھرتا ہے حضرت نجم الدین کبری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہاں اسی کی ضرورت ہے حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے والد کو بڑا تعجب ہوا کہ اس دیوانے سے حضرت کو کون سا کام ہوگا اور یہ خبر نہ تھی کہ۔

آب چشمہ حیواں درون تاریکی ست

(آب حیات کا چشمہ تو تاریکی میں ہے)

چنانچہ تلاش کے بعد حافظ ملے وحشی خاک آلودہ اور ان کو حضرت نجم الدین کبریؒ کے سامنے پیش کیا گیا حافظ رحمہ اللہ نے جب حضرت کی صورت دیکھی تو بے اختیار زبان سے نکلا۔

آنانکہ خاک رابہ نظر کیمیا کنند آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

دردم نہفتہ بہ زطبیبان مدعی باشد کہ از خزانہ غیبش دوا کنند

(کیا وہ ہماری جانب بھی التفات فرمائیں گے ان بڑے بڑے دعوے کرنے والے طبیبوں سے میرا درد چھپائے رکھنا ہی اچھا ہے۔ انہیں چاہئے کہ خزانہ غیب سے میری دوا کریں)

آپ نے سینے سے لگا کر فرمایا کہ بہ تو نظر کردم۔ (میں نے تجھ پر نظر کی) حضرت نجم الدین کبری بہت بڑے شخص ہیں ان کا انتقال اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی کو کوئی شعر پڑھتے سنا کہ اس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

جان بدہ و جاں بدہ وجاں بدہ

(جان دو، جان دو، جان دو)

آپ نے فرمایا کہ افسوس محبوب جان طلب کر رہا ہے اور کوئی نہیں سنتا اور فرمایا کہ۔ جاں دادم و جاں دادم و جاں دادم (میں نے جان دی، میں نے جان دی، میں نے جان دی) اور اس میں انتقال ہو گیا۔ غرض حافظ رحمہ اللہ کو سینے سے لگا کر انہوں نے فیض دیا لیکن وہ فیض کافی نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد یا اس سے قبل مجاہدے کی بھی ضرورت ہوئی یہ دوسری بات ہے کہ قابلیت تامہ کی وجہ سے زیادہ مجاہدے کی ضرورت نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ قوی الاستعداد ہوتے ہیں ان کو تھوڑے کام میں بہت کچھ نفع ہو جاتا ہے۔

حکایت حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ

حضرت سلطان الدین اولیاء قدس اللہ سرہ کے پاس ایک شخص آیا اور ایک ہفتہ میں خلافت لے کر چلا گیا آپ کے دوسرے مرید اس کو دیکھ کر دل میں بہت خفا ہوئے اور یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ

شیخ ہماری طرف پوری توجہ نہیں فرماتے آپ نے ان لوگوں کے انداز سے اس وسوسہ کو تاڑ لیا اوران کے علاج کے لئے فرمایا کہ کچھ تر اور کچھ سوکھی لکڑیاں جمع کرو جب جمع ہوگئیں تو فرمایا کہ گیلی لکڑیوں میں آگ لگاؤ سب نے بہت کوشش کی لیکن ان میں آگ نہ لگی اس کے بعد فرمایا کہ ان سوکھی لکڑیوں میں آگ لگادو چنانچہ ان میں فوراً آگ سلگ اٹھی آپ نے فرمایا کہ کیا وجہ یہ لکڑیاں اس قدر جلد کیوں سلگ اٹھیں اور پہلی لکڑیوں میں کیوں آگ نہیں لگی۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضور پہلی لکڑیاں گیلی تھیں اور یہ سوکھی ہیں گیلی لکڑیوں میں آگ نہیں لگا کرتی آپ نے فرمایا کہ ظالمو تم گیلی لکڑیاں ہوکر میری شکایت کرتے ہواور اس سوکھی لکڑی کے جل اٹھنے پر تعجب کرتے ہو وہ سوختہ ہوکر آیا تھا صرف ایک پھونک کی ضرورت تھی چنانچہ ایک ہی پھونک میں بھڑک اٹھا اور تم گیلی لکڑی ہوکر رات دن دھونکتا ہوں مگر تم آگ ہی نہیں پکڑتے ہو اس میں میری جانب سے کمی ہے یا تمہارا قصور ہے غرض بعضے سوختہ دل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کو تھوڑے ہی کام میں سب کچھ حاصل ہوجائے لیکن آگے یا پیچھے کچھ نہ کچھ مجاہدہ ضرور کرنا پڑتا ہےاور کرنے پر بھی جو کچھ ملتا ہے وہ محض فضل خدا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ پر کسی کا زور نہیں ہے مگر عادۃ اللہ یوں جاری ہے کہ جو ادھر توجہ کرتا ہے خدا تعالیٰ اس کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ من تقرب الی شبرا تقربت الیہ باعا (جوشخص میری طرف ایک بالشت ہوتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں کے یہ ہی معنی ہیں تو صاحبو کیا یہ بات کچھ کم ہے کہ کام پیسے کا کیا جائے اور ملے ایک اشرفی۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را   کہ بیک گل مے خری گلزار را

(اپنے لئے اتنا بڑا بازار حاصل کرتا ہے جو کہ ایک پھول دے کر باغیچہ خریدتا ہے) کہ دیا تو ایک پھول اور اس کے عوض مل گیا ایک باغ خوب کہا ہے۔

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد   ایں چہ در ہمت نیاید آں دہد

(آدھی جان لیتے ہیں اور سو جانیں دیتے ہیں اور جو خیر تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی وہ عطا کرتے ہیں)

کہ آدھی جان لے کر سینکڑوں جانیں دیتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جو تدبیر کرنے کی ہے لوگ اسے نہیں کرتے صرف ناتمام تدابیر پر اکتفا کرتے ہیں حالانکہ تدبیر پوری کرنی چاہئے تب فائدہ مرتب ہوتا ہے۔

آخرت سے غفلت

اب میں مختصر کرتا ہوں اور غفلت عن الاخرۃ کے مضمون کو ایک جملہ سے واضح کرتا ہوں کہ دیکھئے جب کسی سفر کا قصد ہوتا ہے تو اس کے لئے کس قدر سامان کرتے ہو کہ مثلاً چار دن پہلے سے دھوبی کو

حکم کرتے ہو کہ کپڑے جلدی دینا ناشتہ کا سامان کرتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں کیا جاتا کہ عین وقت پر سارا سامان کیا جائے بلکہ اگر ایسا کیا جاتا ہے تو بیوقوف بنائے جاتے ہیں اور خود بھی اپنے کو بیوقوف سمجھتے ہیں کیوں صاحب جب ان چھوٹے سے سفر کے لئے اتنے پیشتر سامان فراہم کیا جاتا ہے تو یہ موت کا اتنا بڑا سفر کتنے پہلے اور کتنا بڑا سامان چاہتا ہوگا کیونکہ یہ وہ سفر ہے کہ اس سے پھر کبھی واپسی ہی نہ ہوگی پھر اس کیلئے کیا سامان مہیا کیا دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جو اطاعت خداوندی میں سرگرم ہیں دوسرے وہ جو مخالفت میں پھنسے ہیں پہلی قسم کے لوگوں کے لئے یہ سفر سفر رغبت اور دوسری قسم کے لوگوں کے لئے سفر رہبت ہے اور یہ دونوں صورتیں دنیا کے سفروں میں بھی ہوتی ہیں پس دیکھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کا مدعو ہو جو کہ سفر رغبت ہوگا تو اس کیلئے کیا کچھ سامان پہلے سے کرے گا اپنے پاس نہ ہوگا تو دوسروں سے قرض لے کر مستعار مانگ کر چیزیں جمع کرے گا۔ اور ہر طرح سے درست ہو کر ارادہ سفر کرے گا اسی طرح اگر کسی شخص نے مثلاً چوری کی ہو اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کے نام سمن آ گیا ہو تو غور کیجئے کہ جانے سے پہلے وہ کیا کیا سامان کرے گا اپنی صفائی کے گواہ جمع کرے گا وکلاء سے مل کر مشورہ کرے گا دوست احباب سے رائے لے گا۔ وغیرہ وغیرہ غرض دونوں قسموں کے سفر میں مختلف طرح کے سامان کئے جاتے ہیں تو کیا وجہ جب یہ ہی دونوں صورتیں آخرت کے سفر میں بھی محتمل ہیں اس میں کیوں سامان نہیں کیا جاتا اور سہل انکاری برتی جاتی ہے۔ صاحبو یہ تو یقینی ہے کہ سفر آخرت آنے والا ہے پس اگر ہم مطیع ہیں تو یہ سفر ہمارے لئے رغبت اور شوق کا سفر ہوگا ورنہ رہبت اور خوف کا سفر ہوگا پس بتلایئے کہ اپنی رغبت کے کیا سامان جمع کئے ہیں اور خلاصی کی کونسی صورتیں پیدا کی ہیں کون سی عبادت کی ہے کتنی حق العبد ادا کر دیئے ہیں بلکہ اگر غور سے دیکھو تو سفر آخرت ہر مسلمان کیلئے رغبت اور رہبت دونوں پہلو لئے ہوئے ہے کیونکہ ایمان بین الخوف والرجا ہے یعنی نہ خدا تعالیٰ پر ناز ہو سکتا ہے اور نہ مایوس ہونا چاہئے۔

غافل مرد کہ مرکب مردان زہد را   درسنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش   تاگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل اس لئے مردان راہ کے گھوڑے سخت جنگل میں چلنے سے عاجز رہے ہیں
ناامید بھی مت ہو اس لئے کہ رند شرابی اچانک ایک نالہ سے منزل پر پہنچ گئے۔
تو مسلمانوں کی اصل حالت یہ ہونی چاہئے کہ رغبت اور رہبت ملی ہوئی ہو۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا حال

چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی حالت بیان فرماتے ہیں یدعوننا رغبا ورھبا وصف ان میں جمع ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میدان قیامت میں یہ ندا ہو کہ صرف ایک شخص جنت میں جائے گا تو مجھے یہ امید ہوگی کہ وہ شخص میں ہوں اور اگر یہ ندا ہو کہ صرف ایک شخص جہنم میں جائے گا تو مجھے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ شخص میں ہی ہوں غرض مسلمان کو ہر وقت رغبت بھی ہونی چاہئے اور رہبت بھی اور جب یہ ہے تو ہر وقت استغفار بھی کرتے رہنا چاہئے اور اعمال میں بھی پوری کوشش کرنی چاہئے۔

روزانہ محاسبہ نفس کی ضرورت

اور صاحبو! ایک آدھ وقت کر لینے سے کام نہیں چلتا ضرورت اس کی ہے کہ روز کا دھندا ہو جائے فرماتے ہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ (اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور چاہئے کہ نظر میں رکھے نفس اس چیز کو جس کو اس نے کل کے لئے بھیجا ہے) یعنی اس کو سوچو کہ کل کے لئے کیا کر رکھا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر معطل ہو جاؤ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی دھن لگ جائے اگر روزانہ نصف گھنٹہ بھی اس تفکر کے لئے نکال لیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت کم نافرمانی ہوگی اور دنیا کی محبت جاتی رہے گی پھر ان شاء اللہ تعالیٰ یہ حالت ہوگی کہ تم دنیا کے سب کاروبار کرو گے لیکن ان کاموں میں جی نہ لگے گا اور اس کے بعد دو چیزوں کی اور ضرورت ہو گی ایک تو بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کی سو بحمد اللہ اب اس کا سامان بہت میسر ہو گیا ہے اور ہر شخص کو ہر جگہ رہ کر اس کا سیکھنا آسان ہے اس کیلئے یہ کرو کہ کوئی جامع رسالہ لے کر اس کو کسی عالم سے پڑھنا اگر پڑھنے کا موقع نہ ہو تو نہایت غور سے دیکھنا شروع کر دو اور ہمیشہ اس کا ورد رکھو۔

اہل اللہ سے تعلق کا منشاء

دوسرے کسی اللہ والے سے تعلق پیدا کر لو مگر تعلق دین کے لئے پیدا کرو دنیا طلبی کے لئے اہل اللہ سے تعلق نہ پیدا کرنا چاہئے ہاں شاذ و نادر اگر کوئی دنیا کا کام بھی ان سے نکل جائے تو مضائقہ نہیں لیکن محض دنیا ہی کو نصب العین بنا کر ان سے راہ اور رسم پیدا کرنا نہ چاہئے مثلاً بعضے لوگ اہل اللہ سے اس لئے ملتے ہیں کہ ان کی ملاقات بڑے لوگوں سے ہے ان کے ذریعہ سے ہمارے کام نکلیں گے یا بعضے لوگ تعویذ گنڈوں کے لئے ملتے ہیں حالانکہ اہل اللہ سے اس قسم کے کام لینے کی ایسی مثال ہے کہ کسی سنار سے کھرپا بنانے یا لوہار سے زیور بنانے کی فرمائش کی جائے۔ بعض لوگ مشورہ کیا کرتے ہیں کہ ہم کس قسم کی تجارت کریں اناج کی تجارت کریں یا کپڑے کی خدا جانے یہ لوگ اہل اللہ کو خدا تعالیٰ کا رشتہ دار سمجھتے ہیں کہ ان کا بتلانا خدا کا بتلانا ہوگا اور جب خدا تعالیٰ بتلا دے گا تو اس کام میں ضرور نفع

ہوگا یا خدا تعالیٰ کا راز دار سمجھتے ہیں کہ یہ خدا سے مشورہ کر کے بتلا دیں گے ابھی کل کی بات ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے کہ مولوی صاحب آپ کو تو سب خبر ہوگئی ہوگی۔ صاحبو! اس دربار میں انبیاء علیہم السلام کا پتہ بھی پانی ہوتا ہے دوسروں کی تو کیا مجال ہے۔

ہست سلطانی مسلم مرورا نیست کس را زہرہ چوں و چرا

(بادشاہت اور سلطانی صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے اس میں کسی کو اعتراض کرنے کی مجال نہیں ہے)

فرماتے ہیں قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (آپ یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین میں ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہیں تو کوئی شخص ایسا ہے جو خدا تعالیٰ سے ان کو ذرا بھی بچا سکے) تو انبیاء کی نسبت جب یہ کہا جا رہا ہے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ ایک صاحب نے مجھ سے یاد نہیں رہا کوئی دنیوی فرمائش کی میں نے کہا یہ کام مجھ کو نہیں آتا کہنے لگے کہ اللہ والوں کو سب کچھ آتا ہے میں نے کہا کہ اگر سب کچھ آتا ہے تو کل ایک چارپائی بھی لے آنا کہ اس کو بن دیجئے غرض مولویوں سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پوچھئے اور اہل طریقت سے اللہ تعالیٰ کا نام پوچھئے دنیا کی فرمائش کسی سے نہ کیجئے ہاں دنیا کے لئے دعا کرانے کا مضائقہ نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے کاموں میں کسی قسم کا انکا دخل سمجھنا سخت غلطی ہے دعا کے متعلق بھی یہ نہ کرو کہ صرف ان ہی پر ڈال دو بلکہ تم خود بھی اپنے لئے دعا کرو اور بزرگوں سے بھی دعا کراؤ۔

شیطان کی شرارت

ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ میں اس قابل ہی نہیں کہ خود دعاء کروں میں نے کہا کہ کلمہ بھی پڑھتے ہو یا نہیں کہنے لگے کہ پڑھتا ہوں میں نے کہا کہ اس کی کیا وجہ کہ تم کلمہ پڑھنے کے قابل تو ہو مگر دعاء کرنے کے قابل نہیں یہ شیطان کی شرارت ہے کہ دلیلیں یوں ڈالتا ہے کہ دعا کے قابل نہ سمجھنا تواضع ہے ایک صاحب نے یہ فرمائش کی تھی کہ تم ہی استخارہ بھی دیکھ دو غرض اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف نہ ہو سب کچھ دوسرے ہی کر دیں مجھے پھر یاد آتا ہے کہ کھانے میں کبھی یہ نہ سوچا کہ بزرگوں سے کہتے ہیں کہ آپ ہی کھا لیا کیجئے ہمارے کھانے کی ضرورت نہیں۔

اصلاح نفس کا تتمہ تدبیر

تو تتمہ تدبیر کا یہ ہے کہ کام دین کا خود کرو اور بزرگوں سے اس میں اصلاح و مشورہ لیتے رہو اور عمر بھر اسی تدبیر میں لگے رہو یہ نہ کرو کہ چار دن کیا اور چھوڑ دیا کیونکہ ہم کو تو جنم روگ لگا ہے اس کے لئے عمر بھر کی ضرورت ہے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

اندریں رہ مے تراش و مے خراش　　　تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس راہِ سلوک میں ادھیڑ بن میں لگے رہو اور خوب کوشش کرو اور آخر دم تک بے کار نہ رہو)

تادم اخر دمے آخر بود　　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

(آخری وقت تک تو کوئی گھڑی ایسی ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی)

یہ مختصر سا بیان اس آیت کے متعلق تھا میں پھر آیت کا ترجمہ مکرر کرتا ہوں فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو اپنی فکر میں لگو کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف جانا ہے وہ تم کو بتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے تھے اب میں ختم کرتا ہوں اور پھر کہہ دیتا ہوں کہ یہ ضرور ہونے والا ہے اس لئے اس کے لئے آج ہی سے تیار ہونا چاہئے اب خدا سے دعا کیجئے کہ وہ توفیق عمل دے۔

الارتیاب والاغتیاب

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۱۳ شوال ۱۳۴۶ھ کو درسگاہ مدرسہ امداد العلوم تھانہ بھون میں سوا تین گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۴۰ تھی مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

بدگمانی اور غیبت سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تمام اعمال کے کچھ نسب نامے یعنی مناشی وعلل ہیں، جن کو صوفیاء کرام نے سمجھا ہے۔ اور دعا کو بھی اصلاح میں بڑا دخل ہے۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا. اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہُ. وَاتَّقُوا اللّٰہَ. اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات:۱۲)

ترجمہ: اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغ مت لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے اس کو تم ناگوار سمجھتے ہو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

یہ آیتیں سورہ حجرات کی ہیں ان میں حق تعالیٰ شانہ نے بعض ان اعمال کا ذکر فرمایا ہے جو ضروری بھی ہیں اور ان میں ابتلا بھی زیادہ ہے اور ان کا مفسدہ بھی زیادہ ہے۔ وجہ اختیار ان اعمال کے بیان کی ان کی ضرورت ہی ہے خواہ اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہ ضروری ہیں یا بوجہ ابتلاء کے یا بوجہ مفسدہ کے ان پر مطلع کرنا ضروری ہے۔

اب میں آیت کا ترجمہ کرتا ہوں اسی سے ان کی ضرورت اور ابتلاء اور مفسدہ کا علم ہو جائے گا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اکثر ظنون سے بچا کرو کیونکہ بعض ظنون گناہ ہیں اور

تجسس نہ کیا کرو (یعنی دوسروں کے عیوب تلاش نہ کرو اور غیبت نہ کیا کرو کیا کوئی تم میں سے اس کو گوارا کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا مرے پیچھے گوشت کھائے، پھر اس سے نفرت کرنے لگو گے۔ ہر چند کے جس عنوان سے اللہ تعالیٰ نے ان امور کا ذکر فرمایا ہے۔ وہی ان کے منہی عنہ اور قابل نفرت ہونے کے لئے کافی ہے مگر میں اس وقت ان اعمال کا نسب نامہ بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ نسب نامہ معلوم ہو جانے سے بغض و نفرت میں اور زیادہ ترقی ہوگی کیونکہ جس طرح نسب نامہ معلوم ہونے کو محبت میں دخل ہے اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص سے تم کو محبت ہو اس کا نام وغیرہ معلوم کرلیا کرو اسی طرح بغض میں بھی اس کو دخل ہے مثلاً ایک شخص سے محبت ہوئی اور نسب نامہ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ سید ہے تو محبت بڑھے گی اور اگر کسی فاسق کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ عدو اللہ کی اولاد میں بھی ہے تو اس سے بغض بڑھے گا تو جیسے اعیان میں یہ بات ہے کہ نسب نامہ معلوم ہونے سے محبت و بغض میں ترقی ہوتی ہے ایسی ہی اعراض و معانی کی حالت میں مگر افسوس چونکہ یہ علم گم ہو گیا ہے اس لئے اعمال کے نسب نامہ کی بہت لوگوں کو خبر نہیں ہے قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تمام اعمال کے لئے نسب نامے ہیں یعنی بعض اعمال دوسرے اعمال سے ناشی ہیں اور بعض امراض دوسرے امراض کا نتیجہ ہیں۔

تکبر کا علاج نماز سے

چنانچہ نماز کے متعلق ارشاد ہے وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (نماز کو میری یاد کے لئے قائم کرو) اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا منشاء ذکر اللہ ہے اور نماز ذکر اللہ کے انواع میں سب سے افضل ہے اسی طرح نماز کا ایک اور منشاء دوسری آیت میں مذکور ہے۔ وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس کا منشاء تواضع بھی ہے اللہ تعالیٰ نے یہود کو اس میں خطاب فرمایا ہے کیوں کہ ان کو تکبر ایمان سے مانع تھا اور تکبر کا علاج نماز سے بہتر کچھ نہیں صاحبو! متکبر نماز نہیں پڑھ سکتا کیونکہ رکوع کرنا اور سجدہ میں سرین کو سر سے اونچا اور سر کو زمین پر رکھنا متکبرین کو دشوار ہے اور ہم لوگوں کو عادت ہوگئی ہے اس لئے دشوار نہیں۔

نماز کا منشاء

نیز اس کے بعد ایک اور منشاء کے متعلق ارشاد ہے وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ کہ نماز واقعی بڑی گراں ہے مگر خاشعین پر گراں نہیں اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا منشاء خشوع بھی ہے جس کے معنی سکون قلب ہیں اور خشوع و ذکر قریب قریب ہیں کیونکہ

دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں اسی طرح قرآن وحدیث سے تمام اعمال کا نسب نامہ معلوم ہوسکتا ہے اور اس کو صوفیہ نے خوب سمجھا ہے وہ سب اعمال کے نسب نامہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں چنانچہ احیاء العلوم وغیرہ کتب تصوف اب بھی محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر معلوم ہوگا کہ اس فن کو صوفیہ ہی خوب جانتے ہیں اور ان حضرات نے اس کو قرآن وحدیث ہی سے سمجھا ہے یہ حضرات قرآن وحدیث کو سب سے زیادہ سمجھتے ہیں کیوں کہ علوم قرآن کے مختلف درجے ہیں اسی طرح لوگوں کی فہم بھی مختلف ہے بعض لوگ تو قرآن کے بعضے علوم کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتے یہ تو عبادت ہے اور بعض لوگ سمجھانے سے سمجھ جاتے ہیں پھر ان میں بعض علوم قرآن تو ایسے ہیں جو عقول متوسطہ سے حاصل ہو سکتے ہیں اور بعض علوم وہ ہیں جو عقول عالیہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں کہ فہم عالی ہی سے سمجھ میں آتے ہیں۔

تفاوت فہم

اور یہ تفاوت فہم مشاہدہ تو ہے ہی حدیث میں بھی اس کی اصل موجود ہے۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ سئل هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشيء دون الناس قال لا الا فهما اوتيه الرجل في القران اوما في سنده الصحيفة. یعنی حضرت علی سے پوچھا گا کہ کیا آپ حضرات (اہل بیت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتلائیں فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کی فہم (خاص درجہ میں) عطا فرمادیں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہو جائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں (اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت وغیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علی کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ دوسرے صحابہ کو بھی اس کا علم تھا مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی) اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ حضرت علی کو چونکہ قرآن سے مناسبت تھی اس لئے ان کو بعض دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتلائیں ہیں یا کسی نے اڑائی ہو یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں جو کتاب وحدیث میں نہیں۔

بعض علوم سینہ بہ سینہ کا خیال غلط ہے

اور یہ خیال عبداللہ بن سبا بانی فرقہ سبائیہ نے ایجاد کیا ہے جس سے مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا پھر بطور نفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علی کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھ

چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تو اب انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلامیہ میں خلط کرنا چاہئے۔ اور اس کا یہ ذریعہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بہ سینہ بتلایا مگر اللہ کا وعدہ ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت کی ہے کہ احکام میں خلط نہیں ہو سکتا گو فرق ضالہ اسلام میں بہت ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے اور تہتر تو اصول کے اعتبار سے ہیں ورنہ ہر فرقہ کے اندر بہت سے فرقے ہو گئے ہیں بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقل فرقہ ہے کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہے تا کہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو کیونکہ اختلاف تو ناگزیر تھا کہ کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا اس عالم میں بناء حکمت یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو اب اگر اختلاف کبھی کبھی ہوتا تو طالب حق کو طبعاً احتمال ہو سکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے کون حق پر ہے اور جب روزانہ نئے نئے فرقے نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً کم ہو جائے گا اور دیکھے گا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہا نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہو گئی ہے کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کرے بس وہ پرانا ہی طریقہ اسلم ہے۔

بعض علوم فہم عالی سے سمجھ آتے ہیں

بہر حال خیال بالکل غلط ہے کہ علوم سینہ بسینہ ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض علوم فہم عالی سے سمجھ میں آتے ہیں عقل متوسط یا ادنیٰ ان کے لئے کافی نہیں اسی واسطے اتباع مجتہدین کی ضرورت ہے اور مجتہدین کے کلام کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں اسی واسطے اتباع ضروری ہے کیونکہ مجتہدین کے کلام کو سمجھنے کے لئے ہر زمانہ میں علماء متقین کا اتباع ضروری ہے کیونکہ مجتہدین کے کلام کو بھی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

صاحبو! اگر دین کو سنبھالنا چاہتے ہو تو ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی عالم متقی کا اتباع کرے بدون اس کے کام نہیں چل سکتا ورنہ جو لوگ عربی سے واقف نہیں اور تراجم دیکھ کر حدیث و قرآن سے احکام کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کی وہی حالت ہو گی جو ایک جاہل کی حالت تھی کہ وہ امامت کی حالت میں بہت ہلا کرتا تھا لوگوں نے اس کو منع کیا کہ یہ کیا واہیات ہے تنہا نماز تو سکون کے ساتھ پڑھتے ہو اور امامت کے وقت اس قدر ہلتے ہو تو آپ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہی آیا ہے اس کے بعد ایک مترجم کتاب حدیث کی لایا جس میں

من ام منکم فلیخفف (الصحیح المسلم کتاب الصلوٰۃ: ۱۸۶)

کا ترجمہ یوں لکھا تھا کہ جو شخص امام بنے وہ ہلکی (یعنی خفیف) نماز پڑھا وے۔ اس جاہل نے ہلکی (بفتح ہاء و یاء معروف) کو ہلکے کے (بکسر ہا و یا مجہول) مشتق ہلنے سے پڑھا اور یہ مطلب

سمجھا کہ امام کو نماز میں ہلنا چاہئے چونکہ وہ خود مجہول تھا اس لئے یا معروف کو یاء مجہول سمجھ گیا۔ بہرحال احکام شرعیہ میں غلط نہیں ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک غلط نہ ہوگا حق تعالیٰ کا صاف ارشاد ہے قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (کہ ہدایت گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے) پس طالب حق کیلئے حق ضرور واضح ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ اس کو قاعدہ سے طلب کرے جس کے دو طریقے ہیں ایک تدبر کہ فکر سے کام لے دوسرے دعا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ مجھ پر حق واضح کردیجئے۔

دعا کی خاصیت

ایک نومسلم کا بیان ہے کہ جب میں نے مذہب حق کو تلاش کرنا شروع کیا تو مجھے مذہب میں حق کی جھلک نظر آتی تھی جس سے میں پریشان ہوگیا آخر میں نے یوں دعا کی کہ اگر آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا کوئی ہے تو میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھ پر حق واضح ہوجائے بس یہ دعا کرتے ہوئے دو چار دن نہ گزرے تھے کہ اسلام کا حق ہونا مجھے واضح ہوگیا۔

صاحبو! دعا بڑی چیز ہے دعا میں خاصیت ہے کہ اس سے تدبیر ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے جس کا بار بار مشاہدہ ہو چکا ہے مگر یہ مطلب نہیں کہ تم تدبیر نہ کرو تدبیر ضرور کرو اور اس کے ساتھ دعا بھی کرتے رہو اس سے تدبیر ضعیف قوی ہوجائے گی افسوس ہم لوگوں نے اس کو آج کل چھوڑ دیا اس کے بعد میں ایک اور بات کہتا ہوں وہ یہ کہ اگر دعا کے بعد بھی کسی پر حق واضح نہ ہو جب بھی اس کو ترک نہ کرے کیوں کہ اس وقت دعا کا یہی قاعدہ ہوگا کہ اس سے دل میں قوت پیدا ہوگی قلب کو راحت وسکون ہوگا اور یہی مطلوب ہے کیونکہ دنیا کی تمام تدابیر سے راحت قلب ہی تو مقصود ہے ورنہ پھانسی کے مجرم کے پاس سامان عیش تو بعض دفعہ دوسروں سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن کیا نفع! اس کی نظر میں سب خار ہے اور محض بے کار ہے کیونکہ اس کے قلب کو راحت حاصل نہیں۔

دعا سے راحت قلب نصیب ہوتی ہے

اور دعا سے راحت قلب ضرور حاصل ہوتی ہے میں اس پر حلف کرسکتا ہوں نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ لوگوں میں مشاہدہ کا بھی دعویٰ کرسکتا ہوں کیونکہ آخر کچھ تو مشاہدہ ہوا ہی ہے گو کامل نہ ہوسکا۔ سوانکھے کے برابر نہ ہو مگر اندھے سے تو افضل ہی ہے لیکن خدا تعالیٰ کے ارشاد کے بعد ہم کو نہ حلف کی ضرورت ہے نہ ادعاء سے مشاہدہ کی علاوہ قوت قلب کے ہا میں ایک نفع یہ ہے کہ یہ شخص حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائے گا کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اتباع نہیں کیا یہ کہہ دے گا کہ میں نے طلب حق کے لئے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے میں نے ان سے بھی عرض کردیا تھا کہ مجھ پر حق واضح کردیا جاوے اب

میں دوسرا ہادی کہاں سے لاتا اور یہ بات میں نے علی سبیل التنزیل کہی ہے کہ اگر دعا کے بعد حق بھی واضح نہ ہوا تو قلب کو قوت تو حاصل ہوگی اور خدا کے یہاں معذور تو ہو جائے گا ورنہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ جو شخص دل سے دعا کرتا ہے وضوح حق اس پر واضح ہو ہی جاتا ہے اسکے خلاف ہوتا ہی نہیں پس دعا کو ہرگز ترک نہ کیا جائے یہ مضمون درمیان میں استطرادًا ذکر کر دیا گیا جس سے اختلاف فرق کی حکمت اور طلب حق کا طریقہ معلوم ہوگیا جو مفید مضمون ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ فرقہ سبائیہ نے یہ بات غلط احکام کے لئے اختراع کی ہے کہ حضرت علی کو کچھ علوم سینہ بسینہ عطا ہوئے ہیں اور بعض لوگ صوفیہ کو بھی اس مضمون کے ساتھ بدنام کرتے ہیں ان کے یہاں بھی کچھ علوم سینہ بسینہ ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے صوفیہ کے یہاں جو چیز سینہ بسینہ ہے وہ علوم نہیں تو ان کے پاس وہی ہیں جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں ہاں ایک بات ان کے یہاں سینہ بسینہ ہے یعنی نسبت اور طریق سے مناسبت اور یہ وہ چیز ہے جو ہر علم میں سینہ بسینہ ہی ہے حتی کہ بڑھئی اور باورچی کے پیشہ میں بھی مناسبت اور مہارت جس کا نام ہے وہ سینہ بسینہ ہی ہے یعنی یہ بات استاد کے پاس رہنے ہی سے حاصل ہوتی ہے محض کتاب پڑھ لینے یا زبانی طریقہ دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی خوان نعمت ایک رسالہ چھپ گیا ہے جس میں ہر قسم کے کھانوں کی ترکیب لکھ دی ہے لیکن کیا اس کو دیکھ کر کوئی شخص باورچی بن سکتا ہے ہرگز نہیں جب تک کسی پکانے والے کو پکاتا ہوا نہ دیکھے اور ایک دوبار کا دیکھنا کافی نہیں بلکہ بار بار کا مشاہدہ شرط ہے چنانچہ ایک عورت گلگلے پکا رہی تھی خاوند آئے اور کوئی کام بتلایا کہ تم فلاں کام کرلو گلگلے میں پکالوں گا بیوی نے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے اس نے کہا واہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ڈالا اور نکال لیا اس نے کہا بہت اچھا ابھی معلوم ہو جائے گا چنانچہ شوہر صاحب نے کھڑے کھڑے ہی اوپر سے گلگلہ کو گھی میں ڈال دیا جس سے گھی کے چھینٹے گرم گرم اڑکر ان کے بدن پر گرے اور بدن جل گیا چھالے پڑ گئے بیوی نے کہا کیا میں نہ کہتی تھی کہ تم سے یہ کام نہ ہوگا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس میں کیا مشکل بات ہے بس ڈالا اور نکال لیا۔ جیسے گنگوہ کے ایک پیرجی کہا کرتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے منہ میں رکھا اور نگل لیا اور چلنا کیا مشکل ہے قدم اٹھایا اور رکھ دیا وہ ظالم بہت کھانا کھا جاتا تھا اور دن میں بہت مسافت طے کر لیتا تھا مگر ان دو لفظوں میں سے کہیں کام چلتا ہے ذرا آپ تو ایسا کر کے دیکھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی اسی طرح نجاری کا کام ایک دوبار دیکھنے سے نہیں آ سکتا۔ بندر بھی تو بڑھئی کو دیکھ کر بڑھئی بنا تھا مگر پھر کیا گت بنی تھی اسی لئے کہتے ہیں کہ زبوزینہ نیست نجاری غرض تصوف میں سینہ بسینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت۔

برکت کا اندازہ مشاہدہ سے ہوتا ہے

ایک اور چیز ہے یعنی برکت جو مشاہدہ سے معلوم ہوگی۔ بدون مشاہدہ کے اس کا علم نہیں ہو

سکتا جیسے نابالغ کو لذت جماع قبل بلوغ کے معلوم نہیں ہوسکتی۔ایک قصہ مشہور ہے کہ چند سہیلیوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ شادی کی لذت کیسی ہوتی ہے ایک لڑکی نے کہا کہ میرا نکاح ہو جاوے تو میں بتلاؤں گی جب اس کا نکاح ہو گیا تو سہیلیوں نے اس سے پوچھا کہ اب بتاؤ اس نے جواب دیا کہ بیاہ یوں ہی تمہارا ہوئے گا تب مزا معلوم ہوئے گا۔غرض امور ذوقیہ کو عبارت میں بیان نہیں کرسکتے وہ مشاہدہ ہی سے معلوم ہوسکتے ہیں اسی طرح برکت بھی مشاہدہ سے معلوم ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں ہوسکتی۔پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی نے اس خیال کی تردید خود فرمادی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا۔الا فهما اوتيه الرجل فی القران. کہ ہاں ایک چیز تو سینہ بسینہ ہے وہ یہ کہ انسان کو قرآن میں خاص فہم عطا ہو جائے۔اس میں قرآن سے مراد تمام شریعت الٰہیہ ہے جیسا ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص آئے اور انہوں نے کہا اقض بيننا بكتاب الله کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کردیجئے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لئے رجم کا حکم دیا اور مرد کیلئے سو درے اور سال بھر جلاوطنی کا حالانکہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد شریعت الٰہیہ ہے کیونکہ تمام احکام شرعیہ کتاب اللہ ہی کی طرف راجع ہیں کلیا یا جزیا۔

چنانچہ ابن مسعود نے بعض احکام حدیث کو قرآن کا مدلول فرما کر یہ آیت پیش کی وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (جس بات کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیں اسے پوری طرح بجالاؤ اور جس بات سے منع کریں اس سے باز آجاؤ) اور یہی فہم ہے جس کا اختلاف بعض اوقات اس درجہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو حدیث معلوم ہے مگر اس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس حدیث سے فلاں مسئلہ مستنبط ہوتا ہے چنانچہ امام ابو یوسف کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوفہ کے بہت بڑے محدث ہیں مشہور ہے کہ محدث نے امام ابو یوسف سے سوال کیا کہ تمہارے استاد امام ابو حنیفہ نے عبداللہ بن مسعود کا خلاف کیوں کیا۔امام ابو یوسف نے کہا کہ کس مسئلہ میں کہا ابن مسعود کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کسی کے نکاح میں ہو اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کردے تو بیع کرتے ہی باندی پر طلاق واقع ہو جائے گی اور امام ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں۔امام ابو یوسف نے کہا کہ تم نے تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاریہ کو طلاق نہیں قرار دیا محدث نے کہا کہ میں نے کب یہ حدیث بیان کی ہے کہ تم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے کہ جب حضرت عائشہ نے بریرہ کو خرید کیا اور آزاد کیا تو رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے بریرہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دیا (کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے باقی رکھیں یا فسخ کردیں) تو اگر بیع جاریہ ہی سے طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنی؟ محدث سوچنے لگے اور کہا اے ابو یوسف کیا یہ مسئلہ اس حدیث میں ہے کہا ہاں محدث نے کہا الا فهما اوتيه الرجل في القرآن ایک صاحب نے مجھ سے ریل میں پوچھا کہ اجتہاد کیا چیز ہے میں نے کہا کہ اس کی حقیقت میں آپ کو کس طرح بتلاؤں ہاں ایک مثال بیان کرتا ہوں اس سے آپ کو اجتہاد کا نمونہ معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہ اگر دو شخص مسافر ایسے ہوں جو علم میں مساوی ہیں قرأت میں بھی مساوی ہیں اور تقویٰ ورع میں بھی برابر ہیں عمر نسبت میں بھی یکساں ہیں پھر وہ دونوں رات کو سوئیں اور جب انہیں میں سے ایک کو احتلام ہو گیا ہو جس کے ذمہ غسل واجب ہے اور دوسرے کو احتلام نہیں ہوا اور دونوں ایسے مقام میں ہیں جہاں پانی دور تک نہیں ملتا اس لئے دونوں نے تیمم کیا ایک نے غسل جنابت کا تیمم کیا ایک نے وضو کا تو بتلایئے ان دونوں میں امامت کے لئے کون افضل ہے کہا وہ شخص جس نے وضو کا تیمم کیا کیونکہ طہارت دونوں کی برابر ہے نجاست ایک کی اشد تھی میں نے کہا لیکن فقہاء فرماتے ہیں کہ جس نے غسل کا تیمم کیا ہے وہ افضل ہے اس پر وہ صاحب حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگے کہ یہ کیونکر؟ میں نے کہا کہ فقہا فرماتے ہیں کہ تیمم فقدان ماء کے وقت طہارۃ کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے اس نے غسل کیا ہے اور جس نے وضو کا تیمم کیا ہے اس نے وضو کیا ہے غسل نہیں کیا اور غسل وضو سے افضل ہے۔ دوسرے جس نے وضو کا تیمم کیا ہے ممکن ہے اس کے ذمہ بھی غسل واجب ہو گیا ہو جس کی خبر نہ ہوئی ہو اور جنابت والے نے چونکہ غسل کا تیمم کیا ہے تو اس کے لئے یہ احتمال اب منقطع ہو گیا کیونکہ اس نے اس وقت غسل کر لیا ہے تو اس کی طہارت ہر طرح کامل ہے اس کو سن کر وہ کہنے لگا کہ واقعی فقہاء نے صحیح کہا میں نے کہا بس یہی اجتہاد کا نمونہ ہے اور اس سے یہ لازم نہیں کہ ہم لوگ استقلالاً فقہاء کے تابع ہیں بلکہ استقلالاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اتباع کرتے ہیں مگر ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد فقہا کے بیان فرمانے سے معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے جیسے کوئی شخص قانون کو وکیل سمجھ کر اس پر وکیل کو بتلانے کے موافق عمل کرلے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ شخص وکیل کا متبع ہے نہیں بلکہ قانون گورنمنٹ کا متبع ہے گورنمنٹ ہی کی اطاعت کر رہا ہے اسی طرح یہاں سمجھو (اور جو لوگ مقلدین کو فقہا کا متبع کہتے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ لوگ خود اہل لغت اور اہل نحو وصرف اور محدثین کا اتباع کرتے ہیں کیوں کہ بدون اہل لغت کے حدیث وقرآن کو سمجھنا محال ہے اسی طرح بدون محدثین کے حدیث کا علم دشوار ہے تو یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع

نہ ہوئے بلکہ ان وسائط کے متبع ہوئے اور اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ محض فہم حدیث وفہم لغت قرآن میں واسطہ ہیں ان کے ذریعہ سے ہم صرف مراد رسول کو معلوم کرتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں تو بعینہ یہی جواب مقلدین کی طرف سے ہے کہ ہم بھی فقہاء کو محض فہم مراد رسول اللہ واسطہ بناتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔

یہ اشکال مقلدین فقہاء کے قول سے رسول کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اگر ایک حدیث کو چھوڑتے ہیں تو کسی دوسری حدیث یا آیت پر عمل کرتے ہیں اور غیر مقلدین بھی ساری احادیث پر عمل نہیں کرتے وہ بھی بہت سی احادیث کو کبھی منسوخ کہہ کر کبھی ضعیف بتا کر چھوڑ دیتے ہیں تو فقہاء نے ایسا کیا تو ناگوار کیوں ہے جیسا تم کو کسی حدیث کے ضعیف کہہ دینے کا حق ہے فقہاء کو بھی حق ہے کہ جیسا تمہارے پاس حدیث کے صحیح وضعیف ہونے کا معیار و قاعدہ ہے فقہاء کے پاس بھی اس کا معیار و قاعدہ ہے اور اس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ تمہارے ہی قواعد صحیح ہیں ان کے صحیح نہیں اگر قرآن وحدیث یہ تم ان قواعد کو ثابت کر سکو تو ہمت کر کے بیان کرو ولن تفعلوا ذلک ابداً (۱۲ اجامع) غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ قرآن و شریعت کے متعلق لوگ یکساں طور پر نہیں سمجھ سکتے بعض علوم وہ ہیں جن کو مجتہدین ہی سمجھتے ہیں۔

تقویٰ کو زیادت فہم میں بڑا دخل ہے

اور ایک درجہ وہ ہے جو علماء عربیت کو حاصل ہے جہلاء کو حاصل نہیں یہی فہم صوفیہ کو دوسروں سے زیادہ ہے کیوں کہ یہ حضرات تقویٰ میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہیں اور تقویٰ سے نور بڑھ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں کہیں تو قرآن کو بصائر للناس فرمایا ہے کہ یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے بصیرت بخش ہے اور کہیں ھدًی للمتقین فرمایا ہے کہ یہ خاص متقیوں کے لئے ہدایت ہے اس میں وجہ تطبیق یہی ہے کہ اس سے متقیوں کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ ہدایت ہوتی ہے وہ اس کو دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کو زیادت فہم میں بڑا دخل ہے (ورنہ صف متقین پر ہدی کو مرتب نہ کیا جاتا اور ایک اور چیز ہے کہ اس کو بھی زیادت فہم میں دخل ہے وہ علم وہبی ہے جس کا مدار محض وہب پر ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کے قصہ میں فرماتے ہیں۔

وَدَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ. وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ. وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا کہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک کھیت کا قصہ یہ ہوا کہ اس میں دوسرے شخص کی بکریاں گھس گئیں اور سارا کھیت کھا گئیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے یہاں مقدمہ آیا آپ نے کھیت کی قیمت کا تخمینہ کرایا تو وہ

اتنی قیمت تھی جس کے برابر دوسرے کی ساری بکریوں کی قیمت تھی آپ نے یہ فیصلہ سنا فرمایا کہ میری رائے اس میں دوسری ہے دریافت کیا گیا کہ آپ کی رائے کیا ہے فرمایا کہ میرے نزدیک یوں فیصلہ ہونا چاہئے۔ کہ بکریوں والا اس کھیت کی خدمت کرے یہاں تک کہ کھیت اسی حالت پر آجائے جس حالت پر پہلے تھا اور اس مدت میں کھیت والا اس کی بکریوں سے نفع اٹھاوے جب کھیت اصلی حالت پر آجائے تو بکریوں والے کو اس کی بکریاں واپس دلا دی جائیں اور کھیت والے کو کھیت واپس کر دیا جائے چنانچہ اسی طرح فیصلہ کیا گیا۔

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس مقدمہ کا فیصلہ حضرت سلیمان کو سمجھا دیا جس سے انبیاء کی فہم میں بھی اختلاف ثابت ہوا باوجود یہ کہ دونوں صاحب علم وصاحب نبوت اور صاحب حکمت تھے مگر یہاں بوجہ وہب کے فرق ہوا نہ بوجہ تقویٰ کے کیونکہ وھب مقید با تقوٰی نہیں ہوتا دوسرے انبیاء علیہم السلام سب صاحب تقویٰ ہوتے ہیں بہر حال نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ تقویٰ اور وھب سے فہم میں زیادت ہوتی ہے اور حضرات صوفیہ صاحب تقویٰ بھی ہیں اور صاحب وھب بھی اس لئے ان کا فہم دوسروں سے بڑھا ہوا ہے اور ایسے واقعات بکثرت ہیں جس سے ان حضرات کی فہم دوسروں سے زیادہ ہونا ثابت ہوتی ہے چنانچہ ایک واقعہ اس وقت یاد آیا کہ ایک صوفی بزرگ کی بیوی بہت بدزبان تھی اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ تو اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ. وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ. گندی عورتیں واسطے گندے مردوں کے اور گندے مرد ہیں واسطے گندی عورتوں کے اور ستھری عورتیں ستھرے مرد کے واسطے اور ستھرے مرد ستھری عورتوں کے واسطے کے خلاف ہے آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں ہی کے پاس ہوتی ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے پاس پھر ان بزرگ کی بیوی خبیث کیوں تھی جواب یہ ہے کہ تم نے آیت کا مطلب غلط سمجھا آیت میں لازم استحقاق کا ہے مطلب یہ ہے کہ بدعورتیں بدمردوں ہی کے لائق ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے مناسب ہیں اس میں یہ کہاں ہے کہ نیک آدمی کی بیوی بد نہیں ہو سکتی۔

کیف قد قال تعالٰی ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ. كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ

(اور اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے حضرت نوح علیہ السلام کی بی بی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی کا حال بیان کرتا ہے کہ وہ دونوں ہی ہمارے خاص بندوں میں سے دو بندوں کے نکاح میں تھیں سو ان دونوں نے ان دونوں بندوں کا حق ضائع کیا تو وہ دونوں نیک بندے

اللہ کے مقابلہ میں ان کے ذرا کام نہ آسکے اور حکم ہو گیا کہ جہنم میں جانے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ۔) بلکہ صرف یہ بتلایا کہ بدعورتیں نیک مردوں کے لائق نہیں بلکہ بدوں ہی کے لائق ہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ نیک مرد کی بیوی بد ہو تو اس کے لئے وبال جان ہے اسی طرح نیک عورت کا خاوند بد ہو تو اس کیلئے قیامت کا سامنا ہے (تو اس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ میاں بیوی میں جہاں خاندانی مناسبت کی رعایت کی جاتی ہے صلاح تقویٰ کی مناسبت بھی ماخوذ ہونا ضروری ہے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام نکاح اللہ تعالیٰ کی رضا اور اذن سے ہوئے ہیں تو وہاں اس کی رعایت بدرجہ اتم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ آپ کی سب بیبیاں طیب ہی ہیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود طیب ہیں آپ کی ازواج مطہرات میں کوئی ویسی نہیں ہو سکتی جیسا منافقین کہتے ہیں پس اسی طرح اس تزاہب صدیقہ پر استدلال ہو گیا قلت وفی الایة دلیل لما قالة الحنیفة ان الفاسق لایکون کفو الصالحة فافهم ۱۲) اور بعض علماء نے کہا کہ یہاں خبیث وطیب سے عورتیں مراد نہیں بلکہ کلمات مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ بیہودہ باتیں خبیثوں کے واسطے ہیں اور اچھی باتیں اچھے آدمیوں کے واسطے ہیں پس منافقین نے جو حضرت عائشہ کی شان میں بیہودہ باتیں کی ہیں حضرت عائشہ کی شان سے ارفع واعلیٰ ہے یہ باتیں منافقین ہی کے واسطے ہیں۔

صاحبو! قرآن وحدیث کا مطلب محض ترجمہ سے معلوم نہیں ہو سکتا اور جو شخص محض ترجمہ سے مجتہد بننا چاہتے ہیں ان کو قسم ہے کہ آج سے وہ صرف طب کی کتابیں دیکھ کر بیوی کو مسہل بھی دے دیں کیونکہ حکیم صاحب بھی تو کتابوں ہی سے کوئی نسخہ دیکھ کر تجویز کریں گے پھر حکیم وطبیب کے محتاج کیوں ہوتے ہو اور اگر طب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہو جاتا طبیب سے مستغنی نہیں کر سکتا تو پھر قرآن وحدیث کا ترجمہ علماء سے تم کو کیونکر مستغنی کر دیتا ہے اس موقع پر مجھے حکیم محمود خاں کے باپ یا دادا کا ایک لطیفہ یاد آیا کسی نے حکیم صاحب سے سوال کیا کہ علاج آپ بھی کرتے ہیں اور فلاں عطائی بھی کتابیں دیکھ کر علاج کرتا ہے اس کے ہاتھ سے بھی کچھ مریض شفایاب ہوتے ہیں اور کچھ مرتے ہیں اور آپ کے ہاتھ سے بھی سب کو شفاء نہیں ہوتی تو پھر آپ میں اور اس میں کیا فرق ہوا کہا یہ فرق ہے کہ میرے ہاتھ سے اگر کسی کو شفا نہ ہو اور مر جائے تو قیامت میں مجھ سے باز پرس نہ ہوگی کیونکہ میں فن کو جان کر علاج کرتا ہوں اور اس عطائی کے ہاتھ سے کسی کو شفا بھی ہوگی جب بھی مواخذہ ہوگا اور کوئی مر گیا تو اچھی طرح گردن ناپی جائے گی کیونکہ وہ فن سے واقف نہیں یہ تو درمیان میں دفع دخل مقدر تھا۔

اہل اللہ کی مسلمانوں پر شفقت

اب میں ان بزرگ کی حکایت کو پورا کرتا ہوں کہ ان کی بیوی بہت بدزبان اور بدخلق تھی تو کسی نے ان سے کہا کہ آپ اس کو طلاق کیوں نہیں دیتے فرمایا کہ میرا بھی ارادہ ہوا تھا مگر میں نے اس کو اس لئے طلاق نہیں دی کہ میں نے سوچا کہ یہ جوان ہے بدوں نکاح کے بیٹھ نہیں سکتی اگر میں طلاق دوں گا تو یہ ضرور نکاح کرے گی اور اس صورت میں کسی دوسرے مسلمان بھائی کو پریشان کرے گی تو میں نے گوارا نہ کیا کہ اپنے سر سے بلا ٹال کر دوسرے مسلمان کو مبتلائے رنج کروں اس لئے میں سب مسلمانوں کا وقایہ بن گیا ہوں۔ واللہ اگر کوئی جاہل یا عالم ظاہر یا زاہد خشک ہوتا تو یہ جواب کبھی نہ دیتا اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کو دین کی فہم کس قدر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ اہل اللہ کو مسلمانوں پر کتنی شفقت اور ان کی مصالح کی کس درجہ رعایت ہوتی ہے۔

اہل شریعت، اہل طریقت، اہل حقیقت

اس شفقت پر ایک اور واقعہ یاد آیا ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ اہل شریعت واہل طریقت واہل حقیقت میں کیا فرق ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان چیزوں میں کچھ تنافی ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ ایک شخص کو صرف شریعت کا پابند ہے اور دوسرا تیسرا طریقت اور حقیقت کا بھی جامع ہے فرمایا کہ فلانی مسجد میں تین بزرگ بیٹھے ہیں وہاں جا کر ہر ایک کے ایک ایک دھول رسید کرو تم کو فرق معلوم ہو جائے گا وہ گیا اور اس نے بادل نخواستہ یہی حرکت کی جب ایک بزرگ کے چپت مارا تو وہ اٹھے اور کھڑے ہو کر اتنے ہی زور سے ایک چپت اس کے مار دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے دوسرے بزرگ کے مارا تو انہوں نے اس کو گھور کر دیکھا اور خاموش ہو گئے اور اپنے کام میں لگ گئے تیسرے بزرگ کے مارا تو انہوں نے کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کو دبانے لگے کہ تمہارے چوٹ لگ گئی ہوگی بہرحال صوفیہ کے علوم اہل ظاہر سے تقویٰ کی وجہ سے زیادہ ہیں واللہ تم کسی محقق کے پاس رہ کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایسا علم وعمل کسی میں بھی نہیں اسی کا ایک نمونہ میں اس وقت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ صوفیہ نے اعمال کے نسب نامے سب سے زیادہ سمجھے ہیں اور یہ مضمون آج ہی اس عنوان سے سمجھ میں آیا ہے اس سے پہلے اس عنوان سے سمجھ میں نہیں آیا تھا اور یہ برکت ہی درخواست کرنے والوں کی کہ نیا مضمون ذہن میں آیا اور دوسری برکت یہ ہے کہ اس وقت بیان کی ہمت ہوگی اور نہ آجکل میری طبیعت ضعیف ہے بیان کی ہمت نہ تھی اسی لئے میں مختصر بیان کروں گا۔

اور اسی لئے میں نے وہ مضمون اختیار کیا ہے جس میں ابتلاء زیادہ ہے اب سنئے کہ اس آیت میں جن اعمال کا ذکر ہے ان کا نسب نامہ کیا ہے؟ اور اس کیلئے مناسب یہ ہے کہ شروع سورت سے جن اعمال کا ذکر ہوا ہے سب کا نسب نامہ بتا دیا جائے تا کہ تمام سورت کے مضامین کا ربط معلوم ہو جائے تو سنئے شروع سورت میں ارشاد ہے لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ میں نے جہاں تک غور کیا ہے تو یہ معلوم ہوا کہ اس سورت کے شروع میں جن اعمال کا ذکر ہے ان کا حاصل تعلیم واضع ہے اور اخیر میں جن اعمال کا ذکر ہے ان کا حاصل نہی عن المنکر ہے چنانچہ شروع میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش قدمی نہ کرو جس کا شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض حضرات نے کسی معاملہ میں گفتگو کی تھی اور اس میں آواز بلند ہو گئی اور جھگڑے کی سی صورت پیدا ہو گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایسا مناسب نہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لینا چاہئے تھا نص کے میسر ہوتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت نہیں بلکہ جائز ہی نہیں۔
ہاں جہاں نص نہ ہو یا نصوص متعارض ہوں تو اجتہاد کی گنجائش ہے اور اس کو علماء محققین ہی سمجھتے ہیں کہ کہاں نصوص متعارض ہیں اور کہاں نص مقصود ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کی کیا ضرورت تھی جبکہ بے تکلف نص میسر ہو سکتی تھی تو اس میں تواضع کی تعلیم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی رائے اور اجتہاد کو فنا کر دینا چاہئے۔ مگر صحابہ کو اس وقت تک معلوم تھا کہ یہ امر خلاف تواضع ہے اس لئے ان کو گناہ نہیں ہوا۔ مگر روک ٹوک اس لئے کی گئی تا کہ مادہ تواضع ضعیف نہ ہو جائے اور اس کے ضعف سے کبر کا مادہ قوی ہو گا اور یہ مضر مفضی ہے معاصی کی طرف اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک مریض بدون علم کے کوئی مضر شے کھائے تو اس کو ملامت تو نہ ہو گی مگر نقصان ضرور ہو گا یہی مطلب ہے اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ اب اشکال رفع ہو گیا حاصل یہ کہ یہ روک ٹوک بطور سد ذریعہ کے ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد فجر وعصر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا کہ اصل مقصود طلوع وغروب کے وقت نماز سے منع کرنا ہے مگر سد ذریعہ کے لئے بعد فجر وعصر کی نماز سے روک دیا تا کہ فجر وعصر کے بعد نماز پڑھنے سے کہیں یہ سلسلہ ممتد نہ ہو جائے اور عین وقت طلوع وغروب میں نماز واقع نہ ہو جائے اس کے بعد ارشاد ہے۔
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمد کہہ کر نہ پکارو۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے ناگواری نہ ہوتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا کیونکہ یا محمد یا محمد بار بار کہنے سے ادب رخصت ہو جائے گا مگر یا اللہ کہنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت غیر متناہی ہے اس میں اس سے کمی نہیں ہو سکتی اور رسول کی عظمت متناہی ہے اس لئے وہاں منع کر دیا گیا ہے۔

آداب مشائخ

حضرات صوفیہ نے اسی صورت میں آداب مشائخ مستنبط کئے ہیں بوجہ ایک مقدمہ کے جو حدیث میں مذکور ہے۔

العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهماً وانما ورثوا علماً. (فتح الباری: ۱۶۰۱)

علماء وارث ہیں انبیاء کے نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام وراثت میں درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ علم کو چھوڑتے ہیں اور جب یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں تو ان کے حقوق و آداب بھی وہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق ہیں ہاں اصل و تبع کا فرق ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ کہ جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں اکثر عقل نہیں رکھتے۔ اس میں ایک تو ان لوگوں کا عذر بتلا دیا کہ وہ کم عقل ہیں اس لئے ان کو معذور رکھا جائے دوسرے یہ بتلا دیا کہ مسلمان کو عقل کے خلاف بھی کوئی کام نہ کرنا چاہئے۔ اب یہ بات قابل غور ہے کہ ان آداب و حقوق کا منشاء کیا ہے تو آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آداب کے مقرر کرنے کا منشاء ایذاء رسول سے روکنا ہے چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ. اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ. اے ایمان والو مت جاؤ نبی کے گھروں میں مگر یہ کہ تم کو حکم ہو کھانے کے واسطے بند راستہ دیکھنے والے اس کے پکنے کی لیکن جب تم بلائے جاؤ تب جایا کرو جب کھا چکو تو خود چلے جاؤ۔ اور آپس میں باتیں کرنے نہ بیٹھو اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگواری ہوتی ہے سو تمہارا لحاظ کرتے ہیں اس میں بلا اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جانے کی ممانعت ہے اور اجازت کے بعد داخل ہوں تو باتیں کرنے کیلئے وہاں مجلس آرائی کی ممانعت ہے۔ اور اس کی علت یہ بتلائی گئی کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء ہوتی ہے اور وہ تم سے شرماتے ہیں (اس لئے اپنی کلفت کو ظاہر نہیں کرتے)

حضرات صحابہ کی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

حضرات صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کلفت کی اطلاع نہ تھی اس لئے اس کا وقوع ہوا اور نہ وہ تو عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اطلاع کے بعد یہ کب ممکن تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کلفت کا سبب بنتے ان کی محبت کی تو یہ حالت تھی کہ غزوات میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جنگ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ میں واپس تشریف لاتے تو مدینہ کی عورتیں اور بچے آپ کے استقبال کرنے آتے اور اس موقع پر بعض عورتوں کو یہ اطلاع دی جاتی کہ اس لڑائی میں تمہارا باپ بھائی اور شوہر شہید ہو گیا تو وہ بے ساختہ سوال کرتیں کہ یہ بتلاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اچھی طرح ہیں صحابہ فرماتے ہیں کہ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بالکل اچھی طرح ہیں تو وہ عورتیں کہتیں کہ بس حضور سلامت چاہئیں۔ آپ کے اوپر ہزار باپ ماں اور اولاد قربان ہے۔ نیز فَيَسْتَحْيِ مِنكُمْ. سے معلوم ہوا کہ یہ فعل فی نفسہ گناہ نہ تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر متنبہ کرنے سے نہ شرماتے اس کے بعد ارشاد ہے وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ. اللہ تعالیٰ ٹھیک بات بتانے سے شرم نہیں کرتے۔ یہ قرآن کا خاص رنگ ہے کہ اس کے پڑھنے سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا متکلم کسی سے بھی نہیں دبتا جو دلیل ہے کلام الٰہی ہونے کی کیونکہ مخلوق کا کلام سن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متکلم دب کر کلام کر رہا ہے حتیٰ کہ حدیث میں بھی یہ رنگ موجود ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق تعالیٰ کا تو خوف غالب مگر قرآن کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متکلم پر کسی کا بھی ذرہ برابر اثر نہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں رکتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان آداب حقوق کی علت ایذا رسول ہے۔ پس صوفیہ نے اس علت کو مدنظر رکھ کر بہت سے مسائل مستنبط کئے جہاں اہل ظاہر کا فہم نہیں پہنچ سکتا چنانچہ آداب شیوخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کے سامنے اس طرح نہ کھڑا ہو کہ اس کے اوپر سایہ پڑے اس کو اہل ظاہر نہ سمجھیں گے اس سے کیوں ممانعت کی۔ کیا سایہ کے اندر بھی کچھ بوجھ ہے اور میں بھی عرصہ تک اس کی وجہ سے متردد تھا مگر ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب میرے سامنے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ان کا سایہ مجھ پر پڑ رہا تھا تو مجھے اس سے الجھن ہوئی اس وقت معلوم ہوا کہ اس کا منشا بھی اذیت ہے اسی طرح یہ بھی لکھا کہ شیخ کے مصلے پر نماز نہ پڑھے کیونکہ اس میں دعویٰ مساوات ہے سعدی کہتے ہیں۔

دلا تا بزرگی تیاری بدست بجائے بزرگان نباید نشست

(اے دل جب تک بزرگی حاصل نہ ہو جائے بزرگوں کی جگہ پر بیٹھنا نہیں چاہئے)

ہاں اگر اجازت ہو جائے تو جائز ہے اس کے لئے دوسرا شعر ہے۔

بجائے بزرگان بباید نشست کہ شاید بزرگی بباید بدست

(بزرگوں کی جگہ پر ضرور بیٹھنا چاہئے کہ شاید بزرگی حاصل ہو جائے)

جائے بزرگاں بجائے بزرگاں

اور حاجی صاحب کا ارشاد ہے جائے بزرگان بجائے بزرگان یعنی بزرگوں کی جگہ میں بھی

برکت و انوار ہوتے ہیں چنانچہ مولانا شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب حاجی صاحب حج کو تشریف لے گئے تو میں ان کی جگہ بیٹھ کر ذکر کرتا تھا تو انوار معلوم ہوتے تھے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ذکر فرماتے تھے کہ ایک بار ریل کے پلیٹ فارم پر بیٹھنے کا اتفاق ہوا بیٹھتے ہی انوار ہونے لگے مولانا نے تحقیق فرمایا معلوم ہوا کہ ایک بزرگ وہاں سے اٹھ کر ابھی تشریف لے گئے تھے۔ غرض اجازت کے بعد تو شیخ کی جگہ یا مصلے پر نماز پڑھنے اور ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں بغیر اجازت کے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی جگہ پر نماز پڑھا کرتے تھے اس کا منشا اتباع تھا دعویٰ مساوات نہ تھا ان کی یہ حالت تھی۔

درمنزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد باخاک آستانش داریم مرحبائے

(جس منزل میں محبوب کسی روز پہنچے ہوں ہم اس کی چوکھٹ کی خاک کو مرحبا کہتے ہیں)

نیز ایک بات اور ہے وہ یہ کہ مدار ادب کا عرف پر ہے اور تبدل عرف سے عرفیات کا حکم بدل جاتا ہے تو صحابہ کے زمانہ میں کسی کی جائے نماز پر نماز پڑھنا خلاف ادب نہ تھا اور اب عرف بدل گیا ہے تو اب یہ ادب نہ ہوگا کیونکہ جو امور مقصود شرعی نہ ہوں ان کے احکام زمانہ کے تبدل سے بدل جاتے ہیں۔ ہاں مقاصد شرعیہ نہیں بدل سکتے پس اب سمجھئے کہ ایذاء سے بچنا تو مقصود شرعی ہے یہ تو کسی حال میں نہیں بدل سکتا رہا یہ کہ کون سی بات موجب ایذا ہے اور کون سی نہیں یہ تبدل زمان وتبدل مکان سے بدل سکتی ہے کہ ایک فعل زمانہ سابق میں موجب ایذا نہ ہو آج کل موجب ایذا ہو یا ایک فعل بلاد عرب میں موجب ایذا نہ ہو بلاد عجم میں موجب ایذا ہو شیخ کے مصلے پر نماز پڑھنے کے متعلق ایک اور بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ بعض لوگ جائے قدم پر سجدہ کرتے ہیں اس میں شرک کا قوی اندیشہ ہے اس کا ہرگز قصد نہ کیا جائے اسی لئے میں اب اس شعر کو پسند نہیں کرتا۔

مقامیکہ نشان کف پائے تو بود سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

(جس مقام پر آپ کے کف پا کے نشان پڑے اہل نظر وہاں سالہا سجدہ کریں گے)

ادب کا منشاء مشائخ کو اذیت سے بچانا ہے

گو ایک وقت میں غلبہ محبت کی وجہ سے میں نے نقشہ نعل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شعر لکھ دیا تھا یہاں اتنی بات اور سمجھ لینا چاہئے کہ ایک تو سجدہ للقدم ہے کہ جائے قدم کو بوسہ کیا جائے تو یہ شرک صریح ہے اور ایک سجدہ علی القدم ہے کہ جائے قدم پر سجدہ کیا جائے حصول برکت کی نیت سے یہ شرک صریح نہیں مگر خطرہ سے خالی نہیں اگر ایسا ہی کسی کو شوق ہو تو وہ موضع قدم رکھے اور موضع سجود پر سجدہ کرے موضع قدم پر سجدہ نہ کرے اور یقیناً عبداللہ بن عمر ایسا ہی کرتے ہوں گے

کیونکہ ان کا مقصود محض اتباع تھا اور اتباع اسی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پڑے ہوں اور وہاں قدم رکھے جائیں اور جہاں آپ نے سجدہ کیا ہو وہاں سجدہ کیا جائے اور اس تقریر سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ آداب مشائخ میں خود اپنے ذوق سے کام لینا چاہئے کہ ان کو کس بات سے ایذا ہوتی ہے کس بات سے نہیں۔ یہ نہ کیا جائے کہ کتابوں سے آداب دیکھ کر عمل کرنے لگے کیونکہ ہر جگہ ہر زمانہ میں اور ایذا بدلتے رہتے ہیں نیز آداب میں غلو بھی نہ کرے کیونکہ غلو سے بھی ایذا ہوتی ہے جیسے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کھڑے ہو گئے جب دیر ہو گئی تو میں نے پوچھا آپ بیٹھتے کیوں نہیں کہا بدوں اجازت کے کیسے بیٹھوں میں نے کہا بہت اچھا دس برس تک بیٹھنے کی اجازت نہیں یہ کہنا تھا کہ فوراً بیٹھ گئے اسی طرح جس بزرگ کو جوتا اٹھانے سے ایذا ہوتی ہو اس کا جوتا نہ اٹھانا چاہئے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا لطیفہ

حضرت مولانا قاسم صاحب قدس سرہ کو اس سے کلفت ہوتی تھی ایک مرتبہ ایک حافظ صاحب نے مولانا کے جوتے اٹھا لئے اور سیڑھیوں کے پاس رکھ دیئے مولانا نے فرمایا کہ حافظ صاحب یہ جوتے تو تبرک ہو گئے اب بتلاؤ میں پہنوں کیا مولانا کے یہاں تواضع میں بھی لطافت ظرافت تھی ہر بات میں لطیفے ہوتے تھے آپ کی عادت تھی کہ مہمانوں میں امراء کو تو ساگ چٹنی کھلایا کرتے تھے اور غرباء کو قورمہ پلاؤ۔ اصل وجہ تو اس کی یہ تھی کہ مولانا کی نظر میں غرباء کی عظمت تھی امراء کی وقعت نہ تھی مگر ایک دفعہ کسی نے اس کی وجہ دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ مہمانوں کو لذیذ کھانا کھلانا چاہئے اور جدید شے لذیذ ہوتی ہے کل جدید لذیذ تو میں اپنے مہمانوں کو جدید اطعمہ کھلاتا ہوں۔ امراء کے لئے ساگ پات چٹنی اچار جدید ہے اور غرباء کیلئے قورمہ پلاؤ جدید ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس بزرگ کو جوتوں کا اٹھانا گراں ہو ان کے جوتے نہ اٹھائے جائیں اس وقت یہی ادب ہے کیونکہ ادب سے مقصود یہ ہے کہ ایذا سے بچے مگر لوگوں میں یہ مرض ہے کہ جس بات کو ادب سمجھ لیا ہے اس کو ہر جگہ ادب سمجھتے ہیں خواہ اس سے دوسرے کو ایذا ہی ہو چنانچہ مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے جوتے کوئی اٹھائے مگر ایک صاحب نے دوڑ کر مولانا کے ہاتھ سے جوتے لینے چاہے مولانا نے انکار کیا اس نے اصرار کیا مولانا نے جوتوں کو مضبوط پکڑ لیا تو احمق معتقد نے ایک ہاتھ سے مولانا کا ہاتھ مضبوط پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر جوتے لے لئے یہ غلو ہے اس کا نام ادب نہیں بلکہ بدتمیزی ہے۔

ادب کا مدار

بس ادب کا مدار اس پر ہے کہ ایذا نہ ہو اس کلیہ کو ملحوظ رکھو یہ مقصود ہے باقی سب اس کے فروع

ہیں جو کہ امور انتظامیہ میں سے ہیں اور وہ تبدل زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں جیسے پہلے زمانہ میں انتظام اوقات کا معیار گھڑی گھنٹے پر نہ تھا آج کل گھڑی گھنٹے پر مدار ہے پہلے سفر کا مدار گھوڑے بیل اونٹ پر تھا آج کل ریل موٹر ہوائی جہاز وغیرہ رائج ہوگئے ہیں یہ سب امور انتظامیہ ہیں جنہیں تبدل وتغیر حسب تبدل زمانہ ہوسکتا ہے ان کو بدعت نہ کہا جائے گا۔ بدعت کہتے ہیں مقاصد شرعیہ کے بدلنے کو کہ غیر مقصود کو مقصود بنادے یا مقصود کو غیر مقصود بنادے اور جو امور مقاصد شرعیہ سے نہیں انہیں ایسا تغیر کہ ایک کی جگہ دوسری شے کو اختیار کیا جائے اور کسی کو مقصود نہ سمجھا جائے جائز ہے۔

خوب سمجھ لو اسی لئے میں نے بعض آداب کو ایک بزرگ کے ساتھ واجب کہا ہے اور دوسرے کے ساتھ حرام کہا ہے۔ بہرحال اس سورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو آداب بیان کئے گئے ہیں صوفیہ کا ماخذ آداب مشائخ میں یہی ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اصل میں کہہ رہا تھا کہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں جو تعلیمات ہیں یا ان کا نسب نامہ تواضع ہے کہ تم کو تواضع اختیار کرنا چاہئے اور تمہارا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش قدمی کرنا آواز بلند کرنا یا حضور کو نام لے کر پکارنا گھر کے باہر سے آواز دینا تواضع اور ادب کے خلاف ہے اس سے بچنا چاہئے یہ مضمون تو پہلے رکوع کے اکثر حصہ میں ہے اور رکوع اول کے اخیر سے دوسرے رکوع کے اخیر تک جو تعلیمات ہیں ان کا نسب نامہ تکبر ہے یعنی ان افعال سے منع کیا گیا ہے جس کا منشاء کبر ہے چنانچہ رکوع ثانی سے پہلے ارشاد ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا الآیۃ۔ اس میں بغاوت سے ممانعت ہے اور بغاوت تکبر ہی سے ہوتی ہے اگر ایک جماعت اپنے کو دوسرے سے کمتر سمجھے تو بغاوت کیوں ہو تو ان سب تعلیمات کا نسب نامہ اور خلاصہ تواضع تو تکبر ہے اور صوفیہ نے جو اعمال کے نسب نامہ بیان کئے ہیں اس میں مصلحت یہ ہے کہ اس سے امراض کی جڑ اور احکام کی اصل بطور خلاصہ کے معلوم ہوجاتی ہے تو معالجہ وغیرہ سہل ہوجاتا ہے کہ ان رزائل کی اصل یہ ہے باقی سب فروع ہیں پس اصل کا علاج کرنا چاہئے یا یہ کہ ان فضائل کی اصل یہ ہے باقی فروع ہیں تو اصل کو حاصل کر لینا چاہئے اس کے ساتھ سب فروع خود ہی آجائیں گے یا ان کا حصول سہل ہوجائے گا۔ اگر اصل کو دریافت کر کے حاصل یا زائل نہ کیا گیا تو فروعات کا الگ الگ حاصل کرنا یا زائل کرنا تعب سے خالی نہیں کیونکہ فروع تو بہت ہیں اور یہ مصلحت بھی حدیث سے ماخوذ ہے۔

قال رجل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم یا رسول اللہ ان شرائع الاسلام قد کثرت علی فمرنی بقول فصل یدخلنی اللہ به الجنة فقال قل امنت باللہ ثم استقم. (او کما قال)

یعنی ایک صحابی نے حضور سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احکام اسلام میرے سامنے بہت ہوگئے تو مجھے ایک فیصلہ کن بات بتلا دیجئے جس سے میں جنت میں پہنچ جاؤں حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ امنت باللہ کہو پھر مستقیم رہو اس میں حضور نے یہ بتلا دیا کہ تمام اعمال شرعیہ میں استقامت مطلوب ہے اس گر کو یاد رکھو ہر جگہ اس سے کام لو پس تمام اعمال ٹھیک ادا ہوں گے حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تمام اعمال کا ایسا خلاصہ ہے کہ اس کو یاد کر لینے سے تمام احکام یاد ہو جائیں گے ایسا خلاصہ تو کوئی بھی نہیں بلکہ وہی مطلب ہے کہ استقامت کے اہتمام سے ہر عمل کامل ہوتا ہے اور عدم استقامت سے خراب ہوتا ہے اس گر کے یاد کر لینے اور تمام اعمال درست و کامل ہو جائیں گے۔

غصہ کا علاج

مجھے یاد ہے کہ میں پہلے غصہ میں تعجیل کرتا تھا جس سے کام بگڑتا تھا تو میں نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ ایک کلیہ یاد کر لیا کہ تعجیل نہ کرنا چاہئے اس سے برسوں تک کام لیتا رہا بحمد اللہ اس طریق سے تعدیل ہوگئی اور اس قسم کے کلیات و مختصرات کی سب اہل فنون کو ضرورت ہے جیسا کہ نحو میں قاعدہ ہے المبتدا مرفوع اس قاعدہ کو یاد کرا دینے کے بعد ہر جگہ نہ بتلانا پڑے گا کہ اس کو رفع ہو یا نصب بلکہ جو مبتدا ہو گا طالب علم اس کو خود ہی مرفوع پڑھے گا اسی طرح ہم نے اپنے گھر میں معمول مقرر کیا تھا کہ جب ملازم کو مردانہ ہے دروازہ میں بلانا ہو دروازہ کی کنڈی ہلا دیا کرو اس سے بعض دفعہ عزیزوں کو اشتباہ ہونے لگا کہ شاید ہمیں بتلاتی ہیں تو اب یہ قاعدہ کر دیا کہ ملازم کے واسطے کنڈی کو ایک بار بجایا جائے اور عزیز کے واسطے دوبارہ ذرا فصل سے اور اس قاعدہ سے سب کو مطلع بھی کر دیا تو ہمیشہ کے واسطے اشتباہ کا انتظام ہو گیا جب یہ سمجھ میں آ گیا کہ حضرات صوفیہ کا اعمال کیلئے نسب نامہ بیان کرنا یعنی امراض کا منشاء اور احکام کی اصل بتلانا حدیث کے بھی موافق ہے تو اب سنئے کہ اس تمام سورت کا خلاصہ میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ اس میں تواضع کی تعلیم اور تکبر سے ممانعت ہے چنانچہ تعلیم تواضع کے بعد بغاوت سے منع فرمایا۔ اس بغاوت کا منشاء بھی تکبر ہی ہوتا ہے اسکے بعد استہزاء و تمسخر سے منع فرمایا اور برے القاب سے کسی کو یاد کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا تکبر سے ناشی ہونا بالکل ظاہر ہے۔

بدگمانی کے مرض کا سبب

اس کے بعد فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ کہ بدگمانی نہ کرو کیونکہ یہ بھی تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے مگر یہ مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو (اور عمل کی صورت میں یہ ہے کہ یا تو دل سے اس پر اعتقاد جازم کر لے یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے ۱۲) جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو اس وقت تک نہ وہ مضر ہے نہ اس پر مواخذہ ہے وسوسہ تو بڑے سے بڑے کامل کو

بھی ہو سکتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا (کہ جو لوگ متقی ہیں ان کی شان یہ ہے کہ جب ان کو شیطانی وسوسہ آتا ہے تو ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں) یہ نہیں فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ کہ جو لوگ متقی ہیں ان کو شیطانی وسوسہ آتا ہی نہیں معلوم ہوا کہ وسوسہ کا آنا خلاف تقویٰ نہیں بلکہ متقی کو وسوسہ آ سکتا ہے اور وہ اس کے ساتھ بھی متقی رہتا ہے اس میں بڑی تسلی ہے اہل سلوک کے لئے پس اس میں غلو نہ کرو اور وسوسہ سے پریشان نہ ہو کہ وسوسہ کیوں آیا گو ظاہر میں یہ تقویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص وسوسے سے بھی ڈرتا ہے مگر حقیقت میں یہ تقویٰ کے خلاف ہے کیونکہ جب یہ غیر گناہ کو گناہ سمجھے گا تو شیطان اس کے پیچھے پڑے گا دیکھو یہ گناہ تم سے ہو گیا جس سے یہ رنجیدہ ہو گا پھر چونکہ وسوسہ کا آنا اس کے اختیار میں نہیں کوئی دوسرا وسوسہ آئے گا پھر تیسرا آئے گا جس سے کچھ دنوں تک تو رنج و غم بڑھے گا پھر سمجھے گا کہ گناہ سے بچنا ممکن ہی نہیں اب شیطان اس کو معاصی پر جری کر دے گا کہ جب گناہ سے کسی طرح بچ ہی نہیں سکتے تو پھر تقویٰ اور زہد فضول ہے خوب سمجھ لو کہ اس کا انجام بہت برا ہے۔

وسوسہ کا علاج

بس وسوسہ کا علاج یہی ہے کہ اس سے اصلاً پریشان نہ ہو ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس کو وساوس بکثرت آتے ہوں اور دفع نہ ہوتے ہوں اسے چاہئے کہ ان وساوس ہی کو جمال حق کا مرأۃ بنا لے کیونکر؟ اس طرح کہ یوں مراقبہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب قدرت ہے کہ دل میں ایک دریا خیالات کا پیدا کر دیا ہے جس کی کہیں انتہا نہیں اور جو رکتا ہی نہیں اب وساوس کو قدرت حق کی معرفت کا وسیلہ بناؤ ان شاء اللہ خود ہی بند ہو جائیں گے (کیونکہ شیطان کا مقصود تو وساوس سے خدا سے بعید کرنا تھا جب اس نے ان کو بھی قرب کا وسیلہ بنا لیا تو اب شیطان وسوسے ڈالنا بند کر دے گا غالباً شیخ ابو سلیمان دارانی کا ارشاد ہے کہ وساوس سے خوش ہوا کرو یعنی خوشی ظاہر کیا کرو کیونکہ شیطان کو علم غیب نہیں ہے جب تم خوشی ظاہر کرو گے تو وہ بھی سمجھے گا کہ دل سے خوش ہو رہا ہے۔ (پس تم غلبہ وساوس کے وقت زبان سے اتنا کہہ دیا کرو کہ میں اس سے نہیں گھبراتا تو اور وسوسے ڈال دے میں نہایت خوش ہوں گا) اور شیطان مسلمان کو خوش نہیں کرنا چاہتا اس لئے وسوسے ڈالنا بند کر دے گا یہ معالجات ہیں جو محققین نے وساوس کے بارے میں بیان فرمائے ہیں ان میں سے ہی نفع ہوتا ہے باقی وسوسے کا دفعہ کرنا اس سے فکر و رنج میں مبتلا ہونا ہرگز نافع نہیں اور یہ معالجات تدبیرات طبعیہ کی قبیل سے ہیں اس لئے ان کے بارہ میں یہ کوشش نہ کرو کہ حدیث میں یہ معالجات کہاں ہیں کیونکہ ایسے امور انتظامیہ کے لئے جزئی

تفصیل کی ضرورت نہیں بلکہ حدیث میں ان سے ممانعت نہ ہونا ہی ان سے ورود فی الشرع کے لئے کافی ہے حضرت عبداللہ بن مسعود نے متفلجات ومتنمصات پر لعنت فرمائی تھی (یعنی ان عورتوں پر جو دانتوں کو ریتی سے باریک بناتی ہیں اور منقاش سے چہرہ کا رواں صاف کرتی ہیں) تو ایک عورت نے سوال کیا کہ آپ ان پر کیسے لعنت کرتے ہیں فرمایا میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں جن پر قرآن میں جب کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے عورت نے کہا میں نے تو سارا قرآن پڑھا ہے کہیں بھی ان پر لعنت نہیں دیکھی فرمایا اگر تو نے قرآن (سمجھ کر) پڑھا ہوتا تو ضرور دیکھتی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا رسول تم کو جو حکم وغیرہ دیں اس کو اختیار کرو۔ اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں سے روکا ہے اور ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ قرآن میں بھی ان کا بدرجہ لعنت منہی عنہ ہونا کلیاً وارد ہوا۔

معالجاتی مشائخ اور قرآن مجید وحدیث

تو جیسے حضرت ابن مسعود نے حدیث کی باتوں کو قرآن میں داخل کیا ہے اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جن مسائل کے قواعد کلیہ حدیث میں موجود ہیں گو جزئیات مذکور نہیں وہ سب حدیث ہی میں داخل ہیں۔ ان کے لئے الگ الگ حدیث کی ضرورت نہیں مثلاً ایک شخص میں تکبر ہے شیخ نے کہا کہ اس کا علاج یوں کرو کہ مسافروں کے پیر دبایا کرو اس سے تکبر زائل ہو جائے گا مگر حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں اور نہ ضرورت ہے کیونکہ یہ معالجات کی قسم سے ہے اور معالجات میں صرف اس کی ضرورت ہے کہ اگر شریعت میں اس کی ممانعت نہ ہو تو کلیاً بھی اس کا اذن ہے صراحۃً مذکور ہونا شرط نہیں ورنہ زکام میں بنفشہ اور گاؤزبان کا پینا بھی جائز نہ ہوگا کیونکہ حدیث میں اس کا کہاں ذکر ہے۔ تو جو شخص ہر معالجہ کے لئے شیخ سے حدیث کا مطالبہ کرے گا وہ بھی تندرست نہیں ہو سکتا۔

شیخ طریقت کی تقلید اور امور انتظامیہ میں کی جاتی ہے چنانچہ ایک مدعی عمل بالحدیث نے مجھے خط لکھا کہ میں طریق باطن حاصل کرنا چاہتا ہوں کیا آپ مجھ کو طریق کی تعلیم دے سکتے ہیں مگر تقلید کا منکر ہوں میں نے جواب میں لکھا کہ یہ بتاؤ کہ طریق کے متعلق میں جو کچھ بتلاؤں گا اس میں میری بھی تقلید کرو گے یا نہیں اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا اگر یہ لکھتا کہ ہاں تقلید کروں گا تو اس پر یہ اشکال واقع ہوتا تھا کہ امام ابو حنیفہ کی تقلید سے تو انکار اور ایک مقلد حنفی کی تقلید کا اقرار اور اگر یہ لکھتا کہ تقلید نہ کروں گا تو میں جواب دیتا کہ اس حالت میں طریق کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کئی مہینوں کے بعد ان صاحب کا خط آیا کہ تم یہ سوال مجھے نہ کرو بس طریق کی تعلیم کر دو میں ہنسنے لگا اور احباب سے کہا کہ اگر یہ شخص مجھ سے پوچھتا تو اپنے سوال کا جواب میں خود اس کو بتا دیتا

کہ تم یہ لکھو کہ ہاں تقلید کروں گا اور اس پر جو یہ اشکال ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی تقلید سے تو انکار ہے اور ایک مقلد کی تقلید کا اقرار ہے اس کا جواب یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ کی تقلید تو احکام میں کی جاتی ہے اور شیخ طریق کی تقلید معالجات وامور انتظامیہ میں کی جاتی ہے اور اس تقلید کے جواز میں اختلاف نہیں بزرگوں کی جوتیوں کی برکت سے ہم خود اپنے لاجواب کرنے کی ترکیب بتلا دیتے ہیں بشرطیکہ مخاطب طالب ہو اگر یہ شخص طالب ہوتا اور اس اشکال کو حل کرتا تو میں خود اپنے اعتراض کا جواب بتا دیتا۔

صوفیاء کی تعلیم کا حاصل

غرض صوفیہ کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ وہ اعمال باطنہ کو خوب سمجھتے ہیں اور امراض باطنہ کا علاج اور ان کی اصلاح کا طریق جانتے ہیں جیسا کہ علماء ظاہر اعمال ظاہر اصلاح کا طریق جانتے ہیں مگر وہ اعمال باطنہ سے ناواقف اور ان کے اصلاح وعلاج سے بے خبر ہیں اور اس کا تجربہ ان معالجات سے ہو سکتا ہے جو صوفیہ رات دن بتلاتے ہیں چنانچہ ایک مثال اسی وقت ذہن میں آئی یہاں خانقاہ میں ایک ذاکر نے دوسرے شخص کو امر بالمعروف کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اس کا لہجہ متکبرانہ تھا تو میں نے تنبیہ کی کہ تم خانقاہ میں اپنے کام کو آئے ہو یا دوسروں کی اصلاح کرنے آئے ہو کہا اپنا کام کرنے آیا ہوں مگر امر بالمعروف واجب ہے تو وہ بھی شرعاً اپنا ہی کام ہے یہ حاصل تھا اس کے عذر کا کہا بے شک لیکن اس کے لئے کچھ شرائط بھی ہیں یا نہیں کہا مجھے معلوم نہیں میں نے کہا کہ اس کے لئے چند شرائط ہیں جن میں سے اول شرط اخلاص ہے کہ محض لوجہ اللہ نصیحت کرے اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے نصیحت نہ کرے اور اس کا معیار یہ ہے کہ عین نصیحت کے وقت یہ شخص مخاطب کو اپنے سے افضل سمجھتا ہو۔ اب تم بتلاؤ اور سچ بتلاؤ کہ نصیحت کے وقت تم اس کو اس سے افضل سمجھتے تھے یا نہیں کہا ہاں اپنی فضیلت کا خیال تو تھا میں نے کہا یہ کبر ہے اور تم کو امر بالمعروف کا حق نہیں کہا غلطی ہوئی میں نے کہا پھر اس غلطی کا علاج؟ کہا جو تجویز فرمایا جائے میں نے کہا اس کا علاج یہ ہے کہ ذکر وشغل چھوڑ دو کیونکہ اس ذکر وشغل ہی کی بدولت تم نے اپنے کو بڑا بزرگ سمجھا ہے علاج تو یہی تھا لیکن پھر مجھ پر شریعت کا ادب غالب ہوا کہ یہ صورۃ منع عن ذکر اللہ ہے اس لئے میں نے یہ بھی کہا کہ ہیئت خاصہ کے ساتھ ذکر نہ کرو وہاں چلتے پھرتے کرتے رہا کرو (کیونکہ اس طرح ذکر کرنے کو لوگ تصوف اور بزرگی نہیں سمجھتے) اور اس کے ساتھ ایک کام یہ کرو کہ نمازیوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر دیا کرو یہ علاج زاہد خشک کی سمجھ میں کبھی نہ آتا وہ ہرگز ترک اذکار کو تجویز نہ کرتا مگر مرض کا علاج ازالہ سبب ہے جب تکبر کا منشاذکر ہو تو اس کا علاج ترک ذکر ہی ہو گا اور وہ ترک صورۃ ہی ہے ورنہ وہ تکمیل ذکر ہے کیونکہ اصلاح اخلاق ذکر ہی کی بڑی فرد

ہے یہ گفتگو وسوسہ کے معالجات کے ضمن میں آ گئی تھی اور وسوسہ کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا تھا کہ میں نے بدگمانی کے متعلق کہا تھا کہ بدگمانی وہ ہے جو از خود لائی جائے اور جو بطور وسوسہ کے بلا اختیار آئے وہ بدگمانی نہیں وہ وسوسہ کا درجہ ہے اس پر گناہ نہیں مگر اس سے آگے نہ بڑھنا چاہئے۔

بدگمانی کا علاج

اب میں بدگمانی کا علاج بتلاتا ہوں اس کا علاج یہ ہے کہ جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو تو اپنے عیوب کو پیش نظر کر لیا کرو جیسے حضرت مرزا جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے خواجہ میر درد کی شکایت کی کہ وہ سماع سنتے ہیں حالانکہ خواجہ میر درد نقشبندی ہیں اور نقشبندیہ کے یہاں سماع بالکل نہیں مگر جب دل میں آگ لگتی ہے تو چاہے نقشبندی ہو یا چشتی بعض اوقات وہ سماع کی طرف مضطرب ہو جاتا ہے تو مرزا صاحب نے یہ شکایت سن کر فرمایا کہ میاں کوئی آنکھوں کا مریض ہے کوئی کانوں کا مریض ہے یعنی میرے سامنے ان پر کیا اعتراض کرتے ہو میں خود ایک مرض میں مبتلا ہوں آنکھوں کے مرض میں۔ کیونکہ مرزا صاحب کو لوگوں نے حسن پرست مشہور کر رکھا تھا حالانکہ حسن پرست نہ تھے بلکہ لطیف الطبع تھے اسی لئے جب جامع مسجد دہلی میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لاتے پالکی کے پٹ بند کر دیا کرتے تھے تاکہ راستہ میں دکانوں کا بے قاعدہ عمارت پر نظر نہ پڑے کیوں کہ اس سے ان کے سر میں درد ہو جاتا ہے اور یہ لطافت مرزا صاحب میں فطری تھی چنانچہ شیر خوارگی کے زمانہ میں بھی کسی بدصورت آدمی کی گود میں نہ جاتے تھے ہمیشہ خوب صورت آدمیوں کی گود میں جاتے تھے کیا اس وقت بھی حسن کے سبب شہوت نفس کا احتمال ہو سکتا ہے ہرگز نہیں پس معلوم ہوا کہ آپ حسن پرست نہ تھے بلکہ لطیف الطبع تھے لیکن عوام کو لطافت کی خبر خبر وہ تو آپ کے واقعات لطافت کو حسن پرستی ہی پر محمول کرتے تھے تو حضرت مرزا صاحب نے خواجہ میر درد کی شکایت سن کر فوراً تہمت کو پیش نظر کر لیا کہ میں بھی تو ایک تہمت سے متہم ہوں۔ اس کے بعد ارشاد ہے **ولا تجسسوا** اس میں تجسس کی ممانعت ہے یعنی دوسروں کے عیوب تلاش کرنے کی اس کا منشا بھی کبر ہی ہوتا ہے۔ پھر عیوب تلاش کرنے کے بعد ایک دوسرا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ان عیوب کو اگر اپنے ہی دل میں رکھے تو خود اپنے جاننے سے نہ بڑائی حاصل ہوتی ہے نہ لوگوں کی نظروں میں دوسروں کی وقعت کم ہو سکتی ہے اس لئے دوسروں کی غیبت شروع نہ کرے تاکہ ان کا نقص سب پر ظاہر نہ ہو جائے۔

غیبت کا منشاء

اس سے یہ معلوم ہوا کہ غیبت کا منشا بھی کبر ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے تجسس اور بدگمانی سب اسی کے مقدمات ہیں اگر کوئی شخص

بدگمانی اور تجسس کرے مگر غیبت سب سے اشد ہے۔ یہ نسب نامہ اور باہمی تعلق ہے ان گناہوں کا کہ یہ سب تکبر سے ناشی ہیں اس کے بعد تفاخر بالانساب سے ممانعت ہے یہ بھی تکبر ہی سے ناشی ہے عرب میں یہ مرض بہت تھا اور اب بھی عجم میں جو قبائل عرب کی نسل سے ہیں ان میں یہ مرض موجود ہے مگر وہ ان مذکورہ امراض کے برابر عام نہیں دوسرے اس کا اثر متعدی نہیں اگر تم نے اپنے نسب پر فخر کیا تو دوسرے کا کیا نقصان کیا اور بدگمانی و تجسس وغیبت کا اثر متعدی ہے اور اگر اپنے نسب پر فخر کرتے ہوئے دوسروں کے نسب پر طعن بھی ہو جو غیر کی طرف متعدی ہے تو یہ غیبت میں داخل ہے تو وہ تعدیہ غیبت کا ہوا اور بدگمانی وہ تجسس کا اثر جو متعدی ہے تو یہ غیبت کے ذریعہ سے ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا اسی لئے غیبت سب سے سخت ہے کیونکہ بدون اس کے ظن و تجسس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

غیبت کا ضرر و مفسدہ

یہ ہے کہ اس سے افتراق پیدا ہوتا ہے عورتوں میں یہ مرض زیادہ ہے کیونکہ وہ عموماً بے کار رہتی ہیں بے کاری میں سوائے غیبت کے ان کا کچھ مشغلہ نہیں ہوتا اور مردوں میں یہ مرض کم ہے اگر ان کو کچھ کام نہ ہو تو ان میں بھی یہ مرض زیادہ ہوتا۔ اور مفاسد افتراق کا علم سب کو ہے کیونکہ مقدمہ بازی لڑائی جھگڑا سب اسی کی بدولت ہوتے ہیں اور اتفاق کے اندر جو مصالح و منافع ہیں افتراق کی صورت میں ان سے بھی محرومی ہو جاتی ہے۔

اتفاق کی جڑ

اب میں اس کا علاج بتلاتا ہوں جس کے لئے سب سے پہلے حاجی صاحب قدس سرہ کا ایک ارشاد بیان کرتا ہوں جس پر کسی فلسفی کی نظر نہیں پہنچی اور اہل اللہ کی یہی تو باتیں ہیں جن کو دیکھ کر فلاسفہ نے بھی اقرار کیا ہے اولئک ھم الفلاسفہ حقا کہ سچے فلسفی یہی ہیں حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ آج کل اتفاق اتفاق تو پکارتے ہیں مگر اس جڑ کی ان کو خبر نہیں۔ اتفاق کی جڑ تواضع ہے بدون اس کے اتفاق نہیں ہو سکتا اور آج کل تعلیمی یا تفاق کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص دوسرے کو اپنے سے متفق اور اپنی رائے کا تابع بنانا چاہتا ہے اگر وہ دوسرا بھی یہی چاہے گا تو اتفاق کیسے ہو گا پس کبر کے ہوتے ہوئے اتفاق ممکن نہیں اتفاق محض تواضع سے ہو گا کہ ہر شخص دوسرے کی موافقت و تقلید کے لئے تیار ہو ورنہ اتفاق دشوار ہے اور اگر ہوا بھی تو محض زبانی اور کاغذی ہو گا۔ اسی کی نظیر امام ابوحنیفہ کی ایک وصیت ہے جو اپنے صاحبزادہ حماد کو کی تھی کہ تم مناظرہ نہ کرنا صاحبزادہ نے عرض کیا کہ حضرت میں نے تو آپ کو مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے پھر مجھے کیوں منع فرماتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ ہمارے مناظرہ میں اور تمہارے مناظرہ میں فرق ہے ہم تو

مناظرہ کے وقت یہ خواہش کرتے تھے کہ ہمارے مقابل کی زبان سے حق ظاہر ہو جائے اور ہم اس کا اتباع کرلیں اس کی بات کو مان لیں تا کہ ہمارے بھائی کو غلبہ وعزت حاصل ہو اور تم یہ تمنا کرتے ہو کہ خصم کی زبان سے حق ظاہر نہ ہو بلکہ باطل ہی ظاہر ہو تا کہ ہم اس کو مغلوب کردیں اور خود غالب ہو جائیں پس ہم تو ہدایت خصم کے طالب تھے اور تم ضلالت خصم کے طالب ہو دیکھئے امام صاحب اور حضرت حماد کے زمانہ میں اتنا فرق ہو گیا کتنی جلدی زمانہ بدل گیا اور اب تو یہ قصد ہوتا ہے کہ خصم کی زبان سے جو بات بھی نکلے گی اس کا وہ بھی کریں گے خواہ حق نکلے یا باطل یہ حالت پہلے زمانہ میں نہ تھی اسی لئے حضرت حاجی صاحب کو مناظرہ سے نفرت تھی اور مجھے بچپن میں جتنا شوق تھا حضرت کی برکت سے اب اتنی ہی نفرت ہے اسی لئے جب مجھے انداز سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب حق کو نہ مانے گا تو سلسلہ کلام بند کر دیتا ہوں اسی سے مناظرہ میں مجھ پر غالب آ جانا آسان ہے کیونکہ گفتگو دو حال سے خالی نہیں یا تو مخاطب حق کہے گا تو میں اس کو فوراً تسلیم کر لیتا ہوں اور دوسرا غالب آ گیا یا باطل کہے گا اور مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ سمجھنا نہیں چاہتا جھگڑنا ہی چاہتا ہے جب بھی گفتگو بند کر دیتا ہوں اس وقت بھی وہ غالب آ گیا یہ مضمون افتراق کے سلسلہ میں آ گیا۔

افتراق کا علاج

اس افتراق کا علاج یہی ہے کہ تواضع اختیار کرو اور یہی علاج ہے غیبت کا کیونکہ اس کا منشاء بھی کبر ہے اور علاج ضد سے ہوتا ہے پس تواضع سے غیبت کا مرض بھی جاتا رہے گا یہ تو اصل مرض کا علاج ہے اور ایک علاج فرض ہے جو نفس میں موجود ہے اور گو وہ قبح کبر و غیبت کے برابر نہیں لیکن اپنے آثار کے اعتبار سے کبر و غیبت سے مقدم انس کا علاج ضروری ہے اطباء بھی بعض دفعہ اس اصل کو اختیار کرتے ہیں مثلاً جب مریض کی حالت خطرناک ہوتی ہے تو وہ عرض ضعیف کو زائل کرنے کے لئے فوری علاج اس کا کرتے ہیں تا کہ کچھ حالت سنبھل جائے تو پھر اصل مرض کا علاج کیا جائے اسی طرح کبر و غیبت و موطن وغیرہ کا اصلی علاج تواضع ہے مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدہ نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

حضرت جو تکبر گھٹی میں پڑا ہوا ہے وہ تو نکلتے ہی نکلتے نکلے گا نوے برس کا رام ایک دن میں کیوں کر دل سے نکل جائے۔

شاہجہاں کے صعوبت زوال کی حکایت

صعوبت زوال پر ایک حکایت یاد آئی عالمگیر نے جب شاہجہاں کو معزول کر کے مقید کیا تو

دریافت کیا کہ اس حالت میں آپ کے لئے کیا شغل تجویز کیا جائے فرمایا کہ کچھ بچے پڑھنے کے لئے بھیج دو ان کو بیٹھا پڑھایا کروں گا عالمگیر نے کہا ہاں ابھی تک بوئے سلطنت دماغ سے نہیں نکلی کیونکہ یہ میاں بھی بادشاہوں سے کم نہیں ہوتے چنانچہ ایک میاں جی کی گفتگو بادشاہ سے ہوئی تھی میاں جی نے کہا میری بادشاہت تمہاری سلطنت سے افضل ہے کیونکہ میری فوج میری اطاعت تمہاری فوج سے زیادہ کرتی ہے بادشاہ نے کہا ہرگز نہیں میاں جی نے کہا بہت اچھا ابھی امتحان کر لیجئے اپنی فوج کو حکم دیجئے کہ سب کے سب اپنے منہ کالا کر کے ایک لنگوٹی باندھ کر ڈنڈے ہاتھ میں لیں اور بازار کے بیچ میں کو کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے کہتے ہوئے ڈنڈے بجاتے ہوئے نکل جائیں چنانچہ بادشاہ نے فوج کو یہ حکم دیا سب نے انکار کر دیا کہ دشمن کے مقابلہ میں بھیج دو جان دینے کو حاضر ہیں لیکن اگر بیچنے کے واسطے ہم نے نوکری نہیں کی تو بادشاہ بہت کھسیانا ہوا اس کے بعد میاں جی نے اپنے مکتب کے لڑکوں کو حکم دا سب نے منہ کالے کر کے ڈنڈے ہاتھ میں لئے اور بیچ بازار میں کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے کرتے ہوئے نکل گئے بچوں کو اپنے میاں جی سے محبت بہت ہوتی ہے ایک بار مجھے میرے والد صاحب نے حافظ صاحب کے پاس سے اٹھانا چاہا کسی بات پر خفا ہو گئے تھے مگر میں مچل گیا اور ہرگز نہ اٹھا آخر والد صاحب تھک کر خاموش ہو گئے نیز میں اکثر اپنا کھانا مکتب میں منگا لیا کرتا تھا تا کہ زیادہ آوے اور حافظ صاحب بھی کھالیں اور ان کو سہارا لگے کیونکہ ان کی آمدنی کافی تھی اور یہ قاعدہ ہے کہ گھر سے جب کھانا باہر جاتا ہے تو خوراک سے زیادہ ہی بھیجا جاتا ہے تا کہ سب کی بس کی نہ ہو۔ مگر جتنی محبت لڑکوں کو میاں جی سے ہوتی اتنا ہی میاں جی کو تنگ بھی کرتے ہیں لوہاری میں ایک میاں جی تھے وہ اپنے حجرہ میں جو چیز کھانے پینے کی رکھتے لڑکے سب کھا جاتے تھے ایک دفعہ ان کے پاس بتاشے آئے تو انہوں نے ایک لوٹے میں رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا لڑکوں کو فکر ہوئی کہ ان کو کس طرح نکالیں تو ایک نے رائے دی کہ لوٹے میں پانی ڈالو سب گھل جائیں گے پھر شربت بنا کر پی لو چنانچہ ایسا ہی کیا اوپر سے منہ بند کا بند رہا اور اندر سے خالی ہو گیا تو دیکھئے شاہجہاں کے دماغ میں بوئے سلطنت بسی ہوئی تھی تو انہوں نے معزولی میں بھی ایسا کام تجویز کیا جو سلطنت کے مشابہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ تواضع ایک دن میں حاصل نہیں ہو سکتی تکبر کو دماغ سے نکالنے کے لئے زمانہ چاہئے تو جب تک اصل مرض کا علاج ہو اس وقت تک مرض کا علاج کرو یعنی غیبت سے بچنے کیلئے فوری تدبیر یہ کرو کہ بدوں سوچے کوئی بات نہ کیا کرو جو بات کرو سوچ کر کرو اس سے غیبت کم ہو جائے گی اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہو گی۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس کلیہ کو کون یاد رکھے کہ ہر بات سوچ کر کیا کرے۔

نماز میں خشوع کی ضرورت

تو صاحبو! تم سے اتنا کام بھی نہ ہو سکے تو بڑی مشکل ہے اس کو تم خود یاد رکھو اگر کبھی بدوں سوچے زبان سے بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل صلوٰۃ التوبہ کی نیت سے پڑھ لیا کرو پھر نہیں بھولو گے کیونکہ نماز کے متعلق ارشاد ہے۔ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ. کہ نماز بجز خاشعین کے لوگوں پر بڑی گراں ہے۔ روزہ اتنا گراں نہیں اس کو عورتوں سے پوچھو ان کو روزہ بڑا آسان ہے چنانچہ جب کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے تو عورتیں فوراً روزہ کی منت مان لیتی ہیں نماز کی قدر نہیں کرتیں۔ کیونکہ روزہ میں کچھ قید نہیں اور نماز میں قید ہے ظاہر کی بھی کہ بات نہ کرو ادھر ادھر نہ دیکھو اور باطن کی بھی کہ دل کو خدا کی طرف رکھو اور یہ توجہ قلب از بس دشوار ہے خصوصاً صاحب کے اعضاء ظاہرہ کو سکون ہوتا ہو تو اس وقت قلب کو حرکت زیادہ ہوتی ہے اور سب کے عوض وہی کام میں لگ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نماز میں دنیا بھر کی باتیں یاد آتی ہیں جو بات دن بھر بھی ذہن میں نہ آئے نماز کے وقت دل میں آجاتی ہے۔

نسیان کا منشاء

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قاعدہ سے ایک شخص کو بھولا ہوا دفینہ یاد کرنے کا طریقہ یہ بتلایا کہ آج رات بھر نماز پڑھنے کا قصد کر لو وہ جو اس نیت سے کھڑا ہوا تو دوسری ہی رکعت میں یاد آگیا اس نے سلام پھیر کر زمین کھودی اور دفینہ نکال لیا صبح کو امام صاحب سے عرض کیا، فرمایا شیطان کو یہ کب گوارا تھا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے اس نے جلدی ہی یاد دلا دیا مگر تم کو چاہئے تھا کہ اس کے بعد بطور شکر کے صبح تک نماز پڑھتے رہتے لیکن یہ علاج یہ نسیان کا نہیں امام صاحب کو فراست سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ نسیان شیطان کے تصرف سے ہے اس کا تو یہ علاج بتلا دیا اور اگر نسیان کا منشا ضعف دماغ ہو تو اس کا یہ علاج نہیں۔

اور یہ بات امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی جیسا شخص سمجھ سکتا ہے اس نسیان کا منشاء شیطانی تصرف ہے یا ضعیف دماغ۔ غرض نماز بڑی گراں ہے تو غیبت پر نماز کا جرمانہ مقرر کرو جب بھی کوتاہی ہو فوراً دو رکعت نفل پڑھ لیا کرو نفس سیدھا ہو جائے گا کہ یہ راہ ہر روز کیسا چلنے لگا اور اگر اس سے بھی پوری اصلاح نہ ہو تو جرمانہ مالی مقرر کرو۔ حدیث میں بھی اس کی اصل موجود ہے وطی حائض اور ترک جمعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدق دینار و نصف دینار کا امر فرمایا ہے۔

ایک علاج اور یہ ہے جو میں نے بعض سالکین کو بتلایا تھا کہ پرچہ پر یہ مضمون لکھ کر بازو پر باندھ لو کہ غیبت گناہ عظیم ہے اس سے بچو وہ پرچہ سامنے ہونے سے ذہول نہیں ہوتا پھر جب

غیبت سے بچو گے تو بدگمانی میں کیا نفع رہا اس کو بھی خواہ مخواہ چھوڑ و گے اور بدگمانی کی جو ابتدائی وجہ ہے جو بطور وسوسہ کے ہوتا ہے گو اس میں گناہ نہیں مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے تا کہ اس میں ترقی نہ ہو جاوے پھر معاصی کی طرف مفضی نہ ہو جائے اس کا خاص علاج یہ ہے کہ جب بدگمانی کا وسوسہ آئے فوراً کسی خیال محمود کی طرف ذہن کو منتقل کرو اور کام میں لگ جاؤ اور کام میں لگ جانے کے بعد بھی اگر کچھ خیال رہے تو وہ خیال اصلاً مضر نہیں اس سے بے فکر رہو حاصل یہ کہ بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جو ذہن میں اعتقاد راسخ ہو اگر راسخ ہو تو مضر نہیں مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے پھر اگر علاج کے بعد بھی کچھ اثر رہے تو وہ مضر نہیں ہے اور یہی علاج ہے وساوس کا جس کو صوفیہ نے خوب تفصیل سے بیان کیا ہے علماء ظاہر نے اعمال سے بحث کی ہے مگر خیال سے غیبی بحث صوفیہ کی ہے کسی نے نہیں کی تو وساوس کا علاج یہ نہیں ہے کہ تم اس کے دفع کا اہتمام وقصد کرو کیونکہ یہ تو بجلی کا تار ہے دفع کے قصد سے بھی ہاتھ لگاؤ گے تو چمٹ جائے گا بلکہ اس کا علاج وہ ہے جو حدیث میں آیا ہے۔ فلیستعذ باللہ ثم لینتہ جو دو اجزاء میں سے مرکب ہے ایک یہ کہ نعوذ باللہ میں مشغول ہو اس کا حاصل یہی ہے کہ اپنی توجہ کو دوسری طرف مشغول کرو ذکر اللہ میں لگ جاؤ دوسرا جزو یہ ہے کہ وسوسہ کی طرف التفات نہ کرے قصداً ادھر توجہ نہ کرے انتہاء سے مراد یہی ہے وسوسہ کا دفع کرنا مراد نہیں کیونکہ دل تو انتہا لازم ہے بمعنی باز آمدن متعدی بمعنی دفع کردن نہیں ہے دوسرا تجربہ ہے کہ نفع عدم التفات ہی سے ہوتا ہے نہ کہ قصد دفع سے اس میں حدیث کے وہی معنی مراد لینا پڑیں گے جو وسوسہ کے رفع میں نافع ہیں اور اس علاج کی صورت نماز میں اگر وسوسہ آ جائے یہ ہے کہ نماز اذکار و اعمال کی طرف متوجہ رہو اگر نماز پر توجہ پوری طرح رہے تو سہو ونسیان نہیں ہوگا سہو نماز پر توجہ کم ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور اگر سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو پر شبہ ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری عدم توجہ الی الصلوٰۃ کا سبب توجہ الی الدنیا ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں توجہ الی اللہ ہوتی ہے اور اول نقص ہے اور ثانی کمال ہے خلاصہ یہ کہ نماز سے توجہ کا ہٹنا ہی سہو کا سبب کہا جاوے لیکن اگر نماز سے توجہ ہٹ کر اعلیٰ من الصلوٰۃ کی طرف مشغول ہو تو گو سہو اس وقت بھی ہوگا مگر یہ منافی کمال نہیں اور اگر ادنیٰ کی طرف مشغول ہو تو نقص ہے۔ یہ جواب صوفیہ نے بیان کیا ہے علماء ظاہر کے کلام میں آپ کا پتہ نہ ملے گا یہ کلام وسوسہ کے متعلق استطراداً بیان ہو گیا اب میں مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ اگر حقوق العباد اور مفاسد افتراق وعناد سے بچنا چاہتے ہو تو بدگمانی اور تجسس وغیبت سے احتراز کرو جس کا اصل علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو تکبر کو دل سے نکالو اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک طبیعت کا فوری علاج یہ کرو کہ فکر و

تامل سے کام لو اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کا ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو اور حقوق العباد کا میں نے اس لئے ذکر کیا کہ غیبت و بدگمانی میں حق العبد بھی فوت ہو جاتا ہے کیونکہ حقوق العباد محض مال کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ آبرو بھی حق العبد ہے حدیث میں ہے

انما اموالکم واعراضکم ودماء کم حرام علیکم کحرمۃ یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا الحدیث (مسند احمد ۱: ۲۳۰)

اور اس مجموعہ میں ترتیب یہ ہے کہ سب سے کمتر مال ہے پھر جان کا درجہ ہے پھر آبرو کا آبرو جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے دیکھو تم جان بچانے کو اپنا مال ڈاکو کے حوالہ کر دو گے اور آبرو بچانے کے لئے جان بھی دے دو گے مثلاً کوئی شخص تمہاری بیوی چھیننا چاہے تو اس وقت جان کی پرواہ نہ کرو گے اور آبرو سے بڑھ کر دین ہے یہ سب سے زیادہ عزیز ہے اس کے سامنے آبرو کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی مثلاً کسی جگہ دین میں عمل کرنے میں یہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کو بے وقوف اور پاگل کہیں گے جیسا کہ بعض ممالک میں داڑھی والے کو احمق بتاتے ہیں تو دیندار کو دین کے سامنے آبرو کی پرواہ نہیں ہوتی وہ یوں کہتا ہے۔

نساز د عشق را کنج سلامت ۔۔۔ خوشا رسوائے کوئے ملامت

حدیث میں ہے اذکروا اللہ حتی یقال انہ مجنون (میزان الاعتدال: ۶۲۶۷)

کہ خدا کا اتنا ذکر کرو کہ لوگ مجنون کہیں پھر تم ان کے جواب میں یوں کہہ دو۔

اگر قلاش و گر دیوانہ ایم ۔۔۔ مست آں ساقی واں پیمانہ ایم

حقوق العباد کی چار قسمیں

پس حقوق العباد چار ہیں نمبر ا کسی کے دین کو نقصان پہنچانا آبرو کو نقصان پہنچانا جان کو نقصان پہنچانا مال کو نقصان پہنچانا ان سب سے بچنا واجب ہے اور سب میں زیادہ سخت دین کو نقصان پہنچانا ہے اس کی یہ صورت ہے کہ کسی مسلمان کو مسئلہ غلط بتلا دیا یا اس کو بدعت میں مبتلا کر دیا مگر اس کو حق العباد میں کوئی شمار نہیں کرتا بلکہ محض حق تعالیٰ سمجھتے ہیں مگر نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ حق العبد بھی ہے ایک حدیث میں غلط مشورہ دینے کی خیانت فرمایا گیا ہے اور مشورہ میں دنیا کی تخصیص نہیں اور خیانت کا حق العبد ہونا ظاہر ہے۔ نیز جب اس پر حق العبد کی تعریف صادق آتی ہے یعنی جس میں عبد کا ضرر ہو۔ پھر حق العبد ہونے میں کیا شبہ ہے اور دین کا ضرر سب ضرروں سے اشد ہے پھر دین کے بعد آبرو کا درجہ ہے آبرو کی تنقیص جان و مال کی تنقیص سے بھی اشد ہے مگر آج کل اس کی ذرا پرواہ نہیں کی جاتی چنانچہ اس میں رات دن مبتلا ہے حتیٰ کہ وہ اتقیاء بھی جو کسی کا ایک پیسہ مارنا بھی جرم سمجھتے ہیں غیبت سے احتراز نہیں کرتے۔

غیبت کے حدود

رہا یہ سوال کے بعض دفعہ غیبت کی ضرورت ہوتی ہے تو سنئے؟ شریعت نے اس کے لئے بھی حدود مقرر کیے ہیں وہ یہ کہ غیبت ایک تو حظ نفس کے لئے ہے یہ تو حرام ہے اور ایک ضرورت سے ہے جس کو شریعت ضرورت کہے وہ جائز ہے مثلاً کسی عورت کو استفتاء کی ضرورت ہے اور اس ضرورت سے اپنے شوہر کا حال مفتی سے کہنا پڑے تو اس کو اس وقت شوہر کی غیبت جائز ہے اسی طرح قاضی کے یہاں بیان کرنا بھی جائز ہے اور مفتی اور قاضی میں فرق یہ ہے کہ مفتی کا جواب تو جملہ شرطیہ ہوتا ہے کہ اگر یہ واقع صحیح ہے تو اس کا حکم یہ ہے اور قاضی کا فیصلہ جملہ انشائیہ ہوتا ہے کہ اس معاملہ کی صورت اس طرح ہو جانا چاہیئے اسی لئے مفتی صرف ایک شخص کے بیان پر فتویٰ دے سکتا ہے اور قاضی ایک شخص کے بیان پر فیصلہ نہیں کرسکتا بلکہ اس کو دونوں طرف کا بیان سننا ضروری ہے پھر شہادت و حلف کے بعد فیصلہ کرے قاضی یا سلطان کو یہ جائز نہیں ہے کہ صرف مدعی کا بیان سن کر فیصلہ کرنے لگے جب تک کہ مدعی عایہ سے دریافت نہ کرے یک طرفہ بیان سن کر قاضی وسلطان کو قضیہ شرطیہ کے ارادہ سے بھی حکم بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں احد الفریقین کی حمایت ظاہر ہوگی اور قاضی وسلطان کو فریقین میں تسویہ کا حکم ہے بخلاف مفتی کے کہ اس کو ایک شخص کا بیان سن کر بھی فتویٰ دے دینا جائز ہے کیونکہ اس کا فتویٰ واقعہ کا فیصلہ نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر واقعہ یوں ہی ہے تو مسئلہ یہ ہے اور اگر یوں نہیں تو جواب دوسرا ہے آج کل لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ مفتی کے فتویٰ کو فیصلہ سمجھتے ہیں اور جب ایک واقعہ میں دو شخص استفتاء کرتے ہیں اور جواب مختلف دیا جاتا ہے تو علماء کو بدنام کرتے ہیں کہ اس کو کچھ جواب دیا اس کو کچھ جواب دے دیا اور یہ نہیں دیکھتے کہ سوال کرنے والوں نے سوال مختلف کیا ہے اور مفتی کا جواب جملہ شرطیہ ہوتا ہے تو دو سوال کے بدلنے سے ضرور بدلے گا اور ہر سوال کا جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ واقعہ یہ ہے کہ تو جواب یہ ہے اور دوسری طرف واقعہ ہے تو جواب دوسری طرح ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ امتحان

اب تمہیں واقعہ کی تحقیق کرنا چاہیئے اور یہیں سے آپ کو حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ کی ایک لطیف تفسیر معلوم ہو جائے گی جو قرآن میں مذکور ہے اِنَّ ھٰذَآ اَخِیْ. لَہٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَۃً وَّلِیَ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ. (یہ شخص میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے) جس کے متعلق واعظوں نے ایک بڑا طومار اختراع کیا ہے اور یا کا

قصہ بیان کیا ہے سو خوب سن لیجئے کہ تفسیر قرآن میں اس واقعہ کا کچھ دخل نہیں بلکہ وہ قصہ ظاہر اً شان نبوت کے بھی خلاف ہے اسی لئے محققین نے اس کو رد کر دیا ہے اور اس کو اسرائیلیات میں سے کہا ہے اس آیت میں جو حضرت داؤد کا امتحان مذکور ہے اس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ ان کے پاس دو شخص مدعی و مدعی علیہ بن کر آئے ایک نے دعویٰ کیا کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے یہ میری دنبی چھین کر اپنے پاس سو پوری کرنا چاہتا ہے حضرت داؤد علیہ السلام نے صرف مدعی کا بیان سن کر یہ فرمایا اس نے تجھ پر ظلم کیا اور واقعی اکثر شرکاء کی یہی حالت ہے کہ زبردست کمزور کو دبانا چاہتا ہے اگرچہ حضرت داؤد نے یہ کلام بطور جملہ شرطیہ کے فرمایا تھا۔ فیصلہ کے طور پر نہیں فرمایا تھا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر یہ بیان صحیح ہے تو تجھ پر ظلم ہوا مگر چونکہ صورۃ وہ جملہ حملیہ ہے شرط نہیں اور شرطیہ بھی ہوتا تب بھی مجلس قضاء کے مناسب نہ تھا بلکہ اول مدعی علیہ سے دریافت فرماتے پھر شہادت یا حلف کے بعد فیصلہ فرماتے مگر اس لغزش پر بہت جلد تنبیہ ہوئی اور سجدہ میں گر پڑے ۔ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ (داؤد علیہ السلام کو خیال آیا کہ ہم نے ان کا امتحان کیا ہے) (اور منشاء اس لغزش کا ایسا امر تھا جس میں ان مرافعہ کرنے والوں کی بھی غلطی کو دخل تھا وہ یہ کہ ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے یہ مرافعہ بر سر اجلاس نہیں کیا بلکہ ایسے دن اور ایسے موقع پر مرافعہ کیا کہ اس دن اور اس موقع پر حضرت داؤد علیہ السلام فصل مقدمات کے عادی نہ تھے کیونکہ یہ دن ان کی عبادت کا تھا جس میں وہ مقدمات کا فیصلہ نہ کرتے تھے اور یہ موقعہ اجلاس کا موقعہ تھا بلکہ عبادت گاہ تھی جس کے دروازے بند تھے مدعی اور مدعی علیہ دیوار سے پھاند کر آئے داؤد علیہ السلام کو ان کے اس طرح بے قاعدہ آنے سے وحشت و پریشانی بھی ہوئی ۔ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ (اور بھلا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مقدمہ کی خبر پہنچی ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے جبکہ وہ لوگ (داؤد علیہ السلام کے) عبادت خانہ کی دیوار پھاند کر ان کے پاس آئے تو وہ گھبرا گئے وہ لوگ کہنے لگے گھبراؤ نہیں) ان تمام امور کے اجتماع سے یہ اثر ہوا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کے ساتھ اس طرح گفتگو فرمائی جس طرح نجی ملاقات میں گفتگو کیا کرتے ہیں چونکہ اجلاس و فصل مقدمات کا نہ یہ موقعہ تھا نہ دن تھا نہ اہل مقدمات اس طرح آیا کرتے تھے اس لئے آپ سے لغزش ہوگئی گفتگو میں ان قواعد کا استحضار نہ تھا جو فصل مقدمات اور اجلاس کے وقت ضروری ہوتے ہیں پس ہر چند کہ حضرت داؤد علیہ السلام اس معاملہ میں امور مذکورہ بالا کی وجہ سے معذور

بھی تھے مگر انبیاء علیہم السلام کی بڑی شان ہے ان کو ایسے عوارض کی وجہ سے بھی احکام میں ذہول نہ ہونا چاہئے اس لئے فوراً تنبہ ہوا کہ مجھ سے لغزش ہوئی اور اس سے استغفار وتوبہ کیا۔

حضرات مجتہدین کا خوف الٰہی

اسی کی نظیر ایک اور واقعہ ہے جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا اور جس کو اپنے وصال کے وقت حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ خداوندا! میں نے اپنے زمانہ قضا میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے خلاف حق فیصلہ نہیں کیا نہ کسی فریق کی رعایت کی ہے ہمیشہ حق کی حمایت کی ہے مگر ایک بار مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ خلیفہ ہارون الرشید کا مقدمہ ایک یہودی کے ساتھ ساتھ اس وقت میں نے خلیفہ کو اپنی مسند پر بٹھلایا اور خود یہودی کے برابر بیٹھا حالانکہ مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا پھر فیصلہ میں ڈگری میں نے یہودی ہی کو دی مگر فریقین کی نشست میں جو مساوات لازم تھی اس میں مجھ سے غلطی ہوگئی اس گناہ سے میں توبہ واستغفار کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں پھر امام ابو یوسف بہت روئے اور اس لغزش پر بہت اہتمام سے بار بار استغفار کیا اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ حضرات مجتہدین خدا تعالیٰ سے کس قدر خائف تھے اور وہ اتباع احکام کا کس درجہ اہتمام کرتے تھے تو کیا ان حضرات کے متعلق یہ وسوسہ ہو سکتا ہے کہ وہ قصداً قرآن وحدیث پر قیاس کو اور اپنی رائے کو مقدم کریں گے اور اپنی رائے کے مقابلہ میں نصوص شریعت کو چھوڑ دیں گے جو لوگ ان کی شان میں ایسی سخت بات کہتے ہیں وہ اپنی عاقبت کی خیر منائیں۔ سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ (اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے یہ بہت بڑا بہتان ہے)

صاحبو! جب ایک فقیہ کو اپنی خفیف لغزش پر جس میں بظاہر انہوں نے فریقین کے درمیان احترام میں مساوات کی بھی بہت کچھ رعایت کر لی تھی کہ خلیفہ کو اپنی مسند پر بٹھلا کر خود دوسرے فریق کے برابر بیٹھے اس قدر ہیبت تھی تو قیاس کر لیجئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر کیا حالت گزری ہوگی بس یہ حاصل تھا ان کے امتحان کا جس کو نہ معلوم مفسرین نے اسرائیلیات سے کس قدر رنگا ہے اسی لئے ہر تفسیر معتبر نہیں۔ یہ ایک ضروری مضمون تھا جو قاضی اور مفتی کے اندر فرق بیان کرنے میں استطراداً ذکر ہو گیا میں یہ کہہ رہا تھا کہ استفتاء کی غرض سے قاضی اور مفتی کے سامنے کسی کی شکایت کرنا پڑے تو یہ غیبت محرمہ میں داخل نہیں بلکہ اس کی اجازت ہے اب بحمد اللہ ان اعمال کے متعلق جن میں آج کل ابتلاء زیادہ ہے احکام ومعالجات کی کافی تفصیل ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بدگمانی اور تجسس غیبت ہی کے مقدمات ہیں ان سے احتراز کرنا چاہئے تاکہ غیبت کی نوبت ہی نہ آئے۔

تجسس کے بعد افراد دقیق ہیں

اب میں تجسس کے بعد افراد کا ذکر کر کے بیان ختم کرتا ہوں اور اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ تجسس کے بعض افراد دقیق ہیں چنانچہ تجسس کا ایک فرد یہ ہے کہ دو آدمی باتیں کر رہے ہوں اور ایک آدمی آڑ میں اس طرح بیٹھا ہو کہ ان کو اس کے موجود ہونے کی اطلاع نہ ہو تو اس طرح آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے اس کو اگر آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہئے کہ میں بیٹھا ہوا ہوں یا اس کے سامنے سونے لیٹ گیا ہو اور دوسروں کو یہ خیال ہو کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں مگر یہ جاگ رہا ہے تو اس کو چاہئے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ میں جاگ رہا ہوں۔ البتہ اگر وہ لوگ اس کے متعلق باتیں کر رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں تو تجسس کے ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے نیز اگر دو شخص آپس میں انگریزی یا عربی میں گفتگو کر رہے ہوں اور تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہو مگر ان دونوں کو خبر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ان دونوں کو مطلع کر دے کہ میں انگریزی یا عربی سمجھتا ہوں کانپور میں ایک جنٹلمین میرے پاس آئے اور بچہ کی تعلیم کے لئے معلم کی درخواست کی میرے سامنے اس وقت ایک طالب علم تھے ان سے اس کے متعلق عربی میں گفتگو کرنے لگا تو وہ جنٹلمین کہنے لگے کہ شاید آپ عربی میں مجھے اخفاء کے لئے گفتگو کر رہے ہیں لیکن میں عربی سمجھتا ہوں اس لئے اگر ارشاد ہو میں دوسری جگہ بیٹھ جاؤں اس شخص کی تہذیب پر مجھے حسرت ہوئی اور اب میں اپنی حرکت سے اتنا شرمندہ ہوا کہ میرے اوپر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کی تہذیب کا میرے اوپر خاص اثر ہوا اور اب ایسے مہذب سے اخفا کی ضرورت نہیں۔

صاحبو! بعض لوگوں کا باطن اچھا ہوتا اور ظاہر خراب ہوتا ہے جیسا اس شخص کا رنگ تھا اسی بناء پر جس وقت حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے مولانا فیض الحسن صاحب کی شکایت کی کہ وہ دل لگی بہت کرتے ہیں یوں فرمایا کہ مولوی فیض الحسن صاحب کا ظاہر خراب ہے مگر باطن اچھا ہے اور ہم لوگوں کا ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب ہے اسی طرح اس جنٹلمین کا ظاہر خراب تھا مگر باطن اچھا تھا اور اس شخص کے واقعہ میں جس طرح اس کی ایک خوابی ظاہر ہوئی اسی طرح مجھ سے ایک غلطی واقع ہوئی وہ یہ کہ حدیث میں وارد ہے کہ تین شخصوں میں دو کو جائز نہیں کہ وہ تیسرے سے الگ ہو کر باتیں کرنے لگیں اس کو شبہ ہو کہ شاید میرے متعلق باتیں کر رہے ہیں اس سے رنج ہوگا یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی ہاں چار ہوں تو پھر جائز ہے کہ دو الگ باتیں کریں اور دو الگ اس میں کسی کی دل شکنی نہ ہوگی اور اگر اس صورت میں کسی ایک کو شبہ ہو کہ شاید یہ دو آدمی مجھ سے

اخفا کرتے ہیں تو اپنے دل کو سمجھالے کہ شاید اس دوسرے سے اخفا کرتے ہوں گے اسی طرح اگر دوسرے کو شبہ ہو وہ بھی یہی سمجھ لے جیسے فقہاء نے غلبہ کے بارے میں کہا کہ اس میں بیل پیشاب کردیں تو تقسیم کے بعد سب پاک ہیں یہاں تقسیم کو مطہر کہا گیا ہے حالانکہ اصل میں مجوز ضرورت ہے مگر عوام کو مطمئن کرنے کے لئے فقہاء نے اس عنوان سے فرمادیا کہ تم یہ مت سمجھو کہ پیشاب کا حصہ تمہارے پاس آیا کیوں کہ ممکن ہے شاید تمہارے ساتھی کے پاس گیا ہو اسی طرح دوسرا بھی یہی سمجھ لے تسلی کے واسطے یہ بات کافی ہے گو حقیقت میں یہ کوئی دلیل نہیں مگر بعض دفعہ دلیل سے تسلی نہیں ہوتی اور معمولی بات سے تسلی ہو جاتی ہے جیسے ایک استاد کو طالب علم نے الکلمة لفظ وضع لمعنی مفرد میں تنگ کر رکھا تھا کہ لام تو جر کرتا ہے پھر لمعنی میں فتح کیوں ہے کسرہ ہونا چاہئے۔ استاد سمجھا رہا تھا مگر شاگرد کا اطمینان نہ ہوتا تھا کہ ایک دوسرے عالم تشریف لے آئے انہوں نے طالب علم سے کہا کہ لام لفظوں میں جر کرتا ہے یا معنی میں اس نے کہا لفظوں میں کہا پھر یہ تو معنی ہے اس پر جر کیوں ہو بس اس سے طالب علم کی تسلی ہو گئی حالانکہ یہ کوئی دلیل نہ تھی بلکہ واقع میں غلط ہے اسی طرح ایک طالب علم کو استاد نے بتلایا کہ ضرب میں ضمیر مستتر ہے اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ضمیر مستتر کہاں ہے آخر کبھی تو اس کو ظاہر ہونا چاہئے جب بہت پریشان ہوا تو اس نے ضرب کو چھیلنا شروع کیا اتفاق سے اسی کے مقابل دوسرے ورق پر لکھا تھا بڑا خوش ہوا کہ استاد نے ٹھیک کہا تھا، واقعی اس کے اندر پوشیدہ تھا جو چھیلنے سے نکلا۔ خیر یہ تو لطائف تھے، مقصود یہ ہے کہ جس گرانی اور ایذا رسانی کے احتمال سے ایسی تناجی سے روکا گیا ہے چار آدمی ہونے سے وہ گرانی نہیں رہتی کیونکہ شبہ ہونے سے ایک صورت تسلی کی موجود ہے شریعت میں اس گرانی کا سخت انتظام کیا گیا ہے اسی لئے استیذان کا حکم ہے کہ بدون اجازت کے کسی کے گھر میں یا خلوت گاہ میں داخل نہ ہو کیونکہ اس سے گرانی کلفت ہوتی ہے اور استیذان کا طریقہ یہ ہے کہ اول باہر کھڑا ہو کر سلام کرے پھر اجازت مانگے۔ السلام علیکم أ أدخل۔ (السلام علیکم کیا میں اندر آسکتا ہوں؟) کہے خواہ عربی میں یا اردو میں خواہ دلی کی زبان میں یا لکھنؤ کی زبان میں مگر سلام کے الفاظ شریعت کے خلاف نہ ہوں جیسے بعض جگہ سلام کی جگہ آداب و تسلیمات کا رواج ہے ایک شخص نے لطیفہ کیا کہ ایک مجلس میں جا کر کہا میرا بھی سجدہ قبول ہو لوگوں نے کہا یہ کیا واہیات ہے کہا حضور ہر آنے والا شخص مختلف الفاظ سے سلام کر رہا ہے کوئی آداب قبول ہو کہتا ہے کوئی بندگی کوئی کورنشات کوئی کچھ حتیٰ کہ سب صیغہ ختم ہو گئے میں نے سوچا کہ اب میں کیا کہوں تو میرے نزدیک سجدہ کے سوا کوئی باقی نہ تھا اس لئے میں نے اسی کو اختیار کیا پس سلام میں خلاف شرع الفاظ استعمال نہ کرنا چاہئے وہاں اجازت حاصل کرنے کے لئے جو الفاظ چاہو کہو اختیار کرو مگر ایسا لفظ جس سے دوسرے کو معلوم ہو جائے کہ اجازت مانگ رہا ہے۔

مسئلہ استیذان

اور یہ استیذان کا حکم زنانہ مکان ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مردانہ مکان میں بھی اگر قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ یہ وقت اس شخص کی خلوت کا ہے مثلاً پردے پڑے ہوں یا اور کوئی علامت ہو مثلاً دوپہر کو لیٹ گیا ہو تو لیٹ جانا بھی خلوت کی علامت ہے اس وقت اس کے پاس نہ جانا چاہئے کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے گو کوئی بزرگ اپنے اخلاق کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ کہیں چنانچہ تھانہ بھون میں جب حضرت حاجی صاحب کا قیام تھا تو بعض لوگ دوپہر کو حاجی صاحب کے پاس آکر بیٹھ جاتے حاجی صاحب بھی اخلاق کی وجہ سے بیٹھے رہتے حضرت حاجی ضامن صاحب کو اطلاع ہوئی ان کی عادت میں سختی تھی وہ ایسے روگ نہیں پالتے تھے فوراً تشریف لائے اور ان لوگوں کو دھمکایا کہ تم لوگ راتوں کو تو بیوی کی بغل میں سوتے ہو اور آٹھ نو بجے جاگتے ہو پھر دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کو بزرگوں کی نیند حرام کرنے آتے ہو تم کو شرم نہیں آتی یہ اللہ والے راتوں کو جاگتے ہیں دوپہر کو تھوڑی دیر آنکھ لگا لیتے ہیں یہی وقت تم برباد کرنے آتے ہو جاؤ اپنا راستہ لو خبردار اس وقت کبھی نہ آنا حافظ صاحب نے اس کا انتظام کر دیا ورنہ حاجی صاحب کے ایسے اخلاق تھے کہ وہ اپنی زبان سے اپنے نفس کے لئے کبھی کسی کو کچھ نہ کہا کرتے تھے بلکہ میں مکہ معظمہ میں دیکھا ہے کہ بعض لوگ دوپہر کو آئے ہیں اور حاجی صاحب ان کی خاطر سے بیٹھے رہے آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہے مگر دوسروں کے لحاظ سے بیٹھے ہیں ایک دفعہ کسی خادم نے لوگوں کو اشارہ سے متنبہ کیا کہ حضرت کو نیند آ رہی ہے اسی وقت آپ تشریف لے جائیں حضرت نے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا خادم کو ڈانٹا اور فرمایا کہ یہ لوگ محض حسن ظن سے میرے پاس آتے ہیں ورنہ مجھ میں کچھ کمال نہیں نہ دنیا کا نہ دین کا کیا عجب ہے کہ ان کی قدم کی برکت سے میری مغفرت ہو جائے اور تم ان کو آنے سے روکتے ہو اس وقت معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کی اس میں کیا نیت ہے مگر یہ بزرگوں کے اخلاق کا تو کمال ہے لیکن تم کو ایسا کرنا جائز نہیں کہ ان کو تکلیف دو اول تو اس سے تکلیف بھی ضرور ہوتی ہے دوسرے یہ دعویٰ محبت کے بھی تو خلاف ہے اور اگر اہل اللہ اپنی تکلیف ظاہر نہ کریں تو یہ مت سمجھو کہ ان کو تو اذیت نہیں پھر ہم کو بھی گناہ نہیں ہوتا یاد رکھو کہ عدم اظہار اور عدم ایذاء کو مستلزم نہیں رہا یہ کہ اگر ان کو تکلیف ہوئی بھی ہو وہ معاف کر دیتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ شاید اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔

حکایت حضرت مرزا جانجاناں مظہرؒ

حضرت مولانا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ اخیر عمر میں کسی سے نہ ملتے تھے لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت بہت لوگ مشتاق ہو کر آتے ہیں اور محروم بناتے ہیں فرمایا

میں کیا کروں لوگوں کی بدتمیزی سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان سے مواخذہ فرماتے ہیں میں نے بار بار عرض کیا کہ میں نے سب کو معاف کیا میری وجہ سے کسی مسلمان سے مواخذہ نہ فرمایا جائے مگر یہ دعا قبول نہیں ہوتی اس لئے اب میں نے امت محمدیہؐ کے حال پر رحم کر کے ملنا ہی ترک کر دیا۔ تاکہ میری وجہ سے کوئی مسلمان گرفتار وبال نہ ہو اور اس میں راز یہ ہے کہ حقوق العباد میں حق اللہ بھی شامل ہے کیونکہ یہ حقوق بھی تو اللہ تعالیٰ ہی مقرر فرماتے ہیں تو جو شخص حقوق العباد کو ضائع کرتا ہے وہ حق اللہ کو بھی ضائع کرتا ہے تو ممکن ہے کہ کسی وقت بندہ اپنا حق معاف کر دے اور اللہ معاف نہ فرمائیں اب میں کہاں تک ان امور کی تفصیل کروں جن سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔

رسالہ آداب المعاشرت

بس میں اپنے ایک مختصر رسالہ کا پتہ دیتا ہوں جس کا نام آداب المعاشرت ہے اس کا مطالعہ کیجئے گو جزئیات کا احاطہ تو اس میں بھی نہیں مگر ایک معتدبہ مقدار موجود ہے اور قواعد کلیہ ایسے بیان کئے گئے ہیں کہ ان کو مستحضر رکھا جائے تو ہر بات کے متعلق یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایذا رساں ہے یا نہیں اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم کو تسلیم اور علم کی توفیق عطا فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد وعلی اله واصحابه اجمعین واخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

علاج الکبر

حضرت حکیم الامت نے یہ وعظ ۲۳ صفر ۱۳۲۸ھ کو تھانہ بھون میں اپنے مکان پر ایک گھنٹہ ۷ منٹ بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

علاج کبر اور کبر پر وعید۔ رسوم شادی وغیرہ کا منشا کبر ہے جہیز، ولیمہ، عقیقہ کے منکرات اور رسوم مروجہ کی اصل کا بیان۔ جب کوئی کام کرے تو سوچ لے کہ قیامت میں اس کے متعلق باز پرس نہ ہوگی۔ اور جو کام ایسے ہو گئے ہوں، ان سے توبہ کرے۔

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمْ.

اَمَّا بَعْدُ: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجاثیہ:۳۷)

(اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست حکمت والا ہے)

کبر ام المعاصی ہے

اس آیت میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے خاص اپنی ایک صفت بیان فرمائی ہے کہ اگر اس کو انسان نظر میں رکھے تو کل مفاسد اس سے الگ رہیں۔ خلاصہ اس کا معرفت تعلق انسانی ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ظاہر ہے تعلق امر نسبتی ہے جو طرفین کو چاہتا ہے ایک طرف حق تعالیٰ ایک طرف بندہ۔ تو اس کے تعلق کے پہچاننے کا طریق دو معرفتوں کا جمع کرنا ہے۔ معرفت حق تعالیٰ کی اور معرفت اپنے نفس کی اور ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ تلازم بھی ہے اگر حق تعالیٰ کو پہچان لیا جائے تو نفس کی پہچان ہو جائے گی اور اگر نفس کا علم ہو جائے تو معرفت حق تعالیٰ ہو جائے گی۔ اسی واسطے کہا گیا ہے۔ من عرف نفسه فقد عرف ربه (جس نے اپنی حقیقت پہچان لی اس نے پروردگار کو جان لیا) اور پہلی معرفت دوسری معرفت سے اس لئے اہم ہے کہ نفس تو حاضر ہے اور اللہ غائب اور غائب کا پہچاننا مشکل ہے حاضر سے اس اہمیت کے سبب اس آیت میں اسی کی تعلیم کی گئی ہے کہ اس میں اپنی ایک صفت ذکر فرمائی کہ اس صفت سے پہچانیں

اور وہ صفت کبریا ہے جو تمام صفات کے درجہ کمال کو شامل ہے اور معنی اس کے بڑائی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ اور جب یہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو دوسرے میں نہ ہونی چاہئے اور بندے میں اس کی بالکل نفی ہونی چاہئے سو جب تک یہ معرفت محفوظ رہے گی حاشا وکلاء جو کوئی مفسدہ بھی ہونے پائے اور جب یہ معرفت نہ رہے گی اور بندہ صفت کبریا کو اپنے اندر لینا چاہے گا تو جو کچھ بھی مضرتیں اور عیوب پیدا ہوں کم ہیں۔

کبر تمام مفاسد کی جڑ ہے

اور واقع میں یہی ایک صفت کبر ہے کہ جڑ ہے تمام مفاسد کی حتیٰ کہ شرک کی۔ دنیا میں جو کوئی بھی کافر ہوا ہے وہ کافر نہیں ہوا مگر اپنے نفس کے کبر سے ورنہ حق مخفی نہیں رہتا۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ الاية. ظلم اور علو کو سبب فرمایا ہے جحد کا علو اور کبر ہم معنی ہیں ابو طالب کو ایمان سے کس نے روکا صرف عار نے یوں کہا کہ مرتے وقت ایمان لاؤں گا تو قوم میری کہے گی ابو طالب دوزخ سے ڈر گیا۔ اس کی حقیقت تو یہی ہے کہ رفعت قوم پر حاصل ہے وہ نہ رہے گی اس رفعت نے پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ کام تمام ہی کر دیا۔

اور کبر کا وجود کسی ایک گروہ میں نہیں بلکہ یہ وہ عام مرض ہے کہ کم و بیش ہر طبقہ کے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور دوسرے عیوب میں تو اکثر جاہل لوگ پھنسے ہوتے ہیں تعلیم یافتوں میں وہ عیب کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کے برے نتائج کو جانتے ہیں لیکن اس میں جاہل عالم سب کم و بیش مبتلا ہیں مشرکین عرب تو جاہل تھے۔ اب اس گروہ کو دیکھئے جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا۔ یعنی اہل کتاب ان کو بھی ایمان لانے میں حارج ہوا سو وہی کبر۔

کفر و شرک کا مبنیٰ

اس مختصر بیان سے بقدر کفایت اس کی توضیح ہو گئی کہ کفر و شرک کا مبنیٰ ہمیشہ کبر ہے۔ اب غور کر کے دیکھئے تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا اور بہت سے معاصی کا مبنیٰ بھی کبر ہی ہے جو کفر و شرک سے نیچے ہیں۔ ایسے گناہ کبر سے اس طرح ہوتے ہیں کہ گنہگار اپنے برے عمل کو صرف اس عار کی وجہ سے نہیں چھوڑتا کہ لوگ کہیں گے کیا اتنے روز سے یہ احمق رہا اس کام کو ہمیشہ سے کیوں کرتا رہا جواب چھوڑنا پڑا۔ اس شخص نے عیب حماقت سے اپنے نفس کو بچایا۔ یہی کبر بڑا مرض ہے اور علاج بالضد ہوا کرتا ہے۔ یہ مرض پیدا ہوا عدم معرفت کبریا حق سے تو علاج معرفت کبریا حق ہو گا یعنی عظمت حق تعالیٰ کی اس کو حق تعالیٰ نے آیت میں بلفظ حصر اپنے واسطے ثابت کیا ہے۔

عظمت صرف حق تعالیٰ کیلئے مخصوص ہے

ولہ الکبریاء یعنی اسی کے واسطے ہے عظمت۔ بلاغت کے قاعدے سے لہ کو مقدم کرنے کا یہی مطلب ہے کہ عظمت مخصوص ہے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ یہ صفت دوسرے میں بالکل نہیں ہو سکتی نیز یہ نہیں فرمایا ولہ الکبریاء العظمی کہ بڑی عظمت تو حق تعالیٰ کے لئے ہے اور چھوٹا موٹا کوئی حصہ اس کا دوسرے کے لئے بھی ثابت ہے بلکہ مطلق کبریاء کو دوسرے سے نفی کر دیا۔ اسی کو حدیث میں اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

العظمة ازاری والکبریاء ردائی فمن نازعنی فیهما قصمتم. (مسند احمد ۲: ۴۱۴)

یعنی عظمت میرا تہبند ہے اور کبریاء میری چادر ہے جو کوئی ان دونوں کو مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ چادر اور تہبند فرمانا کنایہ ہے۔ خصوصیت سے معنی یہ ہوئے کہ یہ دونوں صفتیں خاص ہیں۔ میرے ساتھ دوسری کوئی مدعی ہوگا تو میں اس کو سزا دوں گا جب کبریا حق ہوا باری تعالیٰ کا تو اپنے نفس میں اس کا رکھنا مساوات ہوئی باری تعالیٰ کے ساتھ اور دیگر معاصی کے لئے تو حدود ہیں کہ جب تک ان تک نہ پہنچے معصیت نہیں ہوتی۔ مثلاً کھانا کہ اتنا زیادہ نہ ہو کہ موجب ہو جائے مرض کا اس وقت تک مباح ہے یا بھوکا رہنا کہ جب تک سبب نہ ہو جائے ہلاکت کا جائز ہے مگر کبر وہ معصیت ہے کہ اس کیلئے کوئی حد نہیں بلکہ فرماتے ہیں۔

صفت کبر مضاد ایمان ہے

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال ذرة من کبر. (الصحیح المسلم کتاب الایمان باب: ۳۹)

یعنی جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا۔ بلکہ ایک حدیث میں اس سے بھی زیادہ تشدد ہے۔

اخرجوا من النار من کان فی قلبه مثقال ذرة من ایمان. (اتحاف السادة المتقین ۱: ۱۳۹)

یعنی قیامت کے دن حکم ہوگا کہ جس کے دل میں ایک ذرہ بھر بھی ایمان ہے اسے دوزخ سے نکالو۔ اس کو پہلی حدیث سے ملایئے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے وہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر کبر جس کے دل میں ہے جنت میں نہ جائے گا۔ یہاں فرماتے ہیں ایک ذرہ بھر بھی ایمان جس کے دل میں ہے جنت میں جائے گا اس سے صاف یہ بات نکلتی ہے کہ ذرہ بھر کبر بھی جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر ایمان نہیں ہو سکتا۔ اور ذرہ بھر ایمان جس دل میں ہے اس میں ذرہ بھر کبر نہیں ہو سکتا

ہے دونوں میں بالکل نقیضیں ہیں۔ گو اس کی توجیہ یہ ہے کہ جنت میں جانے کے وقت ذرہ بھر کبر نہ ہوگا لیکن آخر اس سے بھی تو اس صفت کا مضاد ایمان کسی درجے میں ہونا ثابت ہے۔ اب سمجھ لو کہ کبر کس قدر سخت معصیت ہے اور ہونا ہی چاہئے کیونکہ سب سے بڑا گناہ کفر ہے اور کبر خود اس کی بھی اصل ہے اور کفر اس کی فرع تو مسلمان کو چاہئے غور کیا کرے کہ اس کے دل میں کبر ہے یا نہیں۔

ہماری طاعات اور تکبر

مگر ہماری تو عادت ہوگئی ہے کہ سوچتے ہی نہیں ورنہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نہ دیندار ہمارے لیے خالی ہیں کبر سے نہ دنیا دار خالی ہیں کبر سے تو دیندار کہلاتے ہیں وہ دین کے پیرایہ میں اس میں گرفتار ہیں اور جو دنیا دار ہیں ان کو خبر ہی نہیں کہ کبر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ چنانچہ دیندار لوگ نماز پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا داروں سے اچھے ہیں جتنی ترقی ان کو نماز پڑھنے سے ہوتی ہے اس سے زیادہ تنزل اس پندارے سے ہوتا ہے دین کے ساتھ ساتھ بدترین دنیا ان کے قلب میں جگہ پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ نماز میں جب یہ خرابی ہے تو ان کو چاہئے نماز چھوڑ دیں۔

نماز پڑھنے سے تکبر پیدا ہو اس کا علاج

اصل یہ ہے کہ یہ خرابی نماز میں جب پیدا ہوتی ہے جبکہ حق تعالیٰ کی عظمت قلب میں نہ ہو اور جب عظمت ہو تو دوسری طرف توجہ ہی نہیں ہو سکتی بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اپنی نماز سے آدمی بجائے اس کے انداز سے الٹا شرمندہ ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی بہت بڑے شہنشاہ کے حضور میں ایک نہایت ذلیل آدمی کوئی تحفہ بہت کم قیمت لے جائے دربار کی عظمت و شوکت کو دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوگی۔ مختصر یہ ہے کہ اس ذلیل تحفہ کو پیش کرنے پر بھی اس کو قدرت نہ ہوگی ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور غنیمت سمجھے گا کہ کسی سزا کا حکم نہ ہو جائے جلدی کسی طرح یہاں سے خیریت سے نکل جاؤں۔ ہماری نمازوں کی جو کچھ حقیقت ہے وہ خوب معلوم ہے پھر اس کو حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے سامنے پیش کر کے ذرا شرم بھی نہ آنا اسی وجہ سے ہے کہ عظمت و جلال حق تعالیٰ سے ہم نے قطع نظر کر لی ہے۔ اور اسی سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ دوسری طرف توجہ ہوئی اور اپنی نماز کو کچھ سمجھ کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ نماز پڑھنے یا اور دین کے احکام بجالانے سے اگر دل میں کبر پیدا ہو تو اس کا علاج یہ نہیں کہ اس عمل کو چھوڑ دیا جاوے بلکہ جو سبب ہے اس کو قطع کیا جائے۔ سبب اس کبر کا تعمیل حکم دین نہیں بلکہ عظمت الٰہی کا دل میں نہ ہونا ہے سو اس کو پیدا کرنا چاہئے اس سے تعمیل حکم بھی ہوگی اور وہ خرابی جو اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ بھی نہ رہے گی۔ اس غلطی میں بہت سے پڑھے لکھے اور سمجھدار بھی

مبتلا ہیں۔ خوب سمجھ لو۔ غرض ہمارے دیندار بھی کبر میں مبتلا ہیں اور دنیا دار بھی دنیا داروں میں اس طرح کا کبر تو نہیں ہے جو دینداروں میں ہے ہاں دنیا داروں میں اور طریقے کبر کے ہیں۔ وضع میں لباس میں۔ بیاہ شادی میں۔ کبر میں سب گناہوں سے بڑھ کر ایک خرابی اور ہے وہ یہ کہ مسلمان خواہ کسی درجہ کا ہو مگر اس کے دل میں یہ بات ضروری ہے کہ جب کوئی گناہ کر گزرتا ہے کسی ضرورت سے لیکن کرنے کے بعد دل میں چوٹ ضرور لگتی ہے اور پشیمان ہوتا ہے مگر کبر کہ یہ گناہ ساری عمروں میں رہتا ہے اور دل پر صدمہ نہیں ہوتا۔

رسومات بیاہ و شادی میں تفاخر کا منشاء

آپ دیکھتے نہیں کہ بیاہ شادی کی جتنی رسمیں ہیں سب تفاخر ہی پر مبنی ہیں پھر کسی کے دل کو صدمہ تو کیا اور ان سے خوش ہوتے ہیں خاص کر جبکہ ان پر وہ ثمرہ مرتب بھی ہو جائے جس کے واسطے کی جاتی ہیں۔ یعنی علو اور شہرت جبکہ کسی کے یہاں تقریب میں بدنظمی نہ ہو اور کوئی اختلاف پیدا نہ ہو اور خیریت سے اختتام کو پہنچ جائے تو نام ہوتا ہے یوں کہتے ہیں اپنی حیثیت سے زیادہ لگا دیا بڑی ہمت کی پانچ روپے کی اوقات میں کھانا کیا اچھا دیا۔ بارات کیسی بڑھیا لایا۔ اس کو کفر نہ کہئے مگر قریب کفر ضرور ہے دیکھئے شرعی مسئلہ ہے اور کتابوں میں لکھا ہے کہ گناہ کو چھوٹا سمجھنا کفر ہے اس کو سب جانتے ہیں مگر اس کو خاص کر لیا ہے۔

کبر کے ساتھ رضا و فرح قریب کفر کے ہے

معاصی ظاہرہ کے ساتھ کیوں صاحب معاصی قلبیہ میں یہ حکم کیوں جاری نہیں حالانکہ وہ ام المعاصی ہیں پھر کبر کے ساتھ رضا اور فرح قریب کفر بھی نہ ہوگا۔ اب سمجھ لیا آپ نے نام آوری سے خوش ہونا کس درجے کا گناہ ہے۔ رسموں کے متعلق ایک یہ دلیل سیکھ لی ہے مستورات نے۔ آج کل نئے مولوی نکل آئے ہیں اگر یہ بری تھیں تو پہلے کسی مولوی نے کیوں منع نہیں کیا۔ خوب سمجھ لو کہ نصیحت خواہ کیسی ہی معمولی سی ہو دل میں جب ہی جمتی ہے جبکہ توجہ ہو تو یہ کہنا تو غلط ہے کہ کسی مولوی نے منع نہیں کیا۔ مولویوں نے ہمیشہ سے منع کیا ثبوت اس کا یہ ہے کہ انہیں کی کتابیں موجود ہیں جن میں منع لکھا ہے ہاں تم نے ان کے منع کرنے کو سنا نہیں کیونکہ توجہ ہی نہیں تھی اب یہ بات اپنے دل سے گھڑ لی کہ منع نہیں کیا۔ ایک یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رسمیں تو وہ تھیں جو کسی زمانے میں تھیں۔ مثلاً گنگنا باندھنا لبا من سے تاریخ رکھوانا وغیرہ وغیرہ اور اب تو کچھ رسمیں رہی ہی نہیں ان میں کیا کفر و شرک ہے۔

بیبیو! کیا کفر و شرک ہی علت ہے منع ہونے کی کیا تفاخر اور سمعہ اور اسراف علت نہیں ہے۔

آج کل کی رسومات زیادہ خطرناک ہیں

جس شریعت میں کفر و شرک کو برا لکھا ہے کبیرہ گناہ کو بھی برا لکھا ہے زائد سے زائد گوہ اور موت کا سا فرق کہہ لو۔ بلکہ میں کہتا ہوں اس زمانہ کی موجودہ رسمیں ان رسموں سے زیادہ بری ہیں جو چھوٹ گئیں اس واسطے کہ تمہارے ہی قول کے بموجب ان کا مبنیٰ کفر پر تھا اور ان کا مبنیٰ اس چیز پر ہے کہ وہ کفر کی بھی جڑ ہے یعنی کبر پہلی رسمیں کفر تھیں لیکن حظ نفس سے خالی تھیں ان کے ترک میں نفس مزاحم نہ تھا کیونکہ ان میں حظ نہیں تھا اور رسوم موجودہ میں حظ نفس ہے ان سے تنبہ ہونے کی امید نہیں۔ سمجھ لو کہ کفر و شرک میں حظ نفس نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ نفس کو سب سے زیادہ ناگوار کسی کے سامنے لچنا ہے تو جو شخص مشرک ہے اس کو بہت سوں کے سامنے لچنا پڑتا ہے۔ تو اس میں حظ کہاں جہالت وغیرہ اور داعی ان کو ہو جاتے ہیں ورنہ نفس کے وہ رسوم خلاف ہیں علیٰ ہذا یہ سمجھنا کہ آج کل کی رسمیں کچھ رسمیں ہی نہیں ہیں اور زیادہ خطرناک ہے کیونکہ جس گناہ کو آدمی گناہ نہ سمجھے اس سے توبہ کی کیا امید ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ نام ندم یعنی پشیمانی کا ہے اور پشیمانی اسی چیز سے ہوا کرتی ہے جس کی کچھ برائی دل میں ہو۔ جب ان رسموں کی برائی ہی دل میں نہیں ہے تو پشیمانی کیوں ہوگی اور جب پشیمانی نہیں تو اس سے توبہ کیسی بعض رسموں کی نسبت یہ کہہ دیتی ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جیسے جہیز دینا بچوں کو کرتا ٹوپی دینا ولیمہ یا عقیقہ بہ ہیئت مروجہ کرنا۔ میں پوچھتا ہوں نماز پڑھنا کیسا فعل ہے ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ فعل مستحسن ہے اس میں فرض بھی ہے اور واجب بھی ہے اور سنت بھی ہے کم از کم مستحب تو ہے ہی اب اگر کوئی اس میں ذرا سا تغیر کر کے پڑھے مثلاً قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھے تو یہ بتاؤ یہ نماز کیسی ہے جائز ہے کہ ناجائز اور اگر اس سے منع کریں تو یہ نماز سے منع کرنا کہلائے گا حاشا و کلا۔ یہ نماز سے منع کرنا نہیں۔ بلکہ قبلہ کی طرف پشت کر کے پڑھنے سے منع کرنا ہے۔ نماز سے منع کرنا کیسا نماز کو درست کرنا ہے۔ یہی حال رسموں کا ہے جہیز دینے سے منع نہیں کیا جاتا بلکہ دکھلاوے اور تفاخر اور اسراف سے منع کیا جاتا ہے جہیز اگر اپنی بیٹی کو محبت کی وجہ سے دیا جاتا ہے تو اس میں اس کو کیا دخل ہے کہ برادری کے سامنے ایک ایک عدد دکھا کر گنوا کر دیا جاتا ہے اگر اسی کا نام محبت ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی بیٹی سے شادی ہی کی تاریخ میں محبت ہوئی اس سے پہلے نہ تھی کیونکہ پہلے کی عادت تو یہ تھی کہ جو کچھ کھلایا پلایا کبھی اس کی تشہیر نہیں کی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ محلے کے دو چار آدمیوں کو بھی جمع کر کے دکھایا ہو کہ لڑکی کے لئے حلوا بنایا ہے یا کوئی کپڑا عمدہ سلوایا ہے بلکہ یہ کوشش رہتی تھی کہ کسی کو خبر بھی نہ پہنچے کہ پیٹ میں پڑ جائے کسی کی نظر نہ لگے اس وقت جو کچھ پیٹ میں پڑ جائے گا کام آئے گا یہ آج نئی محبت کیسے پیدا ہوئی اگر وہ محبت ہے تو یہ محبت نہیں اور اگر یہ محبت ہے تو اس سے پہلے بجائے محبت کے عداوت تھی۔

جہیز دینے کی آسان صورت

بیبیو! ذرا عقل سے کام لو کیا جہیز دینے کی یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ کپڑے برتن وغیرہ جو کچھ سامان دینا ہو صندوق بند کر کے بند بھیج دیئے جائیں اور بند بھیجنے میں بھی یہ ضروری نہیں کہ لڑکی کے ساتھ جاوے کیونکہ اس میں بھی ضرر ہے کہ وہ وہاں فوراً سب کے سامنے کھلے گا وہی ریاء پھر ہوگا بلکہ جب لڑکی میکے میں آوے اس کو دے دو پھر وہ جب چاہے لے جاوے خواہ دفعتاً و تدریجاً مگر اس کو کوئی گوارا نہیں کرتا ہے۔ ہمارے پاس یہ کافی ثبوت ہے اس امر کا کہ تفاخر اور دکھلاوا ہی منظور ہے پھر جہیز میں وہ چیزیں ہوتی ہیں جو کبھی کام نہیں آتیں صرف ضابطہ کی خانہ پوری کر دیتے ہیں چوکی ضرور دی جاتی ہے جس کا ناپ تول ایسے تجویز ہوا کہ کارآمد نہیں نہ اتنی چھوٹی کہ ہر وقت اٹھانے بٹھانے کے قابل ہو اگر چھوٹی ہوتی تو باورچی خانے ہی میں پڑی رہا کرتی اور اتنی بڑی نہیں کہ نماز پڑھ سکیں۔ ایک عجیب دردسر ہے ایک جگہ ڈال دیں اور دیکھا کریں۔ پیڑھی نواڑ کی بنی ہوئی ضرور ہوتی ہے حالانکہ کبھی کام میں نہیں آتی سوائے اس کے کہ ایک طرف احتیاط سے رکھ دی جائے اور گل کر اور ٹوٹ کر ایندھن ہو جائے کیونکہ پیڑھی کا کام تو یہ ہے کہ چولہے کے پاس اس پر بیٹھ سکیں اور جہیز کی پیڑھی اس قدر نازک اور سبک اور تکلف کی ہوتی ہے کہ چولہے کے پاس رکھنے سے جی دکھتا ہے چولہے کے پاس اس واسطے نہیں رکھی جاتی اور کسی کام کی ہے نہیں۔ بتاؤ یہ کون سی عقل کی بات ہے۔ اسی کو التزام مالا یلزم کہتے ہیں جس سے علماء منع کرتے ہیں۔ جہیز کی چیزیں اکثر ایسی ہی ہوتی ہیں جو ایک دفعہ دکھانے کے لئے نئی بنا دی جاتی ہیں اور واقع میں بیکار اور پرانی ہوتی ہیں حتیٰ کہ بازار والے بھی جانتے ہیں جب خریدنے جاؤ تو پوچھتے ہیں گھر کے استعمال کے واسطے چاہئے یا دینے کے لئے محبت اسی کا نام ہے۔ جہیز بڑھیا ہونے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ لڑکے کے سارے خاندان کو جوڑے دیئے جاتے ہیں اور خاندان میں کئی کئی پشت تک کے مرد بھی شمار کیے جاتے ہیں ان کے بھی جوڑے ہوتے ہیں شاید مردوں کو پہنانا منظور ہے لیکن تعجب یہ ہے کہ جوڑے پہننے کے قابل ہوتے بھی نہیں صرف ضابطہ کی خانہ پوری کے لئے کپڑوں کے عدد پورے کر دیئے جاتے ہیں پاجامہ کا کپڑا دیکھئے وہ چھوٹا کرتے کا دیکھئے وہ چھوٹا۔ جن کے یہاں پہنچتے ہیں وہ ان کا پاجامہ کرتا بناتے نہیں کیونکہ بن ہی نہیں سکتا اور کاموں میں لاتے ہیں۔ کیا یہ باتیں عقل کی ہیں۔

نفس ولیمہ اور اس کی حقیقت

یہ حالت تو جہیز کی ہے۔ اب ولیمہ کی سنئے اس پر بہت ہی زور دیا جاتا ہے کہ یہ تو بالیقین سنت ہے۔ سنت کا نام تو سن لیا یہ بھی معلوم ہے کہ سنت کہتے کس کو ہیں سنت نام ہے ماثبت بالسنۃ

کا یعنی وہ فعل جو حدیث سے ثابت ہو۔ ولیمہ بیشک حدیث سے ثابت ہے مگر لا تقربوا الصلوٰۃ کی مثل نہ کرو کہ نفس ولیمہ کا ثبوت تو حدیث سے لے لیا اور اس کی کیفیت جو حدیث میں آئی ہے۔ چھوڑ دی جس طرح کہ نفس ولیمہ ثابت بالحدیث ہونے کی وجہ سے اختیار کرتی ہو اسی طرح اس کی کیفیت اور طریقہ بھی کیوں نہیں اختیار کرتیں اگر وہ ثابت ہے تو یہ بھی ثابت ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ولیمہ کی کیفیت سنئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ صبح کو صحابہ سے فرمایا جو کچھ کھانے کی چیز کسی کے پاس ہو لے آؤ لوگوں کے پاس سفر میں جیسا کچھ توشہ موجود تھا لا کر رکھ دیا کسی کے پاس کھجوریں تھیں کسی کے پاس پنیر تھا کسی کے پاس سوکھی روٹیاں تھیں جو کچھ تھا لا کر رکھ دیا اور سب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھ کر کھالیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ولیمہ تھا۔ ولیمہ کا ثبوت تو سب کو یاد ہے اس کیفیت کا ثبوت کسی کو یاد نہیں۔ کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ یہ حدیث تو فعلی ہے قولی حدیث لیجئے

شر الطعام طعام الولیمۃ یدعی لھا الاغنیاء

ویترک الفقراء (الصحیح المسلم کتاب النکاح: ۱۹۸)

یعنی برا کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں امیروں کو بلایا جائے غریبوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سب ولیمے اچھے ہی نہیں بعضے برے بھی ہوتے ہیں۔ جب برا ہے تو منع کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ آج کل کا ولیمہ ایسا ہی ہوتا ہے اگر کوئی غریب محتاج مانگے تو کہہ دیتے ہیں پہلے جن کے واسطے پکا ہے ان کو تو کھا لینے دو تم کو بعد میں ملے گا۔ اس ولیمہ کی برائی میں نے حدیث سے سنا دی پھر علماء اگر منع کریں تو کیا الزام دوسری حدیث سے سنئے۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن

طعام المتبارئین. (سنن ابی داؤد: ۳۷۵۴)

یعنی منع فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو شخصوں کے کھانے سے جو آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں یعنی بخشا بخشی سے کھلاتے ہوں۔ اب دیکھ لو کہ برادری کے کھانے ایسے ہی ہوتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایک نے گوشت روٹی دیا ہے تو دوسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ بریانی دے تیسرے کی کوشش ہوتی ہے کہ فرنی بھی ہو چوتھا شیر مال اور بڑھاتا ہے۔ حدیث کے بموجب ایک کے یہاں بھی کھانا نہ چاہئے دیکھو یہ ان تقریبوں کی حالت ہے جن کو مسنون بتاتے ہیں۔

طعام الموت کا مفہوم

بزرگوں کا قول ہے طعام المیت یمیت القلب اس کے معنی متعارف اور مشہور تو یہ

ہیں کہ وہ کھانا جو کسی کی موت میں پکا ہو اس تقدیر میں طعام کی اضافت میت کی طرف بہت ہی بعید ملابست سے ہو سکتی ہے میرے نزدیک میت کے معنی عاصی کے لئے جائیں تو زیادہ مناسب ہے۔ یہ استعمال قرآن شریف میں بھی آیا ہے اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو دولت حیات بخشی اب معنی طعام المیت کے یہ ہوں گے وہ کھانا جو گناہ کے طریق پر پکا ہو یعنی اضافۃ الی الفاعل ہو گی۔ اس کھانے میں یہ نحوست ہے کہ دل مرجاتا ہے یعنی حس نہیں رہتی۔ مردہ اور زندہ میں احساس اور عدم احساس ہی کا تو فرق ہوتا ہے۔ جب قلب میں حس نہ رہی تو جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے۔ یہ برکت ہے ان ولیموں اور عقیقوں اور بھاجیوں کی جن کو کہتی ہو یہ رسمیں تھوڑا ہی ہیں۔ انہیں رسم نہ کہو اثم کہہ لو۔

مبنی علی الکبر رسومات

یاد رکھو یہ سب رسمیں ہی ہیں یہ کیا ضرر ہے کہ رسم وہی ہو جو کفر و شرک ہو اگلے زمانے کی رسمیں بڑی رسمیں تھیں۔ یہ ان کے مقابلے میں چھوٹی سہی مگر ہیں تو رسمیں ہی اور ان کو چھوٹا بھی تنزلاً کہتا ہوں ورنہ درحقیقت ان سے کچھ کم نہیں بلکہ من وجہ زیادہ ہی ہیں جیسا ابھی میں نے بیان کیا کہ رسوم متروکہ مبنی علی الکفر تھیں اور یہ مبنی علی الکبر ہیں اور کفر کی بھی جڑ ہے۔ غرض موجودہ رواج بھی سارے کے سارے رسوم ہی ہیں۔ تغافل کی وجہ سے ذہنوں میں سے ان کا قبح جاتا رہا ہے۔ رسمیں سب چھوڑ دینے کے قابل ہیں۔ ان میں جتنی مصلحتیں بتائی جاتی ہیں سب من سمجھوتی ہیں حقیقت میں سب التزام مالا یلتزم ہے۔ اچھے اچھے سمجھدار ان میں بیوقوف بن جاتے ہیں اور پیروی کیے جاتے ہیں بہت سی رسموں کی مصلحت اور وجہ ایجاد معلوم بھی نہیں مگر اسی ہیت کے ساتھ برابر ہوتی ہیں جب کوئی وجہ بھی ان کی ذہن میں نہیں تو تقلید محض ہوئی یا نہیں اور کسی کی تقلید۔ شریعت کی تو درکنار کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی عقلمند کی بھی تقلید ہے۔ حاشا وکلا بس سوائے اس کے نہیں کہ جہلاء کی تقلید ہے اور رسم محض ہے مصلحت کا نام بھی لینا غلط ہے اور غضب یہ ہے کہ بہت سی رسمیں اب بھی برکت حاصل کرنے کے لئے ادا کی جاتی ہیں۔ جب تک فلاں فلاں کام نہ ہوں شادی سزاوار نہیں ہو گی۔ نعوذ باللہ اور انہیں رسموں کی نسبت جن کی بناء تقلید جہلا پر ہے۔ قرآن شریف میں ہے **ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى** اور **افحكم الجاهلية يبغون**. ازواج مطہرات کو حکم ہے کہ جیسا جاہلیت میں بے دھڑک نکلتی تھیں اب نہ نکلو۔ اور بطور انکار فرماتے ہیں کہ جاہلیت کا حکم پسند کرتے ہیں۔

رسومات سے منع کا ثبوت

بہت لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ رسموں کا شریعت میں کہیں ثبوت نہیں تو منع کا بھی ثبوت

کہاں ہے کیا اچھے کپڑے پہننا منع ہے اپنی اولاد کو دینا ناجائز ہے مہمانوں کی خاطر داری بری بات ہے۔ میں کہتا ہوں منع کا ثبوت قرآن سے مذکور ہوا اب حدیث لیجئے ارشاد ہے۔

من لبس ثوب الشهرة البسه الله ثوب الذل يوم القيمه. (مشکوة المصابیح: ۴۳۴۶)

جو کوئی کپڑا دکھاوے کے لئے پہنے گا اس کو قیامت کے دن ذلت کا لباس پہنایا جائے گا۔ یہ حدیث کپڑے کے بارے میں بالکل صریح ہے اور رسوم کو باشتراک علت شامل ہے اس وعید کی علت شہرت ہے جس کام میں شہرت کا قصد کیا جائے سب اس کے اندر آ گئے خواہ اس کو بیٹی کا دینا کہہ لو۔ یا مہمانوں کی خاطر سمجھا کرو۔ جب عقل سے کام لو گی تو حقیقت میں بنا ان رسموں کی صرف دکھلاوے اور التزام مالایلتزم ہی پر پاؤ گی۔

حضرت سیدۃ النساء کی منگنی کا حال

بیبیو! اگر ان رسموں میں بھلائی ہوتی تو دوسروں جہان کے بادشاہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نکاح میں ضرور ہوتیں کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں کہیں کی کمی تھی۔ حق تعالیٰ جو چاہتے دے دیتے۔ آپ کی منگنی کا قصہ میں بیان کرتا ہوں۔ اول یہاں کی منگنی کے خرافات سنئے۔ یہاں شادی سے پہلے اس کے مقدمہ ہی ہیں جس کی حقیقت سوائے زبانی پخت وپز کے کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا کیا کچھ طومار پھیلائے جاتے ہیں اس کا بھی پورا ایک قانون مرتب ہے دور دراز سے سفر کر کے لڑکے والا جائے۔ اپنا وقت ضائع کرے روپیہ برباد کرے اتنے دنوں میں جو کچھ کمایا اس کو سوخت کرے تب اس سے بات قرار پائے یہ بہت اجمال کے ساتھ بیان ہے ورنہ جو جو قیدیں منگنی میں طرفین سے مقرر ہیں سب جانتے ہیں۔ حاصل یہ کہ جو کام دو پیسے کے خط سے نکلتا اس میں صد ہا روپے ضائع کئے جاتے ہیں کیوں صاحب اس میں کیا مصلحت ہے اگر یہ کہو کہ خط پہنچا نہ پہنچا کیا اعتبار ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ خط کو رجسٹری کرا دیا ہوتا یا بیمہ کرا کے بھیجا ہوتا اگر اس میں بھی ضائع ہونے کا احتمال ہے تو یہ احتمال غیر ناشی عن دلیل ہے اور اس کو خبط اور وہم کہتے ہیں۔ ہم جس مکان میں بیٹھے ہیں اس میں ہر وقت امکان عقلی موجود ہے کہ گر جائے لہٰذا چاہئے کہ بھاگیں پھر جس مکان میں جائیں گے وہاں بھی یہی احتمال ہے نتیجہ یہ کہ بھاگ پھریں۔ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور ایسے احتمالات پر اگر حکم کریں تو دنیا کا ایک کام بھی نہ چلے۔ ہزار ہا روپیہ کے نوٹ ڈاک ہی میں بھیجے جاتے ہیں پارسل ڈاک ہی میں جاتے ہیں۔ اگر ضائع ہونے کا خوف ہے تو سب کاموں کے لئے آدمی بھیجا کیجئے۔ غرض منگنی کے لئے اس قدر دردسر کرنے میں مصلحت کچھ بھی نہیں صرف پابندی رسم ہے ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔

ہندوانہ رسومات اوران کا اثر

میں کہتا ہوں اسی میں غور کیا ہوتا کہ ہمیشہ سے کب سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہندوستان میں پہلے مسلمان نہ تھے۔اب دو حال سے خالی نہیں یا تو جب مسلمان ہندوستان میں آئے ان رسموں کو بھی اپنے ساتھ لائے یا یہاں کی رسمیں تھیں مسلمانوں نے بھی لے لی۔شق اول تو غلط ہے کیونکہ اگر یہ رسمیں اسلامی رسمیں ہوتیں تو مسلمانوں کی کتاب میں ہوتیں حالانکہ ایسا نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ شق ثانی ہی صحیح ہے یہ سب رسمیں ہندوؤں کی ہیں انہیں کی صحبت سے مسلمانوں میں بھی آ گئیں۔رسموں کے نام خود بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی ایجاد ہیں مثلاً بری لفظ ہندی ہے بر دولہا کو کہتے ہیں۔اگر کسی اور ملک کی رسم ہوتی تو فارسی یا عربی میں نام ہوتا۔

اسی طرح بھوڑا اٹھیٹھ ہندی لفظ ہے۔عقل صاف کہتی ہے کہ ہندوؤں کی رسمیں ہیں۔ ہندوؤں سے خلط ملط ہونے سے مسلمان بھی سیکھ گئے ہیں

من تشبہ بقوم فھو منھم (سنن ابی داود:۴۰۳۱)

جس نے جس قوم کی مشابہت کی ہے وہ اسی میں سے ہے۔بہت مشہور حدیث ہے مگر تعجب ہے کہ اس کا مصداق صرف کوٹ اور پتلون یعنی انگریزی وضع کو قرار دے رکھا ہے حالانکہ تشبہ عام ہے لباس میں ہو یا رسم ورواج میں۔ایک قصہ مجھ کو یاد آیا ایک بزرگ تھے وہ ہولی کے دن باہر نکلے تو ہندوؤں کی ہر چیز کو رنگین پایا حتیٰ کہ جانوروں کو بھی۔راستے میں ایک گدھا پڑا۔ہنسی میں کہنے لگے تجھ کو کسی نے نہیں رنگا اور یہ کہہ کر ان پر پان کی پیک ڈال دی بعد مرنے کے کسی نے خواب میں دیکھا کہ حال پوچھا فرمایا کہ اس پیک ڈالنے پر مواخذہ ہوا کہ اس کو ہولی کھیلنے والوں کے ساتھ لے جاؤ تشبیہ ایسی چیز ہے۔

سلطان محمود غزنوی کی بت شکنی

محمود بادشاہ نے جب ہندوستان کو فتح کیا اور سومنات کا مندر توڑا تو تمام بت توڑ ڈالے جو بت سب سے بڑا تھا اس کو بھی توڑنا چاہا۔پجاریوں نے بہت الحاح وزاری کی اور کہا اس کے برابر ہم سے سونا لے لیا جائے اور اس کو نہ توڑا جائے۔محمود نے ارکان سے مشورہ کیا سب نے کہا ہم کو فتح ہو چکی ہے اب ایک بت کے چھوڑ دینے سے ہمارا کیا جاتا ہے اس قدر مال ملتا ہے لشکر اسلام کے کام آئے گا چھوڑ دینا چاہئے مجلس میں سید سالار مسعود غازی بھی تھے فرمایا یہ بت فروشی ہے اب تک بادشاہ بت شکن مشہور تھا اب بت فروش کہلائے گا محمود کے دل کو یہ بات لگ گئی مگر گونہ تردد باقی تھا دوپہر کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدان حشر ہے اور ایک فرشتہ ان کو دوزخ کی طرف

یہ کہہ کر کھینچا ہے کہ یہ بت فروش ہے دوسرے فرشتے نے کہا نہیں یہ بت شکن ہے اس کو جنت میں لے جاؤ اتنے میں آنکھ کھل گئی فوراً حکم دیا بت توڑ ڈالا جائے اس کو جو توڑا تمام پیٹ میں جواہرات بھرے ہوئے نکلے حق تعالیٰ کا شکر کیا کہ بت فروشی سے بھی بچا اور جس مال کی طمع میں بت فروشی اختیار کرتا تھا اس سے زیادہ مال بھی مل گیا۔ یہ جنت اور دوزخ کی طرف کھینچا جانا اس تردد کی صورت دکھائی گئی جو محمود کے قلب میں تھا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ بت کو چھوڑ دینا حقیقت میں بت فروشی نہ تھا لیکن صورۃ بت فروشوں کی مشابہت تھی جس کا یہ نتیجہ ہوا خدا پناہ دے مسلمانو! اس میں سب کفار کی رسمیں ہیں مزید برآں مل گیا ہے ان میں تفاخر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور بدعات ظلمات بعضہا فوق بعض تہ بہ تہ تاریکیاں، شر کے اندر شر گھسا ہوا ہے۔ ہاں سنئے بی بی صاحبہ کی منگنی کیونکر ہوئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح مجھ سے کر دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی سے منظور فرما لیا۔ یہ منگنی ہو گئی۔ یہاں کچھ بھی نہ ہو فقط دولہا مجمع میں بول بھی اٹھے تو غضب آ جائے کیسا بے حیا دولہا ہے۔ اب بی بی صاحبہ کے نکاح کی سنئے اور بارات کا سامان سنئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم کو بلا بھیجا اور نکاح پڑھ دیا۔ مواہب لدنیہ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود بھی نہ تھے نکاح ہو جانے کے بعد آپ کو خبر پہنچی تب آپ نے قبول کیا۔ یہ بارات تھی کہ نوشاہ بھی ندارد۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن کو حکم دیا۔ (یہ ایک لونڈی تھیں) کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو علی رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچا آؤ۔ بی بی صاحبہ منہ لپیٹے ہوئے ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر پہنچ گئیں۔ یہ رخصتی ہوئی۔

حضرت سیدۃ النساء کا جہیز

جہیز دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مگر نہ اتنا کہ گھر لٹا دیا نہ کسی کو دکھایا جہیز دینے سے منع نہیں کیا جاتا۔ ہاں جس طرح دیتے ہیں وہ بیشک منع ہے۔ ایک ایک عدد اٹھا اٹھا کر سب کو دکھایا جاتا ہے جوڑوں پر گوٹہ لپیٹا جاتا ہے کہ جو کوئی نہ بھی دیکھتے تو اس کی چمک ہی سے نگاہ اٹھ جائے بیبیو! یہ تو جائز نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں نے آج کل اس کی یہ اصلاح کی ہے کہ جہیز کھول کر دکھاتے اور گنواتے نہیں صندوقوں میں بند کر کے برادری کے سامنے رکھ دیتے ہیں میں کہتا ہوں یہ اس سے بھی بدتر ہے کھول کر دکھانے سے تو ایک حد اور مقدار اس کی ذہنوں میں آ جاتی ہے اسی کے موافق تحسین و آفرین ہوتی ہے اور بند چیز کی نسبت یہی خیال ہوتا ہے کہ خدا جانے کیا کیا کچھ ہوگا اس سے دینے والے کے نفس کو اور زیادہ بڑائی کا موقع ملتا ہے۔ جہیز کو رخصتی کے وقت بالکل بھیجو ہی مت گھر میں

رکھا رہنے دو جب لڑکی کا گھونگھٹ کھل جائے تب لے جاؤ اور اس کے ہاتھ میں فہرست دو اور گنوا دو اور کنجیاں اس کے حوالے کر دو کہ یہ تیرا جہیز ہے یہ طریقہ تو ہے محبت سے دینے کا باقی سب ریاء و نمود ہے۔ یہ طریقہ اس رواج سے بہتر ہے کہ جس کا جہیز ہے اس کو خبر بھی نہیں ہوتی سسرال والوں کو کنجی دے دیجاتی ہے اگر کوئی چیز جاتی آتی رہتی ہے تو تمام عمر کی لڑائی بندھ جاتی ہے اور ایسا ہوا ہے کہ سسرال والوں کی بدنیتی سے یا غفلت سے چیزیں ضائع ہو گئی ہیں۔

بہوڑا کا حال

اب چوتھی اور چالا کی یعنی بہوڑا سنئے نکاح سے اگلے دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا ذرا سا پانی لاؤ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تم بھی ذرا سا پانی لاؤ اور دونوں پر پانی چھڑکا اور دعا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت گھر چلتی پھرتی تھیں۔ یہاں کی طرح بت بنی نہیں بیٹھی تھیں۔ یہاں یہ بھی ایک تکلیف ہے کہ بہو بالکل بت ہوتی ہے حیوان متحرک کی جگہ حیوان غیر ذی حرکت بن جاتی ہے پاخانہ پیشاب کو بھی بلا دوسرے کے نہیں جا سکتی۔ ہنس بول نہیں سکتی۔ سچ مچ کے حبس بے جا میں رکھی جاتی ہے۔ کئی کئی دن پہلے سے کھانا کم کیا جاتا ہے۔ اس خوف سے کہ پاخانہ کی حاجت ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہو ایسی ہونی چاہئے جس کے پیچھے حاجات انسانی نہ ہوں انسانیت سے خارج ہو نہ بولتی ہو گونگی ہو۔ اس حبس بے جا کو یہاں تک بڑھایا ہے کہ بہو نماز بھی نہیں پڑھتی اول تو نمازی ہوتی تو بہت کم ہیں اور جو کوئی نمازی ہوئی بھی تو نماز کے وقت اگر کوئی سہیلی موجود ہے تو دبے دبائے پڑھ لی اور نہیں تو یہ عذر ہے کہ کوئی تھا نہیں کون پڑھواتا۔ اکیلی کس طرح پڑھتی۔ تف ہے اس پردے سے بہت جگہ اس قید سے لڑکیاں بیمار ہو گئی ہیں۔ اور جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ ہم لوگوں نے جو بات اختیار کی ہے افراط وتفریط سے خالی نہیں پردہ ہو تو اتنا گہرا اور نہ ہو تو بالکل نہیں۔ دیور جیٹھ خالہ پھوپھی کے لڑکوں سے بالکل پردہ نہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ الحمو الموت یعنی دیور موت ہے۔ سفر میں جب چلیں گی تو ریل جیسے آسان سفر میں نمازیں قضا صرف اس عذر سے کہ قبلہ معلوم نہ تھا یا وضو کے لئے پانی کہاں سے آتا پانی مانگنے یا قبلہ پوچھنے میں بے پردگی ہوتی ہے کیوں بیبیو! جس گاڑی میں تم بیٹھی ہو اگر اسمیں کوئی حادثہ ہو جائے مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور ڈاکو گھس آئے تو اس وقت بھی نہ بولو گی اس وقت تو وہ دہائی مچاؤ گی کہ قیامت برپا ہو جائے اس وقت پردہ کہاں جائے گا۔ بات یہ ہے کہ وہ دنیاوی حادثات کی تو ہول دل میں ہے اور اخروی حادثے یعنی گناہ

کے انجام کچھ سمجھ میں نہیں جاتے بہت ہلکی اور معمولی چیزیں ہیں یہ خبر ہے کہ گاڑی میں آگ لگنے یا چور ڈاکو کے ہاتھ سے زائد سے زائد جان جاتی رہے گی یہ تھوڑی سی دیر کی تکلیف ہے کہ ہوئی اور گزر گئی اور ایک نماز کے بدلہ ہزاروں برس اس عذاب میں رہنا ہوگا جس کے سامنے دوزخی موت کی تمنا کریں گے۔ بہو بیچاری حیوان غیر حساس کو یہ عذر ہے کہ کوئی پاس نہ تھا نماز کیسے پڑھتی گھر والوں کو اور سب کاموں کے ہوش میں کھانے کھلانے دینے دلانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی ہاں نماز پڑھوائے بیشک خیال نہیں رہتا خوب سمجھ لو کہ ساری گھر والے مجرم ہیں گناہ ایک بہو ہی پر نہیں سب کو سزا ہوگی غرض پردہ میں جہاں افراط ہے وہاں اس حد تک اور جہاں تفریط ہے وہاں بالکل اڑا ہی دیا۔ یہ سب تراشی ہوئی رسمیں ہیں یا نہیں کیا ان کا کوئی ثبوت ہوسکتا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خود اٹھ کر پانی لائیں کسی سہیلی نے لاکر نہیں دیا۔

جہل مرکب اور قلب کی موت

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگلے مولویوں نے کبھی ان رسموں کو نہ ٹوکا ساری نصیحت آج ہی کل کے مولویوں کے حصے میں آ گئی اس کا جواب ایک تو میں پہلے دے چکا ہوں کہ نصیحت جب ہی دل میں پڑتی ہے کہ جب توجہ ہو ورنہ دیوار کو سنانا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں کچھ بحث نہیں مولویوں نے منع کیا ہو یا نہ کیا ہو جب حدیث میں موجود ہے تو آگے کچھ حجت کی ضرورت نہیں۔ نیز میں کہتا ہوں اگلے مولویوں نے بھی ضرور منع کیا فقہاء نے عورتوں کو اس مجمع میں جانے سے منع کیا ہے جس میں یہ مفاسد ہوں دیکھو ردالمختار میں لکھا ہے۔

یہ مسئلہ ایک طالب علم بھی بتا سکتا ہے مگر یہ ترکیب غضب کی ایجاد ہے کہ مفاسد کو مفاسد ہی نہ کہو موجودہ رسموں کو رسم ہی نہ کہو کہ ان پر منع وارد ہو یہ جہل مرکب اور قلب کی موت ہے۔ کرنے کو جو چاہو کر گزرو مگر یہ یاد رکھو کہ گناہ کا گناہ ہونا تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے پر موقوف نہیں واقع میں جو اثر گناہ کا ہے وہ ضرور ظاہر ہوگا۔ اگر کوئی زہر کھالے اور دل میں خیال کرے کہ زہر نہیں شکر ہے تو کیا وہ شکر ہو جائے گا ہرگز نہیں۔ تھوڑی سی دیر میں مزہ دکھائے گا۔ حق کو اختیار کرلو یا باطل کو۔ ایک طرف کا ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ غلطی میں پڑے رہو اور اس کو غلطی نہ سمجھو۔ جو شخص غلطی میں مبتلا ہو مگر اس کو غلطی سمجھتا ہے تو کبھی نہ کبھی امید ہے کہ اس کو چھوڑ دے گا جو شخص غلطی کو غلطی ہی نہیں سمجھتا اس سے کیا امید ہوسکتی ہے خود تو متنبہ کیوں ہونے لگا۔ اگر کوئی اور بھی خبردار کرے تو جواب میں کہے گا واہ اس میں بھی کچھ برائی ہے جو میں چھوڑ دوں ایسا شخص ہمیشہ گناہ میں مبتلا رہے گا۔ موت کے وقت بھی توبہ نصیب ہونے کی کیا امید ہے غرض یہ خیال بالکل غلط سمجھو کہ موجودہ رسمیں

نہیں ہیں اور ساتھ ہی اس کے رئیس چھوڑنے کی بھی ہمت کر دان کو ہلکا نہ سمجھو یہ اس اصل کی فرع ہیں جو تمام گناہوں کی حتیٰ کہ کفر و شرک کی بھی جڑ ہے۔

کبر اور اس کا مفہوم

میں نے چند نظریں کبر کی بطور مثال کے بیان کی ہیں ان کو اور ہر اس عمل کو جو کبر کی فرع ہو چھوڑ دو جیسے غیبت حسد وغیرہ۔ غیبت کوئی جب ہی کرتا ہے کہ جب اپنے آپ کو اس سے اچھا سمجھتا ہے جس کی غیبت کرتا ہے۔ کسی مریض کو ہنساتا وہی شخص ہے جو خود تندرست ہو اور اگر اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ مریض پائے تو کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے سے کم مریض کو ہنساتا ہو۔ یہ اچھا سمجھنا ہی کبر ہے۔ علیٰ ہذا دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر جو آدمی جلتا ہے (جسے حسد کہتے ہیں) اس کی بناء بھی اس پر ہے کہ اس صاحب نعمت سے زیادہ اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل سمجھتا ہے یہ بھی اپنے نفس کی بڑائی ہے جسے کبر کہتے ہیں۔ غرض اکثر گناہوں کو ٹٹولو تو بنا کبر ہی پر پاؤ گے۔ لہٰذا سب کو چھوڑ دو حتیٰ کہ معاصی کی اصل ہی دل میں سے نکل جائے کیونکہ بڑائی کو حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمایا ہے کسی دوسرے کا اس میں حصہ نہیں تو جو شخص کبر کو نہیں چھوڑتا وہ نہیں پہچانتا کہ یہ کس کا حق تھا اور کس کو دیتا ہے تو اس نے نہ نفس کا حق پہچانا نہ حق تعالیٰ کا اس سے بڑھ کر جاہل کون ہوگا یہ شخص معاصی سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا جس گناہ میں بھی پڑ جائے کم ہے۔ کیونکہ معاصی کی جڑ اس کے دل میں موجود ہے ایک سے بچے گا دوسرے میں پڑ جائے گا۔ گناہ ہو نہ پڑا۔

تمام عبادات کی اصل تذلل ہے

وہ علاج یہ ہے کہ اپنی ایک صفت کو بیان فرمایا کہ جب خیال رکھو گی کہ یہ کسی دوسرے کے لئے کسی وقت اور کسی حالت میں ثابت نہ ہونے پائے تو گناہ تم سے خود بخود چھوٹتے جائیں گے۔ وہ صفت عظمت ہے وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (اور اسی کو زمین و آسمانوں میں بڑائی حاصل ہے) یہ اصل کل ہے تمام گناہوں سے حفاظت کی اور جب صفت کبریاء یعنی عظمت مختص ہوئی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ تو نفس کے واسطے کیا رہ گیا تذلل یہ اصل ہے تمام عبادات کی تو جس شخص نے صفت کبریا کو مختص مان لیا حق تعالیٰ کے ساتھ اس نے حق تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور نفس کا بھی اس سے بڑھ کر کوئی عالم یا محقق ہو سکتا ہے انہیں کی شان میں ہے واولئک ھم اولو الالباب یعنی عقلمند لوگ بھی ہیں جب آدمی کے دل میں سے تمام گناہوں کی اصل نکل گئی اور تمام عبادات کی جم گئی تو سبھی کچھ اس نے پالیا اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اس کے ساتھ اتنا سمجھ لو کہ یہ اصل کلی بہت مختصر الفاظ میں سمجھائی گئی ہے مگر

بعض اوقات بلا تفصیل کے اس پر عمل دشوار ہوتا ہے۔یعنی جب تک ہر عمل کی نسبت معلوم نہ ہو کہ اس کا منشاء کبر کس طرح ہے اس کا ترک آسان نہیں ہوسکتا۔

تکبر کے علاج کی آسان اور مفید تدبیر

اس کے لئے سہل اور مفید تدبیر یہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے بلکہ کسی سے سبقاً سبقاً پڑھ لیا جائے اور جو کوئی پڑھ سکے وہ کسی عالم سے وقتاً فوقتاً سن لیا کرے۔واقعات کو پوچھتا رہے اور وعظ سنا کرے اور عورتوں کو خاص طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں ان کی ہانڈی چولہے کا ایک وقت ہے کتاب کے پڑھنے یا سننے کا بھی ایک وقت ہونا چاہئے لیکن افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مستورات کو اس سے بالکل مس بھی نہیں مرد تو کبھی کوئی مسئلہ پوچھ بھی بیٹھتے ہیں مگر عورتوں کو نہ کہیں زبانی پوچھواتے دیکھا نہ کوئی تحریر کسی کی آتی ہے (الا ماشاء اللہ) حالانکہ بعض مسائل عورتوں کے اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جواب دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں مثلاً پاکی اور ناپاکی کے مسائل کہ فقہ کی تمام بحثوں سے ادق بحث یہ مشہور ہے صورتیں مشکل سے مشکل پیش آتی ہیں مگر اس پر عمل ہے کہ نہ پڑھی نہ قضا ہوئی۔کچھ عورتیں تو شرم کے مارے نہیں پوچھتیں۔اور بعض جو کسی قدر پڑھی لکھی ہیں وہ کسی اردو کی کتاب میں دیکھ کر جو الٹا سیدھا سمجھ میں آیا کر گزرتی ہیں۔حیف کی بات ہے کہ اگر کوئی مرض شرم کا ہو جاتا ہے تو اس کے علاج میں یہ نہیں کرتیں کہ بلا سے جان جاتی رہے مگر شرم نہ جائے۔

مستورات کی اصلاح کی آسان تدبیر

علاج کے لئے سوچ کر کوئی نہ کوئی تدبیر ایسی نکال لیتی ہیں کہ شرم بھی نہ جائے اور علاج بھی ہو جائے۔بیبیو! کسی مسئلہ کا تحقیق کر لینا تو آج کل کچھ بھی بات نہیں دو پیسے میں جا ہے کہاں سے جواب منگالو اگر خود نہ کر سکو اپنے خاوند کی معرفت پوچھوالو یا اور کسی بی بی کے ہاتھ سے لکھوا کر دریافت کرالو اگر نہ خود لکھ سکو نہ شوہر موجود ہو۔مگر بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ جب ہو کہ جب دین کا خیال ہو۔اس غفلت کو چھوڑو اور دین کو دنیا سے بھی زیادہ ضروری سمجھو۔دنیا ختم ہو جائے گی اور آخرت ختم نہ ہوگی۔جو طریقہ میں نے بیان کیا اس سے بہت کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔گھر میں جب مسائل کا تذکرہ ہوگا بچوں کے کان میں پڑیں گے اور ساری عمر ان کو یاد رہیں گے۔جو لوگ تمہارے تابع ہیں ان کی اصلاح ہوگی ان کی اصلاح بھی تمہارے ذمہ ضروری ہے۔حدیث میں ہے

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته (الصحیح للبخاری ۲:۶)

یعنی ہر بڑے کو چھوٹے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محافظ فرمایا کہ ہر ہر شخص کچھ نہ

کچھ ذمہ دار ہے اور اس کی جواب دہی اس کے ذمہ ہے اگر نوکرانی تمہاری نماز نہیں پڑھتی تو وہ گنہگار ہے ہی مگر تم بھی اس کے ساتھ گنہگار ہو اور جواب دینا ہوگا کہ اسے نماز کیوں نہیں سکھائی تھی۔ بعض لوگوں نے اس کا جواب یہی اختیار کرلیا ہے کہ ہم نے تو بہتیری تاکید کی مگر وہ نماز پڑھتی ہی نہیں۔ کیوں بیبیو! اگر کھانے میں وہ نمک کم و بیش کردے تو تم کیا کرتی ہو کیا ایک دو دفعہ سمجھا کر نیک بخت نمک ٹھیک رکھا کہہ کر خاموش ہو رہتی ہو اور پھر نمک ویسا ہی کھالیتی ہو جیسا اس نے ڈال دیا ہو۔ یہ تو کبھی بھی نہ کروگی چاہے نوکرانی رہے یا نہ رہے اسے سمجھاؤ گی پھر مارو پیٹو گی اگر کسی طرح نہ مانے گی تو نکال باہر کرو گی۔ بیبیو! دین کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا نمک کا جو نماز کے مقابلے میں بالکل غیر ضروری چیز ہے۔ دین کا خود بھی خیال کرو اور جن پر تمہارا قابو چل سکتا ہے ان کو بھی دین دار بناؤ تمہاری کوشش سے جو کوئی دیندار بنے گا تمہیں بھی اسی کے برابر ثواب ملے گا۔ اس کا طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ جہاں دنیا کے دس کاموں کا وقت ہے ایک دن کے کام کا بھی وقت نکال لو۔ جو بی بی خود کتاب پڑھ سکیں وہ کتابوں کو دیکھ کر اپنی اصلاح کریں اور جو خود نہ پڑھ سکیں کسی اپنے رشتہ دار سے پڑھوا کر سنیں علماء سے وعظ اپنے مکانوں میں کہلوایا کریں جو واقعات پیش آیا کریں ان کی پوچھ پاچھ کیا کریں۔ علماء سے ان کی معرفت یا خط کے ذریعے سے جواب منگا لیا کریں اس سے دین میں ایسی بصیرت ہو جائے گی کہ رفتہ رفتہ ہر ہر عمل کی نسبت حکم معلوم ہو جائے گا۔ جب کسی چیز کا علم ہو جاتا ہے تو کبھی نہ کبھی تو دل میں اس سے بچنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہی ہے رات میں اگر تم ذرا سی بھی ہمت سے کام لوگی تو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اور تم میں شدہ شدہ تمام مفاسد کی جڑ یعنی کبر بھی قلب سے نکل جائے گی۔

تمام مفاسد کا علاج

اسی کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ تمام مفاسد کا علاج بتا دیا کہ اس ایک کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص مان لو۔ یہ صفت کسی اور کے لئے نہیں ہوسکتی وہ صبر یا ہے یہ ایک جڑ ہے جس کے ہزاروں شعبے میں اجمالاً نہیں بلکہ تفصیلاً اس کے عموں کو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص کردو۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ سب کی سب تبحر کی جاؤ بلکہ جہاں تک موقع ملے غفلت نہ کرو جیسا روپیہ اور زیور کے جمع کرنے کا شوق ہے یہ یقینی بات ہے کہ تمام بیبیاں اپنا دل بھر کے زیور اور روپیہ نہ لے سکتیں مگر غریب ہے یا امیر ہے تو ہر بی بی کو کوشش ضرور ہے کہ زیور اور روپیہ جاوے جتنی کوشش سے ایک مقدار روپیہ کی مل سکتی ہے اتنی کوشش سے بلکہ اس سے دین کی بہت بڑی مقدار مل سکتی ہے۔ ہمت نہ ہارو پھر نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔ تم ایک سے کماؤ گی تو خدائے تعالیٰ کی طرف سے دس حصے مرحمت ہوں

گے۔آگے اس مضمون کواللہ تعالیٰ نے وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (وہ غالب وصاحب حشمت ہے) سے موکد کیاان کے چونکانے کے لئے جواس مفاسد سے کسی طرح بچتے ہی نہیں اوراپنے عیب پران کی نظر ہی نہیں جب ان کو سمجھانے اوران کی بھلائی سوجھانے سے اثرنہیں ہوتا تو فرماتے ہیں عزیز یعنی غالب بھی ہوں اگرتم کہنانہ مانوگے تو میرے ہاتھ سے کہیں جانہیں سکتی چاہوں سزادوں گا۔

اوراگر کیئے عمل پر فوراً سزانہ ملے تو مطمئن مت ہو جاؤ میں حکیم بھی ہوں کسی مصلحت سے مہلت دوں۔بعض لوگ رشوت لیتے اور کہتے ہیں ہمیں رشوت سزاوار ہے۔

آخرت کے احوال وآفات کوسوچنے کی ضرورت

صاحبو!اس دھوکے میں ہوخدا کے غضب کومت بھولو۔اول تو دنیا ہی میں سزا ملے گی اوراگر دنیامیں کسی حکمت اور مصلحت سے ٹل ہی گئی تو آخرت تو دارالجزا ہے ہی وہاں کی سزائیں اورزیادہ سخت ہیں وہاں کی سزا سے تو دنیا ہی کی سزا بھگت لینا اچھا ہے۔وہاں کے احوال وآفات کوسوچتے رہنا چاہیے تصریح موجود ہے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ. یعنی چاہیے کہ خیال رکھے ہر شخص کہ کل کے لئے کیاسامان کیا ہے۔اوراسی کے یاد دلانے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

زوروا القبور واكثروا ذكر هاذم اللذات (بلفظ آخر۔سنن ابن ماجہ:۱۵۶۹)

یعنی قبروں پرجایا کرواور لذتوں کومٹانے والی چیز یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔

عورتوں کے قبرستان جانے کا حکم

(اس سے عورتیں یہ فتویٰ نہ نکال لیں کہ قبرستان میں جانا جائز ہے عورتوں کے پردے سے نکلنے میں بہت سی خرابیاں ہیں مراد تذکرہ آخرت وقیامت ہے جس طرح بھی ہو کسی معتبر کتاب میں قیامت کے حالات پڑھیں یاسنیں)

اور یہ موت اور قیامت کی اجمالی حالت کافی نہیں کہ کوئی موت موت کی تسبیح پڑھا کرے بلکہ موت کو یادرکھنا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرے سوچ لے کہ موت کے اس پرکوئی جواب دہی تو میرے ذمہ عائد نہ ہوگی۔ہمیشہ اس کاخیال رہے اوراگر کچھ کام قابل جواب دہی ہوگئے ہیں تو ان سے توبہ کرو۔اور برابر توبہ کرتی رہو۔

اب دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔

آمین!

التکشف

عن مہمات التصوف

تصوف کے سینکڑوں دقیق مسائل کا قرآن و حدیث سے استنباط

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

تحقیق و تخریج احادیث

حضرت مولانا محمد عفان منصور پوری مدظلہ

مجموعہ رسائل

التقی فی احکام الرقی

اوراد رحمانی

المسوح فیما یتعلق بالروح

حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقۃ

تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ

عرفان حافظ

النکت الدقیقۃ مما یتعلق بالحقیقۃ

چھ نایاب رسائل کا مجموعہ پہلی مرتبہ
جدید ترتیب و تخریج
کے ساتھ

ادارہ تالیفات اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240